قصص الاولیاء

(اللہ کے برگزیدہ بندوں کے حالات اور واقعات)

(5)

ضیا تسنیم بلگرامی

قصص الاولیاء

(اللہ کے برگزیدہ بندوں کے حالات اور واقعات)

(5)

ضیا تسنیم بلگرامی


Compiled by
Abdul Basit

شیخ شرف الدین

شاہ کمال

صابر پیا کلیری

عمرو بن عثمان

قطب ربانی

محبوب سبحانی

عارف ملتانی

یوسف ثانی

صدیق ثانی

محمود واحد گیلانی

بوعلی قلندر

خواجہ احرار

توکل کا بندہ

قبلہ حاجات

غوث علی قلندر

توکل شاہ

شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ

ضیا تسنیم بلگرامی

آپ علم کے سمندر تھے۔ دینی مسائل کے روشن چراغ تھے۔ مخاطب کو قائل کر دینے میں عدیم النظیر اور بے نیازی میں فقید المثال تھے۔ اس بزرگ کے حالاتِ زندگی جس نے فقیری میں بادشاہی کی۔ بڑے بڑے باجبروت شہنشاہ دُنیا سے اُٹھ گئے اور آج اُن کے ناموں سے وہی لوگ واقف ہیں جو کثرتِ مطالعہ سے انہیں یاد رکھ سکے ہیں۔ لیکن شیخ شرف الدین یحییٰ منیری آج بھی مشہور اور مرجع خاص و عام ہیں۔ ملکوں، زمینوں اور جسموں پر حکومت کرنے والے فنا ہو گئے۔ ذہنوں اور دلوں پر حکومت کرنے والا آج بھی ہم سب کے دلوں میں زندہ اور موجود ہے
حیرت انگیز حالات اور سوانح، فکر انگیز اقوال و امثال۔

پٹنہ (بھارت) میں منیر نامی ایک قصبہ ہے، اسی قصبہ میں ساتویں صدی ہجری میں ایک ایسا مسلمان خاندان آباد تھا جس کا نسب نامہ عبد المطلب بن ہاشم بن عبدِ مناف تک پہنچتا تھا۔ یہ خاندان علمی بھی تھا اور روحانی بھی۔ اُن لوگوں نے تبلیغ و اشاعت اسلام کے سلسلے میں شاندار کارنامے انجام دیے اور اس علاقے کو نورِ اسلام سے منوّر کر دیا۔ اسی خاندان میں ۲۶ شعبان ۶۶۱ھ میں ایک بچہ پیدا ہُوا۔ اس بچے کا نام شرف الدین احمد رکھا گیا، بچے کے باپ کا نام شیخ یحییٰ تھا۔ قصبہ منیر کی نسبت سے یہ لوگ منیری کہلاتے تھے۔ نومولود شرف الدین احمد کے اُن سے بڑے ایک اور بھائی بھی تھے۔ اُن کا نام تھا جلال الدین احمد۔ اُن کی ماں کا خاندان بیت المقدس سے تعلق رکھتا تھا اور یہ خاندان عرب کے سادات کی ایک شاخ سے متعلق تھا۔ زہد و تقویٰ میں یہ خاندان بے مثالی تھا۔

شرف الدین احمد ابھی سنِ شعور میں داخل بھی نہ ہوئے تھے کہ اپنے والدین کی خصوصی توجہ کے مستحق قرار پائے۔ باپ نے اُن میں علوم نہیں کیا دیکھ لیا تھا کہ ہر وقت اُن کی تعلیم و تربیت میں لگے رہتے۔ اُن دنوں منیر میں کوئی لائق اور مہتمم بالشان عالم میسّر نہ تھا، اس لیے ان کی نظرِ انتخاب سنار گاؤں کے مشہورِ زمانہ عالمِ دین ابُو توامہ پر پڑی۔ شیخ یحییٰ اپنے بیٹے شرف الدین کو اُن کے پاس لے گئے اور نہایت ادب سے عرض کیا "حضرت! یہ میرا فرزند ہے۔ اس کی علمی تشنگی آپ دُور فرمائیں گے، گویا آج سے یہ میرا نہیں، آپ کا فرزند ہو گا۔"

ابُو توامہ نے اس بچے کی پیشانی میں نور کی چمک محسوس کی، وہ کچھ دیر تک اس بچے کو دیکھتے رہے اس کے بعد شیخ یحییٰ سے کہا "شیخ! کیا گوہرِ نایاب لائے ہیں آپ۔ واللہ جی خوش کر دیا۔ مجھے تو اس کے وجود سے ایک پُرلطف، سرور کُن خوشبو سی محسوس ہو رہی ہے۔"

شیخ یحییٰ نے اپنے بیٹے کی تعریفیں جو سُنیں تو بہت خوش ہوئے اور اپنے بیٹے کو نصیحتیں کرنے لگے "دیکھ شرف الدین! ابھی تو بچہ ہے کل تو بڑا ہو جائے گا۔ اُس وقت تک تجھ کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ ایک باپ اور اُستاد میں کیا فرق ہوتا ہے۔ باپ پیدا کرتا ہے اور اُستاد اس کو نکھارتا، سنوارتا اور آراستہ کرتا ہے۔"

معصوم بچہ اپنے باپ کی ان ادق اور پُرمعانی باتوں کو کس حد تک سمجھ سکا، کسی کو پتا نہیں۔ لیکن بعد کے حالات و واقعات نے بتایا کہ یہ بچہ غیر معمولی سمجھ لے کر آیا تھا۔

شیخ یحییٰ منیر واپس چلے گئے اور بچہ سنار گاؤں میں ابُو توامہ کے گھر میں خاندان کے ایک فرد کی طرح رہنے لگا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم تو گھر ہی میں حاصل کر لی تھی۔ یہاں اپنے استاد ابُو توامہ سے قرآن پاک کی تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔

استاد نے اپنے شاگرد میں جذب و سوز بھی محسوس کر لیا تھا۔ اسی جذب و سوز نے شیخ شرف الدین کو ریاضت اور مجاہدے میں مشغول کر دیا۔ نوجوانی میں زہد و تقویٰ دشوار چیزیں ہیں لیکن شرف الدین کو اس میں بہت مزہ آتا تھا۔

استاد کی ایک ہی شہزادی تھیں۔ انھیں ان کے لیے اس سے اچھا لڑکا نہیں مل سکتا تھا۔ اسی لیے کہنے میں انھوں نے اپنے شاگرد سے کہا۔" اگر تم چاہو تو اس گھر میں زندگی بھر رہ سکتے ہو۔"

شیخ شرف الدین نے پوچھا۔" وہ کس طرح ؟"

ابُو توامہ نے جواب دیا۔" آج میں سُنّتِ رسولؐ اللہ ادا کرتے ہوئے تم سے اپنی بیٹی کے رشتے کی بات کر رہا ہوں۔"

انھوں نے عُذر پیش کیا۔" میں والدین کی موجودگی میں، اُن کو مطلع کیے بغیر یہ کام اپنے طور پر کس طرح انجام دے سکتا ہوں۔"

ابُو توامہ نے جواب دیا۔" میں کب یہ کہتا ہُوں کہ تم یہ کام اپنے والدین کی لاعلمی میں کر گزرو۔ میں انھیں مطلع کر دُوں گا۔"

آپ نے فرمایا۔" نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ آپ کے ساتھ اپنے والدین کے پاس میں بھی چلوں گا اور اُن کی اجازت میں اپنے سامنے حاصل کروں گا۔"

لیکن انہی دنوں اُن کے والد سنارگاؤں اپنے بیٹے کے پاس پہنچے۔ جب انھیں اس واقعے کی خبر ملی کہ اُن کا بیٹا اپنے اُستاد کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اجازت دے دی اور یہ شادی اُن کی موجودگی میں اُن کی اجازت اور رضامندی سے ہوئی۔

آپ اپنے اُستاد اور خسر کے گھر میں کئی سال رہے۔ اسی دوران ایک گھڑسوار آپ کا پتا پوچھتا ہوا سنارگاؤں پہنچا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کے مشہور عالمِ دین ابُو توامہ کہاں رہتے ہیں ؟

چند آدمیوں نے اس سوار کو ابُو توامہ کے گھر کا پتا بتایا تو وہ سوار ابُو توامہ کے گھر پہنچا اور شیخ شرف الدین سے ملاقات کی۔ اس نے کہا۔" حضرت! میں آپ کے گھر سے آپ کے لیے ایک بُری خبر لایا ہوں۔"

آپ نے جواب میں فرمایا۔" اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ہاں، اب بتا کہ تو میرے لیے کون سی منحوس خبر لایا ہے ؟"

سوار نے عرض کیا۔" حضرت! کل رات کو آپ کے والد واصل بحق ہو گئے۔"

اس خبر نے آپ کو بہت پریشان اور غمزدہ کر دیا۔ سوار سے مزید کوئی بات نہیں کی اور اپنی بیوی سے کہا۔" تمھیں میرے ساتھ میرے گھر چلنا ہوگا۔"

بیوی نے جواب دیا۔" میں نے کب انکار کیا ہے۔ میں چلوں گی اور آپ سے یہ بھی نہیں پوچھوں گی کہ کیوں آپ یہاں سے جا رہے ہیں ؟"

یہ سُنارگاؤں سے پٹنہ کے قصبہ منیر روانہ ہو گئے۔ گھر میں ان کی والدہ اور بڑے بھائی بہت سوگوار تھے۔ مرحوم باپ کی آخری رسُوم ادا کی جا چکی تھیں۔ شیخ شرف الدین نے صبر و ضبط سے کام لیا۔ ماں نے کہا۔" بیٹے! تیرے باپ نے آخری لمحوں میں تجھے بے حد یاد کیا۔"

شرف الدین نے جواب دیا۔" ہاں، اللہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، خود مجھے بھی اپنی عدم حاضری پر بہت دکھ ہو رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب میں کیا کروں ؟"

ماں نے کہا۔" اب تو میرے پاس رہ۔"

جلال الدین نے کہا۔" شرف الدین! اگر تم یہاں موجود بھی ہوتے تو کیا کر لیتے ؟ یہ سفر تو سبھی کو درپیش ہے اس کا ملال ہی کیوں ؟"

شرف الدین نے سوچتے ہوئے کہا۔" بیشک یہ سفر تو سبھی کو درپیش ہے اور ہم جو یہاں بھیجے گئے ہیں تو اس کا کوئی مقصد بھی ہوگا۔"

ماں نے جواب دیا۔" ہاں اس کا بھی ایک مقصد ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ انسان کسی حال میں بھی اپنے رب کو نہ بھُولے، ہر حال میں اُس کا شکر گزار رہے اور اس کے احسان کو ہر حال میں یاد رکھے۔"

شرف الدین نے عرض کیا۔" کیا فرمایا آپ نے ؟ کسی حال میں بھی اپنے رب کو نہ بھُولے، خوب، آپ نے اس معاہدے کی یاد دلا دی، جو ہم نے روزِ اوّل اپنے رب سے کیا تھا۔" اس کے بعد اس طرح جیسے وہ کسی حاضر و موجود سے کہہ رہے ہوں، کہنے لگے۔" میں تجھ کو کسی حال میں بھی نہیں بھُول سکتا۔ میں تجھ کو یاد رکھوں گا اور ہمیشہ یاد کرتا رہوں گا، میں شرمسار ہوں کہ اب تک میں کن خیالوں میں تھا۔"

پاس ہی بیوی بھی موجود تھی۔ اس نے معلوم نہیں کیا محسوس کیا کہ اُن کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی، اور کہا۔" میں آپ کو کہیں بھی نہیں جانے دوں گی۔ آپ یہیں اسی گھر میں رہیں گے۔"

آپ نے بیوی کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور ماں سے کہا۔" بہرحال جو دن غفلت میں گزرے گزر گئے، باقی دنوں، باقی لمحوں کو کارآمد بنانا ہے۔"

بیوی نے عرض کیا۔" کچھ مجھ سے بھی تو کہیے، کچھ مجھے بھی تو بتائیے۔"

آپ نے جواب دیا۔" اے شریف خاتون! میں تجھ کو بھی وہ عہد یاد دلا رہا ہوں جو ہم نے روزِ اوّل کیا تھا۔ اس دن اللہ نے

ہم نے رب سے عہد کیا تھا، السست بربکم (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) اس پر ہم نے جواب دیا تھا "بلیٰ" (ہاں، بیشک) جب ہم نے اس کی ربوبیت اور الٰہیت کا روزِ اوّل ہی اقرار کر لیا تھا تو اب اُس کا عملی ثبوت کیوں نہیں فراہم کرتے؟ ہمیں اپنے اعمال اور افعال سے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ہم اپنے رب اپنے اللہ کو پورے خشوع وخضوع سے مانتے ہیں۔ ہم اس کی نافرمانی نہیں کریں گے۔"

بیوی نے پوچھا "میرے لیے کیا حکم ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "چاہو تو اسی گھر میں میری ماں کے ساتھ رہو اور اللہ کو یاد کرتی رہو۔ لیکن اگر یہاں رہنے میں کوئی عذر مانع ہو تو تم اپنے باپ کے گھر چلی جاؤ اور وہاں اپنے رب کی یاد میں کھو جاؤ۔"

بیوی نے سوگوار لہجے میں عرض کیا "جنابِ والا! مجھے اجازت دیجیے کہ میں یہاں اس گھر میں بھی رہوں اور رشتہ نبھاؤں اپنے باپ کے پاس بھی۔"

آپ نے جواب دیا "میری طرف سے اجازت ہے۔"

ماں بھی یہ گفتگو سن رہی تھیں، محبت سے بہو کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "بہو! میں اپنے بیٹے شرف الدین کے اس فیصلے سے آگاہ تھی۔ مجھے بہت پہلے بتایا جاچکا ہے کہ شرف الدین اپنے زمانے کا زبردست صُوفی ہوگا۔ لاکھوں ارادت مند اس کو اپنے دلوں میں جگہ دیں گے اور اس کے علم اور روحانیت کا ایک عالم معترف اور معتقد ہوگا۔"

قریب ہی راج گڑھ کا پہاڑی سلسلہ تھا۔ یہاں کے غاروں اور چٹانوں کے مسقّف سلسلوں میں خدا کے متلاشی اور اس کی راہ میں عبادت وریاضت کرنے والے اپنی زندگیاں گزار دیتے تھے۔ شیخ شرف الدین کو بھی یہی جگہ پسند آئی، اور آپ انہی غاروں میں سے ایک میں چلے گئے۔ گھر میں کام کاج اور خدمت گزاری کے لیے ایک غلام بھی تھا، اس کا نام تھا فتوحا۔ ماں نے فتوحا کو حکم دیا کہ "تو شرف الدین کے پیچھے پیچھے جا اور یہ دیکھ کہ وہ کس غار میں قیام کرتے ہیں۔"

فتوحا نے حکم کی تعمیل کی اور آپ کے پیچھے پیچھے اس غار تک پہنچ گیا جسے آپ نے اپنے لیے پسند کیا تھا۔

ماں نے اپنے بیٹے کے لیے کھانا تیار کیا اور فتوحا سے کہا "تو نے شرف الدین کا ٹھکانا تو دیکھ ہی لیا ہے، یہ کھانا لے اور اس کو پہنچا دے، اس کو وہاں کھانا کون دے گا۔"

فتوحا نے کھانا لیا اور اس غار میں پہنچ گیا۔ اُس وقت شرف الدین آنکھیں بند کیے یادِ الٰہی میں مشغول تھے۔ فتوحا اُن کے پاس جا کھڑا ہوا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ آنکھیں کھولیں تو وہ کھانا اُن کے حوالے کرے لیکن تادیر انتظار کے بعد بھی جب انھوں نے آنکھ نہ کھولی تو فتوحا نے انھیں آواز دی "میاں جی!"

شرف الدین نے آنکھیں کھول دیں، فتوحا کو اپنے پاس دیکھ کر حیران ہوئے، خفگی سے پوچھا "تجھ کو میرا پتا کس نے بتایا؟"

فتوحا نے جواب دیا "جب آپ یہاں آرہے تھے تو ماں کے حکم پر میں آپ کے پیچھے پیچھے چل کے یہاں تک آگیا تھا۔"

ماں کے حوالے نے اُن کی خفگی دُور کر دی، پوچھا "پھر اب کیوں آیا ہے تو یہاں؟"

فتوحا نے پوٹلی میں بندھے ہوئے کھانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ماں نے آپ کے لیے کھانا تیار کیا تھا وہی لے کر آیا ہوں۔"

شرف الدین نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اُدھر رکھ دے اور یہاں سے فوراً چلا جا۔ ماں سے کہہ دینا کہ جس نے رزق کا وعدہ کیا ہے وہی یہاں بھی پہنچائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

فتوحا کھانا رکھ کے واپس چلا گیا۔ گھر میں ماں نے پوچھا "کیا شرف الدین نے کھانا تیرے سامنے ہی کھا لیا تھا؟"

فتوحا نے جواب دیا "نہیں، انھوں نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ کھانا وہاں رکھ دے، میں نے رکھ دیا۔ اس کے بعد میاں جی نے کہا کہ میری ماں سے واپس جاکے کہہ دینا کہ جس نے رزق کا وعدہ کیا ہے وہی یہاں بھی پہنچائے گا آپ فکر نہ کریں۔"

ماں کا دل بھر آیا، کہا "فتوحا! جب دوبارہ کھانا لے کر جائے تو کہہ دینا کہ جس رزّاق نے کھانے کا وعدہ کیا ہے اسی کے حکم پر میں نے یہ کھانا بھیجا ہے۔"

فتوحا دُوسرے دن بھی کھانا لے گیا اور اس بار بھی اشارے سے حکم دیا گیا کہ کھانا وہاں رکھ دے۔

جب کھانا وہاں رکھ دیا گیا تو آپ نے فتوحا سے پوچھا "تو نے میری بات والدہ محترمہ کے گوش گزار کر دی تھی؟"

فتوحا نے جواب دیا "جی۔ گوش گزار کر دی تھی۔ انھوں نے کہا ہے کہ جس نے رزق دینے کا وعدہ کیا ہے، میں اسی کے حکم کی تعمیل میں رزق بھیجتی ہوں۔"

آپ خاموش ہوگئے اور یہ سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ روز روز یہ سنتے سنتے کہ کھانا ایک طرف رکھوا دیا جاتا ہے اور فتوحا نے انھیں ایک بار بھی کھانا کھاتے نہیں دیکھا، ماں کو بڑی تشویش ہوئی اور فتوحا سے پوچھا "کیوں فتوحا! تیرا کیا خیال ہے۔ تیرے آنے کے بعد شرف الدین کھانا کھا تو لیتا ہوگا؟"

فتوحا نے جواب دیا "ضرور کھا لیتے ہوں گے، کیونکہ جب میں جاتا ہوں تو ایک دن پہلے کا رکھا ہوا کھانا مجھے ملتا نہیں ہے۔"

ماں نے کہا "اچھا، آج میں شرف الدین کے لیے کھجور تیار کروں گی تو اُن کو لے جا کر اپنے سامنے کھلائے گا، یہ میرا حکم ہے۔"

اس کے بعد ماں نے میدہ نکالا، اس میں شکر اور خمیر کی آمیزش کی اور کھجوریں تیار کر دیں۔ انھیں ایک بڑے اور گہرے پیالے میں رکھ کر پوٹلی سی بنا دی اور کہا "جا، شرف الدین سے کہنا کہ میں نے یہ حکم دیا ہے کہ انھیں تیرے سامنے کھائے ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔"

فتوحا نے پوچھا "اگر وہ اس کے باوجود نہ کھائیں تو؟ اس وقت میں کیا کروں گا؟"

ماں نے جواب دیا "پھر میری طرف سے یہ کہہ دینا کہ اگر اس نے میرا حکم نہ مانا تو میں دودھ نہیں بخشوں گی اور روزِ قیامت اس کو رسوا کروں گی۔"

فتوحا نے اس حکم کی پوری پوری تعمیل کی اور کھجوریں شرف الدین کے سامنے رکھ کے ماں کا حکم سُنا دیا۔

آپ نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہاں رکھ دے اور واپس جا۔"

فتوحا نے عرض کیا "نہیں میاں جی! آج یہ نہیں ہوگا۔ ماں نے کہا ہے کہ اگر آپ نے یہ کھجوریں میرے سامنے نہ کھائیں تو وہ دودھ نہیں بخشیں گی اور روزِ حشر آپ کو رسوا کریں گی۔"

اب وہ مجبور ہو چکے تھے، زبان سے تو کچھ بھی نہ کہا۔ ایک کھجور منہ میں رکھ لی اور منہ چلانے لگے۔ اسی عالم میں اُن پر غشی طاری ہو گئی۔ وہ بے ہوش ہو کر گر گئے، اُن کا منہ کھلا ہوا تھا اور انھیں اپنا ہوش نہیں تھا۔ پھر فتوحا نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ بہت ساری چیونٹیاں اُن کے کھلے ہوئے منہ کی طرف رینگتی چلی جا رہی تھیں۔ فتوحا انھیں روکنا چاہتا تھا مگر اس وقت وہ خوف زدہ سا تھا۔ اس کی ہمت نہیں پڑی اور چیونٹیاں منہ کے اندر داخل ہو گئیں۔ اور اس کے بعد اس نے وہ حیرت انگیز منظر دیکھا کہ اس کی عقل اور شعور نے اس کو لاجواب اور سکتے میں مبتلا کر دیا۔ ذرا سی دیر میں چیونٹیوں کی یہ فوج ظفر موج حلق میں پھنسی ہوئی کھجور کا ایک ایک ذرّہ باہر لے آئی، اور انھیں لے کر کہیں غائب ہو گئی، اس دن فتوحا نے آپ کی ماں کو خاص طور پر سمجھایا اور کہا کہ 'اب انھیں کسی بات پر مجبور نہ کرنا۔'

دوسری طرف جب شرف الدین کو ہوش آیا تو انھیں کسی نے حکم دیا کہ 'اس غار سے نکل اور دہلی جا۔ وہاں شیخ نظام الدین بدایونی تیری رہنمائی کریں گے۔'

شرف الدین غار سے باہر نکلے اور گھر پہنچے۔ ماں نے اپنے صوفی، اور تارک الدنیا بیٹے کو اچانک اپنے سامنے جو دیکھا تو اُن کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ پیشانی کو چومتے ہوئے کہا "بیٹے! میں تیرے لیے تڑپ رہی تھی، اچھا کیا جو آ گئے۔ بتاؤ اب تمھارے کیا ارادے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا "ماں! اب میں دہلی چلا جاؤں گا کیونکہ ہاتفِ غیبی نے مجھے حکم دیا ہے کہ اب میں غار سے نکلوں اور دہلی میں نظام الدین بدایونی سے رہنمائی حاصل کروں چنانچہ میں غار سے باہر آ گیا اور اب دہلی چلا جاؤں گا۔"

ماں نے تیوریوں پر بل ڈالے اور پوچھا "تیرے ساتھ اور کون کون دہلی جا رہا ہے؟"

انھوں نے سر جھکا کے مؤدبانہ جواب دیا "فی الحال تو میں اکیلا ہی جا رہا ہوں۔ راستے کا علم نہیں کہ اور کون کون اپنے ساتھ ہو جائے گا۔"

ماں نے حکم دیا "تو اکیلا نہیں جائے گا، اپنے ساتھ اپنے بڑے بھائی جلال الدین کو بھی لیتا جا۔ جلال کو بھی بڑی تمنا ہے کہ وہ حضرت نظام الدین سے ملاقات کرے۔ اس طرح وہ بھی مل لے گا اور اُن کا مرید بھی ہو جائے گا۔"

شرف الدین نے اپنے بڑے بھائی جلال الدین کو ساتھ لیا اور دہلی روانہ ہو گئے۔

دہلی میں داخل ہوئے اور سید نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضری دی اور حد درجہ عقیدت و احترام کا مظاہرہ کیا۔

حضرت نظام الدین اولیا نے بطورِ خاص شرف الدین سے پوچھا "خواجہ شرف الدین! کیسے آنا ہوا؟"

انھوں نے آنکھیں اُٹھائیں اور جواب دیا "حضرت! عمر یونہی گزری چلی جا رہی ہے۔ جب میں اپنے ماضی اور حال پر نظر ڈالتا

ہوں تو اب تب خسارہ ہی خسارہ نظر آتا ہے۔"

حضرت نظام الدین اولیائؒ نے کہا۔ "تو ایسا ہے کہ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تم دونوں کو مرید کروں اور تربیت دوں۔ تمھارے لیے میں نے خاندانِ فردوسیاں کو مقرر کیا ہے۔ تم دونوں اُن کے پاس چلے جاؤ، کام ہو جائے گا۔"

اُن دنوں دہلی میں فردوسی خاندان کے نجیب الدین فردوسی کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ فردوسی خاندان کا تعلق سہروردیہ سلسلے سے ہے۔ کہتے ہیں، ایک بار شیخ نجم الدین کبریٰ فردوسی اور شیخ علاء الدین فردوسی یک جا ہوگئے۔ یہ دونوں بزرگ مجاہدے اور ریاضت میں ہم پلہ ہونے کے باوجود مطمئن نہیں تھے۔ اس لیے یہ دونوں، ایک تیسرے نامی گرامی بزرگ شیخ ضیاء الدین ابو نجیب کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا۔ "حضرت! اپنی عمریں ختم ہو رہی ہیں اور ابھی تک کوئی کام نہیں ہو پایا۔ ریاضت و مجاہدے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر ابھی تک مقصود حاصل نہیں ہوا۔ بتائیے اب ہم کیا کریں؟"

شیخ ضیاء الدین ابو نجیب نے جواب دیا۔ "بھائیو! میں خود بھی اسی مرض میں مبتلا ہوں اور میں نے اس کا یہ علاج تجویز کیا ہے کہ ہم تینوں کسی سے بیعت ہو جائیں۔"

چنانچہ یہ تینوں بزرگ شیخ وجیہہ الدین ابو حفص بن عمر بن عمویہ کے پاس پہنچے اور شیخ وجیہہ الدین نے ضیاء الدین اور علاء الدین کو بیعت کر لیا اور کچھ عرصہ بعد انھیں خلافت بھی عطا کر دی گئی لیکن شیخ نجم الدین کبریٰ کو شیخ نجیب الدین فردوسی کے حوالے کر دیا۔ یہ شیخ نجیب الدین کے پاس سات ماہ تک رہے پھر انھیں بھی خلافت مل گئی اور انھیں رخصت کرتے ہوئے فرمایا۔ "شیخ نجیب الدین کبریٰ! تم جاؤ، اب تم فردوسی مشائخ میں سے ہو۔"

اس طرح یہ فردوسی خاندان معرضِ وجود میں آگیا۔

انہی شیخ نجیب الدین فردوسی کی خدمت میں شیخ شرف الدین اور جمال الدین بھی پہنچے۔ شیخ نجیب الدین نے دونوں بھائیوں کو اپنے سامنے دیکھا تو انھوں نے گرم جوشی سے شرف الدین کو مخاطب کیا، بولے۔ "شرفا! بیا۔ از برائے تو زنانے است پیش از سالہائے سال مشتاق تو بودیم و انتظار تو می نمودیم (اے اشرف! آؤ، ہم تمھارے بہت عرصہ سے مشتاق ہیں اور تمھارا انتظار کر رہے ہیں)

اسی وقت انھیں بیعت کر لیا گیا۔ خرقۂ خلافت عطا ہوا اور پیرانِ عظام کے تبرکات اُن کے حوالے کر دیے گئے۔ یہ تبرکات اُن کے پاس بطور امانت رکھے ہوئے تھے۔

آپ اپنے پیر مرشد کے پاس ہی رہنے لگے۔ اُن کے پاس سفوف کی ایک پڑیا تھی۔ اس سفوف سے سونا بنایا جا سکتا تھا۔ آپ نے ایک دن فرطِ عقیدت سے یہ پڑیا اپنے پیر مرشد کے حوالے کر دی اور فرمایا۔ "پیر مرشد! یہ سفوف میری برس ہا برس کی محنت اور ریاضت کا ثمر ہے اس کو قبول فرمائیں، اس سفوف سے سونا تیار کیا جا سکتا ہے۔"

پیر مرشد نے پڑیا لے لی اور اس کو کھول کر سارا سفوف حوض کے پانی میں ڈال دیا۔ اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو پیر مرشد کے اس طرزِ عمل سے بہت دکھ محسوس کرتا مگر شرف الدین نے مسکراتے ہوئے عرض کیا۔ "پیر مرشد! اس سفوف کے ذریعہ تانبے کو سونا بنایا جا سکتا تھا اور یہ سونا حاجت مندوں کے کام آتا۔ لیکن آپ نے اس کو پانی میں ضائع کر دیا۔ اب میں اپنی طبیعت میں ہلکا پن محسوس کر رہا ہوں۔ جب تک یہ سفوف میرے پاس رہا میں ہر وقت اس کی حفاظت کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ اب میں بہت خوش ہوں۔"

پیر مرشد نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر اُن کے حوالے کر دیا اور کہا۔ "اس کو پڑھ لو۔"

انھوں نے یہ چند سطریں جو پڑھیں تو کچھ عجیب ہی محسوس ہوا۔ زمین کی تہوں میں چھپی ہوئی چیزیں بھی انھیں صاف نظر آنے لگیں۔ شرف الدین نے اس کاغذ کو اپنی آنکھوں سے لگایا، بوسہ دیا اور اس کو پیر مرشد کے سامنے دوبارہ رکھ دیا۔

پیر مرشد نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں شرف الدین! کیا بات ہے، تم اسے واپس کیوں کر رہے ہو؟ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

انھوں نے جواب دیا۔ "پیر مرشد! یہ تو اس شخص کو مرحمت فرمائیں جو اس کا طلبگار ہو، مجھے اس کی حاجت نہیں ہے۔"

شیخ نجیب الدین اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور کہا۔ "صاحبزادے! میں تمھارے اس جواب سے بہت خوش ہوں۔ خدا تمھیں تمھارے مقاصد میں کامیاب کرے۔ آمین۔"

کچھ دیر بعد آپ نے اپنے مرید سے کہا۔ "شرف الدین! کیا تمھیں معلوم ہے کہ میری زندگی تمھاری ارادت پر موقوف تھی،"

شرف الدین خاموش رہے۔ پیر مرشد کہتے رہے۔ "شرف الدین! اب تم واپس جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ میں ایسا محسوس کر رہا ہوں،

گویا میں سنے مقوصہ فرض انجام دے کر فارغ ہوگیا ہوں۔"

ہونہار مرید نے پوچھا "میرے لیے کوئی حکم ہے؟"

پیر مرشد نے جواب دیا "جب تمھیں میری وفات کی خبر پہنچے تو تم اس وقت جہاں کہیں بھی ہو میرے پاس چلے آنا۔ یہ میری آخری خواہش بھی ہے اور وصیت بھی۔"

آپ نے اپنے پیر مرشد کی یہ نصیحت اور وصیت گرہ میں باندھ لی اور وطن کے لیے روانہ ہوگئے۔ ابھی بہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ ایک گھڑ سوار اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا آپ کے پاس آیا اور کہا "شرف الدین! کہاں جارہے ہو؟ دہلی واپس چلو کیونکہ وہاں تمھارے پیر مرشد وصال فرما چکے ہیں۔"

فرماں بردار مرید اسی جگہ سے واپس ہوا اور اپنے پیر کی آخری رسوم میں شریک ہوکر اپنا وعدہ پورا کیا۔

یہاں اُن کے نام پیر مرشد کی کچھ تحریری نصیحتیں بھی موصول ہوئیں، ان میں لکھا گیا تھا:

"اے عزیز! یہ بات بہت غور و فکر کے بعد ظاہر ہوئی ہے کہ ترکِ خودی میں مشغولیت کے علاوہ دنیا کے کسی کام میں بھی مشغول رہنا غلطی ہے۔ انسانی حرکات و سکنات، اقوال و افعال ہی سے خودی پیدا ہوتی ہے۔ کھانا، پینا، بولنا، سونا، میل جول پیدا کرنا، سننا، دیکھنا وغیرہ انسانی فطرت کا اقتضا ہے لیکن یہ تمام باتیں بقدرِ ضرورت ہونی چاہئیں۔ زیادتی میں انسان حق سے دور ہو جاتا ہے۔ مجاہدہ اور ریاضتِ نفس اس طرح ہونا چاہیے کہ خودی بالکل جاتی رہے اور انتہائی درجے کا تقویٰ حاصل ہو۔ بات چیت کم سے کم کیجئے، دل کو عمداً اور قصداً کسی چیز میں نہ لگائیے۔

نماز اور قرآن کی تلاوت اور کتاب کے مطالعہ سے نیند کو دور کرے۔"

غرضیکہ اس نصیحت نامہ میں دنیاوی کاروبار میں شدت سے اُلجھ جانے سے منع کیا گیا تھا، کم کھانا، کم بولنا، کم سونا، ان تین پر بہت زور دیا گیا تھا۔ آخری سطروں میں سماع کا ذکر تھا۔

"سماع کے وقت، جہاں تک ممکن ہو، آبدیدہ نہ ہو اور جسم کو حرکت نہ دے۔ یہاں تک کہ مغلوب نہ ہو جائے، اور اپنی حفاظت آپ نہ کرسکے۔ قلب پر جتنی بھی آگ برسے اس کی کسی اور کو خبر نہ ہو۔ اور یہی وہ عظیم مقام ہے جو بڑی مشقت، بڑے مجاہدے اور لمبے ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے، تم اپنی طرف سے کوشش کرو، خدا عطا کرے گا۔ برسوں کی مشقت اٹھانے والے کو راستہ ملتا ہے اور یہ سعادت حاصل نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کا اجر دیتا ہے۔"

آپ اس نصیحت نامے کو لے کر اپنے وطن واپس ہوئے، بھائی جلال الدین ساتھ تھے لیکن اُن میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ابھی پٹنہ نہیں آیا تھا اور دونوں بھائی آرہ کے جنگل سے گزر رہے تھے کہ کسی طرف سے مور کی آواز سنائی دی، اس آواز نے اُن کے اندر آگ سی لگا دی۔ بھائی کا ساتھ چھوٹ گیا اور شرف الدین آرہ کے جنگلوں میں کہیں گم ہوگئے۔ اُن کے بھائی جلال الدین انھیں کئی دن تک تلاش کرتے رہے مگر یہ نہیں ملے۔ آخر مایوس ہوکر جلال الدین اپنے گھر چلے گئے۔ صابر ماں نے بھی صبر کرلیا۔ شرف الدین کی بیوی کا دل یہاں نہیں لگ رہا تھا، یہ بھی اپنے دل پر صبر کا پتھر رکھ کے سنار گاؤں اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔

آپ آرہ کے جنگلات میں مجاہدے اور نفس کشی میں مشغول رہے۔ یہاں درندے بھی تھے اور موذی حشرات الارض بھی۔ لیکن یہ سب اُن کو کسی قسم کا بھی گزند نہ پہنچا سکے۔ ان جنگلات میں ہندو جوگی بھی گیان دھیان اور تپسیا میں مشغول ملے۔ آپ نے اُن سے علمی مباحثے بھی کیے اور انھیں قائل کرتے رہے۔ آرہ کے جنگلات میں پورے بارہ سال گزارنے کے بعد آپ راج گڑھ کے جنگلات میں چلے گئے۔ بھوک لگتی، تو پتوں پر گزارا کرلیتے۔ آپ نے راج گڑھ کے جنگلات میں تیس سال گزار دیے۔ جب باہر نکلے اور گھر پہنچے تو وہاں نہ ماں تھیں، نہ کوئی اور۔ وہ اللہ کو پیاری ہوچکی تھیں۔ شرف الدین کو اس کا دکھ تو بے حد ہوا لیکن صبر سے کام لیا۔

آپ کا شہرہ دور دور سے لوگوں کو کھینچے لا رہا تھا۔ اسی طرح جب آپ بہار شریف کی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ پڑھنے تشریف لے گئے تو وہاں لوگوں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ آپ نے نمازِ جمعہ کے بعد جب پند و وعظ کے لیے اپنی زبان کھولی تو ہجوم فرطِ جذبات سے بے قابو ہوگیا۔

سُلطان محمد تغلق کا دَور تھا، اس نے آپ کی خدمت میں اپنے آدمی بھیجے اور لکھا "آپ مسلمانوں کے لیے نیز اسلام کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں اس کا واقعی اور حقیقی اجر تو اللہ تعالیٰ ہی دے گا لیکن ہم ایک حکمراں اور فرماں روا کی حیثیت سے کم از کم جو دے سکتے ہیں دے رہے ہیں، اسے قبول فرمائیں۔"

نمائندوں نے سلطان کے خط کے ساتھ ایک خانقاہ کی تعمیر کے لیے اخراجات اور ان اخراجات کے مستقل انتظام کے لیے راجگڑھ کی جاگیر کے کاغذات عطایا بھیج دیے تھے۔ چند دنوں ہی میں وہاں ایک شاندار خانقاہ تعمیر ہوگئی۔ اور اس خانقاہ کے اخراجات راج گڑھ کی جاگیر سے پورے کیے جاتے۔ آپ اس خانقاہ میں بیٹھ کر تقریر اور تحریر کے ذریعے رشد و ہدایت کا کام کرنے لگے۔

اس خانقاہ میں ملک بھر سے سالکانِ راہِ طریقت پہنچتے۔ اُن کی مجلسیں منعقد ہوتیں۔ علماء اور محدثین بھی یہاں حاضریاں دیتے، اور مختلف دینی مسائل پر بحث و مباحثہ کرتے۔ اس سے پورے مُلک کو فائدہ پہنچ رہا تھا۔ اِن مجالس میں سب سے نمایاں حیثیت آپ ہی کی ہوتی۔ اِن مجالس میں اسی دَور کے ایک بیان کے مُطابق :

" ہر مجلس میں مریدوں، نیک بندوں اور سچی طلب رکھنے والوں کا مجمع ہوتا۔ اُن میں سے ہر ایک اپنے حال اور کام کے مطابق ایک سوال کرتا۔ اِن سوالات کا تعلق طریقت، شریعت، حقیقت اور معرفت سے ہوا کرتا تھا۔ آپ ہر سوال کا نہایت شافی جواب دیتے، اُن کا بیان دل پذیر اور اُن کے اشارے کنائے بے نظیر ہوتے تھے۔ ہر بیان میں سیکڑوں معانی ہر اشارے میں ہزاروں لطائفِ لاریبی۔ ہر معنی میں بے شمار مفہوم اور ہر لطیفہ میں لاتعداد ادراکات، ہر مفہوم میں بے شمار حالات اور ہر ادراک میں بہت سے مقامات، ہر حال میں ناقابلِ بیان ذوق اور ہر مقام میں اتنی خبریں ہوتیں کہ جن کی گنجائش دنیا میں نہیں۔"

سُلطان محمد شاہ تغلق رخصت ہوا تو اس کے بھتیجے سلطان فیروز شاہ تغلق نے اس کا تاج و تخت سنبھالا۔ یہ بھی آپ کے معتقدین میں شامل ہو گیا۔ آپ اس کو بھی وقتاً فوقتاً تحریری نصیحتیں فرمایا کرتے تھے۔ سلطان کا داماد داؤد ملک بھی آپ کے عقیدت مندوں میں شامل ہوگیا۔ آپ اس کو عملی تعلیم دیا کرتے تھے۔ قاضی شمس الدین حاکمِ چوسہ نے بھی آپ کی مریدی اختیار کرلی تھی اور آپ سے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ چنانچہ ایک بار آپ نے قاضی شمس الدین کو خط میں لکھا :

"برادرم شمس الدین ! اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مستقل مزاج رہو۔ کاتبِ حروف کے سلام و دُعا کے بعد اے بھائی! یہ ضروری ہے کہ تم اپنے اخلاق کی بُری باتوں کو اچھی باتوں میں تبدیل کرنے کی روزانہ ہر ممکن کوشش کرو اور اُسے ایک اہم کام سمجھو۔ اگر اس کام کو تم نے چھوڑ دیا۔ یا غفلت اختیار کی تو پھر بلائیں پیش پیش آئیں گی۔ اس دُنیا کے جانوروں اور چوپایوں میں جو صفات ہیں اُن میں سے ہر صفت انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اُن میں کی جو صفت انسان میں غلبہ اختیار کرلیتی ہے وہی قیامت کے دن صورت بن کر ظاہر ہوگی۔"

ایک دوسرے خط میں تحریر فرمایا :

"یہ ضروری ہے کہ کپڑا، جسم اور لقمہ پاک اور حلال ہو۔ سو اس خمسہ بھی حقیقت سے پاک ہوں، دل بھی اوصافِ ذمیمہ یعنی بخل و حسد وغیرہ سے پاک ہو۔ کپڑے اور جسم کی پاکی سے مزید راہِ دین میں دو قدم آگے بڑھ جاتا ہے اور دل کی پاکی سے مزید تین قدم آگے بڑھ جاتا ہے اور اس پر توبہ کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور وہ حقیقتاً تائب ہوتا ہے۔"

آپ کہیں جا رہے تھے، آپ کے ساتھ ساتھ مرید بھی چل رہے تھے۔ راستے میں ایک حاکم سے ملاقات ہوگئی۔ مریدوں نے اس حاکم کے بارے میں آپ کو بتایا کہ یہ شخص بہت نیک ہے۔ خدا نے اسے بہت زیادہ دولت دے رکھی ہے۔ یہ اپنی دولتمندی کے باوجود عبادت، ریاضت اور نوافل میں مشغول رہتا ہے۔

آپ نے فرمایا۔ "افسوس کہ یہ شخص اپنی راہ بھول گیا ہے اور دوسروں کے راستے پر چل رہا ہے۔"

مریدوں نے جواب خلافِ توقع جو پایا تو حیرت ہوئی، کہا ۔" حضرت! ہم آپ کی باتوں کا مطلب نہیں سمجھے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "سیدھی سی بات ہے۔ اللہ نے اس کو دولت عطا کی ہے تو اس دولت سے حاجتمندوں کی حاجت روائی ہونی چاہیے۔ اس کا فرض ہے کہ یہ فقرا اور مساکین کو اس دولت سے لباس مہیا کرے، انھیں اچھے اچھے کھانے کھلائے۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا رسول اللہ کے حکم کی پابندی کرنے میں شمار کیا جائے گا۔" اس کے بعد آپ نے مزید فرمایا۔ "اس تاریک دنیا میں قلم، زبان، مال اور جاہ سے حتی المقدور محتاجوں کو راحت پہنچاؤ۔ صوم و صلوٰۃ اور نوافل اپنی جگہ پر بہت اچھے ہیں مگر دلوں کو راحت پہنچانے سے زیادہ سُود مند نہیں۔"

آپ ہر ممکنہ کوشش سے مسلمانوں کو فائدے پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ایک بار آپ نے پرجوش لہجے میں فرمایا۔ "مسلمانوں کا کام انجام دینا اور اُن کے کاموں میں لگا رہنا بڑی دولت مندی ہے۔ یہ کام پیغمبروں کا ہے کیونکہ انھوں نے مسلمانوں کے کام کیے اور

اُن کی بلائیں اپنے سر لیتے رہے۔

آپ کے مریدوں میں ایک شیخ مظفر بلخی بھی تھے، یہ آپ کے خلیفہ بھی تھے اور صاحبِ اسرار اور اپنے مرشد کے محرمِ اسرار بھی تھے۔ یہ پچیس سال تک راہِ سلوک پر گامزن رہے اور اس حال میں جو واقعات اور معاملات و حالات پیش آئے، انھیں اپنے مرشد کی خدمت میں لکھتے رہے۔ آپ اپنے مرید و خلیفہ کے ہر خط کا تفصیلی جواب دیتے رہے۔ ان میں سے بعض خطوط کے جوابات میں آپ نے جو کچھ لکھا اُن کے آخر میں یہ لکھ دیا تھا کہ " برادرِ عزیز! میں نے تمھاری مشکلات اور معاملات کا حل تحریر کر دیا ہے مگر یہ خطوط کسی کو دکھانا مت۔ کیونکہ اس طرح ربوبیت کے بعض اسرار ظاہر ہو جائیں گے "۔

شیخ مظفر بلخی کے مرید اُن سے اکثر درخواست کرتے کہ حضرت ان خطوط کی نقل ہمیں بھی مرحمت فرمائیں۔

شیخ بلخی جواب دیتے " افسوس کہ میں ایسا نہیں کر سکتا "۔

مریدوں نے عرض کیا " تب پھر آپ ایسا کیجیے کہ وہ خطوط ہمیں یہیں دے دیں، ہم انھیں نقل کر لیں گے یہیں، اسی جگہ۔ انھیں گھر نہیں لے جائیں گے "۔

شیخ بلخی نے جواب دیا " بات یہاں وہاں کی نہیں ہے بلکہ وہ خط کسی کو دکھائے نہیں جا سکتے۔ میں نے انھیں مُہر بند کر دیا ہے "۔

ایک مرید نے عرض کیا " اچھا تو اس وقت ہم اُن کے مطالعہ سے محروم رہیں گے مگر آپ کے بعد۔ جب آپ ہم میں نہیں ہوں گے، اُس وقت ہمیں ان کے مطالعہ سے کون روکے گا؟ "

شیخ بلخی نے جواب دیا " اپنے بعد کے لیے میں نے اپنے ورثاء کو وصیت کر دی ہے کہ انھیں اسی حال میں میرے کفن میں رکھ دیا جائے "۔

جملہ مرید اس جواب سے مایوس ہو گئے۔

شیخ مظفر بلخی کا انتقال ہو گیا اور وصیت کے مطابق اُن کے ورثا نے اُن خطوط کو آپ کے کفن میں رکھ کر دفن کر دیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد پتا چلا کہ چند خطوط کفن میں رکھے جانے سے رہ گئے ہیں۔ یہ خطوط مریدوں کے ہاتھ لگ گئے۔ اُن میں سے چند کا شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ذکر کیا ہے اور ان خطوط میں سے صرف انھی حصّوں کو عوام کے سامنے پیش کر دیا ہے جن سے انھیں نفع حاصل ہو۔

" برادرِ عزیز! اللہ تعالیٰ کے کاموں میں تنوع پایا جاتا ہے۔ اس کے کام ہمیشہ ایک ہی نہج اور طریقے پر جاری نہیں رہتے۔ کچھ پتا نہیں کہ اللہ اپنے بندوں میں سے کس کو کس طرح اقبال مندی اور کشائش سے نوازے گا۔ موسیٰ کو دیکھ لو، پیدائش کے بعد انھیں صندوق میں محبوس کیا گیا، پھر یہ صندوق دریا میں ڈال دیا گیا، پھر انھیں اُن کے دشمن فرعون کے محل میں پہنچا دیا گیا۔ جوان ہوئے تو اُن کے ہاتھوں ایک قبطی کو ہلاک کرا دیا گیا۔ اس قتل کی وجہ سے اُن کو اپنا وطن چھوڑنا پڑ گیا۔ اور پردیس میں دس سال تک بکریاں چراتے رہے۔ اسی زمانے میں ایک رات آسمان پر سیاہ بادل چھا گئے: بجلی چمکنے لگی اور جنگل سے بھیڑیے نکل آئے۔ بکریاں بھاگ گئیں۔ آپ راستہ بھول گئے۔ آپ کی بیوی کو دردِ زہ نے گھیر لیا، شدید درد اور سخت سردی۔ آگ کہیں دُور دُور تک نہیں نظر آ رہی تھی۔ سردی اتنی سخت تھی کہ چقماق رگڑنے سے بھی آگ نہیں نکلتی تھی۔ جب ہر طرف سے مایوسی نے گھیر لیا تو اس عالم میں غیبی امداد نے آپ کی دستگیری کی اور آپ نے کہا، اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا (میں آگ دیکھنا چاہتا ہوں) اور اسی عالم میں آپ آگ لینے چلے گئے تو وہاں ایک دُوسرا گُل کھلا۔ آپ کو مقامِ طور پر آگ بھی نظر آئی اور یہ آواز بھی سُنائی دی۔ اِنِّیۡۤ اَنَا رَبُّکَ فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡکَ ۚ اِنَّکَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًی ﴿ؕ﴾ وَ اَنَا اخۡتَرۡتُکَ فَاسۡتَمِعۡ لِمَا یُوۡحٰی (بیشک میں تمھارا رب ہوں اپنے دونوں جوتے اتار دو کیونکہ تم پاکیزہ مقامِ طُویٰ پر ہو اور ہم نے تمھیں چن لیا اور ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اُسے غور سے سنو)۔

اسرارِ ربُوبیت غیر معلوم ہیں۔ اگر اللہ کے احوال بندے پر ایک ہی نہج اور طریقے سے جاری رہتے تو بندے کا علم اپنے خُدا کی صفات کا احاطہ کر لیتا۔ حالانکہ اللہ کی صفات کا احاطہ ناممکن ہے۔

دوسری جگہ حرکت اور اسباب کے بارے میں لکھا: " اے برادر! انسان ایک چیونٹی کی طرح جنگلات میں بے حس و حرکت پڑا رہے اور یہ خواہش اور تمنا کرے کہ مکۂ معظمہ پہنچ جائے گا تو ایسا ناممکن ہے۔ کیونکہ اگر وہ اس کے اسباب تیار نہیں کرتا تو اس کا مکۂ معظمہ چلا جانا عادتاً محال ہے "۔

کسی خط میں آپ نے یہ بھی لکھا " اے بھائی! تمام کو ترک کر دینا دراصل حقیقت کو پا لینا ہے۔ عربی کا ایک محاورہ ہے۔ لن یصل الی الکل الا من انقطع عن الکل (کُل کو وہی حاصل کرتا ہے جو کُل سے الگ ہو جاتا ہے) جو شخص تمام سے علیحدگی اختیار کر لیتا ہے وہ تمام کو پا لیتا ہے "۔

ایک اور خط میں ہجر و وصال کی عظمت درمذہب کا ذکر اس طرح کیا۔

ہجرِ تو خوشتر از وصالِ دگراں منکر شدنت بہ از رضائے دگراں

(تیرا فراق دوسروں کے وصال سے بہتر ہے اور دوسروں کی رضا سے تیرا انکار بہتر ہے)

برادرِ من! تمھیں خدا کے خُم خانۂ رحمت سے جو عطا کیا جا رہا ہے اس کو گھونٹ گھونٹ کرکے بطیبِ خاطر پی اور اس انعام کے ملنے پر فخر نہ کر۔

ایک جگہ ہمت اور حوصلے کا ذکر اس طرح کیا ہے "محبت کا دریا تو ناپیدا کنار ہے۔ اس کا ایک بار کا پیاسا لازمًا ہزار بار پیاسا ہوگا۔ اس دنیا کے تمام تر کار و بار ہمت پر موقوف ہیں جس کی جتنی بلند ہمت ہوگی اس کی تشنگی بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

گردشِ ایام میں صبر کے کڑوے گھونٹ پینے کے علاوہ چارۂ کار نہیں۔ سختیوں میں جینا سیکھو، ورنہ کچے اور خام رہ جاؤ گے یہ محض تیرے ہی لیے نہیں ہے بلکہ تمام سالکین کا یہی طریقہ ہے۔"

ایک جگہ شیطان کا ذکر اس طرح کیا:

"میں نے بعض کتابوں میں دیکھا ہے کہ شیطان نے کوہِ طور کے قریب حضرت موسیٰؑ سے ملاقات کی۔ باتوں ہی باتوں میں موسیٰؑ نے ابلیس سے کہا "ابلیس! تو نے آدم کو سجدہ نہ کرکے بہت بُرا کیا۔"

ابلیس نے جواب دیا "میں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا، اس کو پُورا کیا۔ میں نے اللہ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں تیرے علاوہ کسی کو بھی سجدہ نہیں کروں گا۔ چنانچہ میں نے سزا تو برداشت کر لی مگر اپنے قول سے نہیں پھرا۔ ایک تم ہو کہ اپنے رب سے وعدہ کچھ کرتے ہو اور عمل کچھ۔"

اسی طرح آپ نے اپنے ایک خط میں لکھا "سلطان العارفین بایزید بسطامی فرماتے ہیں کہ اگر تمھیں عیسیٰؑ کی روحانیت، موسیٰؑ کی خدا سے ہمکلامی، ابراہیمؑ جیسی خلت عطا کر دی جائے تو تم اللہ سے اس سے زائد کا مطالبہ کرو کیونکہ اللہ کے خزانوں میں اس سے بھی زیادہ موجود ہے۔"

اے بھائی! ہر زمانے اور ہر دور میں عالمِ بالا سے اپنے عاشق کو یوں خطاب کیا جاتا ہے "اے مشرق کے مسافر! اے مغرب کے مجاہد! اے بلندیوں پر نظر رکھنے والے! اے ثریا پر کمند ڈالنے والے! تو مجھے جہاں تلاش کرے گا وہیں پائے گا۔"

ایک بار آپ نے اپنی عجیب کیفیت کا اس طرح ذکر کیا۔

"اے بھائی! جب تمھارا خط ملا، اس وقت بہت شور و شغب تھا۔ سنو، جب کسی نے ابُو بکر شبلی سے پوچھا کہ عارف کے اوصاف کیا ہیں؟ تو آپ نے اس کو جواب دیا "عارف وہ ہے جو بہرا، گونگا اور اندھا ہو۔"

اس لیے تمہیں چاہیے کہ زبان کو قابو میں رکھیں کیونکہ شور و غوغا سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے برعکس سوختہ جان ہو جانا مناسب ہے۔ مصیبتوں کو برداشت اور ماتم و نوحہ کو پی جانا چاہیے۔ زندگی کے لیے صبر و تحمل ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور چارہ بھی تو نہیں۔ دنیاداروں کا یہ قاعدہ ہے کہ جب تک دنیا میں رہتے ہیں وہ روتے دھوتے رہتے ہیں۔ پھر جب دنیا سے جاتے ہیں تب بھی روتے ہی جاتے ہیں۔ یاد رکھو، آج جو قبروں میں سو رہے ہیں وہ قیامت کے دن قبروں سے اسی کیفیت کے ساتھ اٹھائے جائیں گے جس کیفیت کے ساتھ وہ مرے تھے۔"

ایک خط میں انسان کے اس دعوے کا بطلان کیا جو یہ اپنے تقدس اور پاکیزگی کے بارے میں کرتا رہتا ہے۔

"برادرِ عزیز! گندگیوں میں ملوث ہونے کے باوجود قدس و طہارت کا دعویٰ احمقانہ ہے۔ یہ دعویٰ تو خدا ہی کو زیب دیتا ہے۔ یقین کرو کہ گناہوں سے پاک رہنا یا تو پیدائش سے پہلے ممکن تھا یا موت کے بعد ممکن ہوگا۔ اس لیے عارف لوگ کہتے ہیں کہ اُرِیدُ عَدَمًا لَا وَجُودَ لَہٗ (میں عدم کو چاہتا ہوں جس کا وجود نہیں)۔"

※

آپ سے سماع کے بارے میں پوچھا گیا کہ یہ جائز ہے یا ناجائز؟

آپ نے جواب دیا "سماع اہلِ حق کے لیے مستحب، اہلِ زہد کے لیے مباح اور اہلِ نفس کے لیے مکروہ ہے۔"

کسی نے ذرا گھما پھرا کے سوال کیا "سماع مذموم ہے یا محمود؟"

آپ نے جواب دیا "سماع اگر طلبِ منفعت کے لیے ہو تو مذموم ہے اور اگر طلبِ حقیقت کے لیے ہے تو محمود ہے۔" اس کے بعد آپ نے اس کی اس طرح وضاحت کی۔ "لوگو! اگر سماع سے اللہ کی محبت کی تحریک ہو اور احوال شریف یعنی مکاشفات ظہور پذیر ہوں تو یہ حلال ہے، اور اگر اس سے طبیعت فسق و فجور کی طرف مائل ہو تو یہ حرام ہے۔ اس طرح سماع حرام بھی ہے اور حلال بھی۔ مکروہ بھی ہے اور مباح بھی۔ یوں سمجھ لو کہ اگر سماع سے دل حق کی طرف مائل ہو تو حلال ہے، اگر مجاز کی طرف مائل ہو تو یہ حرام ہے۔ اور اگر کچھ غیر حق کی طرف متوجہ ہو اور کچھ... حق کی طرف تو یہ مکروہ ہے۔ اور اگر یہ حق اور مجاز دونوں ہی طرف مائل ہو مگر حق کی طرف زیادہ مائل ہو تو یہ مباح ہے۔"

آپ کا پورا زمانہ وعظ و تلقین میں گزر گیا۔ یہ تحریری بھی ہوتی اور زبانی بھی۔ کہتے ہیں کہ آپ کے مریدوں کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی۔ جو آپ کے سامنے ہوتے انھیں وعظ و تلقین زبانی فرماتے لیکن جو سامنے نہ ہوتے، دور ہوتے، ان کی اصلاح خط و کتابت سے کی جاتی۔

آپ شریعت کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ آپ نے اپنے مریدوں کو بارہا بتایا۔ "جو کوئی اس راہ کی طلب میں ہو اس کو چاہیے کہ شریعت سے سرمایہ بنائے۔ اور یہ اُس وقت تک کرتا رہے جب تک کہ وہ شریعت سے طریقت میں راہ نہ پا جائے۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ طریقت سے حقیقت میں قدم رکھے تو ایسا ناممکن ہے۔ جو شریعت سے لاعلم ہو وہ طریقت سے اور بے بہرہ رہے گا۔ اور طریقت سے بے بہرہ رہنے والا حقیقت سے دور اور محروم رہے گا۔ لوگو! میری بات غور سے سنو اور اس پر توجہ دو اور پھر عمل کرو۔ جو کوئی بے معرفت شرع بے شریعت اس راہ میں قدم رکھے گا، خود کو ہلاکت میں ڈالے گا اور کوئی مرتبہ نہیں حاصل کر سکے گا۔"

اسی طرح ایک بار آپ نے عبادت کی اس طرح تعریف کی:

"عبادت اولیاء کا سرمایہ ہے، اتقیا کا پیرایہ ہے، مردوں کی حرفت ہے، صاحبِ ہمت کا پیشہ ہے، عمر کا فائدہ ہے، علم کا ثمرہ ہے، خداوندانِ بصیرت کا طریقہ ہے اور سعادت و جنت کا راستہ ہے۔"

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

"میں نے اللہ تعالیٰ کے کاموں کے بارے میں تمھیں کئی بار بتایا ہے کہ اس کا کام کبھی بھی ایک روش پر نہیں ہوتا۔ اس لیے انسانوں کو یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کس راستے سے اقبال و فتوح عطا کرے گا، نعمت کے راستے سے یا عطا کے راستے سے یا بلا کے راستے سے۔ اس لیے لوگو! میں تمھیں مشورہ دیتا ہوں کہ اپنے کام میں مردانہ وار مشغول رہو۔ سنو، میری باتیں غور سے سنو کہیں ایسا نہ ہو کہ امور کی شدت، ابتلا کی کثرت اور گوناگوں امتحان کی ہیبتات تمھارے کاموں میں قصور و فتور پیدا کر دیں، یاد رکھو، سالک کی راہ میں یہ ساری رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔"

کسی موقع پر راہِ توحید کی آپ نے اس طرح وضاحت فرمائی:

"راہِ توحید جو مردوں کا دین ہے ایک دریائے بے محیط ہے۔ یہاں علم اور عقل غرق ہیں۔ لکھنا اور بات کرنا تو ایک طرف، جو شخص اس میں گر جاتا ہے گویا وہ عالمِ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔"

ایک شخص آپ کے پاس آیا اور عرض کیا "حضرت! میری حاجتیں پوری نہیں ہوتیں، محرومیاں میرا مقدر بن گئی ہیں، بتائیے کہ اس سلسلے میں میں کیا کروں؟"

آپ نے جواب دیا "میرے پاس اس کا علاج ہے لیکن یہ تو بتا کہ تو نماز بھی پڑھتا ہے یا نہیں؟"

اس شخص نے جواب دیا "نماز تو میں بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا "فجر کی نماز میں سنّت اور فرضوں کے درمیان اکتالیس بار سورۂ فاتحہ پڑھ کے دم کر لیا کر۔ اللہ نے چاہا تو تیرے سارے کام بن جائیں گے۔"

اس شخص نے اس کو اپنا معمول بنا لیا اور چند ماہ بعد آپ کے پاس آیا اور بتایا "حضرت! میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں محرومیوں کا شکار ہوں۔"

دوسرے مریدوں نے یہ سنا تو وہ بھی آپ سے اپنی مصیبتوں اور دکھوں کے لیے عمل اور وظیفے معلوم کرنے لگے۔

ایک صاحب آپ کے پاس آئے اور عرض کیا "حضرت! مجھے کوئی پریشانی نہیں، اللہ کا دیا سب کچھ ہے میرے پاس۔ اپنا کوئی کام بھی

"[illegible] ایک [illegible] آدھ مہینے سے میں جس [illegible] ہو گیا ہوں، سمجھ نہیں آتا، اس کا [illegible]؟"
آپ نے فرمایا۔" اپنی پریشانی بتا، ممکن ہے اس کو کسی طرح دُور کیا جا سکے۔"
مرید نے عرض کیا۔"حضرت! ادھر کئی ماہ سے میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ لوگ میرے خلاف طرح طرح کی شرارتیں کرتے رہتے ہیں اور میں ان شرارتوں کے جواب دیتے دیتے تنگ آ گیا ہوں، اس کے علاوہ کچھ شرارتیں ایسی بھی وجود میں آئیں جو اُوپر سے آتی تھیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو میں اُن کا مقابلہ کس طرح کروں گا؟"
آپ نے کچھ دیر کے لیے سکوت اختیار کیا، اس کے بعد دریافت کیا۔" کیا نماز پڑھتے ہو؟"
اس نے جواب دیا۔" پڑھتا تو ہوں، لیکن پابندی سے نہیں۔"
آپ نے فرمایا۔" تب پھر تو نمازوں کو پابندی سے پڑھا کر، اور رات کو عشا کے بعد سُورۂ تَبَّتْ یَدَا کا ایک ہزار بار ورد کر لیا کر۔ اکیس دن متواتر عمل کرنے کے بعد ہمیں بتا کہ اس کا کیا اثر ہوا؟ کیا نتیجہ نکلا؟"
مرید نے آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر پابندی سے عمل شروع کر دیا۔ بائیسویں دن آپ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔" حضرت! میں کتنا خوش قسمت انسان ہوں کہ مجھے آپ کا دور ملا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہم نشینی بھی۔ میں نے آپ کے بتائے ہوئے عمل پر متواتر اکیس دن عمل کیا اور آج میں آپ کو فخریہ یہ بتا رہا ہوں کہ اشرار سے مجھے نجات مل چکی ہے، اب میں بہت خوش ہوں۔"
آپ نے اس کو مزید دعائیں دیں۔" اللہ تجھ کو ہمیشہ اسی طرح خوش رکھے اور دنیا کے شر سے محفوظ رکھے۔"
اسی طرح ایک اور صاحب بھی آپ کے پاس آئے اور عرض کیا۔" حضرت! آپ نے بہتوں کے دکھوں کا مداوا کیا ہے، کچھ میری طرف بھی نظرِ کرم ہو جائے۔"
آپ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔" تجھے کیا تکلیف ہے؟ ذرا تفصیل سے بتا، شاید میں اس کا کوئی حل تلاش کر سکوں۔"
مرید نے عرض کیا۔" وہی قضائے حاجت کی بات ہے۔ میں جو چاہتا ہوں وہ نہیں ہوتا۔"
مرید کا خیال تھا کہ اُسے بھی سورۂ تبت کے ورد کا حکم ملے گا لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا اور جواب دیتے ہوئے فرمایا۔" صبح کی نماز کے بعد اکتالیس بار سورۂ انعام کا ورد کر لیا کر، اللہ نے چاہا تو تیری حاجتیں پوری ہونے لگیں گی۔"
مرید نے پوچھا۔" سورۂ انعام؟ صرف سورۂ انعام؟"
آپ نے جواب دیا۔" ہاں سورۂ انعام۔ تیرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"
مرید نے اصرار کیا۔" حضرت! اس کے علاوہ کچھ اور بھی؟"
آپ نے جواب دیا۔" رات کو عشا کے بعد سات ہزار بار سورۂ اخلاص کا ورد بھی بہت مفید رہے گا۔"
مرید نے پوچھا۔" کتنے دنوں تک؟"
آپ نے فرمایا۔" اگر سورۂ انعام کا ورد کرنا ہو تو چالیس دن تک، اور اگر سورۂ اخلاص پڑھنی ہو تو اکیس دن تک۔"
مرید چلا گیا اور تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد آپ کے پاس آیا اور عرض کیا۔" حضرت! اب میں بہت خوش ہوں کیسا بہتر بہدف نسخہ مرحمت فرمایا تھا آپ نے۔"
آپ کے بتائے ہوئے وظائف کا اتنا شہرہ ہوا کہ ہر روز کئی کئی مرید اپنی مشکلات اور مصائب کا ذکر کر کے وظائف معلوم کرنے لگے۔
ایک اور مرید آیا اور عرض کیا۔" حضرت! میرے معمولی معمولی کام بھی مشکل سے انجام پاتے ہیں۔ میں اپنی ان مشکلات کے دفعیہ کے لیے کیا کیا کروں؟"
آپ نے جواب دیا۔" عشا کی نماز کے بعد سو بار یا فتاح کا ورد کر لیا کر، متواتر چالیس دن تک۔ اللہ نے چاہا تو تیری مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا۔"
ایک اور مرید کھڑا ہو گیا اور عرض کیا۔" جنابِ والا! میری معاشی حالت بہت خراب ہے۔ کیا آپ کوئی ایسا وظیفہ بتا سکتے ہیں جس سے میری معاشی تنگی دور ہو جائے؟"
آپ نے جواب دیا۔" ہر روز رات کو عشا کے بعد سونے سے پہلے سورۂ جمعہ پڑھ لیا کر۔ اللہ نے چاہا تو معاش میں فراخی ہو جائے گی۔"
اس نے اس پر بڑی مستعدی سے عمل کیا اور معاشی تنگی سے نجات پا لی۔



آپ کے ایک پاؤں میں لنگ تھا۔ یہ معمولی لنگ پیدائشی تھا، لوگ اس کو دیکھتے تھے مگر یہ نہیں پوچھتے تھے کہ یہ کیوں ہے؟

ایک دن کسی نے آپ سے پوچھا "حضرت! اگر آپ گستاخی نہ سمجھیں تو میں ایک بات پوچھوں؟"

آپ نے فرمایا "پوچھ۔ کیا پوچھنا چاہتا ہے؟"

مرید نے عرض کیا "حضرت! بادشاہ آپ کا نیازمند ہے۔ قاضی حاکم اور لاتعداد امراء آپ کے مرید اور غلام ہیں۔ اگر آپ اشارہ بھی کر دیں تو طبیبوں کا مجمع لگ جائے اور اس کا علاج ہو جائے۔۔۔۔۔۔"

آپ نے فرمایا "تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف کہہ۔"

مرید نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا "حضرت! آپ کے پاؤں میں ہلکا سا لنگ پایا جاتا ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ یہ کب سے ہے؟ اور اگر اس کا علاج ممکن ہے تو طبیبوں سے رجوع کیا جائے۔"

آپ نے فرمایا "یہ روزِ ازل سے ہے۔ میں نے ازل میں اولیاء کی صف سے نکل کر انبیا کی صفوں میں قدم رکھ دیا تھا۔ دنیا کا یہ لنگ اسی کی سزا ہے۔"

۷۸۲ھ کے رمضان گزر چکے تھے، عید کے دن سے مریدوں کا تانتا جو لگا تو یہ ٹوٹتا ہی نہیں تھا۔ دور دور سے لوگ آپ سے ملنے چلے آ رہے تھے، ایسا لگتا تھا، گویا ان سب کو حاضری کا حکم دیا گیا ہے۔ چھ شوال کو اس میں زیادتی ہو گئی۔ اس روز صبح ہی سے یہ حال تھا کہ مریدوں کی قطاریں لگ گئیں۔ آپ انہیں باری باری اندر بلانے لگے۔ یہ آتے، آپ بعض کو گلے لگا لیتے اور بعض سے صرف مصافحہ کرتے، بعض کو دعائیں دے کر رخصت کر دیتے۔ اور ان میں سے بعض ایسے تھے جنھیں وصیتیں بھی کرتے۔ پھر اس سلسلے کو اچانک بند کر دیا اور قرآنِ پاک کی تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ تلاوت کرتے کرتے دعائیں پڑھنے لگے اور پھر قریبی مریدوں نے دیکھا کہ آپ دراز ہو کر کلمہ پڑھنے لگے، اور موجود مریدوں سے کہا "بندہ تو چلا اپنے رب کے پاس۔"

اور مریدوں نے پریشان ہو کر آپ پر جھک کر جو دیکھا تو پتا چلا کہ جسدِ خاکی تو موجود ہے اور اس میں کی لطیف شے واصل بحق ہو چکی ہے۔ آپ وفات پا چکے تھے۔

پٹنہ کے منیر نامی قصبے میں آپ پیدا ہوئے تھے اور اسی قصبے میں آپ نے وصال فرمایا۔

جب تجہیز و تکفین کے بعد لوگ تدفین کے لیے آپ کا جنازہ لے کر چلے تو اسی وقت برصغیر کے مشہور ترین بزرگ شیخ اشرف جہانگیر سمنانی بھی وہاں پہنچ گئے۔ یہ بزرگ بنگال کے نامی گرامی بزرگ اور اپنے پیر مرشد علاء الدین گنج نبات سے ملنے کے لیے پنڈوہ جا رہے تھے، یہ منیر میں رک گئے اور آپ کے جنازے کی نماز پڑھائی۔ اور آپ کے مکتوبات کی نقول لے کر پنڈوہ چلے گئے۔

آپ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے تھے ان میں تصنیف کا کام بھی بڑا وقیع ہے۔

مکتوبات کے تین مجموعے مکتوباتِ صدی، مکتوباتِ دو صدی اور مکتوباتِ بست و ہشت صدی کے ناموں سے مرتب ہوئے۔

ملفوظات پر مشتمل گیارہ کتابیں ہیں معدن المعانی، مخ المعانی، راحت القلوب، خوانِ پر نعمت، کنز المعانی، مغز المعانی، مخ لا یغنی، مونس المریدین، تحفۂ غیبی، ملفوظ الصفر اور برأت المحققین مشہور ہیں، پتا نہیں یہ اب بھی کہیں موجود ہیں یا نہیں۔

ان کے علاوہ آپ کی تصانیف مجموع بھی ہیں، ان میں چند کے نام درج ذیل ہیں۔

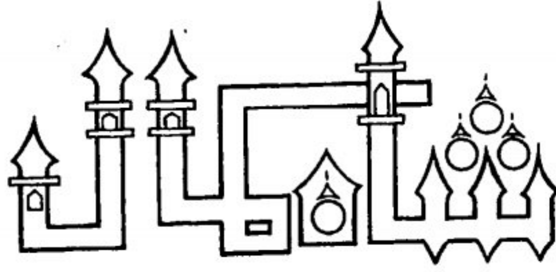
فوائدِ رکنی۔ شرحِ آدابِ المریدین، عقائدِ شرقی، ارشاد السالکین، ارشاد الطالبین، اجوبہ، اورادِ خورد وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی چھ مجموعے اور ہیں۔

آپ کی جملہ تصانیف اور مجموعہ ہائے ملفوظات میں خطوط کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی اور کتاب کو نہیں حاصل ہوئی۔

مضمون کے مآخذ

سیر العارفین | اخبار الاخیار | گلزار ابرار | اشرف جہانگیر سمنانی

حامد بن فضل اللہ جمالی | شیخ عبدالحق محدث دہلوی | محمد غوثی شطاری | سید عبدالباری



ضیاء تسنیم بلگرامی

بغداد کے باہر مشرقی جانب حاجی حافظ سید عمر نامی طبیب کا اچھا خاصا کشادہ مکان اس اعتبار سے خاصی شہرت رکھتا تھا کہ یہ حکیم صاحب نہ صرف بلند پایہ طبیب تھے بلکہ حدیث، فقہ، اصول معقول و منقول اور فلسفے میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ پورے عراق کے محدثین اور مشائخ دقت دقیق اور نازک ترین مسائل میں مشورے آپ ہی سے طلب کرتے تھے۔ حافظ عمر کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضؓ سے مل جاتا تھا۔ ۸۹۵ھ کو بروز جمعہ ان کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا، باپ نے بچے کا نام کمال رکھا، کیونکہ باپ کا ارادہ تھا کہ اس بچے کو وہ اعلا تربیت اور مروجہ علوم کے ذریعے رتبۂ کمال کو پہنچا دیں گے۔

بچے کی ولادت کے کچھ عرصے بعد اس عہد کے مشہور بزرگ حضرت شاہ فضیل قادری حافظ عمر سے ملنے آتے، انھیں نومولود کی خوشخبری سنائی گئی، شاہ فضیل قادری نے فرمایا۔ "ذرا اس بچے کو ہمارے پاس تو لاؤ۔ ہم بھی تو دیکھیں اس کمال کو!"

باپ اندر سے بچے کو اٹھا لایا اور شاہ صاحب کی گود میں ڈال دیا۔ شاہ صاحب نے بچے کو دیکھا اور اس کے مشاہدے میں تا دیر کھوتے رہے، وہ معلوم نہیں اس بچے میں کیا دیکھ رہے تھے۔ حافظ عمر نے ادب سے سوال کیا "حضرت! اس بچے میں وہ کون سی ایسی بات ہے کہ آپ اس پر اس استغراق اور محویت سے غور فرما رہے ہیں؟"

شاہ صاحب نے ہوش میں آکر جواب دیا۔ "حافظ عمر! حضرت غوثِ اعظم کی ایک پیش گوئی سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے کہ ان کے خاندان میں ایک ولیِ کامل اور ہادیِ افضل پیدا ہوگا، ہم اس بچے میں غوثِ اعظم کی پیش گوئی کی شبیہہ دیکھ رہے ہیں، پیش گوئی پوری ہو چکی ہے اور اب یہ تمھارا فرض ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دو، تم نے اس کا نام کمال رکھا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ واقعی درجۂ کمال پر فائز کیا جا چکا ہے، اس کا علم وسیع، عمر دراز اور کشف و ریاضت کا مرتبہ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے گا!"

جب بچے نے ذرا ہوش سنبھالا تو اس کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا، قرآن پاک کی تلاوت کے دوران کمال اس میں کھو جاتے اور آس پاس کی کچھ خبر نہ ہوتی۔ شاہ فضیل قادری نے کمال کی بابت جو پیش گوئی سالہا سال پہلے کی تھی، ممکن ہے ماں باپ کے ذہن اور حافظے سے محو ہو گئی ہو لیکن کمال کی طبیعت اور مزاج کا حیرت انگیز انداز حافظ عمر کو فکرمند کر دیتا۔ کمال میں دنیاداری کے اطوار مفقود تھے وہ جو کچھ پڑھتے، اس کا عالمانہ اظہار نہ ہوتا اور اس کے مادی مفاد کی طرف کمال کی طبیعت راغب ہی نہ ہوتی حالانکہ حافظ عمر کی سب سے بڑی خواہش ہی یہ تھی کہ کمال تعلیم کی تکمیل کے بعد طب، فلسفے اور حدیث و فقہ کے بحرالعلوم ہو جائیں اور اس سے مادی مفاد حاصل کریں۔

کمال کے سامنے قرآنِ پاک کھلا ہوا تھا اور آیۂ کریمہ پر نظریں جمی ہوئی تھیں۔ "زمین کی سیر کرو اور قدرتِ الٰہیہ کے نشانات دیکھو!"

اس آیت نے دل کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ وہ قدم جو ابھی تک گھر کی حدود یا شہر کے اندر چل پھر کر پرکار کی صورت گردش میں تھے، اس مقررہ دائرے سے باہر نکل گئے اور کمال نے جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھاننی شروع کر دی۔ یہ نئی تبدیلی والدین کے لیے بڑی پریشان کن تھی لیکن معلوم نہیں وہ کون سی قوت تھی جو ان کی زبان پر تالے کی طرح مسلط تھی۔ وہ کمال سے کچھ کہنا چاہتے لیکن قوتِ گویائی جواب دے جاتی۔

اخبار الاخیار (شیخ عبدالحق محدث دہلوی) ○ خزینۃ الاصفیاء (مفتی غلام سرور لاہوری) ○ الکمال (سید خورشید حسن بخاری) ○ تاریخ فرشتہ (محمد قاسم فرشتہ) ○ تحفۃ الکرام (میر علی شیر قانع)

بیٹے کو گھر سے غائب ہوئے کئی دن گزر چکے تھے، باپ کو تو زیادہ بے چینی نہیں تھی کیونکہ انھوں نے خود کو اس کا عادی سا بنا لیا تھا لیکن ماں کے لیے یہ اطوار ناقابلِ برداشت تھے، وہ کئی دن سے بیٹے کی جدائی کا غم دل میں دبائے بیٹھی تھیں، آخر یہ صدمہ برداشت سے باہر ہو گیا، وہ گھنٹوں دروازے سے باہر نظریں جمائے بیٹے کی منتظر رہتیں اور ہر دور سے آنے والا کمال کا تصور ین کے اُبھرتا لیکن جیسے جیسے قریب آتا فریبِ نظر ثابت ہوتا۔ آخر انتظار نے اضطراب کو ہوا دی اور انھوں نے شوہر کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ بیٹے کی تلاش میں نکل جائیں اور اس وقت تک واپس نہ آئیں جب تک کمال کو تلاش نہ کر لیں۔ حافظ عمر گھر سے چلے گئے۔ باہر نکل کر دشواری پیش آئی کہ وہ جائیں تو کدھر جائیں شمال جنوب، مغرب یا مشرق کدھر کا رُخ کریں معلوم نہیں وہ اتفاق تھا یا کچھ اور کہ وہ شمال مغرب میں چل پڑے، کتنی دن اور کتنی راتیں تلاش و جستجو میں برباد ہو گئیں۔ لوگوں سے کمال کا حلیہ بتا کے پتہ پوچھتے تو لوگ پوری باتیں سن کر غور سے پریشاں حال حافظ عمر کو دیکھتے اور نفی میں سر ہلا دیتے۔ یہ اور آگے بڑھ جاتے۔ آبادی سے گزر کر ویرانے میں قدم رکھا، انھیں کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں کئی بار جی میں آئی کہ وہ واپس چلے جائیں لیکن پھر ایسا محسوس ہوا کہ وہ جہاں بھی جا رہے ہیں خود سے نہیں جا رہے کوئی غیر مرئی قوت انھیں اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور وہ بے دست و پا کسی غیر مرئی دھاگے میں بندھے چلے جا رہے ہیں۔ پیر لہو لہان ہو گئے اور پنڈلیاں تکان سے اینٹھنے لگیں، اسی عالم میں یکایک ان کی نظریں پچاس ساٹھ قدم دور ایک گھنیرے درخت کے سایے میں پڑیں اور وہ اپنی آنکھیں ملنے لگے، وہ جو کچھ دیکھ رہے تھے، اس پر انھیں وہم و گمان کا شبہ ہوتا تھا۔ سامنے درخت کے سائے میں ان کا بیٹا کمال شانِ بے نیازی سے آرام کر رہا تھا، اس طرح کہ داہنے ہاتھ کو تکیہ بنا کے کنپٹی اور سر کو اس پر ٹکا رکھا تھا اور غالباً آنکھیں بند تھیں، بیٹے کی محبت نے جوش مارا اور شفقتِ پدری طوفان کی طرح اُبلنے لگی، یہ تیز تیز قدم اٹھاتے بیٹے کی طرف بڑھے لیکن ابھی چالیس پچاس قدم ہی طے کیے ہوں گے کہ ان سے بیس پچیس قدم دُور ایک مہیب جنگلی درندہ کسی طرف سے نمودار ہو کر راستہ روک کر کھڑا ہو گیا، اس نے اپنی شعلہ بار خوفناک آنکھیں حافظ عمر پر گاڑ دیں۔ یہ خوفزدہ ہو گئے اور بیٹے کی طرف جانے کے بجائے واپسی کے لیے مڑ گئے۔ درندہ کھڑا انھیں گھورتا رہا۔ یکایک انھیں خیال آیا کہ یہ کیا خود غرضی ہے کہ اپنی جان بچا کے بھاگ رہے ہو، آخر کمال بھی تو خطرے میں ہے، درندہ اسے بھی تو ہلاک کر سکتا ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ آخر اس درندے کا مقابلہ کس طرح کیا جائے اور کمال کو اس کی درندگی اور سفاکی سے کس طرح نجات دلائی جائے۔ حافظ عمر ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ درندہ آہستہ آہستہ کمال کی طرف بڑھا۔

حافظ عمر بڑی مشکل میں پھنسے ہوتے تھے، بیٹے کی محبت ان کے پیر پکڑ رہی تھی اور درندے کی دہشت دُور دُور رہنے اور بھاگ جانے پر مجبور کر رہی تھی۔ اب درندہ سوتے ہوئے کمال کے قدموں میں پہنچ چکا تھا۔ وہ کئی بار کمال کے ارد گرد پھرا، اس کے بعد قدموں میں سر رکھ کر لیٹ گیا، حافظ عمر کے کان میں کوئی کہہ رہا تھا۔ "واپس جاؤ، اس لڑکے کا پیچھا مت کرو، یہ درندہ جس سے تو خوفزدہ ہے، وہ سوتے ہوئے کمال کی چوکیداری اور نگہبانی کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔"

حافظ عمر وہیں سے واپس ہو گئے اور گھر پہنچ کے مضطرب بیوی کو بتایا۔ "بیوی! ہمارا کمال جس مرتبۂ بلند پر فائز ہو چکا ہے، وہاں دُنیا اور علائقِ دنیا بے معنی اور فضول شے ہیں، اُسے واپس لانا ہمارے اختیار میں نہیں رہا اور نہ یہ مناسب ہے کہ اُسے اس کے مقام سے نیچے لانے کی کوشش کی جائے۔ ہمیں حضرت فضیل قادری کی پیش گوئی یاد آ رہی ہے جو انھوں نے ہمارے جدِ اعلا حضرت غوثِ اعظم کے حوالے سے بیان فرمائی تھی۔ کمال یقیناً مشائخِ کبار میں شامل ہو گیا ہے۔"

بیوی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ انھیں بیٹے کی مفارقت کا صدمہ بھی تھا اور مرتبۂ بلند پانے کی خوشی بھی، ان کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو بیک وقت خوشی کے بھی تھے اور غم کے بھی۔ کچھ عرصے بعد کمال گھر واپس آ گئے۔ حافظ عمر نے انھیں سینے سے لگا لیا اور ماں نے پیشانی کے بوسے لیے۔ انھیں جس حال میں درخت کے نیچے دیکھا گیا تھا، اس کا کوئی ذکر نہ کیا گیا، کمال اپنے والدین کے روبرو ادب و احترام سے کھڑے تھے لیکن یہاں کا عالم ہی کچھ اور تھا، بظاہر تو وہ والدین کا احترام بجا لائے تھے لیکن اگر والدین کے دل ٹٹولے جاتے تو معلوم ہوتا کہ ان کے دل میں اپنے بیٹے کے لیے عزّت و احترام موجود ہے۔

اتفاق کی بات کہ اسی دن حضرت شاہ فضیل قادری بھی کہیں سے تشریف لے آئے۔ حافظ عمر نے بیٹے کا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "حضرت! اس کی تعلیم و تربیت ہم جیسے ناقصوں کے بس کی بات نہیں، اسے آپ اپنی شاگردی اور مُریدی میں قبول

فرمالیں۔“

شاہ صاحب گویا اسی لیے تشریف لائے تھے۔ انھوں نے کمال کو خوشی خوشی اپنی شاگردی اور مُریدی میں لے لیا اور باقاعدہ سلوک و تصوّف کی تعلیم دینے لگے۔ اب وہ کمال سے شاہ کمال ہو چکے تھے۔ کہتے ہیں کہ شاہ کمال کو حضرت غوث اعظم سے اسی طرح براہ راست فیض حاصل تھا، جس طرح حضرت اویس قرنیؓ کو رسولِ مقبولؐ سے شرفِ دیدار اور شرفِ ملاقات نہ ہونے کے باوجود حاصل تھا۔ حضرت غوث اعظم نے اپنا خرقۂ خاص اپنے بیٹے عبدالرزاق کو اس لیے مرحمت فرمایا تھا کہ وہ اسے سلسلہ بسلسلہ اپنے کمالِ روحانی کے ذریعے حضرت شاہ کمال تک پہنچا دیں گے۔ چنانچہ یہ خرقۂ خاص انھیں حضرت فضیل قادری سے حاصل ہو گیا۔ بعد میں یہی خرقہ ایک وسیلے سے حضرت مجدد الف ثانی کو مرحمت فرمایا گیا۔

شاہ کمال سیر و سیاحت کے لیے ایک بار پھر نکل کھڑے ہوئے لیکن اس بار وہ تنہا نہیں تھے۔ ان کے ساتھ ان کے پیرو مرشد شاہ فضیل قادری بھی تھے، ان دونوں نے کئی بار ایک ساتھ حج کیا۔ ان دونوں حضرات نے مختلف ممالک کی سیر کی اور ان سے عجیب و غریب کرامات ظاہر ہوتی رہیں۔ جب شاہ فضیل قادری نے یہ سمجھ لیا کہ شاہ کمال سلوک و معرفت کی جملہ منازل طے کر چکے ہیں تو آپ کو اس مشن سے آگاہ کیا جس کے لیے آپ پیدا کیے گئے تھے اور شاہ فضیل قادری جس مقصد سے ان کی تعلیم و تربیّت فرما رہے تھے۔ ۹۲۰ھ بروز اتوار انہیں خرقۂ خلافت عطا ہوا اور انھیں ہندوستان کی روانگی کا حکم دیا گیا۔ آپ مشہد، نجف اشرف تبریز اور اصفہان کی سیاحت کرتے ہوئے درّہ گومل سے برصغیر میں داخل ہوئے اور ٹھٹھہ میں قیام فرمایا، جب آپ ٹھٹھے میں تشریف لائے۔ یہاں ہر طرف فقہا اور محدّثین کا بڑا زور تھا اور یہاں پابندِ شریعت سادات کے چند خاندان پہلے ہی سے قیام پذیر تھے۔ ان میں سید محمد مدرس کو خاص شہرت حاصل تھی۔

سید محمد مدرس کی یہ عادات بہت مشہور تھی کہ وہ احکامِ شریعت کے نفاذ میں مثالی سخت گیر رویہ رکھتے تھے۔ ان کے حلقۂ درس میں اس عہد کی نامی گرامی شخصیات موجود رہا کرتی تھیں، شاہ کمال بھی اس محفل میں شرکت فرمانے لگے۔ یہ تھے مجذوب سالک، ان کے یہاں دنیاداری کے طور طریق مہمل اور فضول تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ ستر پوشی کی جو تعریف ہے شاہ کمال اس پر پورے نہ اترتے، فاضل اجلّ سید محمد مدرس کو یہ بات ناگوار گزرتی، لیکن کسی وجہ سے خاموش رہتے۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ایک بار جو اس قابلِ اعتراض حالت میں انھیں شریکِ درس دیکھا تو درشت لہجے میں کہا "شاہ کمال! کیا تم جانتے ہو کہ جب سے یہ دنیا وجود میں آئی ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں پیدا ہوا جس نے دنیا کی بہترین امّت، امتِ محمدی کو تمھاری طرح ذلیل اور رُسوا کیا ہو!"

آپ اس تلخ بات کو ہنس کر برداشت کر گئے اور سید محمد سے مختلف مباحثِ علمی اور دینی پر مناظرہ و مباحثہ کرنے لگے۔ اس مشغلے سے فارغ ہونے کے بعد شاہ کمال آبادی سے دور چلے جاتے اور ان کے جاتے ہی سید محمد پر ندامت کا دورہ پڑتا اور سوچنے لگتے کہ "میں بھی کتنا احمق ہوں جو اس دیوانے سے بحث و مباحثے میں الجھتا ہوں، میں ایک بااختیار اور بااثر انسان ہوں، مجھے بحث و مباحثے میں بیکار وقت ضائع کرنے کے بجائے اس دیوانے کو آبادی سے نکال باہر کرنا چاہیے۔ اگر میں ایسا کروں گا تو گویا اپنا شرعی فریضہ انجام دوں گا!"

لیکن دوسرے دن جب آپ سیّد محمد کے حلقۂ درس میں تشریف لاتے تو شاہ کمال کا کچھ ایسا رعب طاری ہوتا کہ ان کی شان کے خلاف ایک لفظ بھی نہ ادا کر سکتے۔ کئی بار سیّد محمد نے اپنے اس ارادے کا ذکر شریکِ درس طلبہ سے بھی کر دیا اور انھیں حکم دیا کہ جب دوسرے دن شاہ کمال قابلِ اعتراض حالت میں شریکِ درس ہوں تو سید محمد کو ان کے ارادے اور فیصلے کی یاد دلا دی جائے۔ چنانچہ اس ہدایت کے دوسرے دن جب شاہ کمال قابلِ اعتراض حالت میں حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور سیّد محمد کی قوّتِ گویائی جواب دے گئی تو ایک شاگرد ان کے پاس پہنچا اور ان کے کان میں چپکے سے عرض کیا۔

"حضورِ والا! کل آپ نے فرمایا تھا کہ شاہ کمال کو قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر محفل سے نکلوا دیں گے اور یہ کہ آپ کو آپ کے اس ارادے اور فیصلے کی یاد دلا دی جائے۔ چنانچہ میں اس کی یاددہانی کے لیے حاضر ہوں، جو قدم مناسب سمجھیں، اُٹھائیں"

سید محمد اپنے شاگرد کی باتیں نہایت غور سے سنتے رہے اور آخر میں اپنے زانو پر سر رکھ کر چپ چاپ بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ شاہ کمال نے حلقہ درس سے اُٹھ کر ویرانے کی راہ لی۔ ان کے جاتے ہی سید محمد ندامت میں ڈوب گئے، وہ اپنے شاگردوں سے آنکھ ملانے کی بھی ہمت نہ رکھتے تھے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے شاگردوں کے سامنے حد درجہ بزدلی کا ثبوت دیا تھا یہ کیا کہ شاگرد تو انھیں ان کے

فیصلے اور ارادے سے مطلع کریں اور وہ سید محمد کمال کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھا سکیں۔ وہ شرمسار اور نادم سر جھکا کر بیٹھ جائیں۔ آخر ایک گستاخ اور صاف گو شاگرد بھی سامنے آیا اور کہا "سید صاحب! جب وہ مجذوب آپ کے سامنے آتا ہے تو آپ کی قوت گویائی جاتی رہتی ہے اور آپ گم صم بیٹھے رہ جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ چلا جاتا ہے تو اس پر شرمسار نظر آتے ہیں کہ آپ اسے اپنے حلقۂ درس سے دھتکار کیوں نہ سکے اور میرا خیال یہ ہے کہ جو کام آپ کسی وجہ سے انجام نہیں دے سکتے۔ اس پر نادم یا شرمسار ہونے سے حاصل؟"

سید محمد شاگرد کی بات بھی برداشت کر گئے۔ شاگردوں کے سامنے مزید نہ بیٹھا جا سکا، معذرت کر کے زنان خانے میں چلے گئے۔ وہاں ان کی بہن بھی نہایت فکرمند اور اُداس بیٹھی ہوئی تھی۔ بھائی بھی اداس تھا اور بہن بھی، سید محمد کی یہ بہن کوئی معمولی عورت نہ تھی۔ زہد و تقوے میں اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بہن نے فکرمند اور شرمسار بھائی کو دیکھا تو دریافت کیا "بھائی خیریت تو ہے؟ آپ اداس کیوں ہیں؟"

بھائی نے جواب دیا "بہن! میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟"

بہن نے پوچھا "کچھ مجھے بھی بتلائیے، شاید میں ہی کوئی ایسا مشورہ دے سکوں جس سے آپ کی فکرمندی دُور ہو جائے!"

بھائی نے کچھ کہنے سے پہلے ذرا سکوت اختیار کیا۔ بہن کے سامنے اس نیم برہنہ مجذوب کا ذکر کرتے ہوئے انھیں شرم سی محسوس ہو رہی تھی۔ بہن نے خاموش بھائی سے مزید کہا۔ "آپ کی باتیں سننے کے بعد میں بھی ایک مسئلہ آپ کے سامنے رکھنے والی ہوں اور وہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ زبان شرم کی وجہ سے ساتھ دینے سے انکار کرے گی لیکن اس کے باوجود میں اسے زبان پر لانے اور آپ سے اس سلسلے میں مشورہ کرنے پر مجبور ہوں!"

سیّد محمد نے ذرا ہمت پیدا کی، بولے "بہن تم نے اس نیم برہنہ مجذوب کا ذکر تو سنا ہی ہوگا روزانہ ہماری مرضی کے خلاف قابل اعتراض حالت میں ہمارے حلقۂ درس میں شریک ہو جاتا ہے میں کئی دن سے اس کوشش میں ہوں کہ اسے حلقے سے نکال باہر کروں اور اگر خدا ذرا اور ہمت دے دے تو اسے آبادی سے نکال باہر کروں کیونکہ یہ صرف میری ہی منشا نہیں ہے شرع بھی یہی کہتی ہے اور اخلاقی ذمہ داریاں بھی یہی بتاتی ہیں!"

بہن نے پوچھا "پھر آپ ایسا کرتے کیوں نہیں؟"

بھائی نے جواب دیا "لیکن جب وہ مجذوب ہمارے حلقۂ درس میں پھر اسی قابلِ اعتراض حالت میں آ بیٹھتا ہے تو ہماری قوتِ گویائی ہی ہم سے چھین لی جاتی ہے آخر ایسا کیوں ہے؟"

بہن نے اس کے بعد نہ تو کوئی بات پوچھی۔ نہ کسی بات کی وضاحت چاہی اور نہ ہی کسی قسم کا مشورہ دیا۔ بھائی سکوت اختیار کیے بہن کی شکل دیکھتا رہا۔ پھر پوچھا "تم کیوں چُپ ہو گئیں کچھ اور کہو، میں تم سے مشورہ لینے آیا ہوں!"

بہن نے آہستہ سے کہا "میں نے اس مجذوب کو آج تک نہیں دیکھا۔ لیکن آپ حیرت کریں گے کہ میں جس موضوع پر آپ سے بات کرنے والی ہوں یا مشورہ طلب کرنے والی ہوں، اس میں اس نیم برہنہ مجذوب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔"

سید محمد اور زیادہ فکرمند ہو گئے۔ کچھ عجیب سوالیہ انداز سے بہن کی صورت دیکھنے لگے۔

بہن نے کہا "آپ میری صورت کیا دیکھ رہے ہیں۔ یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے؟"

سیّد محمد نے جواب دیا "بہن تم دُعا کرو کہ میں اپنے فیصلے پر قائم رہوں اور شاہ کمال کو آبادی کے باہر بھیج دوں!"

بہن نے اپنی بات چیت کی ابتدا نہایت پُراثر لہجے میں کی "ایک ایسی بات کہ اگر کہتی ہوں تو آپ اسے سن کر مشتعل بھی ہو سکتے ہیں اور نہیں کہتی تو اس بات کا ڈر رہتا ہے کہ آپ سے ایک ناقابلِ تلافی غلطی ہو جانے کا امکان ہے اور میں آپ کو اس سے بچانا چاہتی ہوں!"

سید محمد نے پُوری توجہ سے بہن کی بات سنی اور بے چینی سے پوچھا "کیا بات ہے؟ صاف صاف بتاؤ!"

بہن نے جواب دیا "اس مجذوب کو ستانے یا اُس کی دل آزاری کی غلطی سے خود کو بچائیے!"

سیّد محمد نے ناگواری سے کہا "تم اس کی کیوں سفارش کر رہی ہو؟ اس نیم برہنہ مجذوب کی، جو خلافِ شرع حرکات کا مرتکب ہوتا ہے۔"

بہن نے جواب دیا "بھائی! میں نے دو دن پہلے یہ خواب دیکھا کہ رسول مقبولؐ فرما رہے ہیں کہ اس نیم برہنہ کی بیعت کر لو، میں شک و شبہے میں پڑ گئی، لیکن کل رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا کہ رسُول اللہؐ فرما رہے ہیں کہ ہم نے تمہیں حکم دیا ہے کہ اس

نیم برہنہ شخص کی بیعت کرلو۔ اس پر میں نے ڈرتے ڈرتے حضورؐ سے کہا: "یارسول اللہؐ! میرے بھائی تو احکامِ شریعت کے تحت اس شخص کو آبادی سے نکال دینے کا ارادہ کرچکے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے کہ علما انبیاء کے وارث ہوتے ہیں۔ میرے بھائی بھی عالم ہیں اگر میں نیم برہنہ شخص کی بیعت کرلوں گی تو کیا انبیاء کے وارث میرے عالم بھائی کی مخالفت نہیں ہوگی؟" جواب میں رسول اللہؐ نے فرمایا۔ "کمال بھی عالم ہے اور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ مجذوب بھی ہے اور اسے یہاں تیری ہدایت کے لیے لایا گیا ہے۔ ہمیں تیرے بھائی کی فلاح و بہبود منظور ہے۔ تیرا بھائی سیّد محمد اس مجذوب کی کیمیائی نظر سے عارف ربّانی بن جائے گا۔ اور عنقریب اسے بھی بشارت دی جائے گی۔" بہن یہ کہہ کر بھائی سے کہنے لگی "اب آپ فرمائیں کہ ہم ان حالات میں کیا کریں۔ میں تو آپ سے یہ درخواست کروں گی کہ اس نیم برہنہ شخص کی بابت جو قدم بھی اٹھائیں سوچ سمجھ کر اٹھائیں۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں شرمندگی اٹھانی پڑے۔"

سید محمد سب کچھ سن کر کسی سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر بعد سر اٹھا کر کہنے لگے "شیطان کی تو یہ مجال نہیں کہ وہ توبہ نعوذ باللہ رسول اللہؐ کی شکل میں آکر اس قسم کی باتیں کرے تمھارا خواب میرے لیے پریشان کن ہے اور میں فکرمند ہوں کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔" پھر پوچھا "بہن کہیں ایسا تو نہیں کہ تم اس نیم برہنہ شخص کی بابت بہت کچھ سوچتی رہی ہو اور تمھارے یہی خیالات خواب میں متشکل ہوگئے ہوں!"

بہن نے جواب دیا "نہیں ایسی کوئی بات نہیں!"

سید محمد نے خاموشی اختیار کی، پورا دن خاموشی میں گزر گیا رات آئی، کھانے پینے کا ہوش ہی کسے تھا، انھیں بار بار یہ خیال آتا کہ رسول اللہؐ کا فرمان کس طرح غلط ہوسکتا ہے۔ دیر تک جاگتے رہے انہیں دو باتیں پریشان کررہی تھیں۔ ایک تو یہ کہ اگر وہ نیم برہنہ مجذوب کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتے تو اس سے وہ اس گناہ کے مرتکب ٹھہرتے ہیں کہ علم شریعت رکھنے کے باوجود وہ اس کے نفاذ میں ناکام رہے اور اگر شریعت کا حکم بجالاتے ہیں تو اب اس بات کا احتمال پیدا ہوگیا ہے کہ رسول اللہؐ کے فرمان سے روگردانی کے گناہگار ٹھہریں گے۔ اس فکر نے انھیں بہت پریشان کردیا۔ اسی پریشانی میں ان کی آنکھ لگ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد انھوں نے بھی خواب میں دیکھا کہ رسول اللہؐ فرما رہے ہیں "سیّد محمد! ہم چاہتے ہیں کہ تو نے علم سے جو قیل و قال پائی ہے اور اس کے چنیں چناں میں مبتلا رہتا ہے، اس سے تجھے نجات بخشیں، تیرے سینے میں اس مجذوب سالک ہی کی خاطر امرِ شرعی مضبوط کیا گیا ہے۔ اس کی مخالفت سے باز آ اور اس سے دوستی اور ہدایت کا طالب ہو، یہ تیرے ہی لیے یہاں بھیجا گیا ہے!"

دوسرے دن صبح شاہ کمال سیّد محمد کے حلقۂ درس میں شامل نہیں تھے، سیّد محمد کی بے چین نظریں انھیں تلاش کرتی رہیں جب شاہ کمال کے دیدار سے محروم رہیں تو انھوں نے سلسلۂ درس موقوف کیا، شاگردوں کے سامنے اپنا خواب بیان کیا۔ پھر خاندان والوں کو جمع کیا اور انھیں بھی اس خواب سے مطلع کیا، اور ان سبھوں کو لے کر یہ خود شاہ کمال کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اور عاجزی سے کہا "بابا کمال! ہم اپنی کم علمی اور کم نظری سے آپ کو دکھ پہنچانے کے مرتکب ہوتے رہے ہیں۔ اب ہم معافی طلب کرنے آئے ہیں۔ آپ ہمیں معاف فرماکر اپنی بیعت سے مشرف فرمائیں!"

شاہ کمال نے کچھ دیر تک سیّد محمد کے چہرے پر نظریں گاڑے

بایزید بسطامیؒ

جب مسجد میں داخل ہوئے تو جماعت شروع ہوچکی تھی، یہ بھی نیّت باندھ کر نماز میں شریک ہوگئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں نے آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور مختلف قسم کے سوالات کرنے لگے۔ امام بھی ان کے پاس پہنچا اور بہت ساری باتوں کے بعد اس نے بایزیدؒ سے کہا "بایزید! تم کوئی کام تو کرتے نہیں، کھاتے کہاں سے ہو؟" بایزید نماز کے لیے دوبارہ کھڑے ہوگئے۔ بولے "افسوس کہ جو شخص اپنے رازق کو نہ پہچانتا ہو۔ اس کے پیچھے تو نماز تک جائز نہیں۔"
اس کے بعد آپ نے دوبارہ نماز ادا فرمائی۔

رکھیں، ان کی نظرِ کیمیا اثر اپنا کام کر گئی اور سید محمد کا سینہ گداز ہو گیا علم کی خشک چوب، کیف وجذب سے تر ہو گئی۔ اب وہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ جذب وکیف بھی ہو گئے تھے۔

سیّد محمد اور ان کے تمام رشتے دار اور شاگرد شاہ کمال سے بیعت کرنے کی سعادت سے سرفراز ہوئے!'

ٹھٹھے میں رہتے ہوئے شاہ کمال کو ڈھائی سال گزر چکے تھے اب ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا، انھوں نے یہاں سے ملتان کی راہ لی۔ ملتان میں ان دنوں حمید خان کی حکومت تھی اور یہ شیر شاہ سوری کی طرف سے حکومت کر رہا تھا۔

حمید خان نے آپ کی بڑی آؤ بھگت کی۔ لیکن آپ نے ان تکلّفات سے خود کو بچایا۔ کچھ دن ایک کُٹیا بنا کے قیام فرمارہے پھر لدھیانہ چلے گئے۔ لدھیانے سے پایل (سرہند) کا رُخ کیا۔ پایل سے کیتھل پہنچے اور یہیں مستقل قیام فرمایا۔ مشرقی پنجاب کا یہ شہر ضلع کرنال کی ایک تحصیل ہے اور دہلی سے ۱۲۴ میل دور واقع ہے۔ اس سے ذرا فاصلے پر ہندوؤں کا گڑھ تھانیسر (کوروکشیتر) واقع ہے جسے اب عرفِ عام میں پانی پت کہتے ہیں جہاں ہندوستان کی فیصلہ کن جنگیں ہوتی رہی ہیں اور یہیں شمس الدین التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ کا مزار ہے۔ ہندو روایت کے مطابق کیتھل کو ہنومان نے آباد کیا تھا۔ چونکہ یہاں بندروں کی بہتات تھی۔ سنسکرت میں کپس بندر کو اور تھل رہنے کی جگہ کو کہتے ہیں پہلے یہ کپس تھل تھا لیکن امتدادِ زمانہ نے اسے کپس تھل سے کیتھل کر دیا۔ یہیں وہ جگہ ہے جسے استھان انجنی کہتے ہیں۔ انجنی ہنومان کی ماں کا نام تھا۔ استھان انجنی ایک مندر ہے جسے ہنومان کی ماں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ ہندوؤں میں نہایت قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جب شاہ کمال یہاں تشریف لائے، کفر والحاد کا بڑا زور تھا۔ شاید اسی کفر وضلالت کی تاریکی کو دور کرنے کے لیے ہی شاہ کمال کو یہاں بھیجا گیا تھا۔

کیتھل میں ایک تالاب کے کنارے ایک ہندو درویش باوا ستیل داس لوگوں کو ایک عجیب وغریب کرشمہ دکھایا کرتا تھا۔ وہ اپنی انتڑیاں باہر نکال لیتا اور اسے خوب اچھی طرح صاف کر کے دوبارہ پیٹ میں رکھ دیتا، ہندو درویش کا یہ کرشمہ لوگوں میں خوش فہمی اور خوش عقیدگی کا باعث بنا ہوا تھا۔ ہر طرف اس کا چرچا تھا اور لوگ باوا کی زیارت اور درشن کے لیے دُور دُور سے آتے اور اپنی آنکھوں سے یہ حیرت انگیز تماشا دیکھتے۔ ایک دن شاہ کمال کیتھل کے ویرانے سے تشریف لا رہے تھے کہ تالاب کے کنارے لوگوں کا ہجوم دیکھ کر رک گئے اور ہجوم کو چیر کر باوا ستیل داس کے روبرو پہنچ گئے۔ آپ نے ہندو درویش کو اپنی انتڑیاں صاف کرتے دیکھا تو بآوازِ بلند ارشاد فرمایا۔

"خوب۔ اس کھیل سے تیرا مقصد کیا ہے؟ اگر صفائیِ قلب مقصود ہے تو اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور اگر اس سے شہرت کی حصولیابی مقصود ہے تو اور بات ہے!"

شاہ کمال نے جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور اپنی راہ لی، لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ باوا ستیل داس اپنی آنتوں کو پیٹ میں رکھنے کی بار بار کوشش کرتا اور ہر بار ناکام رہتا، وہ عاجز آ گیا شاہ کمال کے کلمات اس کے کانوں میں پڑ چکے تھے اس نے لوگوں سے پوچھا "لوگو! ابھی جو شخص یہاں آیا تھا اور میری ریاضت پر چند لفظوں پر مشتمل کلمات تنقید ادا فرمائے تھے وہ کون تھا؟"

کسی نے جواب دیا "یہ ایک مسلمان بزرگ ہیں جو کہیں باہر سے تشریف لائے ہیں!"

ہندو درویش نے کہا "یہ شخص مجھے اذیت میں مبتلا کر گیا ہے۔ آنتوں کے نکالنے اور دوبارہ ان کی جگہ واپس رکھنے کا جو کام میں روزانہ، معمول کے مطابق انجام دیا کرتا تھا۔ آج میں اس میں ناکام ہو رہا ہوں، ہو نہ ہو یہ اس مسلمان درویش کی نظر کا اثر ہے کہ میں بے اثر ہو گیا ہوں!"

ابھی وہ لوگ بھی جو ابھی تک شاہ کمال کی طرف متوجہ نہ ہوئے تھے ہندو درویش کی بات نے انھیں بھی شاہ کمال کی طرف متوجہ کر دیا مجمع میں سے کسی نے دریافت کیا "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ شاہ کمال تم سے بڑا درجہ رکھتے ہیں؟"

ہندو درویش نے جواب دیا "میں یہ کہنا ہی نہیں چاہتا بلکہ دل کی گہرائیوں سے اس کا اعتراف کر رہا ہوں کہ شاہ کمال سے میرا کوئی مقابلہ نہیں۔ وہ ایک پہنچے ہوئے ولیِ کامل ہیں اور میں ایک معمولی انسان!"

اس کے بعد اس نے لوگوں سے کہا "تم میں سے جو لوگ شاہ کمال کی اقامت گاہ سے واقف ہیں مجھے وہاں تک لے چلیں اگر میں وہاں تک تادیر نہ پہنچ سکا تو یہ طے ہے کہ میں زندہ نہ بچوں گا۔ ہلاک ہو جاؤں گا۔ میں آنتوں کو ان کی جگہ رکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن ناکام رہتا ہوں۔ اب آخری صورت یہی رہ گئی ہے کہ میں ان کے قدموں میں غلامانہ پہنچوں اور درخواست کروں

مہب تہنک

کہ وہ میری آنتیں پھر سے ان کی جگہ پر پہنچا دیں!"

ہندو درویش لوگوں کے ہجوم میں اس شان سے چلا کہ اس کی آنتیں دونوں ہاتھوں میں تھیں اور وہ رک رک کر آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اور ہر ہر قدم پر آہ آہ کرتا جا رہا تھا جو لوگ ہمیشہ اس کے شعبدے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ آج اس کی بے بسی پر ہنس رہے تھے اور ان کی نظر میں شاہ کمال کا مرتبہ بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔

شاہ کمال اپنے حجرے میں تشریف فرما تھے کہ انھیں ہندو درویش کی آواز سنائی دی "بابا کمال! ابھی کچھ دیر پہلے جس گناہ گار سے آپ نے کچھ دریافت فرمایا تھا وہ جواب دہی کے لیے خود حاضر ہو گیا ہے یا تو سامنے آ کر اسے اپنے دیدار سے فیض یاب فرمائیں ورنہ حکم دیں کہ یہ عاجز خود حاضر ہو جائے اور اپنے دل کی تاریکی کا علاج کرائے!"

شاہ کمال حجرے سے نکلے اور ہندو درویش کو اپنے قریب بلایا، اسے نظر بھر کے دیکھا اور ارشاد فرمایا۔

"تماشا تو اچھا دکھا لیتے ہو لیکن مریض تم بھی ہو، اپنا علاج کراؤ!"

ہندو درویش کی آنتیں خود بخود پیٹ میں چلی گئیں، وہ آپ کے قدموں میں گر گیا اور روتا ہوا بولا۔

"حضرت! میں اپنا علاج کس سے کراؤں گا۔ اب تو آپ ہی نظر کرم فرمائیں گے تو کچھ بھلا ہوگا" اس نے شاہ کمال کے پیر پکڑ لیے۔ شاہ کمال نے اسے اٹھایا اور اپنا دستِ مبارک اس کے سینے پر پھیر دیا ہندو درویش کی دنیا ہی بدل گئی۔ وہ مسلمان ہو گیا اور شب و روز آپ ہی کی خدمت میں رہنے لگا۔ بعد میں وہ خود اتنی ترقی کر گیا کہ شاہ کمال سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

یہ عجیب ستم ظریفی تھی کہ بابا استیل داس نے تو اسلام قبول کر لیا اور شاہ کمال کی عظمت اور بزرگی کا دل کی گہرائی اور سچائی سے اقرار کر لیا۔ لیکن کیتھل کے بعض مسلمان انھیں خاطر ہی میں نہ لاتے تھے۔ ان منکرین میں کیتھل کے مفتیان پیش پیش تھے۔

یہاں مفتیوں کے کئی خاندان آباد تھے اور یہ لوگ خود کو بہت بڑا عالم اور علوم دینی کا منتہی سمجھتے تھے۔ ان کی نظر میں شاہ کمال کی حیثیت مخبوط الحواس دیوانے جیسی تھی۔ شاہ کمال ان کی تکلیف دہ باتیں ایک عرصے تک برداشت کرتے رہے۔ کیتھل کے مفتی بدقسمتی



سے یہ نہیں جانتے تھے کہ شاہ کمال حد درجہ جلالی واقع ہوتے ہیں وہ چشتیہ سلسلے کے علاء الدین صابر کلیری سے کم جلال نہ رکھتے تھے۔

کیتھل کے مفتیوں کا یہ حال تھا کہ ان کی تقریباً پانچ سو پالکیاں نکلا کرتی تھیں اور پوری مسلم آبادی ان کے علم و فضل کی معتقد و معترف تھی۔ شاہ کمال کی تشریف آوری نے ان کے عقیدت مندوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اب عقیدت مندوں کی تعداد شاہ کمال کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ مفتیوں نے شاہ کمال کا لوگوں سے بڑا ذکر سن رکھا تھا اور روز بروز اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا مفتیوں نے طے کیا تھا کہ شاہ کمال کے اثر کو کسی بھی طرح کم ہی کرنا پڑے گا۔ اس مہم کا آغاز اس طرح ہوا کہ مفتیوں نے اپنے عقیدت مندوں اور پرستاروں سے یہ مشہور کرانا شروع کر دیا کہ شاہ کمال لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ اور اس سے لوگوں کو دور دور بھاگنا چاہیے۔

مفتیوں کی اس تلقین کا یہ اثر ہوا کہ ان کے پرستاروں اور معتقدوں نے شاہ کمال کو ستانا شروع کر دیا۔ شاہ کمال مفتیوں کی سختیاں اور اذیتیں برداشت کرتے رہے اور منہ سے بددعا کا ایک لفظ بھی نہ ادا کیا۔

صبح کا وقت تھا، فجر کی نماز کے لیے نمازی مسجد میں جمع ہو رہے تھے۔ کچھ لوگ وضو کر کے ہاتھ منہ پونچھ رہے تھے اور کچھ وضو کر رہے تھے۔ وضو کرنے والوں میں شاہ کمال بھی تھے ان کے پاس ہی ایک مفتی، انھیں تنقیدی نظروں سے دیکھ رہا

تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر پائی جانے والی خشونت بتا رہی تھی کہ آج کی فضا اچھی نہیں اور دونوں فریق ایک دوسرے کے مقابل کچھ کر گزرنے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ شاہ کمال مسح فرما رہے تھے۔ مفتی نے مذاق اڑانے کے انداز میں طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔ "تو کیسا مسلمان ہے کہ تجھے مسح کرنے کی بھی تمیز نہیں!"

آپ نے دوبارہ مسح فرمایا اور نہایت نرمی سے کہا۔

"اب تو ٹھیک ہو گیا بھائی؟"

مفتی کی خشونت اور تکبر میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو گیا رعونت سے جواب دیا۔ "عقل مند آدمی! اس طرح بھی نہیں"

آپ نے سہ بارہ مسح کرتے ہوئے فرمایا۔ "اس طرح؟"

مفتی نے جواب دیا۔ "اس طرح بھی نہیں۔"

آپ نے ناگوار انداز میں چوتھی بار مسح فرماتے ہوئے پوچھا۔ "اور اب؟"

مفتی نے اسی حاسدانہ انداز میں جواب دیا۔ "اب بھی نہیں!"

اب شاہ کمال پر جلالی کیفیت ہو گئی۔ آپ نے اپنے سر کو بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیا، سر ہاتھ میں آ گیا، اسے پانی کے حوض میں پھینک دیا، سر سے آواز آ رہی تھی۔ "کیا اس طرح؟"

جو لوگ ادھر متوجہ تھے ان کے ہوش و حواس جاتے رہے حوض کے اندر سے دوسری آواز بھی سنائی دی۔ "لو اب تو مسح ٹھیک طرح سے ہو گیا!" اور اس دوسری آواز کے ساتھ ہی مفتی کا سر بھی حوض ہی میں پہنچ گیا۔ جو لوگ اس عبرت انگیز منظر کو دیکھ رہے تھے وہ خوفزدہ ہو کر اِدھر اُدھر منہ چھپانے لگے، لیکن یہ بات اس سے بھی عجیب دیکھی کہ انھوں نے شاہ کمال کو صحیح سلامت مسجد سے نکلتے دیکھا اور مفتی کا بے جان اور بے سر جسم وہیں پڑا رہ گیا۔

مفتیوں کی بستی میں کہرام برپا ہو گیا اور کیتھل والے سراپا اعجاز شخص شاہ کمال کی خدمت میں جوق در جوق حاضری دینے لگے ____ لیکن مفتیوں کی رعونت کا اب بھی وہی حال تھا وہ اسے شاہ کمال کا سحر قرار دے رہے تھے۔ انھوں نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ شاہ کمال ایک شعبدہ باز ساحر ہے جو اُلٹے سیدھے شعبدے دکھا کر لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ شاہ کمال مفتیوں کی باتیں پھر برداشت کرنے لگے لیکن جب یہ باتیں حد سے بڑھ گئیں تو آپ نے نہایت جوش سے فرمایا۔

"مفتیوں کی جڑ اللہ اور شاہ کمال نے اُکھاڑ پھینکی"۔

اس کے بعد مفتیوں پر وہ آفت نازل ہوئی کہ اللہ کی پناہ۔ مفتیوں پر نت نئی مصیبتوں کا نزول شروع ہوا، وہ تیزی سے موت کا شکار ہونے لگے، پورے پورے خاندان ہلاک ہو گئے، جو گھر کل تک آباد اور بھرے پُرے تھے، آج وہاں خاک اڑ رہی تھی۔ ان کی حویلیاں سنسان ہو گئیں۔ بستی کے لوگ ان لاوارث حویلیوں اور مکانوں کی اینٹیں اکھاڑ اکھاڑ کر اپنے کام میں لینے لگے۔ لیکن یہ لوگ بھی بربادی اور پریشانی سے نہ بچ سکے، ان کے مکانات نذرِ آتش ہونے لگے۔ آخر کار لوگ مفتیوں کی املاک کے سائے تک سے بچنے لگے۔ اس واقعے نے آس پاس، دور دور تک ایک تہلکہ مچا دیا۔ یہاں تک دنیائے مفتیان سراسیمہ اور خوفزدہ ہو گئی کیتھل سے دور رہنے والے مفتی بھی پریشان ہو گئے۔ وہ باقاعدہ ایک وفد کی شکل میں کیتھل کے قریب ایک گاؤں میں آ کر ٹھیر گئے اور کیتھل والوں کو پیغام بھیجا۔

"براہِ کرم شاہ کمال سے بصد عجز و نیاز دریافت کیا جائے کہ ان کی بددُعا صرف کیتھل کے مفتیوں کے لیے تھی یا تمام مفتیوں کے لیے؟"

جواب ملا۔ "صرف کیتھل کے مفتیوں کے لیے۔"

اس جواب سے دنیائے مفتیاں کی جان میں جان آئی،



آپ نے تبلیغ کا کام نہایت جوش و خروش سے انجام دیا، بہ کثرت ہندو مسلمان ہو گئے۔ عقیدت مندوں کا ہجوم رہنے لگا۔ شاہ کمال کا لباس یا تو سُرخ رنگ کا ہوتا یا پھر فوجی وردی میں نظر آتے۔ جب فوجی وردی پہنتے تو گھوڑے کی سواری بھی فرماتے اور اِدھر اُدھر نکل جاتے۔ تھانیسر کے شیخ جلال الدین کی بزرگی کا بڑا شہرہ تھا۔ ایک دن فوجی وردی زیبِ تن فرما کے گھوڑا طلب کیا اور اس پر بیٹھ کر شیخ جلال تھانیسری کی ملاقات کو چل پڑے۔ شیخ جلال تک پہنچنے کے لیے ایک سرائے سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ سرائے کے دروازے پر پہنچ کر آپ گھوڑے سے اتر پڑے۔ سرائے دار کی بیوی دروازے پر کھڑی تھی۔ آپ نے اس سے فرمایا۔ "اے عورت! ہم اندر شیخ جلال کی ملاقات کو جاتے ہیں تم ہمارے گھوڑے کی نگرانی کرتی رہنا۔"

سرائے کے مالک کی بیوی نے تلخی سے جواب دیا۔ "جناب یہاں تو

شیخ جلال الدین کی زیارت کو ہر روز سینکڑوں ہی آدمی آتے ہیں، میں کس کس کے گھوڑے کی نگرانی کروں گی۔"

شاہ کمال نے عورت کے ایک کوڑا رسید کر دیا اور کوئی ہدایت کیے بغیر اندر چلے گئے۔ عورت کوڑے کی ضرب سے بے ہوش ہو گئی۔

شیخ جلال الدین نے اپنی مجلس میں ایک فوجی کو دیکھا تو ہاتھ ہلا کر دریافت کیا۔ "کہیے جناب، کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟ بادشاہ کا کیا حال ہے؟"

شاہ کمال نے غصے میں کہا۔ "شیخ! ایک مسکین اگر فوجی وردی میں تمھاری مجلس میں آ بیٹھے تو تم اس سے بادشاہ کا حال پوچھنے لگتے ہو، خوب! بادشاہ کی بابت سوالات کرنا تمھارے شایانِ شان نہیں۔ اگر تمھیں خبر دل کا شوق ہے تو گھر سے نکل کر راستے میں بیٹھ جاؤ اور جو راہگیر بھی گزرے اس سے خبریں معلوم کرتے رہو!"

شیخ جلال الدین حلم و مروّت سے خاموش رہے۔ اسی مجلس میں شیخ عبدالاحد نامی ایک دوسرے بزرگ بھی تشریف رکھتے تھے۔ وہ شاہ کمال کے تیور سے خاصے متاثر نظر آتے تھے۔

شیخ جلال الدین اس پُرجوش اجنبی کے اندازِ تخاطب پر غور ہی کر رہے تھے کہ شاہ کمال نے ان کے سامنے تصوّف کا ایک دقیق مسئلہ رکھ دیا اور کہا۔ "میں تم سے اس کی وضاحت کا طلبگار ہوں۔"

شیخ جلال الدین نے جواب دیا۔ "اجنبی! تم ایک فوجی ہو، تمھارا اس مسئلے سے کیا تعلق، اس مباحثے میں پڑ کر خواہ مخواہ اپنا اور ہمارا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟"

شاہ کمال نے کہا۔ "علم کے دروازے فوجی پر بند تو نہیں کیے جاتے، میں فوجی ہی سہی لیکن علم کی پیاس تو رکھتا ہوں اور تمھارا فرض ہے کہ اسے بجھاؤ۔"

شیخ جلال نے زچ ہو کر پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔ "مسئلہ خاصا دقیق اور تا دیر بیان کیے جانے کا متقاضی ہے، اس لیے بہتر ہے کہ تم اُس وقت آؤ جب یہاں کوئی اور نہ ہو۔"

شاہ کمال نے کہا۔ "اگر سب کے سامنے اس کی وضاحت کر دی جائے تو کیا ہرج ہے؟"

شیخ جلال نے تحمل سے جواب دیا۔ "یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ حاضرینِ مجلس کے پلّے ہی نہ پڑے گا۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے خلوت میں آ کر ملو!"

شاہ کمال نے جوش میں کہا۔ "شیخ! جب تمھیں خود ہی اس بات کا اعتراف ہے کہ مسئلہ دقیق ہے اور حاضرین کی سمجھ ہی میں نہ آئے گا تو ان نادانوں کے سامنے بیان کر دینے میں کیا تامل ہے۔ جب یہ ان کی سمجھ ہی سے بالاتر ہے تو اس مجلس ہی کو خلوت تصوّر کر لیا جاتے!" پھر آپ غصّے میں کھڑے ہو گئے اور واپس جاتے ہوئے فرمایا۔ "شیخ! یہ بات نہیں ہے کہ تم اس مسئلے کی وضاحت کا علم یا سلیقہ نہیں رکھتے۔ تم بخل سے کام لے رہے ہو اور بخل اچھی عادت نہیں ہے"!

اس کے بعد آپ وہاں سے چلے آئے۔ اس وقت تک سرائے کے مالک کی بیوی ہوش میں آ چکی تھی اور آپ کے گھوڑے کی نگرانی کر رہی تھی۔ دیکھتے ہی آپ کی طرف والہانہ دوڑی اور آپ کے قدموں میں گر گئی اور آپ کے پیروں کو بوسے دینے لگی۔

یہاں وہ لوگ بھی موجود تھے جو عورت کو شاہ کمال کی مار کھاتے دیکھ چکے تھے۔ انھوں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ تھوڑی دیر بعد جب شاہ کمال واپس آئیں گے اور عورت اپنے ہوش میں آ جائے گی تو یقیناً اپنے شوہر اور ملازمین کی مدد سے جھگڑا کرے گی لیکن جب اسے کوڑا رسید کرنے والے کے پیر پکڑ کر بوسے لیتے دیکھا تو دنگ رہ گئے۔ انھوں نے عورت سے کہا "او نیک بخت یہ کیا کرتی ہے کیا تیرا دماغ چل گیا ہے۔ یہ وہی شخص تو ہے جس نے تجھے کوڑے سے پیٹا تھا؟"

عورت نے والہانہ انداز میں جواب دیا۔ "تم لوگ ٹھیک ہی کہتے ہو کہ انھوں نے میرے کوڑے رسید کیے تھے لیکن کوڑے کی ایک ہی ضرب نے میرے دل کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی ہے۔ میں اپنے آپ کو معلوم نہیں کیا محسوس کر رہی ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مجھ پر علوم و اسرار کی بارش ہو رہی ہے اور میں ان کی مدد سے محوِ پرواز ہوں۔"

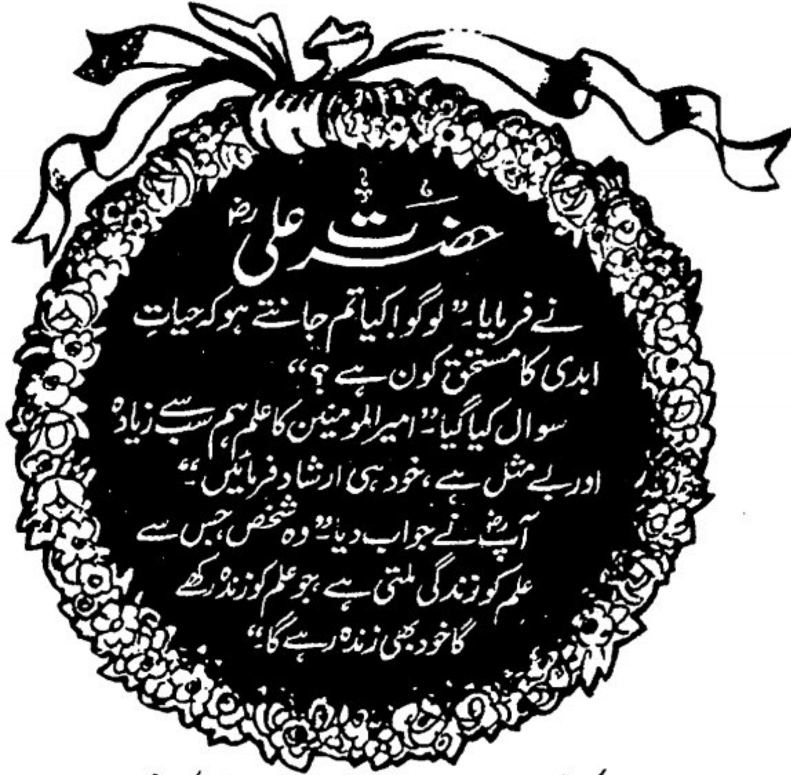
لوگ سمجھے عورت کا دماغ چل گیا ہے، خاموش ہو گئے۔

شاہ کمال نے عورت سے پیر چھڑائے اور گھوڑے پر سوار ہو گئے

کافی راستہ طے کر لینے کے بعد شاہ کمال کو محسوس ہوا کہ ان کے پیچھے کوئی شخص بھاگا چلا آ رہا ہے۔ انھوں نے گھوم کر دیکھا۔ شیخ جلال الدین ننگے پیر بھاگے چلے آ رہے تھے۔ شاہ کمال نے گھوڑا روک دیا اور شیخ جلال کا انتظار کرنے لگے۔

شیخ جلال الدین نے قریب پہنچ کر رکاب تھام لی اور عرض کیا۔ "حضرت! پہچاننے میں مجھ سے سخت غلطی ہو گئی ہے، خدا کے لیے مجھے معاف فرما دیجیے۔"

شاہ کمال نے جواب دیا۔ "شیخ تو اور تیرے مرید ہمارے قبضے میں ہیں اب تو کیا چاہتا ہے؟"



شیخ جلال الدین نے عاجزی سے عرض کیا۔ "مجھ سے پہچاننے میں غلطی ہوئی۔ اب میں اس کی معذرت کرنے حاضر ہوا ہوں۔"

شاہ کمال نے جواب دیا۔ "جا، واپس جا! ہم تجھے غم زدہ دیکھ کر اپنا فیصلہ واپس لیتے ہیں۔"

شیخ جلال تو واپس ہو گئے لیکن ان کی مجلس کی مشہور شخصیت شیخ عبد الاحد شاہ کمال کے پاس پہنچ گئے اور ان سے عاجزی سے دریافت کیا۔ "حضرت! آپ کے بلند مرتبے سے تو یہ خاکسار آگاہ ہو گیا۔ آپ ذرا اپنا اسمِ مبارک بھی بتا دیں تو بڑا کرم ہو گا!"

شاہ کمال نے جواب دیا۔ "بندے کو شاہ کمال کہتے ہیں۔ پائل میں قیام رہتا ہے اگر کبھی خواہش ملاقات ہو تو وہیں آ جانا، ملاقات ہو جائے گی۔"

اس کے بعد سے شیخ عبد الاحد کی شاہ کمال کی خدمت میں آمد و رفت جاری ہو گئی۔

ایک دن عبد الاحد نے مراقبے میں دیکھا کہ پوری دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ مختلف قسم کے اور عجیب و غریب شکل و صورت کے بھیانک درندے لوگوں کو ہلاک کرتے پھر رہے ہیں۔ اسی عالم میں ان کے سینے سے نور کی ایک شعاع پھوٹی اور اس شعاع نے بجلی سی چمکنے لگی۔ یہ بجلی چاروں طرف لپکی اور اس نے درندوں کو جلانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد منظر بدل گیا اور انھوں نے دیکھا کہ ایک نہایت نورانی شکل کے بزرگ ایک تخت پر مسند نشیں ہیں۔ ان کے آس پاس مقدس شکل و صورت کے لوگ کھڑے ہیں۔ ظالموں، جابروں اور کافروں کو اس مسند نشیں بزرگ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور وہاں سے ان کے قتل کا حکم صادر کر دیا جاتا ہے۔ مقدس شکل و صورت کے بزرگ حکم پاتے ہی انھیں ہلاک کر دیتے ہیں۔ کسی طرف سے آواز آ رہی ہے۔ "حق آیا، باطل رخصت ہوا اور باطل رخصت ہونے کے لیے ہی تھا۔"

عبد الاحد خواب کے اثر سے لرزاں و ترساں شاہ کمال کی خدمت میں پہنچے اور ان کے سامنے خواب بیان کر کے اس کی تعبیر دریافت کی۔ قدرے تامل اختیار کرنے کے بعد شاہ کمال نے ارشاد فرمایا:

"عبد الاحد! تو ایک خوش قسمت باپ ہے، تیرے گھر میں ایک ایسا فرزند پیدا ہو گا۔ جو مرتبے میں اولیائے کرام کے مقابل نمایاں حیثیت کا مالک ہو گا۔ اس کے نور سے شرک و بدعت کی تاریکی دور ہو جائے گی اور اسلام کو روشنی اور تابانی میسر آئے گی۔"

اس واقعے کو کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ آپ نے عبد الاحد سے پھر ارشاد فرمایا۔ "عبد الاحد! کیا تمھیں معلوم ہے کہ جس فرزند کی ہم نے تمھیں خوش خبری سنائی تھی وہ اب آنے والا ہے، تیرا فرزند اس پائے کا ہو گا کہ وہ شاہوں کی گردنیں جھکا دے گا اور بڑے بڑے سرکش اس کی تعظیم بجا لائیں گے!" پھر فرمایا۔ "شیخ عبد الاحد! جب یہ بچہ تمھارے رو برو آئے تو اس بات کا بطورِ خاص خیال رکھنا کہ جب تک میں نہ آؤں، اس فرزند کو کوئی چیز بھی نہ کھلانا۔"

اس ہدایت اور پیش گوئی کے بعد عبد الاحد نے تو شاہ کمال کا پیچھا

سامنے لیا۔ کوئی بات ہوتی، شاہ کمال کی خدمت میں پہنچتے ہی عرض کرتے اور جو جواب ملتا اس کے عواقب اور نتائج پر غور کرنے لگتے۔

کچھ عرصے بعد عبدالاحد کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ انھیں شاہ کمال کی ہدایت یاد آئی۔ بچے کو گود میں لیا اور شاہ کمال کی خدمت میں پہنچ گئے۔ بچے کو ان کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔

"حضرت! آپ کے ارشاد کی تعمیل کر دی ہے اور بچے کو اب تک کھانے پینے کو کچھ بھی نہیں دیا۔ اب آپ جب حکم دیں گے بندہ اس کی تعمیل کرے گا۔"

شاہ کمال نے نظر بھر کے نومولود کو دیکھا اور اپنی انگشت شہادت بچے کے منہ میں دے دی اور فرمایا۔ "عبدالاحد! یہ بچہ تجدیدِ دین کے لیے ہے۔ یہ خلقِ خدا کو بے اندازہ روحانی فیض پہنچائے گا۔ یہ ہمارا فرزندِ معنوی ہے۔"

نومولود نہایت انہماک اور شوق سے شاہ کمال کی انگشتِ شہادت چوستا رہا۔ کچھ دیر بعد شاہ کمال نے انگلی باہر نکال لی اور فرمایا۔ "بس کرو بیٹے! ہم اپنی اولاد کو کیا دیں گے۔ کچھ ان کے لیے بھی رہنے دو۔"

یہ نومولود آگے چل کر شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کہلایا اور اس نے اپنے عہد کے جلیل القدر بادشاہوں کو اپنے زیرِ بوجھ کا لیا۔



جیسا کہ پیچھے لکھا جا چکا ہے کہ شاہ کمال یا تو سرخ رنگ کا لباس زیبِ تن فرماتے تھے یا پھر فوجی وردی پہن لیتے تھے۔ لوگوں کو آپ کے سرخ لباس پر اعتراض تھا۔ لیکن زبان سے کچھ کہہ نہ سکتے تھے۔ ان معترضین میں علما تے وقت پیش پیش تھے۔

ان علما کو آپ کے باکمال ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن دل سے یہ چاہتے تھے کہ شاہ کمال سرخ لباس نہ پہنا کریں۔ انھوں نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہ شاہ کمال کو سرخ لباس میں دیکھ کر ٹوک دیں گے لیکن جب انھیں ایسا موقع ملتا تو ان کی زبان ساتھ نہ دیتی اور وہ لوگ خاموش رہ جاتے۔ انھوں نے لب کشائی کی کئی کوششوں کی ناکامی کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنی زبان سے کچھ بھی نہ کہیں گے بلکہ ایک سفید لباس تیار کرا کے شاہ کمال کے حوالے کر دیں گے اور ان سے درخواست کریں گے کہ "حضرت یہ لباس زیبِ تن فرمایا کریں۔"

شاہ کمال کو اپنے تصرفِ باطنی سے اس منصوبے کا علم ہو چکا تھا۔ انھوں نے علما سے سفید لباس لے لیا اور اسی وقت پہن لیا اور فرمایا۔ "تم نے ہمیں سفید لباس دیا، ہم نے پہن لیا لیکن اب تم اس سفید لباس کو غور سے دیکھتے رہو۔"

لوگوں کی نظریں شاہ کمال کے سفید لباس پر جم گئیں۔ انھوں نے محسوس کیا، سفید لباس آہستہ آہستہ سرخ ہوتا جا رہا ہے اور آخر کار ذرا سی دیر میں وہ بالکل سرخ ہو گیا۔ آپ نے اس سرخ لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "لوگو! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم سرخ رنگ بے حد پسند کرتے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں، یہ تو قدرت ہے جو ہمارے لباس کو سرخ کر دیتی ہے۔"

اس واقعے سے آپ کی دہشت لوگوں کے دلوں پر اتنی بیٹھ گئی کہ یہ حضرات خود ہی مجلس سے اٹھ جانے کا ارادہ کرنے لگے لیکن آپ نے انھیں روک کے رکھا اور ارشاد فرمایا۔ "لوگو! ہمیں الزام نہ دو۔ ہم تو اس تاجر کی طرح ہیں جو وہی سامانِ تجارت اپنے ساتھ رکھتا ہو جس کی لوگوں کو کوئی ضرورت نہ ہو یا وہ اسے پسند نہ کرتے ہوں۔ ہم تھی میں سے ہیں لیکن اختلافِ حال اور اختلافِ طبائع کے شکار ہیں۔"

اس واقعے کے بعد لوگوں نے آپ کو لال دیال کا خطاب دیا۔

ایک بار آپ صحرا سے گزر رہے تھے۔ کئی دن سے کچھ کھانے کو نہ ملا تھا۔ انھیں ایک جگہ ایک چرواہا نظر آیا جو اپنے جانوروں کو بیری کے پتے کھلانے میں مشغول تھا۔ اس وقت اس کے رومال میں دو روٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ آپ نے چرواہے کو نام لے کر مخاطب فرمایا۔ کہا۔

"سجن! اگر تو اپنی دو روٹیوں میں سے ایک کسی مردِ خدا کو عنایت کر دے تو تجھے بے شمار دینی اور دنیوی فائدے حاصل ہوں گے۔"

چرواہے نے غور سے اس درویش کو دیکھا اور اپنے دل میں کہا۔ "جناب یہ عجیب درویش ہے جو مفت کی روٹی سے اپنا جسم پالنا چاہتا ہے، خوب!!"

آپ نے ذرا بھی ناگواری کا اظہار نہ کیا اور خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ ابھی شاہ کمال دو میل مشکل گئے ہوں گے کہ سجن بھاگتا ہوا ان کے پاس پہنچا اور اپنی ساری چیزیں ان کے حوالے کر کے قدموں میں گر گیا اور اپنے ناقص خیال کی معافی مانگنے لگا۔ آپ نے اسے اپنے ساتھ ہی رکھ لیا اور اسے روحانی فیوض سے مالا مال فرما دیا۔



شاہ کمال کے جلالی واقعات بہت مشہور ہیں۔ آپ کے ایک مرید کو اشتیاقِ تجلی بے حد تھا۔ اس شوق میں اس نے سالہا سال ریاضت کی لیکن جو دیکھنا چاہتا تھا، اس سے محروم رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اس معاملے میں شاہ کمال اس کی ضرور مدد کریں گے لیکن تجربے نے اسے مایوس ہی رکھا۔ ایک دن اس نے دل میں سوچا کہ اگر شیخ نجم الدین کبریٰ کی رفاقت میسر آئی تو وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاتا کیونکہ نجم الدین کبریٰ

کے لیے یہ مشہور تھا کہ وہ جسے نظر بھر کے دیکھ لیتے تھے، اس کی دُنیا ہی بدل جاتی تھی۔ مرید ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ شاہ کمال نے جھرجھری سی لی۔ غصے میں دریافت فرمایا۔ "تو شیخ نجم الدین کبریٰ کا تصوّر کرتا ہے کہ وہ ذاتِ تجلی کا تجھ پر انکشاف کرے۔"

مرید سمجھا مراد بر آئی، سراپا اشتیاق سے عرض کیا۔ "حضرت! سالہا سال کی ریاضت اور مجاہدے کے بعد بھی یہ عاجز دلی مراد پانے سے محرُوم ہے۔"

شاہ کمال نے جوش میں حکم دیا۔ "ادھر دیکھ ہماری طرف!"

مرید نے نظر بھر کے شاہ کمال کو دیکھا۔ معلوم نہیں اسے ان کے چہرے میں کیا نظر آیا کہ وہ غش کھا کے گر گیا۔ تھوڑی دیر تڑپا اور جاں بحق ہو گیا۔ دوسرے مرید گھبرا گئے۔ ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اس بارے میں کوئی استفسار کرتے لیکن کسی جرأت مند مرید نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ "حضرت! یہ کیا ہوا؟"

آپ نے پر جوش لہجے میں جواب دیا۔ "اس نااہل اور کم حوصلہ شخص میں ذاتِ تجلی کے دیدار کا حوصلہ ہی کب تھا جو اتنی بڑی تمنا کر بیٹھا اور جو شخص اپنی حیثیت اور مرتبے سے زیادہ کا مطالبہ کرتا ہے، اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

آپ کے جلال کا کسی پر بھی اظہار ہو سکتا تھا۔ اس سے گھر والے بھی محفوظ نہ تھے۔ چنانچہ ایک روز آپ کے بڑے صاحبزادے شاہ عماد الدین گھر کے باہر تخت پر بیٹھے حجامت بنوا رہے تھے۔ یہ صاحبزادے بھی کشفِ باطنی رکھتے تھے۔ اسی عالم میں انھوں نے آواز سنی: "شاہ کمال شاہ کمال!!" یہ آواز کہیں بہت دُور سے آ رہی تھی۔ سورت کی بندرگاہ سے ذرا آگے ایک بحری جہاز گرداب میں پھنس گیا تھا اور اس پر سوار شاہ کمال کے مرید انھیں پکار رہے تھے۔ شاہ عماد الدین نے حجام سے پیچھا چھڑایا اور تخت سے اتر کر ہوا میں زور لگانے لگے۔ بالکل اس طرح جیسے کسی بھاری چیز کو سہارا دے کر آگے کی طرف کھسکا رہے ہوں۔ اسی وقت شاہ کمال حجرے سے باہر نکلے اور غضب ناک ہو کر صاحبزادے سے سوال کیا۔ "تو یہ کیا کر رہا ہے؟"

صاحبزادے نے خوفزدہ ہو کر جواب دیا۔ "باوا جان! اہلِ جہاز آپ کو پکار رہے تھے۔ مجھے شرم محسوس ہوئی کہ وہ لوگ آپ کو یاد کرتے کرتے ڈوب جائیں۔ اس لیے ازراہِ ہمدردی میں نے جہاز کو سہارا دے دیا۔"

شاہ کمال نے غضب ناک ہو کر دریافت کیا۔ "کیا تو نے لوحِ مبارک کا مطالعہ کر لیا تھا؟ کیا تجھے مشیت ایزدی کا علم ہو چکا تھا؟"

صاحبزادے نے شرمندہ ہو کر گردن جھکا لی۔ شاہ کمال آگے بڑھے اور اپنے بیٹے کے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ ان کی ساری رُوحانی طاقت سلب ہو گئی۔ اس کے بعد شاہ کمال یہ کہتے ہوئے حجرے میں واپس چلے گئے۔ "عاقبت نااندیش! تیری یہی سزا ہے!"

اسی طرح ایک دن آپ کے چھوٹے صاحبزادے نور الدین دیوار پر گھڑسواری کے انداز میں بیٹھے اسے حکم دے رہے تھے۔ "چل آگے بڑھ!" دیوار مرتعش ہو گئی۔ شاہ کمال غصے میں باہر نکلے اور ڈانٹ کر کہا۔ "صاحبزادے! تم اپنی حیثیت اور مرتبے کا اظہار وقت سے بہت پہلے کیے دے رہے ہو!"

اس کے بعد انھیں دیوار سے اُتار لیا اور ان کے سینے پر ہاتھ پھیر کر رُوحانی قوت سلب کر لی اور اس کے ساتھ ہی بچے کی رُوح بھی پرواز کر گئی۔ منجھلے صاحبزادے شاہ موسیٰ نے دونوں بھائیوں کا یہ حشر جو دیکھا تو باپ سے دوری اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انھیں ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں ان کا بھی یہی حشر نہ ہو۔ انھوں نے ایک رات راہِ فرار اختیار کی۔ وہ ساری رات بھاگتے رہے اور صبح ہوئی تو دیکھا ہنوز کیتھل کے اندر ہی ہیں۔ اسی کشمکش میں انھوں نے دیکھا کہ شاہ کمال ان کے سامنے کھڑے ہیں اور پوچھ رہے



جنگ نے لوگوں کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ ایک لاپروا اور بے فکر بیوی ہر روز اپنے شوہر کو نہایت انہماک سے اخبار پڑھتے دیکھتی تو کُڑھنے لگتی۔ ایک دن اُس نے شوہر سے اخبار چھین لیا اور پوچھا۔ "آخر تم ہر وقت اخبار ہی کیوں پڑھتے رہتے ہو؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "سخت جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اس کی تفصیلات پڑھتا رہتا ہوں۔"

بیوی نے کہا۔ "یہ لوگ کب تک لڑتے رہیں گے مل بیٹھ کر کوئی تصفیہ کیوں نہیں کر لیتے؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "یہ دونوں مل جل کر تصفیہ ہی کرنے تو بیٹھے تھے کہ وہیں سے لڑائی شروع ہو گئی"

ہیں۔" موسیٰ تو پریشان کیوں ہے ؟"

بیٹا باپ سے اپنی ذہنی کش مکش اور اندیشے چھپانے پر قادر ہوتا تو ضرور چھپاتا۔ اسے معلوم تھا کہ باپ نے سب کچھ کشف سے معلوم کر لیا ہے اور سوال تجاہلِ عارفانہ سے کیا گیا ہے۔ سب کچھ سچ سچ باپ کے گوش گزار کر دیا۔

شاہ کمال نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تو مت گھبرا، ہم تجھے خرقۂ خلافت سے نوازیں گے۔"

اور اپنے اس وعدے کو انھوں نے اس طرح پورا کیا کہ موسیٰ کو خرقۂ خلافت عطا فرما کے کوٹ قبولہ (منٹگمری موجودہ ساہی وال) کی ولایت بخش دی۔

موسیٰ نے اعتراض کیا اور متاملانہ عرض کیا۔ "باوا جان! وہ تو حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کا علاقہ ہے۔"

شاہ کمال نے جواب دیا۔ "تو ٹھیک کہتا ہے لیکن وہ یہ علاقہ تجھے بخش دیں گے کیوں کہ تو حضرت غوثِ اعظم کی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور کون ہے جسے حضرت غوثِ اعظم کا ادب و پاس نہیں؟"

شاہ موسیٰ کوٹ قبولہ چلے گئے اور یہاں بڑا نام پیدا کیا۔



شاہ کمال کا بیشتر وقت حجرے ہی میں گزرتا تھا۔ آپ حجرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیتے تھے اور عبادت و ریاضت اور مراقبے میں مشغول ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی تو آپ چھ چھ ماہ اندر ہی رہتے اور باہر تشریف نہ لاتے۔

یہ ۲۹ رجمادی الآخر ۹۸۱ھ کا ذکر ہے۔ بڑے صاحبزادے شاہ عمادالدین کسی غرض سے آپ کے حجرے کے دروازے پر پہنچے وہاں ہو کا عالم تھا انھیں کچھ شبہ ہوا، جھانک کر اندر دیکھا۔ وہاں شاہ کمال بے سُدھ پڑے ہوتے تھے۔ شاہ عمادالدین کو بد اندیشی نے گھیر لیا۔ انھیں اپنے والد کی زندگی کی طرف سے ناامیدی محسوس ہوئی۔ وہاں سے ہٹے اور چند آدمیوں کو لے کر واپس آ گئے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ بمشکل دروازہ اُتارا اور دوڑ کر باپ کے پاس پہنچ گئے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور نبض ساکت تھی۔ بے جان جسم مصلے پر لیٹا ہوا تھا۔ وصال کی خبر آناً فاناً پھیل گئی اور ایک کہرام برپا ہو گیا۔ دُور دور سے لوگ آپ کے آخری دیدار کے لیے آنے لگے۔ گھر والے تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے لگے۔ غسّال غسل دینے لگا۔ ابھی وہ غسل سے فارغ نہ ہوا تھا کہ شاہ کمال نے کروٹ لی اور آنکھیں کھول دیں اور اپنے آس پاس لوگوں کو دیکھ کر تبسّم فرمایا۔ غسّال خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا سب سے زیادہ بُرا حال تھا۔ وہ دہشت سے بے ہوش ہونے ہی والا تھا کہ شاہ کمال کے لبوں کو جنبش ہوئی۔ دریافت فرمایا۔ "کیا ہمارے وصال کی خبر سارے شہر میں پھیل چکی ہے؟"

خوف زدہ غسّال نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔ "جی حضرت!"

آپ نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور ارشاد فرمایا۔ "اچھا یہ بات ہے تو ہم بھی جاتے ہیں!"

یہ کہا اور دم سادھ کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

شہر کے باہر مشرقی جانب 'بُدھ کیار' نامی تالاب کے کنارے آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ مزار کے چاروں طرف مختلف النوع درختوں کا جھنڈ گھنی چھاؤں کیے رہتا ہے۔ کھرنی کی شاخیں املی کے درخت میں گھل مل گئی ہیں۔ جب موسم بہار آتا ہے تو نیم کی سبز پتیاں اور سفید پھولوں کا بچھونا ایک دل کش سماں پیدا کر دیتا ہے۔ مولسری کے پھول ہوا کے جھونکوں سے مینہ کی طرح برسنے لگتے ہیں۔

امتدادِ زمانہ سے مزار شکستہ ہو گیا تھا۔ اس کی از سرِ نو تجدید ہندوؤں کے ہاتھوں ہوئی۔ کیتھل کے ایک ہندو برہم دت شرما نے موجودہ سجادہ نشین مقبول محی الدین گیلانی کے نام ایک مختصر خط ۱۲ مارچ ۱۹۶۷ء کو لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے شاہ کمال کے حالات معلوم کیے تھے۔ انھوں نے اپنے طویل خط میں لکھا تھا:

"میرے محترم روشن لال جی بی اے، پسر سورگیہ باشی شری ہنس راج جی ریٹائرڈ چیف گڈس کلرک شاہ کمال کے مزارِ پاک کی تزئین اور آرائش کے روحِ رواں اور محرک ہیں —— یہ چار سال قبل شاہ کمال کے مزار پر تشریف لے گئے تھے۔ مزار کی خستہ حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے اور انھوں نے قسم کھائی کہ مزار کو جلد از جلد درست کرایا جائے گا۔ یہ جناب شاہ کمال کے حکم ہی کا نتیجہ ہے۔ ہم سب ان کے لیے بہت عقیدت اور جذبۂ محبت رکھتے ہیں —— جو کچھ حضرت شاہ کمال نے ہم اہلِ ہنود کو حکم دیا تھا۔ یہ عین مقتضائے وقت تھا جس کی تعمیل کر دی گئی۔"

آپ نے ایک بار کسی سے فرمایا تھا۔ "خودی کے مکتب میں پڑھنا شروع کر، جب تک یہاں کی اُلف بے نہیں پڑھے گا، تب تک عاشقوں کے راز کو نہیں پائے گا۔"

آپ اسی درس گاہِ خودی کے معلّم اور سرخیلِ عاشقاں تھے۔ اور عشق زمانوں پر حاوی اور محیط ہے۔ اس کی گرفت میں زمان و مکاں اور تمام مذاہب و ملل ہیں۔ کیا ہندو کیا مسلمان سبھی اس کے اسیر اور تابع ہیں۔



اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے
سوانح عمری خواجگانِ چشت — از سید شہباز علی بستلی؛
خواجگانِ چشت ———— (مولانا محمد منیر لکھنوی)
سیر الاقطاب ———— (ابنِ شیخ عبد الرحیم)
انوارِ اصفیا ———— (شیخ غلام علی اینڈ سنز)



ضیا تسنیم بلگرامی

لوگ تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر کچھ دیر کے لیے نوجوان بیوہ کے پاس رُکے جو اپنے سات سالہ بچے کو سینے سے لگائے چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔ ان ہمدردوں نے رسمی لفظوں میں اسے صبر و شکر کی تلقین کی اور بیوہ کو بے یار و مددگار چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو سدھار گئے۔ صابر بچہ سب کچھ دیکھ اور سمجھ رہا تھا لیکن چُپ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ یتیم ہو چکا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مشیتِ ایزدی ہی یہی تھی اور خدا کے کاموں میں عقل یا دل کی دخل اندازی فضول اور گستاخانہ عمل ہے

ہرات کی ایک گلی میں اپنے مالک سے محروم ہو جانے والا یہ گھر رات کو اور زیادہ اُجاڑ لگنے لگا جس حصّے میں شوہر کی موت واقع ہوئی تھی وہاں شمع جلا کر، مرنے والی کی بیوہ رات بھر تلاوتِ کلام پاک کرتی رہی اور شوہر کی روح کو ایصالِ ثواب پہنچاتی رہی معصوم بچہ بے چینی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا اور زبان سے ایک ایسا لفظ بھی ادا نہ کیا جس میں اس سانحے کا افسوس یا مشیتِ ایزدی کا شکوہ کیا گیا ہوتا۔

گھر کی مالی حالت شوہر کی زندگی ہی میں افسوسناک تھی اور اب روٹیوں کے بھی لالے پڑ گئے۔ ایک وقت شکم سیر ہو جانے کے بعد کچھ پتہ نہ ہوتا کہ پھر روٹی کب ملے گی شہر کے سارے اعزا نظریں پھیر چکے تھے۔ بیوہ نے بھوکے بچے کو گود میں لے کر سوچنا شروع کیا کہ اس معاشی مسئلے کو کہاں اور کس طرح حل کیا جائے۔ اسی دوران اسے یاد آیا کہ اجودھن (پاک پٹن) میں اس کا عظیم القدر بھائی بابا فرید گنج شکرؒ موجود ہے، ہرات سے اجودھن کا فاصلہ معمولی نہ تھا لیکن حالات کے تھپیڑوں اور معیشت کے چرکوں نے بیوہ میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ وہ اس سلسلے میں کوئی بڑا قدم اُٹھائے۔ اس نے سات سالہ بچّے کو گود میں لیا، مکان کو تالا لگایا اور اجودھن، اپنے بھائی کے پاس چل کھڑی ہوئی۔

بڑے بڑے کان، چوڑی پیشانی، اونچی ناک، کشادہ ابرو اور لمبے ہاتھوں والا یہ بچہ جب اپنے ماموں بابا فرید گنج شکرؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو وہ اپنے بھانجے کو بغور دیکھتے رہے۔

بچے کو ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا اور اسے ایک عجیب حکم دیا "ذرا اپنا کرتا تو اُتارنا"

لڑکے کو حکم کی تعمیل میں تامل ہوا تو بھائی نے اپنی بہن سے کہا "ذرا اس کی پشت برہنہ تو کرنا"

ماں نے آگے بڑھ کر لڑکے کو برہنہ کر دیا، بابا فریدؒ بچے کی پشت پر موجود کسی علامت کو تلاش کرنے لگے اور پھر علامت داہنے شانے کے نیچے بے ترتیب سیاہ بالوں کے ایک گچھے کی شکل میں نظر آگئی، بابا فریدؒ نے اسے دیکھا اور ان کے چہرے پر بشاشت دوڑ گئی۔ انھوں نے لڑکے کو پیار کر کے رخصت کر دیا اور اپنی بہن سے کہنے لگے "بہن! تم نے کبھی بالوں کے اس عجیب و غریب نشان پر بھی غور کیا؟"

"ہاں بھائی!" بہن نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "اس نشان کی بابت اور کچھ تو جانتی نہیں بس لوگوں ہی سے سن رکھا ہے کہ یہ خوش قسمتی کا نشان ہے۔" پھر اُداس ہو کر کہنے لگیں "اگر خوش طالعی اسی کو کہتے ہیں کہ باپ صغر سنی ہی میں انتقال کر جائے تو میرا علی احمد واقعی خوش قسمت ہے!"

یہ کہتے کہتے ان کا دل بھر آیا اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔

بابا فریدؒ نے کہا "رونے کی کوئی ضرورت نہیں، خدا نے اس کی پشت پر داہنے شانے کے نیچے سیاہ بالوں کی ترتیب سے لفظ "ولی اللہ" لکھ دیا ہے اور یہ کوئی معمولی بشارت نہیں ہے!"

اس بات کو تین سال گزر گئے۔ بابا فریدؒ اپنے بھانجے کی رُوحانی تربیت و تہذیب فرماتے رہے۔ تین سال میں اس دس گیارہ سالہ بچے نے اتنا کچھ حاصل کر لیا کہ اپنے ماموں کے بقول کوئی دوسرا چھ سال میں بھی حاصل نہ کر سکتا تھا۔ ماں کو اپنے گھر کی یاد ستانے لگی لیکن وہ علیؒ کو اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتی تھیں، انھیں کچھ پتہ نہ تھا کہ ان کی عدم موجودگی میں مقفل گھر اور گرہستی کا کیا حشر ہوا؟ انھوں نے اپنے ارادے کا ذکر بابا فریدؒ سے کیا تو آپ نے بخوشی واپسی کی اجازت دے دی اور ایک چھوٹی سی تقریب منعقد کر کے بہن کے سامنے اپنے بھانجے کو شرفِ مریدی بخشا۔

بابا فریدؒ نے محسوس کیا کہ بہن کی خوشی میں فکر اور اندیشہ بھی موجود ہے۔ آپ نے پوچھا "بہن! تم ملول کیوں ہو؟"

بہن نے مامتا بھرے دل اور درد مند آواز میں کہا "بھائی! جانے سے پہلے ایک گزارش کروں گی!"

بابا فریدؒ نے شفقت آمیز نظروں سے بہن کو دیکھا اور پوچھا۔ "کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟"

بہن نے رقّت سے عرض کیا "علی احمد نے بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں، میں اسے آپ کے پاس چھوڑ کر ہرات جا رہی ہوں، میں بس اتنا چاہتی ہوں کہ میرا علی احمد بھوکا نہ رہے!"

بابا فریدؒ نے غریبوں اور مستحقوں کے لیے لنگر جاری کر رکھا تھا آپ نے اسی وقت لنگر کی تقسیم کا کام علی احمد کے سپرد کر دیا اور بہن سے فرمایا "اب تو تم خوش ہو آج سے لنگر کی تقسیم علی احمد کے سپرد ہے!"

ماں مطمئن ہو کر خوش خوش ہرات واپس چلی گئیں اور بیٹا اپنے ماموں کی آغوشِ تربیت میں اپنی عمر کے ماہ و سال گزارنے لگا۔ لیکن عالم یہ تھا کہ صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ بارہ سال بعد جب ماں دوبارہ اپنے بیٹے سے ملنے اجودھن (پاک پٹن) تشریف لائیں اور ہڈیوں کے ڈھانچے علی احمد کو اپنے سامنے ضعف اور نقاہت سے لرزاں دیکھا تو دل مسوس کر رہ گئیں، آنکھیں بھر آئیں اور بیٹے کو لے کر بھائی کے روبرو پہنچ گئیں، صدمے اور جذبات کی شدّت کی وجہ سے کہنا کچھ چاہتی تھیں اور منہ سے نکلتا کچھ تھا۔ آخر بدقّت تمام کام کی بات بس اتنی ہی کہہ سکیں۔ "بھائی! کیا میں نے چلتے چلتے آپ سے یہ درخواست نہیں کی تھی کہ میرے علی احمد کو بھوکا نہ رکھنا" پھر علی احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ذرا اس کی صحت تو ملاحظہ فرمائیں، ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گیا ہے!" اس کے بعد وہ آنچل میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

بابا فریدؒ نے، بارہ سال میں شاید پہلی بار ہڈیوں کے اس پنجر کو بغور دیکھا اور کہا "بہن! ہم نے بخدا اسے بھوکا نہیں رکھا تمھیں خوب یاد ہوگا کہ ہم نے تمھارے سامنے ہی لنگر کی تقسیم کا کام علی احمد کے سپرد کر دیا تھا، یہ لنگر خانے کا مالک و مختار تھا، جس کو چاہتا دیتا جس کو نہ چاہتا نہ دیتا، اس لنگر سے جو چاہتا کھاتا کسی نے اس کا ہاتھ تو نہیں پکڑ رکھا تھا!"

ماں نے بیٹے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں "پھر تمھارا یہ حال کیونکر ہوا؟"

بیٹے نے چونکا دینے والا جواب دیا "اماں! ماموں نے لنگر کی تقسیم کا کام ہمارے سپرد کیا تھا خود ہمیں کھانے کی اجازت تو مرحمت نہیں فرمائی تھی۔"

بابا فریدؒ نے شفقت سے بھانجے کو دیکھا اور دریافت فرمایا "پھر تم بارہ سال تک کہاں سے کھاتے پیتے رہے؟"

سعادت مند بھانجے نے جواب دیا "نباتات گھاس اور پتے وغیرہ!"

بابا فریدؒ نے فرطِ محبّت میں خوشی سے فرمایا "تم نے صبر کی انتہا کر دی علی احمد تم صابر ہو اور اس میں تم یکتا و فرد ہو!" اس کے بعد سے یہ نوجوان علی احمد صابر کہلانے لگا۔

ماں نے مجسمۂ صبر و رضا علی احمد کی طرف دیکھا اور انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کا شکایت بھرا دل کدورت اور رنجش سے پاک ہو چکا ہے۔ دلوں کی کیفیات اپنے کشف سے جان لینے والے بابا فریدؒ نے ماں بیٹے پر فاتحانہ نظر ڈالی۔ ان کے چہرے کا سکون اور لہجے کی طمانیت یہ بتا رہی تھی کہ علی احمد کے اندر ودیعت کیے ہوئے صبر و تحمل کا وہ جوہر جو بارہ سال کی آزمائش میں کھل کر سامنے آگیا تھا اسی طریقے سے پرکھا جا سکتا تھا اور وہ اسی طرح سامنے لایا جا سکتا تھا۔ رہی سہی کسر بابا فریدؒ نے بھانجے کو سینے سے لگا کر پوری کر دی

ہندوستان کے بادشاہ غیاث الدین نے اپنی بیٹی بابا فریدؒ کے عقد میں دے دی تھی، اب اس بادشاہ زادی کی بیٹی جوان ہو چکی تھی بیوہ ماں کو یہ لڑکی بہت پسند تھی، علی احمد بھی جوان ہو چکا تھا ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنے بیٹے کا جیتے جی سہرا بھی دیکھ لیں۔ لڑکی گھر ہی میں موجود تھی۔ انھوں نے اپنی درخواست بابا فریدؒ کے سامنے پیش کر دی۔ بابا نے جواب دینے کے بجائے فکر مندانہ سکوت اختیار کیا۔ بہن نے اس تردّد کا کچھ اور ہی مطلب لیا۔ بولیں "کیا علی احمد تمھارا بھانجا نہیں ہے؟"

بابا فریدؒ نے نرمی سے جواب دیا "ہے کیوں نہیں!"

بہن نے جوش سے پوچھا "کیا اس میں تمھارا خون موجود نہیں ہے؟"

بابا فریدؒ نے وہی مختصر سا جواب دیا "ہے کیوں نہیں!"

بہن نے آزردگی سے پوچھا "پھر تمھیں اس رشتے میں تامل

کیوں ہے؟"

بابا فریدؒ نے بدستور فکرمند لہجے میں جواب دیا "یہ بات نہیں ہے بہن، ہم کسی اور ہی بات سے فکرمند ہیں!"

جذباتی بہن نے غصے میں کہا "شاید اس لیے کہ علی احمد بیوہ ماں کا بیٹا ہے اور تمہاری بیٹی شہنشاہِ ہند کی نواسی ہے اسی وجہ سے شاید تم اس رشتے کو ناقابلِ اعتنا سمجھتے ہو؟"

بابا فریدؒ نرمی سے کہا "تم نے ہمارے تامل کا غلط مطلب لیا ہے۔ ہم تو صرف اس لیے فکرمند ہیں کہ علی احمد کو شادی راس نہیں آئے گی، اس کا جلال لڑکی کو ہلاک کر دے گا۔ اگر تم اس رشتے پر بضد ہی ہو تو ہم دونوں کی شادی کیے دیتے ہیں لیکن اس شادی کا انجام وہی ہوگا جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔"

بہن نے بھائی کی باتوں پر کوئی دھیان نہ دیا اور بیٹے کی شادی شہنشاہِ ہند کی نواسی سے بخیر و خوبی انجام پا گئی لیکن اس شادی کا انجام وہی ہوا جس کی بابا فریدؒ نے پہلے ہی پیش گوئی کر دی تھی، جب یہ دونوں میاں بیوی یک جا ہوئے تو بیوی اپنے شوہر کا جلال چار ماہ بھی نہ برداشت کر سکی، اور انتقال کر گئی۔ اس کی موت پر جب یہ چھوٹا سا کنبہ یک جا ہوا اور سوگوار چہرے آمنے سامنے بیٹھے تو بابا فریدؒ نے رنج و صدمے سے آبدیدہ بہن کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ "دیکھ لیا تم نے، ہم جو کہتے تھے وہ ہو کر رہا نا!"

بہن نے اشکبار نظروں سے بھائی کو دیکھا اور شرم و ندامت سے نظریں چرانے لگیں، وہ اپنی ضد پر بہت زیادہ شرمسار اور نادم تھیں۔

اس کے بعد علی احمد کی ریاضت اور مجاہدے میں اتنی شدت آگئی کہ انھیں دنیا کا ہوش ہی نہ رہا۔ لوگوں سے ملنا جلنا اور بات چیت کرنا چھوڑ دیا۔ زبان میں اتنی تاثیر پیدا ہو گئی کہ جو منہ سے نکل جاتا وہ ہو کر رہتا۔ لوگ ان کے جلال سے ڈرنے لگے اور دور رہتے۔ بابا فریدؒ بھی ان کے روحانی کمال اور ارتقا سے بخوبی واقف تھے۔ آپ نے ہم عصر اولیائے کرام اور بزرگانِ دین کو اکٹھا کیا اور ان کی موجودگی میں علی احمد کے سر پر اپنی کلاہ رکھ کر اس پر سبز عمامہ باندھ دیا، پھر جبہ پہنایا اور اپنا عصا اور پیالہ بھی علی احمد کے حوالے کر دیا، آخر میں ایک قینچی بھی اس غرض سے عطا کی گئی کہ بالوں کی تراش خراش میں آسانی رہے، مصلیٰ نماز کے لیے عطا ہوا۔ اسی تقریب میں انھیں دہلی کی ولایت کا پروانۂ تقرری بھی عطا کیا گیا لیکن اس کے لیے یہ شرط بھی لگا دی کہ یہ پروانہ اسی وقت کارآمد ہوگا جب اس پر قطبِ عصر شیخ جمال الدین ہانسویؒ اپنی مہرِ قطبیت لگا دیں گے۔

علی احمد پروانۂ قطبیت لے کر ہانسی روانہ ہو گئے۔

ڈولے میں سوار علی احمد شانِ بے نیازی سے جمال الدین کی خانقاہ میں داخل ہوئے تو شیخ جمال ان کی پیشوائی کو آگے بڑھے، ان کا خیال تھا یہ ڈولا ان کے قریب ہی رک جائے گا لیکن علی احمدؒ ان کی پروا کیے بغیر ڈولے کو آگے بڑھ جانے دیا اور خانقاہ کے اندر، لبِ فرش پہنچ کر ڈولے کو رکوا کر باہر نکلے۔ ان کی یہ خود سری جمال الدین کو پسند نہیں آئی — اس کے باوجود خندہ پیشانی سے انھیں خوش آمدید کہا اور نہایت تعظیم اور اعزاز و اکرام سے اپنی مسند پر بٹھایا۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا، دونوں نے ایک ساتھ مغرب کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد ہر سو اندھیرا پھیل چکا تھا خانقاہ میں ابھی تک چراغ نہیں جلا تھا۔ علی احمد نے فرمانِ قطبیت کھول کر جمال الدینؒ کے سامنے رکھ دیا اور کہا "اس پر مہر ثبت فرما دیجیے!"

جمال الدینؒ نے اندھیرے کا عذر کیا، کہا: "اس وقت اندھیرا ہے، رات کو آرام کیجیے صبح مہر لگا دیں گے!"

علی احمد نے مجبور کیا، بولے "حضرت! تامل نہ کیجیے اسی وقت مہر لگا دیجیے اور مرید کو حکم دیجیے کہ وہ چراغ لے آئے!"

جمال الدینؒ نے اسی وقت چراغ طلب فرمایا اور اچاٹ دلی سے مہر لگانے پر آمادہ ہو گئے۔

اتفاق کی بات کہ چراغ آتے آتے بجھ گیا۔

جمال الدین نے بے دلی سے کہا "علی احمد! صبر کرو، صبح فجر کے بعد مہر لگا دیں گے۔"

علی احمد نے اس عذر کو رد کر دیا۔ اپنی انگلی پر کچھ پڑھ کر دم کیا، وہ چراغ کی طرح روشن ہو گئی۔ روشن انگلی آگے بڑھاتے ہوئے بولے "لیجیے روشنی ہو گئی فرمان پر مہر لگا دیجیے۔"

جمال الدینؒ بھی برداشت نہ کر سکے۔ فرمانِ قطبیت غصے میں چاک کر دیا اس کے پرزے ہوا میں اڑا دیے اور گرم مزاج طالبِ قطبیت کو ڈانٹتے ہوئے بولے "یہ گرم مزاجی؟ تحمل پیدا کرو۔ دہلی والے اس گرم مزاجی کو کس طرح برداشت کریں گے۔ تم تو جب بھی جوش میں آؤ گے انھیں جلا کر خاک کر دو گے!"

بابا فریدؒ کے فرمان کو چاک ہوتے دیکھ کر علی احمد بھی مشتعل ہو گئے

اور غصے میں پیر ٹپکتے ہوئے فرمایا۔

"کوئی پروا نہیں آپ نے ماموں فریدؒ کا فرمانِ قطبیت چاک کیا تو ہم نے تمہارا سلسلۂ قطبیت چاک کر دیا۔"

جب یہ جنگ ہو رہی تھی اجودھن میں بابا فریدؒ منہ ہاتھ دھو رہے تھے، انھوں نے اپنے مریدوں سے متبسم ہو کر فرمایا۔

"خدا خیر کرے دو بڑے پہلوان پنجہ آزمائی کر رہے ہیں۔"

علی احمد دل برداشتہ اجودھن واپس آ گئے اور بابا فریدؒ کو پوری روداد سنا کر دریافت کیا۔ "اب فقیر کے لیے کیا حکم ہے؟"

بابا فریدؒ نے افسوس سے جواب دیا۔ "پارہ کردۂ جمال را فرید نتواں دوخت (جمال کے پھاڑے کو فرید نہیں سی سکتا) اس کے بعد پوچھا۔ "جب جمال نے فرمانِ قطبیت چاک کیا تو تم نے کیا جواب دیا تھا؟"

علی احمد نے جوش میں کہا "ہم نے بھی ان کا سلسلۂ قطبیت چاک کر دیا۔"

بابا فرید نے پوچھا۔ "اول سے یا آخر سے؟"

بھانجے نے جواب دیا "اول سے!"

بابا فریدؒ نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا: "تمہاری زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی رائیگاں نہ جائے گا لیکن یہ خیر ہوئی کہ تم نے اسے آخر سے نہیں چاک کیا چنانچہ اب خود تمہارے سلسلے میں ایک ایسا قطب پیدا ہو گا جس کی دعا سے جمال کا سلسلہ باقی رہے گا۔"

کہتے ہیں علی احمد کے ارشادِ جلالی کے بعد جمال ہانسویؒ کے بڑے صاحبزادے باپ کے سامنے ہی انتقال فرما گئے اور چھوٹے صاحبزادے باپ سے تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے باوجود خلافت سے محروم رہے کہتے ہیں کہ جمال ہانسوی اپنے آخری لمحات میں باہوش و حواس ہر قسم کی گفتگو فرماتے رہے ان کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو خلافت کی تحریر عطا فرما دیں گے لیکن وہ جب بھی سلسلۂ خلافت کچھ کہنے کا قصد فرماتے زبان قابو میں نہ رہتی اور اسی عالم میں انتقال فرما گئے۔

علی احمد صابرؒ نے بابا فریدؒ کی خدمت میں کچھ زمانہ اور گزار دیا جمال ہانسویؒ کے انتقال کے بعد بابا فرید نے ایک بار پھر انھیں فرمانِ ولایت عطا فرمایا۔ یہ فرمان کلیر کی ولایت کا تھا کلیر سہارنپور میں رڑکی کے قریب ایک قصبہ ہے لیکن جس زمانے کے یہ واقعات ہیں ان دنوں اس کا بڑے شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ بابا فریدؒ نے فرمانِ ولایت عطا فرماتے ہوئے کہا "بیٹے صابر! کلیر میں اسلام کو پہنچے اڑتالیس سال گزر چکے ہیں، جاؤ اور اپنے فیوضِ رُوحانی سے سرفراز فرماؤ" اس کے بعد خادم خاص علیم اللہ ابدال کو اشارے سے قریب بلا کر ارشاد فرمایا "تم صابر کے ساتھ جاؤ ممکن ہے وہاں تمہاری ضرورت پیش آجائے"

علیم اللہ ابدال صابرؒ کے ساتھ ہو لیے۔ یہ دونوں حضرات جب کلیر میں داخل ہوئے تو ایسا محسوس کیا، جیسے بیگانوں میں جا پھنسے ہوں۔ پورے شہر میں سے صرف تین افراد آپ کی پیشوائی کو آگے بڑھے اُن میں ایک عورت تھی اور دو مرد۔ عورت کا نام گلزار دی تھا اور مردوں میں سے ایک کا نام بہار الدین اور دوسرے کا نام جمال روغن گر تھا۔ ان میں بہار الدین پیش پیش تھا اور اس نے دونوں کے اپنے گھر قیام فرمانے کا شرف بھی حاصل کیا تھا۔

جمعے کا دن تھا کلیر کی جامع مسجد میں نمازیوں کا اجتماع شروع ہو چکا تھا۔ حضرت صابرؒ اپنے ساتھی علیم اللہ ابدال کے ساتھ مسجد میں داخل ہوئے اور لوگوں کے درمیان سے گزر کر ممبر کے قریب جا بیٹھے۔ انھیں اس بات کا بالکل پتہ نہ تھا کہ کلیر کی جامع مسجد میں وہاں کے معززین اور امرا کے لیے جگہیں مخصوص ہوتی ہیں اور ہر شخص ہمیشہ اپنی مقرر کردہ جگہ پر ہی کھڑے ہو کر نماز ادا کرتا ہے۔ آپ جس جگہ بیٹھے تھے وہ کسی امیر کی جگہ تھی اس نے آتے ہی انھیں اس جگہ سے ہٹا دیا آپ بے چون و چرا دوسری جگہ جا بیٹھے لیکن تھوڑی دیر بعد جب اس جگہ کا بھی مالک آ گیا تو انھیں وہاں سے بھی اُٹھ جانا پڑا۔ اس طرح ہٹتے ہٹتے آپ کو مسجد کے باہر چلا جانا پڑا۔

بہار الدین اور جمال روغن گر حضرت صابرؒ کے اضطراب اور بے چینی کو بُری طرح محسوس کر رہے تھے۔ آخر جب مسجد والوں کا اہانت آمیز رویہ ناقابلِ برداشت ہو گیا تو ان دونوں نے باری باری مسجد والوں کو حضرت صابرؒ کے مرتبے سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ ان دونوں نے کہا "لوگو! انھیں پہچانو، یہ آپ کے شہر میں صاحبِ ولایت ہیں"

کسی نے مجمع میں سے بآوازِ بلند کہا "لوگو! یہ دونوں کیا بکتے ہیں؟ بھلا انھیں کس طرح معلوم ہوا کہ یہ اجنبی صاحبِ ولایت ہے آخر اس کی کوئی دلیل تو ہونی چاہیے!"

حضرت صابرؒ نے جواب دیا۔ "لوگو! تم کیوں فکرمند ہوتے ہو! اس فقیر نے تمہارے شہر کا ولایت نامہ حضرت بابا فریدؒ سے حاصل کیا ہے اگر یقین نہ ہو تو یہ ناچیز اسے دکھا بھی سکتا ہے!"

اسی مجمع میں کلیر کا امیر قیام الدین بھی موجود تھا، گستاخانہ قدم اٹھاتا ہوا حضرت صابرؒ کے پاس پہنچا اور سوال کیا: "کیا آپ واقعی یہاں کے ولی ہیں؟"

حضرت صابرؒ نے فرمانِ ولایت کھول کر امیر شہر کے سپرد کردیا۔ امیر نے لاپروائی اختیار کی اور فرمانِ ولایت پر ایک نظر ڈالنا بھی فضول سمجھا۔ اس سے نظریں ہٹاتا ہوا بولا: "اگر آپ یہاں کے واقعی صاحبِ ولایت ہیں تو آپ کو ہمیں کرامت دکھانی پڑے گی۔"

حضرت صابرؒ نے دریافت کیا: "بولو، کیسی کرامت دیکھنا چاہتے ہو تم لوگ؟"

امیرِ شہر نے کہا: "حضرت! آپ سے کیا چھپانا، میرے پاس حرمنہ نامی ایک بکری تھی، تین ماہ پہلے اسے معلوم نہیں کس نے چرا لیا، کیا آپ اس کے چور کا پتہ بتا سکتے ہیں؟"

حضرت صابرؒ نے اطمینان سے فرمایا: "بالکل بھی لو، سارے چور یہیں اکٹھا ہوئے جاتے ہیں!" اس کے بعد آپ نے با آوازِ بلند کہا: "حرمنہ! تو کہاں ہے؟ اے حرمنہ کے کھانے والو! کہاں ہو سامنے آجاؤ!"

اور پھر لوگوں نے یہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ستائیس آدمی افتاں و خیزاں بھاگے چلے آرہے ہیں، یہ لوگ حضرت صابرؒ کے روبرو مجرموں کی طرح آکر کھڑے ہوگئے۔ آپ نے ان سے دریافت کیا:

"لوگو! تم نے امیرِ شہر کی بکری ذبح کرکے کھالی ہے، بتاؤ اسے تم نے کس جگہ ذبح کیا تھا؟"

جواب میں سبھی انکار کر گئے۔

حضرت صابرؒ نے تنبیہہ کی: "اگر تم لوگ اپنی زبان سے اقرار نہ کروگے تو کسی اور طرح تمہارا پردہ ابھی فاش ہوا جاتا ہے!"

ان میں سے چند بگڑ گئے اور حضرت صابرؒ کو جوش دلادیا، کہنے لگے "حضرت! اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے انکار کے بعد آپ اپنی کرامت کے زور سے گناہِ ناکردہ کا اقرار کرالیں گے تو ہم سب کی طرف سے آپ کو اجازت ہے کہ ہمارا پردہ ضرور فاش کریں۔"

حضرت صابرؒ نے جوش میں آکر بکری کو آواز دی: "حرمنہ! تم کہاں ہو؟ تم پر جو بیتی ہے اس کا با آوازِ بلند اپنے مالک اور حاکمِ شہر کے سامنے اظہار کرو۔" جواب میں باری باری سبھی نے بے اختیارانہ اقرار کیا کہ ہم نے حرمنہ کا اتنا اتنا گوشت کھایا تھا!

حضرت صابرؒ نے دوسرا سوال کیا: "حرمنہ کی ہڈیاں کہاں ہیں؟"

لوگوں نے جواب دیا: "کوچۂ صدرق کے کنوئیں میں!"

صدرق کا یہ کنواں مجرموں اور خطاکاروں کی تادیب کے لیے کھدوایا گیا تھا اور جسے بھی موردِ عتاب ٹھہرایا جاتا، امیرِ شہر اس کنوئیں میں ڈلوا دیتا تھا۔

لوگ ہکا بکا یہ تماشا دیکھ رہے تھے، قاضیِ شہر مجمع سے نکل کر حاکمِ شہر کے قریب پہنچا اور کہنے لگا: "جناب! آپ دھوکا کھارہے ہیں یہ شخص جو خود کو صاحبِ ولایت اور حاملِ کرامت قرار دے رہا ہے بہت بڑا جادوگر معلوم ہوتا ہے اس سے بچیے اور اپنے ایمان کو سلامت لے کر گھر تشریف لے جائیں۔"

حاکمِ شہر کو بھی حضرت صابرؒ کی کرامت پر ساحری کا گمان ہونے لگا، کوئی جواب دیے بغیر چپ چاپ مجمع سے نکل کر اپنے گھر چلا گیا۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

کے پاس ایک پادری آیا۔ اور سوال کیا: "حضرت! ایک سوال بہت دنوں سے مجھے پریشان کر رہا ہے، اگر اس کا جواب عنایت فرمائیں تو بڑا اکرم ہوگا!"

محدث دہلویؒ نے جواب دیا: "پوچھو!"

پادری نے پوچھا: "ایک شخص استراحت فرما رہا ہے یوں سمجھو سویا ہوا ہے۔ اس کے پاس ہی ایک دوسرا شخص بیٹھا ہوا ہے، ایک بھولا بھٹکا مسافر ان دونوں کے قریب آکھڑا ہوتا ہے، اب یہ بتائیے کہ وہ راستے کی رہبری کس سے حاصل کرے، اس سے جو سویا ہوا ہے یا اس سے جو بیدار بیٹھا"

محدث دہلویؒ سمجھ گئے کہ سوئے ہوئے شخص سے پادری کی مراد رسولِ مقبولؐ سے ہے جو مدینۂ منورہ میں آرام فرما رہے ہیں اور بیدار شخص سے حضرت عیسیٰ مراد ہیں جو چوتھے آسمان پر زندہ تشریف فرما ہیں۔

حضرت محدث دہلویؒ نے جواب دیا: "ظاہر ہے کہ مسافر رہنمائی اس سوئے ہوئے شخص ہی سے حاصل کرے گا کیونکہ پاس بیٹھا ہوا بیدار شخص خود اس بات کا منتظر ہے کہ سویا ہوا شخص جاگے تو اس سے راستہ پوچھا جائے۔"

آپ نے اِن منکروں کو حیرت سے جلتے ہوئے دیکھا اور کہا۔
"یہ انھیں ہو کیا گیا ہے یہ ہماری باتوں کو گمان اور شبہے کی نظروں سے کیوں دیکھتے ہیں ؟"

قاضیٔ شہر نے بے ہودگی سے جواب دیا "اس لیے کہ تم صاحبِ ولایت نہیں، ساحر ہو اور ساحر سے خدا بچائے !"

حضرت صابرؒ نے تبسم فرمایا اور خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے بولے "الٰہ العالمین، تیرا شکر ہے کہ آج اس فقیر سے سُنّتِ نبویؐ بھی ادا ہوگئی لوگوں نے حضرت رسول مقبولؐ کو بھی اسی طرح ساحر قرار دیا تھا۔"

حضرت صابرؒ نے سارے حالات بابا فریدؒ کو لکھ بھیجے اور انھیں بتایا کہ جب امیرِ شہر معتقد ہو چلا تھا تو عین وقت پر قاضیٔ شہر ہمارے درمیان آگیا اور امیرِ شہر کو ورغلا کر ہم سے بدظن کر دیا۔

جواب میں بابا فریدؒ نے قاضیٔ شہر کے نام ایک خط لکھا اور اس میں اسے صاف صاف بتا دیا کہ " صابر ہمارے بھیجے ہوئے کلیر کے ولی ہیں، ان کی روحانی امامت تسلیم کرلو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے"

قاضی نے بابا فریدؒ کے خط کو پھاڑ دیا اور ان میں سے ایک ٹکڑے کی پشت پر لکھ دیا "جنابِ والا ! زمانۂ قدیم سے یہاں ہماری امامت چلی آرہی ہے، تمھارے کہنے سے ہم تمھارے خلیفہ کو اپنا امام کس طرح تسلیم کرلیں۔ چنانچہ ان حالات میں تمھارا یہ کہہ دینا کہ صابرؒ کلیر کے امام اور ولی ہیں اور ہم ان کی امامت تسلیم کرلیں ہمارے لیے ہرگز قابلِ قبول نہیں۔"

یہ خط اور بابا فریدؒ کا چاک شدہ فرمان جب حضرت صابرؒ کے پاس پہنچا تو آپ نے نہایت دُکھ سے خط لانے والے سے فرمایا "تم قاضیٔ شہر سے کہنا کہ اگر وہ اس فرمان کو چاک کیے بغیر ہمارے پاس بھیج دیتا تو کیا حرج تھا ؟" حضرت صابرؒ نے چاک کیا ہوا بابا فریدؒ کا خط اور قاضیٔ شہر کا جواب علیم اللہ ابدال کے ذریعے حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں روانہ کردیا۔

جب یہ دونوں چیزیں اجودھن پہنچیں تو آپ نے فوراً ہی ایک اور خط امیرِ شہر کلیر کے نام لکھا۔

" قیام الدین ! اللہ تعالیٰ نے تجھ کو کلیر کا والی، اور مخدوم علی احمد علاء الدین کو اس شہر کا امام مقرر فرمایا ہے پھر یہ کیا بات ہے کہ تم اس کی امامت سے انکار کرتے ہو۔ تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ تم سب مخدوم صابر کی فرماں برداری اختیار کرو اور ہمیشہ اس کے مطیع رہو۔ اگر ایسا نہ کیا تو تم سب حشر تک شرمندہ اور پشیمان رہو گے"

علیم اللہ ابدال نے یہ خط امیرِ شہر کو پہنچا دیا۔ امیرِ شہر نے قاضی سے مشورہ کیا۔ قاضی نے حقارت سے قہقہہ لگایا، بولا۔
"یہ ساری باتیں غلط ہیں، آپ بلاوجہ شکوک اور اوہام میں نہ مبتلا ہوں !"

حاکمِ شہر نے بابا فریدؒ کے اس نامے کو بھی چاک کر دیا اور اس کے پرزے حضرت مخدوم صابرؒ کی خدمت میں بھیج دیے۔ حضرت صابرؒ تلملا گئے آپ نے یہ پھٹا ہوا خط اپنے خط کے ساتھ بابا فرید کی خدمت میں روانہ کر دیا اس میں اپنے غم اور غصّے کا اس طرح اظہار فرمایا تھا۔

"حضرت ! فقیر کو امیرِ شہر کے رویّے سے بے انتہا صدمہ پہنچا ہے، حضورِ انور کو سارے ہی حالات کا بخوبی علم ہے۔ فقیر جذباتی ہے اور یہ بیمار پڑ چکا ہے اگر حضور نے اس بار بھی بے نیازی برتی تو خیال ہے کہ یہ خاکسار شدید بیمار پڑ جائے گا اور علاج مشکل ہو جائے گا ان حالات میں حضور جیسا ارشاد فرمائیں اس پر عمل کیا جائے گا۔"

اس خط نے حضرت بابا فریدؒ کو بھی غضبناک کر دیا۔ آپ نے حضرت مخدوم صابرؒ کو چند سطری خط میں وہ سب لکھ دیا جو صفحوں میں بھی نہ لکھا جا سکتا تھا۔ بابا فریدؒ نے لکھا۔

"عزیزی علی احمد صابر ! بحکم خدائے عز و جل ولایت کلیر تمھاری بکری ہے اور تمھیں اس بات کا پورا پورا اختیار دیا جاتا ہے کہ تم خود اس کا گوشت کھاؤ یا دودھ پیو۔"

حضرت صابرؒ نے بابا فریدؒ کا فرمان آنکھوں سے لگایا اور خوش خوش جمعے کی نماز پڑھنے جامع مسجد میں پہنچ گئے۔ آپ حسبِ سابق ممبر کے قریب جا پہنچے پھر انھیں وہاں سے ہٹنا پڑا اور پھر جو شخص بھی آتا حضرت مخدوم صابرؒ کو ان کی جگہ سے ہٹا دیتا۔ اس طرح ہٹتے ہٹتے آپ مسجد سے باہر نکل گئے۔ لوگ سنتیں پڑھنے میں مشغول تھے اسی دوران امام نے خطبہ شروع کر دیا۔ جب وہ خطبہ پڑھ چکا تو آپ نے جوش میں مسجد کو مخاطب کیا، بولے "مسجد ! لوگ یہاں آتے ہیں اور نماز پڑھ کر چلے جاتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تو نے اس عرصے میں ایک سجدہ بھی ادا نہیں کیا۔ اب ہمارے حکم سے تو بھی نماز پڑھ اور سجدے میں چلی جا۔"

حکم پاتے ہی مسجد کے درودیوار ہلنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بنیادوں سے اکھڑ کر حملہ نمازیوں کو اپنی آغوش میں لے کر بیٹھ گئی۔ گرد و غبار بلند ہو کر آسمان پر پھیل گیا۔ آس پاس کہرام برپا ہو گیا۔ لوگوں کی چیخ پکار سے میدانِ حشر کا سماں طاری تھا۔ زخمیوں کی آہ و بکا اور ذرا دیر بعد جمع ہو جانے والے ان کے اعزا کے شورِ ماتم میں قیامت کا کرب محسوس ہوتا تھا۔ اسی عالم میں حضرت صابرؒ کی عقیدت مند گلزاروی بدحواس اور پریشان حاضر ہوئی اور آپ کے قدموں میں گر کر عرض کیا۔ "حضرت۔ انھی نمازیوں میں آپ کا پرستار بہارالدین بھی تو شامل تھا"

آپ نے علیم اللہ ابدال کو حکم دیا۔ "جا، بہارالدین کو مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے سے نکال لا۔"

علیم اللہ ابدال تلاش کرتا ہوا سیڑھیوں کے نیچے پہنچا۔ مسجد کی سیڑھیوں نے دیوار کے ملبے کو اپنے اوپر روک رکھا تھا اور ان کے نیچے سیڑھیوں کے زیرِ سایہ بہارالدین دبکا پڑا ہوا تھا۔ جب اسے اندر سے نکال کر باہر لایا گیا تو اس کے جسم پر ایک خراش تک نہ آئی تھی۔

بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ آپ کی زبان خدا کی تلوار تھی۔ کلیر کے لوگوں نے آپ کو بڑا دکھ پہنچایا تھا اور بابا فریدؒ کے فرمان اور حکام کی بے عزتی کی تھی۔ نمازیوں کو تباہ و برباد کر چکنے کے بعد آپ کا جلال شہر کلیر پر نازل ہوا۔ پوری آبادی طاعون کی زد میں آ گئی۔ گلٹیاں نکلتیں، بخار چڑھتا اور آدمی رخصت ہو جاتا۔ آناً فاناً آباد اور پُر رونق شہر ویران ہو گیا اور پورے پورے خاندان موت کے شکار ہو گئے۔ میتیں پڑی سڑتی رہیں، انھیں دفن کرنے والا تک میسر نہ آتا۔ کہتے ہیں کہ کلیر کی وہ رونق اور آبادی جو جلالِ صابری سے پہلے پائی جاتی تھی پھر کبھی واپس نہ آئی۔ شاہانِ دہلی نے بڑی کوششیں کیں کہ اسے دوبارہ آباد اور پُر رونق شہر بنا دیا جائے لیکن انھیں اپنے اس مقصد میں ناکامی ہوئی۔

کلیر کی تباہی کے بعد آپ پر کچھ ایسا استغراق طاری ہوا کہ کسی بات کا ہوش نہ رہا، ویرانے میں گولر کے ایک درخت کے نیچے آپ مستقل اقامت گزیں ہو گئے۔ یہیں عالمِ سرمستی میں عبادت فرماتے اور لوگوں سے نفور اور بیزار تنہائی میں شب و روز گزارتے رہے۔ کسی میں اتنی مجال نہ تھی کہ آپ کے پاس جاتا۔ اگر جاتا تو نقصان اٹھاتا۔ لوگ حیران تھے کہ اس ویران اور غیر آباد جگہ پر حضرت صابرؒ کے کھانے پینے کا انتظام کون کرتا ہے؟

بابا فریدؒ ان کی اس کیفیت سے آگاہ تھے۔ جب اس حال میں رہتے ہوئے بارہ سال گزر گئے تو بابا فریدؒ نے اپنے مریدوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "لوگو! کیا تم میں کوئی ایسا بھی ہے جو ہمارے صابر کو ہوش میں لے آئے؟"

شمس الدین ترک پانی پتی نامی بزرگ آگے بڑھے اور بابا فریدؒ کے روبرو دست بستہ کھڑے ہو کر عرض کیا۔ "خادم یہ فرض انجام دینے کو تیار ہے"

بابا فریدؒ نے اس حوصلہ مند شخص کو غور سے دیکھا اور متبسم ہو کر فرمایا "کیا تمھیں اس بات کا یقین ہے کہ تم صابر کو ہوش میں لے آؤ گے؟"

شمس الدین نے مؤدبانہ عرض کیا۔ "اگر حضرت کی دعا، فیضانِ روحانی شاملِ حال رہا تو یہ کام اتنا مشکل بھی نہیں۔" پھر دبے لفظوں سے پوچھا۔ "اگر خادم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو اسے اس کارِ عظیم کا صلہ کیا ملے گا؟"

بابا فریدؒ نے جواب دیا۔ "جو چاہو گے، عطا کر دیا جائے گا۔"

شمس الدین نے کہا "حضرت! خادم اس کے صلے میں حضرت صابرؒ کی خدمت میں حاضر رہنے اور ان کی خدمت گزاری کی سعادت کا خواہش مند ہے!"

بابا فریدؒ نے اجازت دے دی لیکن یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "ذرا ہوشیار اور محتاط رہنا کیونکہ صابر کا جلال تمھارے لیے خطرہ بھی ہے!"

شمس الدین بابا فریدؒ سے رخصت ہو کر حضرت صابرؒ کی بارگاہ میں اس طرح پہنچے کہ درخت کی آڑ میں خود کو چھپائے رکھا۔ اللہ نے شمس الدین کو دلوں کو کھینچ لینے والی خوش الحانی عطا فرمائی تھی۔ انھوں نے درخت کی آڑ میں بیٹھ کر خوش الحانی سے قرآنِ پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ حضرت صابرؒ کا دل کھنچنے لگا اور جلالی کیفیت موم کی طرح پگھل گئی۔ خوشگوار کیفیت طاری ہو گئی۔ آپ نے آنکھیں کھول دیں اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر شمس الدین کو تلاش کیا اور حکم دیا۔ "کون ہو؟ سامنے آؤ!"

شمس الدین نے عرض کیا۔ "حضرت! خادم آپ کے جلال سے خوفزدہ ہے اگر امان عطا ہو تو سامنے آئے!"

آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ڈرنے کی ضرورت نہیں، امان ہے، سامنے آؤ!"

شمس الدین سامنے آ گئے۔ ارشاد ہوا۔ "تلاوت کرو!"

شمس الدین نے تلاوت شروع کردی آپ پر وجدانی کیفیت طاری ہوگئی جب ہوش میں آئے تو خوش ہوکر ارشاد فرمایا "بہت خوب تم نے ہمارا دل خوش کر دیا، بول کیا چاہتا ہے؟"

شمس الدین نے عرض کیا "خادم حضور کی خدمت میں حاضر رہنے کا خواہش مند ہے!"

آپ نے جواب دیا "اجازت ہے لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ ہمارے سامنے ہرگز نہ آنا عقب میں رہ کر گزر بسر کرنا کیونکہ ہمیں خود نہیں معلوم کہ تم ہم سے کب نقصان اٹھا جاؤ!"

شمس الدین نے عقب میں رہنے کی شرط منظور کرلی اور دن رات حضرت صابرؒ کی خدمت میں رہنے لگے۔

ایک دن حضرت صابرؒ نے ان سے پانی طلب کیا۔ انھیں پانی لانے میں کچھ دیر ہوگئی جب وہ پانی لے کر حضرت صابرؒ کے عقب میں پہنچے تو وہ سخت غصے میں تھے، جوش میں فرمایا "شمس! ایک آبخورہ پانی لانے میں اتنی تاخیر؟ کیا تجھے سجھائی نہیں دیتا، اندھا ہوگیا ہے"

شمس الدین نے پانی کا آبخورہ تو حضرت صابرؒ کو دے دیا لیکن خود اندھے ہوگئے۔ انھوں نے رو کر عرض کیا "حضرت! آپ نے اپنے غلام کو اندھا کر دیا مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا"

حضرت صابر نے مڑ کر نابینا شمس کو دیکھا اور سجدے میں گر کر گڑگڑاتے ہوئے عرض کیا۔

" الٰہ العالمین! تو عالم الغیب ہے اور خوب جانتا ہے کہ تیرے اس گناہگار بندے کا یہ شمس الدین ہی دوست اور ساتھی ہے اس کے حال پر رحم فرما"

دعا ختم ہوئی اور شمس الدین کی بصارت واپس آگئی۔

ایک عرصے بعد آپ نے شمس الدین کو دکن چلے جانے کا حکم دیا۔ یہ جانے پر آمادہ نہ تھے لیکن حضرت صابرؒ کا حکم ٹال بھی نہ سکتے تھے، شمس الدین کو شبہ تھا کہ شاید دکن سے واپسی پر حضرت صابرؒ سے ملاقات نہ ہوسکے گی۔ انھوں نے دریافت کیا "حضرت! کیا واپسی پر آپ سے ملاقات ہوگی؟"

جواب ملا "ہاں ہوگی لیکن ہم اس دنیا سے رخصت ہوچکے ہونگے"

شمس الدین نے اضطراب سے سوال کیا "پھر ملاقات کیونکر ہوگی؟"

جواب ملا "ہم جو وعدہ کررہے ہیں وہ پورا ہوگا تمھیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے!"

شمس الدین نے چلتے چلتے سوال کیا "حضرت معلوم نہیں پھر کب، کس طرح اور کن حالات میں شرفِ دیدار حاصل ہو، خادم چاہتا ہے کہ حضرت اسی وقت فنا اور بقا کی بابت کچھ ارشاد فرمادیں"

آپ نے جواب دیا "یہ راز بھی اسی وقت آخری ملاقات میں عیاں ہوگا!"



اس کے بعد شمس الدین دکن چلے گئے۔ ایک مدت میں جب واپس آئے تو حضرت صابرؒ گولر کے درخت کے نیچے موجود نہ تھے، پھر سہمے ہوئے، ملول اور افسردہ حضرت صابرؒ کو تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھے تو دیکھا درخت کے نیچے ایک شیر بیٹھا ہوا ہے، شمس الدین نے شیر کے خوف سے اِدھر اُدھر ہوجانا چاہا لیکن اس سے پہلے شیر خود ہی کہیں چلا گیا۔ یہ درخت کے نیچے پہنچے تو وہاں حضرت صابرؒ کا بے جان جسدِ خاکی پڑا ہوا تھا۔ یہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ویران جگہ، کوسوں آبادی کا پتہ نہ تھا، شمس الدین یہ سوچ کر اور زیادہ آزردہ ہوگئے کہ اتنا بڑا صاحبِ کمال شخص اور اس طرح بے یار و مددگار اس ویرانے میں پڑا ہے اس کی تجہیز و تکفین اور نمازِ جنازہ کا انتظام کس طرح ہوگا، مجبوراً خود ہی نہلایا دھلایا اور قبر کھودی، سوچ رہے تھے کہ خود ہی تنہا نمازِ جنازہ بھی پڑھ دیں گے لیکن اسی وقت کہیں دور سے ایک گھڑ سوار نمودار ہوا، یہ شخص گرد و غبار سے منہ بچانے کے لیے، چہرے پر چادر لپیٹے ہوئے تھا، شمس الدین نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک لیا اور قریب جاکر عرض کیا "جنابِ والا! آپ کو زحمت تو ضرور ہوگی لیکن اس ویرانے میں آپ کے سوا کوئی دوسرا آدمی بھی میسّر نہیں یہ سامنے اس دور کے مشہور بزرگ علاءالدین علی احمد صابرؒ کی میت رکھی ہوئی ہے اس کی نمازِ جنازہ کے لیے چند آدمیوں کی ضرورت ہے۔ اب آپ آگئے ہیں تو براہِ کرم ہمارے ساتھ کھڑے ہوکر نمازِ جنازہ ادا کرادیں"

گھڑ سوار گھوڑے سے نیچے آگیا اور آہستہ آہستہ میت کی طرف بڑھا، قریب پہنچ کر جنازے کو غور سے دیکھا اور شمس الدین سے کہا۔ "جناب میں اِس شرط پر نمازِ جنازہ میں شریک ہوسکتا ہوں کہ امامت میں خود کروں گا!"

شمس الدین کو تامل ہوا لیکن پھر رضامند ہوگئے۔

اس اجنبی نے امامت کی اور شمس الدین مقتدی بنے نماز کے دوران

سب رنگ

شمس الدین کو ایسا محسوس ہوا جیسے آس پاس بے شمار انسان نمازِ جنازہ میں موجود ہیں، سلام پھیرنے کے بعد یہ شبہ حقیقت بن کر سامنے آگیا آس پاس اور پیچھے دور تک انسان ہی انسان نظر آرہے تھے، یہ حیرت سے اجنبی امام کی طرف بڑھے اور دریافت کیا "جناب والا! یہ اتنا بڑا انسانی انبوہ یک بیک کہاں سے آگیا اور خود آپ کون ہیں؟"

اجنبی نے چادر کا ایک کونا چہرے سے سرکا دیا، شمس الدین کے ہوش و حواس جاتے رہے، یہ چہرہ حضرت صابرؒ کا تھا جو اپنے جنازے کی خود ہی امامت فرما چکے تھے۔

حضرت صابرؒ نے کہا "ہمیں یہاں اس لیے حاضر ہونا پڑا کہ ہم نے تم سے آخری ملاقات کا وعدہ کیا تھا" پھر قدرے سکوت کے بعد کہا "تم نے ہم سے فنا اور بقا کی بابت ایک سوال کیا تھا" پھر اپنی میت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ فنا ہے!" اس کے بعد اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ارشاد فرمایا "اور یہ بقا ہے!"

اس کے بعد بعجلت اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گئے اور گرد و غبار اڑاتے ہوئے آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اِدھر سے فراغت پا کر جب اس انبوہ [illegible] پر نظر ڈالی جو نمازِ جنازہ میں شریک ہوا تھا تو اس کا بھی کہیں پتہ نہ تھا۔ حیرت بالائے حیرت۔ آخر آپ جنازے کی طرف رجوع ہوئے کہ ابھی اسے قبر میں اتارنا باقی تھا، میت بھی موجود نہ تھی [illegible] قبر کا منہ بند ہو چکا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے میت ابھی ابھی قبر میں اُتار کر اس پر مٹی جما دی گئی ہو۔

شمس الدین کا بیان [illegible] حضرت صابر کی خدمت میں بیس سال گزارنے کے دوران موسموں کی شدت کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ یہاں سردی، گرمی، بارش اور لو کا کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ کہتے ہیں ایک عرصے بعد حضرت صابرؒ کی قبر کا نشان تک معدوم ہو گیا اور کچھ ہندوؤں نے اس جگہ مندر تعمیر کرنا چاہا۔ ایک پنڈت کام کی نگرانی کر رہا تھا، اسی دوران اسے حضرت صابرؒ کی قبر کے آثار نظر آئے تو اس نے دریافتِ حال کی غرض سے قبر کو کچھ کھود کر اندر جھانکنا شروع کر دیا اس کا خیال تھا اندر شاید دفینہ ہو، لیکن وہ جیسے ہی جھکا پھنس کر رہ گیا، بعد میں حضرت صابرؒ کے چند عقیدت مندوں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت صابرؒ فرما رہے ہیں کہ "جلد از جلد ہماری قبر تک پہنچو ایک پنڈت ہمارے مزار کو کھودنا چاہتا ہے ہم نے اسے پکڑ لیا ہے"

جب وہ عقیدت مند آپ کے مزار پر پہنچے تو پنڈت مر چکا تھا، اُس کی لاش کو کھینچ کر باہر نکالا گیا اُس کی شکل کسی جانور کے مشابہ ہو چکی تھی۔

کہتے ہیں کہ عرصے تک حضرت صابرؒ کے مزار پر جلال کی یہ کیفیت رہی کہ لوگ اس کے پاس جاتے ہوئے گھبراتے تھے اور اگر کوئی شامت کا مارا وہاں تک چلا بھی جاتا تھا تو جان گنوا بیٹھتا تھا یا کوئی دوسرا بڑا نقصان اٹھا کر واپس آتا تھا۔

آخر ایک مدت بعد ایک دوسرے بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ حضرت صابرؒ کے مزار پر تشریف لے جانے لگے تو انھیں بھی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بغیر بادلوں کے بجلیاں کوندنے لگیں۔ حضرت گنگوہیؒ نے رقت سے عرض کیا "حضرت! اب تو اپنے جلال میں کمی فرمائیں، لوگوں نے اس جلال کی وجہ سے جیتے جی آپ سے دوری اختیار کی تھی اور اب وصال کے بعد بھی پاس نہیں آسکتے! اب بندگانِ خدا پر اپنے جمال کا اظہار فرمائیں تاکہ آپ کے مزار پر لوگ حاضری دے سکیں!"

حضرت گنگوہیؒ مزار تک پہنچ گئے اور کسی قسم کے بھی نقصان یا آزار سے محفوظ رہے رات کو انھوں نے خواب میں دیکھا حضرت صابرؒ نے ان سے فرمایا "عبدالقدوس سن! ہم نے تیری استدعا پر اپنے جلال میں کمی کر دی ہے اور اپنے جمال کا نزول فرما رہے ہیں، اب لوگ ہمارے مزار پر حاضری دے سکتے ہیں"

حضرت علاء الدین علی احمد ۱۹ ربیع الاول ۵۹۲ھ کو ہرات میں پیدا ہوئے تھے اور ربیع الاول ہی کی ۱۳ تاریخ کو ۶۹۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت غوثِ اعظم سید عبدالقادر جیلانیؒ سے تعلق رکھتا ہے۔

آپ کے جلال سے کلیر کی جو حالت ہوئی اس کو پیش نظر رکھ کر جب جمال ہانسویؒ کے اس قول پر غور کیا جاتا ہے کہ "اہلِ دہلی آپ کی گرم مزاجی کے ہرگز متحمل نہ ہو سکیں گے!" تو جمال ہانسوی کا شکر گزار ہونا پڑتا ہے کہ اگر انھوں نے حضرت صابرؒ کے حق میں جاری کیے ہوئے بابا فرید کے فرمانِ قطبیت چاک کیا ہوتا اور اس پر اپنی مہر لگا دیتے تو آج دہلی کی کیا حالت ہوتی"



میری معلومات کا تعلق ہے، کسی ذہنی صدمے کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ جانچنے کا کوئی ذریعہ ہے کہ اس صدمے کا معاوضہ کتنا ہونا چاہیے۔ درخواست دہندہ اس وقت بھی عدالت میں موجود ہے اور خاصا ہشاش بشاش دکھائی دیتا ہے۔ کم از کم مجھے اُس کی ذہنی یا جسمانی صلاحیتوں میں کسی نوع کی کمی دکھائی نہیں دیتی۔ لہٰذا ذہنی نقصان کا ہرجانہ، جس کا تخمینہ درخواست دہندہ نے دس ہزار روپے لگایا ہے، خارج از بحث ہے۔

اب میں اصل ہرجانہ کے دعوے کی طرف آتا ہوں۔ جناب عالی! جیسا کہ آپ ابھی سن چکے ہیں اور جیسا کہ میں شواہد سے ثابت کر چکا ہوں اور جیسا کہ درخواست دہندہ بھی متفق ہے کہ اصل ہرجانہ پانچ ہزار دو سو روپے بنتا ہے۔ میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ درخواست دہندہ نے اپنی درخواست میں ہرجانہ طلب کیا ہے، جرمانہ نہیں۔ اور جیسا کہ انشورنس کمپنی کا سرویئر اس بات کا اظہار کر چکا ہے اور موٹر کمپنی کا منیجر اس کی تصدیق کر چکا ہے کہ درخواست دہندہ ہرجانے کی مد میں مبلغ آٹھ ہزار روپے وصول کر چکا ہے۔ چونکہ درخواست دہندہ کا کلیم ہرجانے کا تھا، نہ کہ جرمانے کا، لہٰذا یہ بات ثابت شدہ ہے کہ وہ ہرجانہ وصول کر چکا ہے۔ اور چونکہ وہ ہرجانہ وصول کر چکا ہے... بلکہ اصل نقصان سے زیادہ وصول کر چکا ہے۔ لہٰذا مزید ہرجانے کا دعویٰ باطل قرار پاتا ہے۔ ہاں، اگر انشورنس کمپنی مناسب سمجھے تو حادثے کی ذمہ دار خاتون پر ہرجانے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا نہیں کریں گے۔

"جناب عالی! میری مؤکلہ ایک یتیم لڑکی ہے اور اس کی کوئی ذاتی آمدنی نہیں۔ اس کا کوئی بھائی یا چچا وغیرہ بھی نہیں ہے۔ اُس کی بیوہ ماں نہایت مشکل حالات میں اپنی دو بیٹیوں کی پرورش کر رہی ہے۔ میں ان حالات کا ذکر کر کے موصوفہ کی عزت نفس کو مجروح نہیں کرنا چاہتا۔ جناب عالی! میری مؤکلہ کالج کی طالبہ ہے اور اپنے ایک عزیز کی کار میں.... کالج آتی جاتی ہے۔ ایکسیڈنٹ اسی کار کا ہوا تھا۔ میری مؤکلہ پچیس ہزار تو کجا پچیس سو روپے بھی ادا نہیں کر سکتی۔ ٹریفک کے چالان میں اُسے پانچ سو روپے جرمانہ ہو چکا ہے جسے اُس نے اپنے جہیز کا کچھ زیور فروخت کر کے ادا کیا ہے۔ اُس کے مقابلے میں درخواست دہندہ ایک اعلیٰ سرکاری افسر ہے۔ اور مضبوط مالی حیثیت کا مالک ہے۔ مزید برآں وہ ہرجانے سے زیادہ رقم بھی وصول کر چکا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ یتیم لڑکی کا خیال کرتے ہوئے خود ہی اس دعوے سے دستبردار ہو جاتا۔ لیکن افسوس کہ اُس نے ایسا نہیں کیا۔ لہٰذا میں فاضل عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس مقدمے کو خارج کر دے۔"

ان دلائل کی روشنی میں عدالت نے چند منٹوں میں فیصلہ سنا دیا۔ یعنی دعویٰ خارج کر دیا۔

میں نے عدالت سے فیصلے کی نقل حاصل کی اور سیدھا ملکہ بانو کے گھر پہنچ گیا۔ وہ ماں بیٹی میرا انتظار ہی کر رہی تھیں۔ شہزادی نے ٹٹولنے والی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ بولی۔ "آپ کچھ خوش نظر آ رہے ہیں۔ کیا فیصلہ ہوا؟"

میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مٹھائی اور ساڑھے سات ہزار روپے کا انتظام کر لو۔ ہم مقدمہ جیت گئے ہیں۔"

"سچ؟" وہ خوشی سے اچھل پڑی۔

"ہاں، جج نے مقدمہ خارج کر دیا ہے۔" میں نے کہا اور مختصر الفاظ میں تفصیل بیان کر دی۔

ملکہ بانو اندر گئی اور نوٹوں کی ایک گڈی نکال لائی۔ "ماجد بیٹا! اس وقت میرے پاس صرف چار ہزار روپے ہیں۔ فی الحال یہ رکھ لو، باقی رقم چند روز تک ادا کر دوں گی۔"

میں نے اپنی فیس کی رقم نکال کر باقی پیسے واپس کر دیے اور کہا۔ "اس رقم پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔ اسے واپس رکھ لیں۔"

شہزادی نے تشکر آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ بولی۔ "حق تو ہے آپ کا۔ ہم شرط ہار چکے ہیں۔"

"شرط میں نے صرف اس لیے لگائی تھی کہ آپ ہرجانہ ادا کرنے سے باز رہیں۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ مجھے یقین تھا کہ کیس کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا۔"

"اچھا کچھ پیسے انعام کے طور پر رکھ لیں۔"

"آپ کی خوشی میرا سب سے بڑا انعام ہے۔"

"اچھا... تو پھر ایسا کریں کہ کل رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔" شہزادی نے کہا۔ "ایسا لذیذ کھانا پکاؤں گی کہ آپ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔ اور... بھابی کو بھی ساتھ لائیں۔"

"تو پھر چند سال ٹھہر جائیں۔"

"کیوں؟"

"ابھی میں نے تمہاری بھابی کی تلاش کا سلسلہ شروع نہیں کیا۔"

اگلی رات کا کھانا واقعی لذیذ تھا۔ آج تک یاد ہے۔



عمرو بن عثمان مکی

ضیاء تسنیم بلگرامی

انا الحق کے دعوے دار حسین بن منصور کے پیر مرشد عمرو بن عثمان مکی۔ آپ صوفی تھے لیکن صوفیوں کی غیر شرعی باتوں کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ آپ کے پاس صوفی کو پرکھنے کے دو معیار تھے۔ ایک تو قرآن پاک دوسرا رسولِ مقبول کی سنت جو ان دو معیار پر پورا نہیں اترتا تھا آپ اسے رد کر دیتے تھے۔ ابنِ منصور کو اس وجہ سے اپنے حلقۂ درس و تصوف سے نکال باہر کیا کہ ان کی گستاخانہ باتیں آپ کو بالکل پسند نہ تھیں۔ آپ کے زہد و تقویٰ کا یہ حال تھا کہ آپ کو پیرِ حرم کہا جاتا تھا۔ مشہورِ زمانہ صوفیوں کے ہم عصر اور حضرت جنید بغدادی کے دوست۔ آپ علم حدیث و فقہ کے ماہر تھے۔ باتوں میں اسرار و رموز کی زیادتی نے مکے والوں کو آپ کے خلاف کر دیا اور آپ کو مکہ چھوڑنا پڑا لیکن انہیں حرم پاک سے انتہائی محبت تھی اور مکہ کو کسی حال میں بھی چھوڑنا پسند نہیں فرماتے تھے آپ پیدا ہوئے یمن میں سکونت اختیار کی مکہ میں بغداد اور اصفہان میں وقت گزارا اور بغداد ہی میں وصال فرمایا اور اسی شہر میں آپ کی آخری آرام گاہ ہے مگر زبان زدِ خاص و عام مکی ہیں۔ یہ عشقِ صادق کی معراج ہے۔

آپ یمن میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اور پھر اپنے عہد کے مروجہ علوم کس سے حاصل کیے، کچھ پتا نہیں چلتا لیکن آپ نے جو علوم حاصل کیے تھے اور آپ کو ان سے جتنی فہم اور ادراک حاصل ہوا تھا اس سے آپ فقیہ اور محدث قرار پائے۔ یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب بغداد میں حضرتِ معروف کرخی، سری سقطی، ابو عبداللہ الحارث محاسبی، محمد القصاب جیسے نامی گرامی صوفی اپنے اثرات چھوڑ چکے تھے اور جنید بغدادی مسندِ تصوف پر تشریف فرما ہو چکے تھے۔ ان سے پہلے خواجہ حسن بصری، رابعہ بصری، فضیل بن عیاض وغیرہ اپنی شاندار تصوفانہ زندگی سے ایک زمانے کو متاثر کر چکے تھے، عمرو بن عثمان نے ان سب کا مطالعہ کیا تھا اور اس مطالعے نے ان کی روح کو مضطرب اور بے چین کر کے رکھ دیا تھا۔

ان کے کانوں میں بہت سی آوازیں گونج رہی تھیں۔ معروف کرخی کی یہ آواز "خدا کے اولیا کی تین نشانیاں ہوتی ہیں، ان کا خیال خدا کے حضور میں رہتا ہے، ان کا رہن سہن خدا کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کا سارا کاروبار بھی خدا ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔"

اس آواز کے ساتھ ہی دوسرے صوفی سلیمان دارانی کی آواز سنائی دی "جب عارف کی روحانی آنکھ کھل جاتی ہے تو اس کی جسمانی آنکھ بند ہو جاتی ہے اور وہ ذاتِ حق کے سوا کسی چیز کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

کہیں دور سے ذوالنون مصری کی آواز سنائی دے رہی تھی "خدا کی معرفت وجد سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ جو خدا کی سب سے زیادہ معرفت رکھتا ہے، وہی ہے جو اس میں سب سے زیادہ گم ہے۔"

یہ دنیا ہی دوسری تھی۔ تصوف کی دنیا، سوز اور کرب کی دنیا، عشق اور تڑپ کی دنیا۔ جن لوگوں نے اس سمندر کی غواصی کی تھی، ان کی باتیں، ان کے تجربے اور ان کے تجزیے انوکھے اور عجیب تھے۔ ان کے ہاں گناہ کا تصور بہت عجیب تھا۔ معروف کرخی نے لوگوں کو بتایا تھا کہ گناہ کرنے والے سے میل جول رکھنا گناہ پر راضی ہونے کے برابر ہے اور گناہ پر راضی ہونا گناہ کرنے کے برابر ہے۔

یہی معروف کرخی لوگوں کو بتا چکے تھے کہ کسی کا برا چاہنے والا ہمیشہ خود مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے۔

جب معروف کرخی سے پوچھا گیا کہ صبر کیا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا تھا۔ "ایک ایسی چیز جس کا اوّل تلخ اور آخر شیریں ہے۔"

عمرو بن عثمان جب یہ چیزیں پڑھ رہے تھے تو انھیں یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہوا میں پرواز کر رہے ہیں اور بہت ہلکے ہو چکے ہیں۔

اس مطالعے کے دوران وہ رابعہ بصری کی تیز و تند باتوں کے اثرات اپنے دل و دماغ پر یکساں محسوس کرتے رہے۔ انھوں نے دورانِ مطالعہ سفیان ثوری اور رابعہ بصری کے پُراثر مکالمے پڑھے تو ان کا دل تڑپ گیا ــــ سفیان ثوری نے رابعہ بصری کی موجودگی میں آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "خدایا مجھ سے راضی ہوجا۔"

اس پر رابعہ بصری نے تند و تیز لہجے میں کہا "کیا تجھے اس خدا سے رضامندی طلب کرتے ہوئے شرم نہیں آتی، جس سے تو خود راضی نہیں ہے؟"

اس سلسلے میں رابعہ بصری کا ایک اور واقعہ عمرو بن عثمان کے پورے وجود کو ہلا دینے کے لیے کافی تھا، اس واقعہ میں عشقِ الٰہی اپنی معراج کو پہنچا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک رات رابعہ بصری نے خواب میں رسول اللہؐ کو دیکھا۔ آپؐ نے پوچھا "کیوں رابعہ! کیا تم مجھ سے محبت رکھتی ہو؟"

رابعہ بصری نے جواب دیا "یا رسول اللہ! کون ہے جو آپ سے محبت نہیں رکھے گا لیکن بخدا اللہ تعالیٰ کی محبت نے مجھے اپنے اندر اتنا جذب کر لیا ہے کہ میرے دل میں نہ کسی دوسرے سے محبت کرنے کی گنجائش باقی رہ گئی ہے نہ کسی سے نفرت کرنے کی۔"

ان اقوال اور واقعات نے ابنِ عثمان کے دل میں ایک آگ سی لگا دی تھی اور وہ اس میں بُری طرح پھنکے جا رہے تھے۔ ان دنوں بغداد تصوّف کا گہوارہ تھا، انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ بغداد جائیں گے اور وہاں تصوّف کے جادے پر فی الفور قدم رکھ دیں گے۔

عمرو بن عثمان نے یمن چھوڑ دیا اور مکّے کی سکونت اختیار کر لی۔ مکہ کئی اعتبار سے انتہائی اہم شہر ہے، یہاں خدا کا گھر ہے اور اس کے گلی کوچوں میں رسول مقبولؐ نے اپنی زندگی کے ترپن سال گزارے تھے۔ آپ جب کسی راستے سے گزرتے تو ہمیشہ آپ کے ذہن میں یہی ہوتا کہ کبھی رسول اللہؐ کے پائے اقدس بھی کہیں نہ کہیں پڑے ضرور ہوں گے۔

وہ ایک عرصے تک مکّے میں رہے اور جب بھی کوئی بات ہوتی، وہ اس بات کو ظاہر اور باطن دونوں ہی سے حل کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگتے۔

کچھ دنوں بعد انھیں احساس ہو گیا کہ کسی کی مدد کے بغیر تصوّف کی کٹھن اور پُرپیچ راہ پر چلنا بہت دشوار ہے۔

اب آپ نے بغداد کا قصد کیا۔ بغداد میں نہ صرف یہ کہ جنید بغدادی سید الطائفہ موجود تھے بلکہ اس شہر میں دور دور سے صوفیائے کرام پہنچتے رہتے تھے۔ ان کی آپس میں بات چیت ہوتی رہتی تھی جس سے بڑے کام کی باتیں علم میں آتی رہتی تھیں۔

آپ بغداد روانہ ہو گئے۔ بغداد میں آپ کی ملاقاتیں کئی صوفیا سے ہوئیں۔ ان میں سعید حزاز اور ابوعبداللہ سعید بن زید نباجی کے نام نامی زیادہ مشہور ہیں۔ نباجی کی مجلس میں پہنچے اور ان کے ارادت مندوں میں یوں گھل مل گئے کہ انھیں الگ سے نہیں جانا جا سکتا تھا۔ نباجی نے اپنے ارادت مندوں سے پوچھا "کیا تمھیں معلوم ہے کہ آج ایک فقیہہ اور ذی علم بھی ہماری مجلس میں موجود ہے؟"

ہر شخص اپنے پاس بیٹھے ہوئے آدمی کو دیکھنے لگا۔ کسی ارادت مند نے پوچھا "کیا وہ فقیہہ اور ذی علم کوئی اہم انسان ہے؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں وہ بہت اہم انسان ہے۔ جب کوئی عالم اور فقیہہ تصوّف کی راہ میں قدم رکھے گا تو اس کی شان ہی کچھ اور ہوگی۔"

کچھ دیر بعد حضرت نباجی نے فرمایا "او یمنی فقیہہ! سامنے آ، لوگوں میں کیوں بیٹھ گیا۔"

عمرو بن عثمان، نباجی کی خدمت میں پہنچ گئے، کہا "میں اجازت کے بغیر کس طرح حاضر ہو سکتا تھا، آپ کا کرم جو مجھے یاد فرمایا اور حاضری کی اجازت مرحمت فرمائی۔"

حضرت نباجی نے فرمایا "الادب حلیۃ الابرار" (ادب نیکوں کا زیور ہے)

ابنِ عثمان ان کے سامنے سر جھکا کے بیٹھ گئے۔ حضرت نباجی فرماتے رہے "ابنِ عثمان! کیا تم نے یہاں آنے سے پہلے اس پر غور کیا کہ اب جس راستے کا تم نے انتخاب کیا ہے، وہ آسان نہیں ہے اور یہ بڑی سنگلاخ اور خار دار وادی ہے۔ سب کچھ کھونے کے بعد تمھیں کیا ملے گا؟ کبھی اس پر بھی غور کیا؟"

انھوں نے جواب دیا "حضرت! میں نے خوب غور و خوض کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔"

حضرت نباجی نے انھیں اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دی اور فرمایا "عمرو! یہ یاد رہے کہ دنیا تمھیں اپنی جملہ

رعنائیوں اور دلکشیوں کے ساتھ اپنی طرف راغب اور متوجہ کرنے کی کوشش کرے گی۔"

انھوں نے جواب دیا: "لیکن میں اپنی رغبت اور توجہ کو ماسوا اللہ ہلاک کر دوں گا۔"

حضرت نباجی نے کہا: "تمھارا علم تمھیں سوچنے اور اپنے بھلے بُرے پر غور کرنے کی دعوت دے گا۔ دین کی دشواریاں تمھیں عاجز اور پریشان کر دیں گی اور دنیا کی تن آسانیاں اور تعیشات تم پر کمندیں پھینکیں گی، اس وقت تم کیا کرو گے؟"

انھوں نے جواب دیا: "جب میں تصوف کے آداب سے واقف ہو جاؤں گا تو میں کسی بھی چیز سے خوف نہیں کھاؤں گا اور نہ ہی دنیا اور اہلِ دنیا مجھے ورغلانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔"

حضرت نباجی نے جواب میں فرمایا: "لِکُلِّ شَیٍٔ خَادِمٌ وَخَادِمُ الدین الادب" (ہر شے کا خادم ہوا کرتا ہے اور دین کا خادم ادب ہے)

ابنِ عثمان کے دل و دماغ حضرت نباجی کی باتوں میں نشہ سا محسوس کر رہے تھے۔ وہ سرشار ہوئے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے درخواست کی: "پیر مرشد! آپ مجھے روشنی عطا فرمائیں۔ میں اپنے دل کی آنکھوں سے وہ نشانیاں دیکھنا چاہتا ہوں جو دل اور دماغ کو اعلیٰ و ارفع روشنی عطا فرمائیں۔"

حضرت نباجی نے جواب دیا: "ابنِ عثمان! اللہ سے امید رکھو اور اس پر تکیہ کرو کہ کوئی نشان اس سے بڑھ کر روشن نہیں۔"

اب فیصلہ ہو چکا تھا۔ ابنِ عثمان نے حضرت نباجی کی خدمت میں رہنا شروع کر دیا۔ یہاں ہر روز عشا کے بعد ارادت مند جمع ہو جاتے اور آپ ان کے سامنے تصوف اور معرفت کے دریا بہا دیتے۔ حضرت نباجی کی باتوں میں بڑا اثر تھا اور ان کی صحبت میں بلا کی کشش اور جاذبیت تھی۔ جو بھی ان کے پاس کچھ وقت گزار کے چند باتیں سن لیتا، وہ وہیں کا ہو کے رہ جاتا۔

ابنِ عثمان کافی دنوں تک ان کی خدمت میں رہے اور مجاہدے اور مراقبے کی تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے۔ ایک دن فجر کی نماز کے بعد مریدوں نے اپنے پیر مرشد حضرت نباجی کو کہیں جانے کے لیے تیار دیکھا اور کسی بھی مرید کو جو اس وقت وہاں موجود تھے، یہ نہیں معلوم تھا کہ حضرت نباجی جا کہاں رہے ہیں؟

ابنِ عثمان بھی یہ سب دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے پیر مرشد سے پوچھا: "حضرت! اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔"

حضرت نباجی نے جواب دیا: "چلو، مجھے کوئی اعتراض نہیں، میں تمھیں ان سے ملانا بھی چاہتا ہوں۔"

ابنِ عثمان اپنے پیر مرشد کے ساتھ روانہ ہو گئے، سناروں کے محلے کے اس پار حضرت نباجی ایک مکان میں داخل ہو گئے۔ یہاں بھی کچھ لوگ جمع تھے جو ایک بزرگ کے سامنے ادب سے بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت نباجی نے ان بزرگ سے ابنِ عثمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "سعید! یہ عمرو بن عثمان ہیں۔ میں ان کے پُرسوز قلب اور بے پایاں علم کی بڑی قدر کرتا ہوں آپ انھیں اجازت دیں کہ یہ جب چاہیں یہاں حاضری دیتے رہیں۔ اس جوان میں جوہرِ قابل کی کوئی کمی نہیں بس ذرا نظرِ فیض، اثر اور توجہ کی ضرورت ہے۔"

یہ ابوسعید کی خانقاہ تھی۔ اپنے وقت کے جید ترین صوفی جنید بغدادی بھی ان کے مداح اور ارادت مند تھے۔ ابنِ عثمان نے یہاں کشش محسوس کی، جتنی دیر بیٹھے سکون محسوس کرتے رہے۔ اب ابنِ عثمان کو دو جگہیں حاصل ہو گئی تھیں۔ آپ یہاں اکثر آ جایا کرتے تھے۔ یہاں دوسرے صوفیوں سے بھی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ کبھی کبھی جنید بغدادی بھی آ جایا کرتے تھے۔

ابوسعید کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے سے انھیں بڑی کام کی باتیں معلوم ہوئیں، ایک دن انھوں نے ابنِ عثمان کو مخاطب کر کے کہا: "اے ابنِ عثمان! اہلِ معرفت کے لیے کیا ضروری ہے؟"

ابنِ عثمان نے جواب دیا: "ایسے ہی سوالات کے جوابات حاصل کرنے یہاں آتا ہوں۔"

ابوسعید نے کہا: "اہلِ معرفت خدا کے سوا کسی کو بھی نہیں دیکھتے اور نہ کسی سے محوِ گفتگو ہوتے ہیں اور نہ خدا کے سوا کسی کے ساتھ مشغولیت اختیار کرتے ہیں۔"

ایک دن ابنِ عثمان، ابوسعید کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا کہ آپ موزے سی رہے ہیں، پھر کبھی اور دن جوتے سیتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان کی مجلس میں کسی نے دبی زبان میں جنید بغدادی سے پوچھا: "ابوسعید کو اکثر چمڑے کی چیزیں سیتے دیکھا جاتا ہے۔ کیا اس حال میں یہ اپنے رب سے غافل نہیں ہو جاتے ہیں؟"

جنید بغدادی نے جواب دیا "نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ ابوسعید خراز تو ہیں (خراز یعنی چمڑے کی چیزیں سینے والے) مگر ان کا ایک ٹانکا بھی انھیں یادِ الٰہی سے غافل نہیں کر سکتا۔ وہ ہر وقت یادِ الٰہی میں گم رہتے ہیں۔"

آپ نے ابوسعید خراز کی صحبت میں آنے جانے کے ساتھ ہی جنید بغدادی کی صحبت میں بھی آنا جانا شروع کر دیا۔ جنید بغدادی ان کے علم و فضل کے قائل تھے۔ آپ کو صوفیائے کرام کی جو باتیں اچھی لگتی تھیں، قبول کر لیتے تھے مگر وہ سنتِ رسولؐ کے بے حد قائل تھے اور آپ ہر اس چیز کو رد کر دیتے تھے جو رسول اللہؐ کی زندگی اور قول سے مناسبت نہ رکھتی ہو۔ جنید بغدادی نے ان کے رجحان کو سمجھتے ہوئے ایک بار کہا "عمرو! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم آخر کار خلافت کی طرف سے پیش کردہ کوئی خدمت قبول کر لو گے؟"

عمرو بن عثمان نے جواب دیا "حضرت! میرے خیال میں اس میں کوئی ہرج بھی نہیں، کیونکہ گوشے میں بیٹھ کے پوری دنیا سے قطع تعلق کر لینا سنتِ نبویؐ کے خلاف ہے اور میں اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں پاتا کہ رسول اللہؐ کی سنت کے خلاف کچھ کروں۔"

جنید بغدادی نے فرمایا "لیکن یہ زمانہ کچھ اور ہے۔ ہر طرف مکر و فریب اور ریاکاری کا دور دورہ ہے۔ اس لیے اہلِ تصوف کو چاہیے کہ وہ دنیا سے دور رہیں۔"

ابنِ عثمان نے جواب دیا "زمانہ کوئی بھی ہو، مکر و فریب اور ریاکاری سے پاک نہیں ہوگا۔ پھر ہم اس سے محفوظ کیوں کر رہ سکتے ہیں؟"

جنید بغدادی نے گفتگو کا سلسلہ ہی موقوف کر دیا۔ بس اتنا ہی دونوں کے لیے کافی تھا۔

آپ نے جنید بغدادی کی محفل میں سب سے اہم بات یہ محسوس کی تھی کہ یہاں حال اور قال دونوں ہی مل جاتے تھے۔ یہاں تصوف بھی تھا اور علوم بھی، ظاہری علوم بھی باطنی علوم بھی۔ آپ یہاں کی گفتگو میں خود بھی شریک ہو جاتے تھے۔ سورۂ فاطر کا یہ حصہ موضوعِ گفتگو تھا۔ اِنَّمَا یَخشَی اللّٰہَ مِن عِبَادِہِ العُلَمٰٓؤُا "اللہ کے بندوں میں سے اس سے ڈرنے والے تو اہلِ علم ہی ہوتے ہیں۔"

آپ نے جنید بغدادی سے پوچھا "آپ اس کی تشریح اور تفسیر میں کیا فرمائیں گے؟"

جنید بغدادی نے جواب دیا "ایک تو عارف باللہ ہوتا ہے اور دوسرا عالم باللہ۔ مسلمانوں کے درمیان جب ایک ایسا شخص دیکھا جائے جو خدا کی حمد و ثنا بیان کر رہا ہے، اس کی تسبیح و تکریم میں منہمک ہے۔ اللہ سے خوف زدہ بھی رہتا ہے اور اس سے امیدیں بھی وابستہ رکھتا ہے، اس کی جستجو کرتا ہے اور اس کے لیے سراپا شوق بھی بنا رہتا ہے۔ نیک عمل کرتا ہے، آنسو بہاتا ہے اور اپنے گناہوں پر نادم رہتا ہے۔ نہایت عجز و انکسار کے ساتھ اللہ کا تقرب چاہتا ہے تو اس شخص کی بابت یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی جو معرفت حاصل ہے، وہ ایک عام آدمی کی معرفت سے بہت بلند اور عالی مرتبہ ہے۔"

ابنِ عثمان نے اس میں اتنا اضافہ کر دیا "لیکن انسان کا محض عارف یا عالم ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ اس کا باعمل ہونا بھی ضروری ہے محض عالم ہونا کافی نہیں ہوتا۔"

جنیدؒ نے ناگواری سے کہا "ابنِ عثمان! اگر تم چاہو تو دنیا کو ترک کر کے عارف باللہ کا مقام حاصل کر لو، ورنہ عالم باللہ تو کہلاؤ گے ہی۔"

ابنِ عثمان نے جواب دیا "شیخ! میں انسانی جبلّت سے آزادی حاصل نہیں کر سکتا، انسان جو کھاتا پیتا ہے، محبت کرتا ہے، نفرت کرتا ہے، رشک میں مبتلا ہو جاتا ہے، حسد کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ انسان ان جبلّی خصوصیات و اوصاف سے کس طرح کنارہ کش ہو سکتا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ بُری جبلّت کو اچھائیوں میں دبا دوں لیکن انھیں یکسر ختم کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ کیا کھانا پینا ترک کر کے انسان کچھ کر سکتا ہے۔ کھانا پینا اعتدال میں تو رکھا جا سکتا ہے لیکن اس کو یکسر ترک نہیں کیا جا سکتا۔ جسم کی بقا کا انحصار غذا اور پانی پر ہے۔ ان کے بغیر کوئی معرفت حاصل نہیں کی جا سکتی اور جب انسان کھائے پیے گا تو اس کے لیے کام بھی کرنا پڑے گا اور جب انسان کام کرے گا تو اس کو دنیا میں دنیا کے ساتھ رہنا بھی پڑے گا۔ پھر تصوف میں ترکِ دنیا کا اسلام کی رو سے کیا مقام رہ جاتا ہے۔"

جنید بغدادی نے جواب دیا "میں ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دیتا، میں جانتا ہوں کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کو ترک کر دینا بہت دشوار عمل ہے۔ دریا میں کودنا اور بھیگنے سے محفوظ رہنا

ناممکن ہے ؟"

آپ نے اس گفتگو کی روشنی میں محسوس کیا کہ جنید بغدادی کی صحبت میں زیادہ وقت نہیں گزارا جاسکتا۔ کیونکہ دونوں کے اندازِ فکر میں فاصلہ تھا۔ آپ نے بغداد کو چھوڑ دیا اور اصفہان چلے گئے۔ اب آپ محض جستجو میں تھے۔ آپ ذاتی طور پر یہ کوشش کر رہے تھے کہ دنیا کو ترک کر کے کیا پاتے ہیں اور کیا کھوتے ہیں۔ آپ نے اپنے اردگرد تارک الدنیا صوفیوں کو دیکھا تھا۔ اللہ کی یاد میں ڈوبے ہوئے، اللہ کی یاد کے سوا ہر چیز کو چھوڑے ہوئے لوگ، ان کے آس پاس ان کے ارادت مندوں کا ہجوم رہتا اور یہ خود مجاہدے اور وعظ و تلقین میں مشغول نظر آتے۔

آپ کو اس دوران ایک کتاب میسر آگئی، اس کتاب کا نام تھا گنج نامہ۔ اس کتاب نے آپ کو بہت متاثر کیا۔ اس کے معنی و مفاہیم نے آپ کے اندر ایک انقلاب برپا کر دیا۔ یہ گنج نامہ آپ کی جائے نماز کے نیچے ہر وقت موجود رہتا اور آپ اس کا مستقل مطالعہ فرماتے رہتے۔

گنج نامہ میں لکھا تھا۔ "ہم نے آدم کی تخلیق کے بعد فرشتوں کو سجدے کا حکم دیا، ابلیس کے سوا سبھی نے سجدہ کیا، فرشتوں نے آدمؑ کو اس لیے سجدہ کیا تھا کہ وہ تخلیقِ آدمؑ کے راز سے واقف نہیں تھے لیکن ابلیس اس اسرار سے واقف تھا۔ اس لیے اس نے سجدے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف آدمؑ بھی ابلیس کے سجدہ نہ کرنے کے بھید سے جتنے واقف تھے، دوسرا واقف نہیں تھا۔ ابلیس کو مردودِ بارگاہ کرنے کی یہی وجہ تھی۔ پھر ہم نے کہا کہ زمین کے اندر ہم نے ایک ایسا خزانہ پوشیدہ کر دیا ہے کہ جو بھی اس سے واقفیت حاصل کرنا چاہے گا اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔"

ابلیس نے کہا۔ "مجھ کو جو خزانہ عطا کیا گیا ہے، اس کے بعد مجھے کسی اور خزانے کی ضرورت نہیں۔"

اسے بتایا گیا۔ "لیکن یہ خزانہ تیرے خزانے سے کہیں زیادہ بڑا اور عظیم ہے۔"

ابلیس نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں کوشش کروں گا کہ مجھے اس خزانے کا علم بھی حاصل ہو جائے اور اگر میں نے

Scanned with CamScanner

یہ علم حاصل کر لیا تو اسے عام کر دوں گا۔ سب کو بتا دوں گا۔"
جواب دیا گیا۔ "تجھ کو مہلت اور اجازت دی جاتی ہے۔ ہمارے بندے تجھ کو جھوٹا کہیں گے اور جھوٹا ہی سمجھیں گے۔ وہ کہیں گے کہ ابلیس ایک ایسا جن تھا جس نے اللہ کا حکم نہیں مانا اور جب ان کے دلوں میں یہ یقین پکا ہو چکا ہوگا تو وہ تیری کسی بات کو بھی سچ نہیں سمجھیں گے۔"
اس گنج نامہ میں ایک دوسری جگہ لکھا تھا۔
"اللہ نے دل کو روح سے سات ہزار سال قبل تخلیق کیا اور اسے محبت کے باغ میں رکھا۔ دماغ کو روح سے ایک ہزار سال قبل تخلیق کیا اور اسے مقامِ وصل میں ٹھہرایا۔ یہاں اس پر ہر روز تین سو ساٹھ بار نظریں ڈالی جاتیں پھر کلماتِ محبت سے ارواح کو واقف کرایا گیا۔ اس کے بعد دل پر تین سو ساٹھ لطائف وارد کیے گئے اور دماغ پر تین سو ساٹھ بار کشفِ جمال کی تجلیات ڈالی گئیں۔ اس کے بعد جب دوسری مخلوق پر نظریں ڈالی گئیں تو آدم سے برتر کسی کو بھی نہ پایا گیا۔ اس کے بعد اللہ نے امتحان کے طور پر دماغ کو روح میں، روح کو دل میں اور دل کو اجسام میں قید کر دیا۔ نبیوں کو ہدایت کے لیے بھیجا گیا اور جب یہ سب اپنے اپنے مقام کے متلاشی ہوئے تو اللہ نے نماز کا حکم دیا چنانچہ جسم نے نماز کی مطابقت کی، دل نے محبت کی، روح نے قربت کی اور دماغ نے وصال کی مطابقت کی۔"
اس گنج نامہ میں اور بھی بہت کچھ تھا۔ آپ اپنے ارادت مندوں کو اس کے مطالعہ سے منع فرمایا کرتے تھے۔
کسی ارادت مند نے دریافت کیا۔ "آپ تو اس کا مسلسل اور مستقل مطالعہ فرماتے ہیں پھر ہمیں کیوں منع فرماتے ہیں؟"
آپ نے جواب دیا۔ "اس میں جو کچھ لکھ دیا گیا ہے، اس کے معنی اور مطالب میں اسرار پائے جاتے ہیں۔ تم لوگ نادانی سے ان کا جو مطلب لو گے، اس سے فتنہ و فساد برپا ہو جائے گا اور تم ہلاک کر دیے جاؤ گے۔ اس لیے اس کا مطالعہ نہ کرنا ہی اچھا ہے۔"
ارادت مند خاموش ہو گیا۔
اصفہان میں جو لوگ آپ کے پاس آتے جاتے تھے، ان میں ایک نوجوان بھی تھا۔ وہ آپ کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ وہ کسی کی پروا کیے بغیر آپ کے پاس حاضری دیا کرتا تھا۔ اس نوجوان کا متمول باپ صوفیوں سے بہت چڑتا تھا۔ وہ یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ اس کا بیٹا ان کی محبت میں اٹھ بیٹھ کر کسی کام کا بھی نہ رہ جائے۔
اس نوجوان کا باپ ابنِ عثمان کا ذکر سن چکا تھا۔ اصفہان کے بازاروں، گلیوں اور کوچوں میں آپ کی شہرت پھیل چکی تھی، گھروں میں آپ کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اسی چرچے اور شہرت نے اس نوجوان کو آپ کی خدمت میں پہنچا دیا تھا۔ آپ بھی اس پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ نوجوان کے باپ نے دوسروں کے ذریعے آپ کو پیغام بھیجا کہ آپ میرے بیٹے کو اپنے پاس مت آنے دیا کریں۔ اس سے میری بڑی دل آزاری ہوتی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ میں اس سلسلے میں کوئی بڑا قدم نہ اٹھا بیٹھوں۔
آپ نے جواب میں کہلوا دیا۔ "میں کسی کو یہاں آنے سے منع نہیں کر سکتا۔ نوجوان تیرا بیٹا ہے تو خود اسے کیوں نہیں روکتا؟"
اس کے بعد جب یہ نوجوان آپ کے پاس پہنچا تو اس نے پہلی نظر ہی میں آپ میں کسی قسم کی تبدیلی محسوس کر لی۔ اس وقت تو وہ کچھ نہ بولا لیکن کچھ دیر بعد پوچھا۔ "پیرومرشد! کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟"
آپ نے قدرے بے رخی سے جواب دیا۔ "نہیں تو، کیوں؟ یہ تو کیوں پوچھ رہا ہے؟"
نوجوان نے عرض کیا۔ "میں آپ کی نظروں میں پہلے جیسی بات نہیں دیکھ رہا۔ آپ کو میری آمد گراں گزری ہے شاید۔"
آپ نے جواب دیا۔ "جب تیرا باپ یہ پسند نہیں کرتا کہ تو یہاں آئے تو تو کیوں آتا ہے؟"
نوجوان شرمندہ ہو گیا۔ بولا۔ "تو یہ بات آپ کے علم میں آ چکی ہے۔"
اس کے بعد نوجوان نے کوئی بات نہیں کی اور چپ چاپ اٹھا اور اپنے گھر چلا گیا۔ باپ نے اپنے بیٹے کو خاموشی سے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو پوچھا۔ "تو کہاں سے آ رہا ہے؟"
بیٹے نے جواب دیا۔ "وہیں سے جہاں کا آنا جانا آپ کو پسند نہیں ہے۔"
باپ نے کہا۔ "ہاں بیشک میں یہ پسند نہیں کرتا کہ تو صوفیوں کی صحبت میں اٹھ بیٹھ کر خود کو برباد کر لے۔ میں ایک

کاروباری انسان ہوں، میرے بعد تجھ کو ہی میرا کاروبار سنبھالنا ہے۔ اس لیے میں تجھ کو اپنے پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔"
بیٹے نے باپ سے زیادہ بحث نہیں کی۔ بولا "آپ بزرگ ہیں۔ اب میں آپ سے کیا بات کروں لیکن میں خود کو آپ کے اور آپ کے کاروبار کے لائق نہیں پاتا۔ میں کاروباری تو بالکل ہی نہیں اور شاید آپ مجھ سے وہ حاصل نہ کر سکیں جس کی اپنے دل میں تمنا رکھتے ہیں۔"
باپ نے غصے میں کہا "کچھ بھی سہی لیکن اب میں تجھ کو اس درویش کے پاس قطعی نہیں جانے دوں گا جو خود تو بیکار اور فضول زندگی گزار ہی رہا ہے، اپنے ساتھ تجھ کو بھی ضائع کرنا چاہتا ہے۔"
نوجوان نے سکوت اختیار کیا لیکن اس سکوت میں بڑا کرب تھا، بڑی اذیت تھی، بہت دکھ تھا اور اس اذیت میں وہ بیمار پڑ گیا۔ باپ نے شروع میں تو کوئی پروا نہ کی لیکن جب بیٹا گھلنے لگا تو اسے فکر لاحق ہو گئی۔ اس نے لائق ترین طبیبوں سے رجوع کیا۔ انھوں نے علاج شروع کر دیا لیکن ؎
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی
آخر وہ خود کو مجبور اور بے بس محسوس کرنے لگے اور صاف جواب دے دیا "جناب والا! یہی پتا نہیں چلتا کہ اس کو بیماری کیا ہے، پھر علاج کیا ہو؟"
نوجوان کے باپ نے حیرت سے کہا "تم لوگ اپنے وقت کے بقراط اور جالینوس ہو مگر افسوس کہ یہ بھی پتا نہ چلا سکے کہ میرے بیٹے کو مرض کیا لاحق ہے؟"
طبیبوں نے جواب دیا "جن مرضوں کا ہم علاج کرتے ہیں، ان میں تو یہ نوجوان مبتلا نہیں، شاید دوا کے بجائے دعا سے یہ صحت یاب ہو جائے۔"
باپ نے پوچھا "لیکن کس کی دعا سے۔ اس کے حق میں کس سے دعا کرائی جائے؟"
اس کا جواب طبیبوں کے پاس نہیں تھا۔ وہ منہ موڑ کر چلے گئے۔ باپ حسرت اور بے بسی سے ان کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ اس نے بیٹے سے پوچھا "تیری حالت کیا ہوئی جاتی ہے کچھ مجھے تو بتا۔"
بیٹے نے شکایت آمیز نظروں سے باپ کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر کے کروٹ بدل لی، منہ دوسری طرف ہو گیا۔ اب باپ کے لیے بات ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ وہ رونے لگا۔ بیٹے کے پاس ہی بیٹھ گیا، پوچھا "بیٹے! کچھ تو بتا کہ بات کیا ہے۔ یہ تجھ کو کون سا مرض لگ گیا ہے جو طبیبوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔"
بیٹے نے ایک سرد آہ بھری اور آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ باپ نے کہا "اب میں اس درویش کے پاس جاؤں گا اور اس سے کہوں گا کہ میرے بیٹے کو اچھا کر دے ورنہ اصفہان سے کہیں اور چلا جا۔"
بیٹے نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ باپ نے اس بار ذرا سختی سے کہا "میرا خیال ہے کہ یہ اس کی بددعا کا اثر ہے جو تو بیمار پڑ گیا۔ وہ نہ جانے یہاں اصفہان میں کیا لینے آ گیا۔"
نوجوان نے کروٹ بدلی اور باپ کو آپ کے پاس جانے سے منع کر دیا "جب آپ کو میرا وہاں جانا پسند نہیں ہے تو اب آپ وہاں کیوں جائیں گے؟"
باپ نے جواب دیا "میں وہاں تیرے حق میں دعا کرانے جاؤں گا۔"
بیٹے نے کہا "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"
باپ بیٹے میں یہ گفتگو جاری تھی کہ عمرو بن عثمان اپنے ارادت مندوں کے ساتھ خود ہی وہاں پہنچ گئے اور نوجوان سے پوچھا "یہ تو بستر پر کیوں پڑا ہے؟" پھر نوجوان کے باپ سے پوچھا "تم نے طبیبوں سے اس کا علاج نہیں کرایا؟"
باپ آپ سے مرعوب ہو چکا تھا۔۔۔ وہ بات کرنا چاہتا تھا مگر آواز نہیں نکل رہی تھی۔
آپ نے پھر وہی سوال کیا "تم نے اپنے بیٹے کا علاج نہیں کرایا؟"
باپ نے جواب دیا "کئی طبیب آئے تھے۔ وہ دیکھ کر واپس چلے گئے، کہتے تھے مرض سمجھ میں نہیں آ رہا۔"
آپ نے فرمایا "پھر اب کیا ہو گا؟"
باپ نے جواب دیا "حضرت! میں تو آپ ہی کے پاس آنے والا تھا کہ آپ خود تشریف لے آئے۔"

آپ نے پوچھا: "تم میرے پاس آنے والے تھے وہ کیوں؟"
باپ نے جواب دیا: "میں اپنی حرکتوں پر نادم ہوں، میں نے اپنے بیٹے کو آپ کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے سے منع کر کے بڑی غلطی کی۔"
آپ نے نوجوان سے پوچھا: "تیرا کیا حال ہے؟"
نوجوان نے نحیف آواز میں جواب دیا: "آپ کی دعاؤں سے اچھا ہوں۔"
آپ نے فرمایا: "ابھی تک تو ٹھیک نہیں ہے لیکن اللہ نے چاہا تو اب ٹھیک ہو جائے گا۔"
نوجوان نے عرض کیا: "حضرت! میں خوش الحانی میں کسی قوال سے کچھ سننا چاہتا ہوں۔ اگر آپ سنوا دیں تو کرم ہوگا۔"
آپ نے اپنے ایک ارادت مند کو حکم دیا کہ جا کسی قوال کو اسی وقت اپنے ساتھ لے آ۔"
ارادت مند چلا گیا اور کچھ دیر بعد ایک قوال کے ساتھ واپس آ گیا۔ آپ نے قوال کو حکم دیا: "میرے اس بیمار کی فرمائش پوری کر اور اسے کچھ سنا دے۔"
قوال نے بیمار نوجوان کی طرف دیکھا اور انتہائی پُرسوز دھن میں پہلا شعر سنایا ؎

مالی مرضت فلم یعدنی عائدٌ	منکم ویمرض عبدکم فاعید
(معلوم نہیں کیوں، کہ جب میں بیمار ہوا تو تمہاری طرف سے کوئی بھی میری عیادت کے لیے نہیں آیا	حالانکہ تمہارا غلام بھی بیمار ہو جائے تو میں اس کی بھی عیادت کرتا ہوں)

نحیف و نزار نوجوان ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر شگفتگی پیدا ہو گئی۔ اس نے بے اختیار کہا: "زدنی۔" (میرے لیے کچھ زیادہ کیجیے)
قوال نے آپ کی طرف دیکھا۔ آپ نے اجازت دے دی: "دوسرا شعر — ہاں دوسرا شعر۔"
قوال نے دوسرا شعر خوش الحانی سے ادا کیا۔

واشدّ من مرضی علیّ صدودکم	وصدود عبدکم علی شدید
(اور تمہارا مجھ سے رُکا رہنا میرے نزدیک میرے مرض سے زیادہ سخت ہے۔	اور تمہارے غلام کا رُکا رہنا بھی میرے لیے تکلیف دہ ہے)

آپ نے ہاتھ کے اشارے سے قوال کو روک دیا اور کہا: "بس، اتنا ہی کافی ہے۔"
نوجوان کے باپ نے اپنے بیٹے کے چہرے پر تازگی اور شگفتگی جو دیکھی تو آپ کی خوشامد کرنے لگا۔ بولا: "حضرت! کچھ دیر تو اور رُکیے۔ آپ کی تشریف آوری نے تو یہاں کا نقشہ ہی بدل دیا۔"
آپ نے جواب دیا: "میں نے کہہ جو دیا کہ بس اتنا ہی کافی ہے۔"
نوجوان نے اپنے باپ کو منع کیا: "آپ پیر مرشد کو کسی بات پر مجبور نہ کیجیے۔"
آپ نے نوجوان کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور فرمایا: "میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہوں۔ اب تم باپ بیٹے میرے پاس آؤ گے۔"
آپ اپنے ارادت مندوں کے ساتھ واپس چلے گئے۔ تیسرے دن باپ اپنے صحت مند نوجوان بیٹے کے ساتھ آپ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا: "حضرت! یہ آپ کا غلام آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ قبول فرمائیں۔"
آپ نے جواب میں فرمایا: "اس کی ضرورت تو نہ تھی۔ اس کی قسمت میں جو کچھ ہے، اس سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا یہ تو اپنے عہد کا مرشدِ کامل ہے۔"
اس نوجوان نے اپنے باپ کی اجازت اور خواہش پر دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کی اور بلند مقام حاصل کیا۔

اصفہان پھولوں کی سرزمین، آپ کو یہ جگہ بہت پسند آئی۔ آپ کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا، ہر وقت ارادت مندوں اور عقیدت رکھنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ آپ ہر ایک سے انتہائی خوش اخلاقی اور محبت سے پیش

آتے۔ آپ نے کچھ عرصے بعد اصفہان سے تُحرَقہ کا رُخ کیا۔ تُحرَقہ عمان کی ایک بستی تھی۔ یہاں بھی آپ کی خدمت میں حاضری دینے والوں کی کمی نہیں تھی۔

فجر کی نماز کے بعد آپ نے اپنے ارادت مندوں کے سامنے ایک چھوٹا سا وعظ کیا اور دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گئے۔ ایک ارادت مند نے اندر داخل ہو کے مطلع کیا۔ "حضرت! ایران کے شہر بیضا سے ایک بیس سالہ نوجوان آیا ہے اور آپ سے ملاقات کی تمنا رکھتا ہے۔"

آپ نے پوچھا۔ "بیضا سے۔ یہ بیضا وہی شہر ہے نا جو اصطخر کے قریب واقع ہے، شیراز اور شاپور سے متصل۔"

مرید نے جواب دیا۔ "غالباً۔ صحیح جواب تو آنے والا ہی دے سکتا ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ "بُلا، اندر بُلا، دیکھوں کیا کہتا ہے وہ؟"

مرید باہر گیا اور کچھ دیر بعد ایک نوجوان کو لیے ہوئے اندر داخل ہوا۔ آپ نے اس بیس سالہ نوجوان کے سراپا پر سرسری نظر ڈالی اور پوچھا۔ "کہو، کیوں آئے ہو؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "حضرت! میں نے آپ کا بہت شہرہ سنا تھا۔ ملاقات کا شوق آپ کے پاس کھینچ لایا۔"

آپ نے پوچھا۔ "تیرا نام کیا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "حسین۔"

آپ نے دوسرا سوال کیا۔ "تو بیٹا کس کا ہے؟"

نوجوان نے کہا۔ "منصور کا۔ میرے باپ کا نام منصور تھا، ان کا انتقال ہو چکا ہے۔"

آپ نے کچھ سکوت اختیار کیا، پھر پوچھا۔ "کیا چاہتا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "میں آپ سے بیعت ہونے آیا ہوں۔"

آپ نے دریافت کیا۔ "پہلی بار یہاں آیا ہے یا کسی اور کا مرید بھی رہ چکا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "میں عبداللہ تستری کا مرید رہ چکا ہوں۔"

آپ نے چونک کر نوجوان کو دیکھا اور حیرت سے پوچھا۔ "تو عبداللہ تستری کا مرید رہ چکا ہے؟ کتنے عرصے؟"

نوجوان حسین نے عرض کیا۔ "حضرت! صرف دو سال۔"

آپ نے جواب دیا۔ "خوب، پھر تو تُو وہیں چلا جا اور عبداللہ تستری ہی سے واسطہ اور تعلق رکھ۔"

حسین نے کہا۔ "اگر مجھے وہاں واپس جانا ہوتا تو یہاں کیوں آتا۔"

آپ نے فرمایا۔ "لیکن سوال تو یہ ہے کہ تو نے عبداللہ تستری کو کیوں چھوڑ دیا؟"

حسین نے جواب دیا۔ "وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکتے۔ وہاں سے میں سیر نہیں ہو سکتا۔"

آپ نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ یہاں سے تو سیر ہو جائے گا؟"

حسین نے جواب دیا۔ "اندازہ تو یہی ہے۔ کیونکہ آپ میں دونوں خصوصیات موجود ہیں۔ آپ عالم بے بدل ہیں اور صوفی بے مثل ہیں۔"

آپ نے فرمایا۔ "میری تعریف کر کے میرے نفس کو سرکش اور مغرور نہ بنا۔ شاید وہ نہ نکلوں جو تو سمجھ رہا ہے۔"

حسین نے ضد اور استقلال کا اظہار کیا۔ "حضرت! میں جو فیصلہ کر کے آیا ہوں، اس سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ میں آپ سے بیعت ہونے آیا ہوں اور بیعت ہو کر رہوں گا۔"

آپ نے کراہیت سے فرمایا۔ "وہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھے ہمیشہ یہ ملال رہے گا کہ میں نے عبداللہ تستری کے مرید کو مرید کر لیا۔"

حسین نے جواب دیا۔ "یہ فکر اور دُکھ تو مجھے ہونا چاہیے آپ کیوں دُکھ میں مبتلا ہوں۔"

آپ نے طوعاً و کرہاً حسین کو اپنے حلقۂ ارادت مندان میں داخل کر لیا۔ یہ نوجوان کچھ زیادہ ہی دلیر اور پُرجوش نظر آتا تھا۔ آپ نے اپنے مریدوں سے کہا۔ "مجھے تو اس نوجوان کے آثار بہتر نہیں نظر آتے۔"

آپ اس نوجوان کی عجیب و غریب باتوں سے پریشان رہنے لگے۔ وہ آپ سے حیران کن سوال کرنے لگا۔ آپ

نے اسے سمجھایا: "حسین! ایسی باتیں مت کیا کر کیونکہ ان میں فتنہ مستور ہے تو خود نقصان اٹھائے گا اور ہمیں بھی پریشان کرے گا۔"
حسین نے کمال استغنا سے جواب دیا: "پیر مرشد! جو جس کے مقسوم میں ہوگا، وہ اسے مل کر رہے گا پھر ہم پریشان کیوں ہوں؟"
آپ نے فرمایا: "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تو نے عبداللہ تستری کو خود نہیں چھوڑا، بلکہ انھوں نے تجھے چھوڑ دیا ہوگا۔"
حسین نے جواب دیا: "بات تو ایک ہی ہوئی۔ میں انھیں چھوڑ دیتا، مگر اس سے پہلے ہی انھوں نے مجھے چھوڑ دیا۔"
ایک دن آپ نے حسین کو اس حال میں دیکھا کہ وہ گنج نامہ لیے بیٹھا پڑھ رہا ہے۔ آپ نے پوچھا "یہ تو کیا پڑھ رہا ہے؟"
اس نے جواب دیا: "گنج نامہ۔ کیوں؟ آپ کو اس پر کس قسم کا اعتراض ہے؟"
آپ نے فرمایا: "ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہمیں تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ گنج نامہ تو لایا کہاں سے ہے؟"
حسین نے جواب دیا: "آپ ہی کا ہے۔ آپ کی جانماز کے نیچے سے۔ کیوں آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"
آپ نے فرمایا: "ہاں مجھے اس پر اعتراض ہے تجھ کو میری جانماز کے نیچے سے کوئی چیز میری اجازت کے بغیر نہیں نکالنا چاہیے۔"
حسین خاموش ہو گیا۔
آپ نے اپنے مریدوں سے کہا: "حسین ایک سرکش اور شوریدہ سر نوجوان ہے۔ اس کو میری چیزیں مت چھونے دیا کرو۔ اگر تم اسے نہ روک سکو تو اس سے مجھ کو مطلع کر دیا کرو۔"
مریدوں نے وعدہ کر لیا۔ کچھ دنوں بعد آپ کو اندازہ ہو گیا کہ حسین اس لائق نہیں ہے کہ اسے کوئی صوفی اپنی صحبت میں رکھے۔ اس کی باتوں سے فتنہ اور کم عقلی کی بو آتی تھی۔ حسین کو آپ نے کئی بار کچھ لکھتے ہوئے دیکھا۔ ایک بار آپ نے اس سے پوچھ ہی لیا: "کیوں حسین! یہ تو کیا لکھتا رہتا ہے؟"
حسین نے جواب دیا: "میں جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں، یہ دوسروں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس لیے میرا خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔"
آپ نے اصرار کیا: "پھر بھی، کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ تم کیا لکھتے رہتے ہو اور اس میں وہ کیا ہے جو کسی اور کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔"
حسین نے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا: "اس سلسلے میں پھر کبھی بات ہوگی، سردست گفتگو کو موقوف کر دیا جائے تو بہتر ہے۔"
آپ خاموش ہو گئے۔ آپ نے حسین کو کئی بار اپنے آپ سے میں نہیں دیکھا۔ وہ دیوانوں جیسی حرکتیں کرنے لگتا تھا۔
عصر سے ذرا پہلے حسین کچھ لکھنے میں مشغول تھا، اتنے میں آپ وہاں پہنچ گئے اور رسماً پوچھ لیا: "حسین! کیا ہو رہا ہے؟"
حسین نے جواب دیا: "قرآن کا جواب لکھ رہا ہوں۔" ؎¹
آپ غصے میں برس پڑے: "یہ کیا بک رہا ہے تو۔ دُور ہو جا میری نظروں سے، دفع ہو جا۔ ورنہ میں حالتِ اشتعال میں تجھ کو قتل کر دوں گا۔"
حسین آپ کی برہمی دیکھ کر سامنے سے ہٹ گیا۔
دوسرے دن صبح جب آپ نے نماز فجر کے بعد گنج نامہ پڑھنے کی غرض سے جانماز کے نیچے ہاتھ ڈالا تو وہ

؎¹ لیکن اس واقعہ کو ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر شعبۂ دینیات الازہر یونیورسٹی قاہرہ (مصر) اپنی کتاب جنید بغداد سوانح، نظریات اور رسائل میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔
"عمرو ابن عثمان مکی حلاج (حسین بن منصور) کی بابت کہتے تھے کہ اگر میں اسے کہیں پالوں تو اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دوں۔"
جب ان سے اس قدر برہمی کا سبب دریافت کیا گیا تو جواب دیا: "میں ایک مرتبہ قرآن کریم کی ایک آیت پڑھ رہا تھا کہ حلاج بول اٹھا: ایسا کلام تو میں بھی بول سکتا ہوں۔"
اس مضمون میں جو لکھا گیا وہ تذکرۃ الاولیا از شیخ فریدالدین عطار سے لیا گیا ہے۔

وہاں موجود نہیں تھا، آپ بہت پریشان ہوئے اور اپنے مریدوں سے پوچھا "میری جا نماز کے نیچے گنج نامہ رکھا تھا۔ وہ نہیں مل رہا۔ کسی نے لیا ہو تو بتا دے۔"

مرید ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ وہ سب بہت پریشان تھے۔

آپ نے برہمی سے پوچھا "تم لوگ خاموش کیوں ہو۔ جواب کیوں نہیں دیتے؟"

ایک مرید نے سب کی طرف سے جواب دیا "ہم سب بے قصور ہیں، اب آپ کو کس طرح یہ یقین دلائیں کہ ہم نے آپ کا گنج نامہ نہیں لیا۔"

آپ بہت ناخوش تھے، بولے "جب کسی نے لیا نہیں تو وہ کہاں چلا گیا؟"

اس مرید نے عرض کیا "اب اگر جواب میں ہم کچھ کہیں گے تو بات غیبت اور شبے کی ہو جائے گی۔"

آپ نے فرمایا "میں جواب چاہتا ہوں، میں اس شخص کا نام جاننا چاہتا ہوں جس نے میرا گنج نامہ چوری کیا ہے۔"

ایک دوسرے مرید نے عرض کیا "حضرت! آج صبح حسین بن منصور نے آپ کی جا نماز الٹ کے کوئی چیز لی تھی۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے۔"

آپ کو بے حد غصہ آیا، فرمایا "ابن منصور! تو نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔ تو جہاں کہیں بھی ہو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں لیکن گنج نامہ کی عبارت تیرے لیے مصیبت بن جائے گی۔ کیونکہ تو اس کا جو مفہوم لے گا، اسے عام کرے گا اور آخر کار تو دار پر چڑھا دیا جائے گا۔"

مریدوں نے پوچھا "کیا ابن منصور کے ساتھ ایسا ہو کر رہے گا؟"

آپ نے جواب دیا "ایسا ضرور ہوگا بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی۔ میرا گنج نامہ جو بھی لے گیا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کے پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا اور اس کی لاش کو جلا کے راکھ ہوا میں اڑا دی جائے گی۔ اس کو گنج نامہ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ وہ اس کے بھید تک رسائی نہیں حاصل کر سکے گا۔"

آپ بغداد تشریف لے گئے اور یہیں رہنے لگے۔ انھیں ایک بار پھر بہت سے صوفیوں سے ملاقات کا موقع ملا، یہاں ان سب کے سرخیل جنید موجود تھے۔ آپ ان کے پاس پابندی سے حاضریاں دینے لگے۔ آپ سے جنید بغدادی کی گفتگو علمی اور عارفانہ ہوا کرتی تھی۔ ایک روز صحو پر گفتگو ہوئی تو صحو کے سلسلے میں حضرت جنید بغدادی کی ایک نظم آپ کو بے حد پسند آئی۔ وہ نظم یوں تھی۔

جو کچھ میرے اندر تھا، وہ میں نے پالیا
میری زبان تجھ سے پردۂ اخفا میں ہمکلام ہوئی
اور ہم دونوں ایک لحاظ سے متحد ہو گئے
لیکن ایک دوسرے اعتبار سے ہم ایک دوسرے سے جدا ہیں
اور اگرچہ رعب و ہیبت نے تجھے میری ان آنکھوں سے پوشیدہ کر رکھا ہے
لیکن جذبۂ وجد و انبساط نے تجھے میرے سب سے قریبی حصۂ جسم سے بھی قریب تر کر دیا ہے۔

اس نظم میں صحو (نظریہ بحالی ہوش) کی ترجمانی کی گئی ہے۔ صحو کی یوں تو اس طرح وضاحت کی گئی ہے۔ وہ نفوس جو اپنی انفرادیت گم کر کے اور انسانی وجود سے گزر کر توحید کے مقام کو پہنچ جاتے اور ذات خداوندی میں رہنے لگتے ہیں اور ان پر اس ذات مطلق کا کامل غلبہ ہو جاتا ہے اور وہ پوری طرح اپنے مالک اور فاتح کے قبضہ میں ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا اپنا ارادہ بھی باقی نہیں رہتا۔ بلکہ وہ اس ذات غالب کے ارادے میں ضم ہو جاتا ہے اور ان کے لیے اس دنیا میں کوئی کام کرنے یا کوئی مقصد سامنے رکھنے کی بابت سوچنا بھی ممکن نہیں رہتا، جب کوئی انسان اس حال کو پہنچ جائے تو دنیوی زندگی کے عام قوانین اور معیار اس کے لیے اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔ اب وہ ایک آلہ بن جاتا ہے خدا کے لیے۔ یہاں نیکی اور برائی کا امتیاز بھی بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہر وہ چیز جو خالق کی طرف سے آتی ہے، خوب ہوتی ہے۔ اس کے لیے سب کچھ اللہ کی رضا ہوتی ہے۔

عمرو بن عثمان کو اس پر یہ اعتراض تھا کہ یہ حالت صوفی کو منطقی طور پر ایک ایسے رویئے کی طرف لے جاسکتی ہے جس سے وہ خود کو معاشرے کے احکام و قوانین سے بالاتر سمجھنے لگے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بعض صوفیہ فی الواقع دینی احکام کو پس پشت ڈالنے لگے ہیں اور مذہبی فرائض اور واجبات سے انھوں نے اپنے ہاتھ اٹھالیے ہیں۔

آپ کہتے کہتے ایک دم رُک گئے تو جنید بغدادی نے کہا "ہاں ہاں، بولو بولو، رک کیوں گئے ؟"

آپ نے فرمایا "یہ لوگ معروف کو بجالانے اور منکر سے اجتناب کرنے سے یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں کہ جب ایک شخص خدا کی رضا میں محصور ہو گیا تو اسے ان احکام پر عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ گویا یہ سمجھتے ہیں کہ شریعت کے احکام اور قوانین صرف عوام الناس کے فائدے کے لیے ہوتے ہیں اور رہے وہ نفوس عالیہ جو خالق کائنات کے ساتھ ایک حالت اتحاد میں رہتے ہیں تو ان کے لیے یہ فضول اور بے فائدہ ہیں۔"

جنید بغدادی آپ کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہے تھے، آپ جیسے ہی چپ ہوئے، جنید بغدادی نے کہا "کہہ چکے یا کچھ اور ؟"

آپ نے فرمایا "اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ مذہب کے احکام اور معاشرے کے قائم شدہ رواجوں کی طرف سے یہ مکمل بے تعلقی ایک صوفی کو ایک خاص قسم کی رندی اور آوارگی کی طرف لے جاتی ہے۔ میں کئی صوفیہ میں مذہبی اعمال کی طرف ایک پورا منفی رویّہ پاتا ہوں۔"

جنید بغدادی نے پوچھا "بس یا کچھ اور ؟"

آپ نے کہا "میں دیکھتا ہوں کہ بعض صوفیہ ایسے بھی ہیں جن کا یہ نظریہ ہے کہ عمل سے دور رہنا ہی نیکی ہے اور اسی میں خشیت الٰہی پائی جاتی ہے۔"

جنید بغدادی نے جواب دیا "یہ ان کا عقیدہ ہے جو مذہبی اعمال کو بالکل بے وقعت خیال کرتے ہیں اور میرے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ ایسا عقیدہ رکھنے والے شخص سے تو ایک زانی اور چور بھی میرے نزدیک بہتر ہے۔ جو لوگ اللہ کی معرفت رکھتے ہیں، وہ اس کے احکام بہ طیب خاطر بجالاتے ہیں اور ان پر عمل کر کے انھیں اس کی جناب میں واپس پیش کر دیتے ہیں۔ اگر میری عمر ایک ہزار سال بھی ہو تو میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ میرے اعمال خیر میں ایک ذرہ بھر بھی کمی پائی جائے۔"

اسی دوران آپ کو مکہ میں قاضی کا منصب پیش کیا گیا، آپ نے اسے قبول کر لیا۔ جب جنید بغدادی کو یہ خبر پہنچائی گئی تو وہ عمرو بن عثمان سے ناراض ہو گئے اور کہا "بس جناب! اب ہماری دوستی ختم ہوتی ہے۔ آپ کو یہ منصب مبارک اور مجھے آپ سے انقطاع تعلق مبارک۔ اب ہم دونوں پاس پاس نہیں رہ سکتے۔"

آپ نے جواب دیا "کیوں ؟ کیا ایک صوفی کو حکومت کا کوئی منصب نہیں قبول کرنا چاہیے ؟"

جنید بغدادی نے فرمایا "کم از کم میرا تو یہی عقیدہ ہے۔"

آپ نے فرمایا "میں منصب قضاۃ سے بہتوں کو فائدے اور انصاف دے سکوں گا۔"

جنید بغدادی نے افسردگی سے کہا "بہرحال ایک دوست کی جدائی کا میں ہمیشہ غم محسوس کروں گا۔"

اس کے بعد آپ مکہ چلے گئے اور منصب قضاۃ سے حقداروں کو فائدے پہنچانے لگے۔

آپ نے مکے میں قاضی کا منصب نہایت ایمانداری اور جرأت سے انجام دیا لیکن تصوّف پر بھی کاربند رہے۔ آپ بارہا اعتکاف میں بھی بیٹھے۔ آپ کو حرم کعبہ سے بڑی محبت تھی اور اسے کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ آپ حد درجہ نیک اور پرہیزگار ہونے کے باوجود توبہ و استغفار میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کے ایک مرید نے کہا۔

"حضرت! آپ کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتے، ہمیشہ انصاف سے کام لیتے ہیں۔ زہد و تقوے میں بھی کوئی آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پھر آپ توبہ و استغفار میں کیوں مشغول رہتے ہیں۔ آپ کو اس کی کیا ضرورت؟"

آپ نے جواب دیا۔ "رسولِ مقبول تو خیر البشر اور خاتم النبیین تھے۔ آپؐ افضل الکائنات تھے مگر آپ بھی توبہ و استغفار سے غافل نہیں ہوئے۔ پھر میں تو ایک گناہگار بندہ ہوں، میں جانتا ہوں کہ میں کتنا نیک اور پرہیزگار ہوں۔" اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ "جملہ گناہگار اور نافرمان، ان کے گناہ بڑے ہوں یا چھوٹے، معمولی ہوں یا غیر معمولی، توبہ ان سب پر فرض ہے۔ ترکِ توبہ کے لیے کوئی عذر قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔"

ایک بار آپ نے جنید بغدادی اور ابوبکر شبلی کو خطوط لکھے۔ ان میں آپ نے لکھا تھا۔ "آپ لوگ اہلِ عراق کے مرشدین میں سے ہیں۔ لہٰذا جو شخص جمالِ کعبہ کا مشاہدہ کرنا چاہے، اس کو بتا دو کہ جب تک تم اپنے نفس کو شق نہیں کرو گے، اس کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اور جو انسان قربِ الٰہی کا خواہاں ہو، اس سے کہہ دو کہ جب تک وہ اپنی روح کو شق نہیں کرے گا، وہ قرب نہیں حاصل کر سکتا اور جب وہ اس راہ میں قدم رکھے گا تو اسے پہلے تو راستے میں آگ کے دو ہزار پہاڑ اور ایک ہزار بحرِ بیکراں ملیں گے۔ ہلاکت خیز بحرِ بیکراں۔ اس راستے پر وہی چلے گا جس کے دل میں ان کا خوف نہیں ہو گا۔"

جنید بغدادی نے آپ کا یہ خط عراق کے مرشدوں کے سامنے رکھا اور پوچھا۔ "اس کے بعض حصے وضاحت طلب ہیں۔ آپ لوگ سمجھنے میں میری مدد کریں۔"

وہ لوگ کافی دیر تک غور و خوض کرتے رہے۔ آخر کار متفقہ طور پر آگ کے پہاڑوں کا یہ مطلب لیا گیا کہ اس سے مراد نیست و نابود ہونا ہے یعنی جب تک بندہ دو ہزار مرتبہ خود کو نیست نہیں کرے گا اور ایک ہزار بار ہست کی منزل میں داخل نہیں ہو گا، قرب حاصل نہیں کر سکتا۔

حضرت جنید نے فرمایا۔ "یعنی میں تو ابھی ان دو ہزاروں میں سے صرف ایک ہی راہ طے کر پایا ہوں۔"

ایک دوسرے صوفی جریری نے کہا۔ "جنید! تم خوش قسمت ہو۔ کیونکہ میں تو ابھی اس راہِ صرف میں تین قدم چلا ہوں۔"

ابوبکر شبلی نے کہا۔ "آپ دونوں خوش قسمت ہیں میرے مقابلے میں۔ کیونکہ میں تو ابھی اس راہ کے نزدیک تک نہیں پہنچا ہوں۔"

شیخ علی سہل آپ کی خدمت میں موجود تھے۔ انھوں نے ایک دن آپ سے پوچھا۔ "اے عمرو! ذکر کے قواعد و قانون مختصراً بیان کر دیجیے۔"

آپ نے جواب میں فرمایا۔ "اللہ کی ذات کو برحق اور یکتا ماننا اور پھر اس کے اوصاف کو پہچاننا۔" مزید فرمایا۔ "آدمی اس کی یکتائی کو نہیں پا سکتا اور جو اس کی یکتائی کو پا جاتا ہے، وہ آدمی نہیں ہو سکتا۔"

آپ کے کلام میں رموز و غوامض کا عنصر زیادہ ہوتا تھا۔ اس لیے مکے والوں نے آپ کو متکلمین میں شامل کر دیا اور آپ سے اتنے ناراض ہوئے کہ مکہ کی سکونت ترک کرنا پڑ گئی۔ آپ کو جدہ میں قاضی مقرر کر دیا گیا لیکن آپ کو یہ جگہ بھی راس نہ آئی۔ اور آخر کار آپ بھی بغداد تشریف لے گئے اور اپنی بقیہ زندگی یہیں گزار دی۔

بغداد میں آپ سے طرح طرح کے سوال کیے جاتے اور آپ ان کے اتنے معقول اور قابلِ فہم جواب دیتے کہ سائل آپ کے عرفان اور تصوّف کا دل سے قائل ہو جاتا۔

کسی نے آپ سے پوچھا۔ "حضرت! آپ مروّت سے کیا مراد لیتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "مروّت یہ ہے کہ بھائیوں کی لغزشوں سے قطع نظر کیا جائے۔"

آپ نے انتہائی مشغول اور نامور زندگی گزار کے ۲۹۷ھ میں وصال فرمایا اور بغداد ہی میں مدفون ہوئے۔

مضمون کے مآخذ



قطبِ پانی

ضیا تسنیم بلگرامی

پانی پت میں ایک عثمانی خاندان رہتا تھا۔ خاندان کے بزرگ کا نام محمود تھا۔ ان کی اولادیں تو کئی تھیں لیکن محمد نامی بچے کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ان کے آس پاس رہنے والوں نے اِس بچے کے سلسلے میں یہ عجیب بات محسوس کی کہ اس عہد کے مشہور بزرگ بوعلی شاہ قلندرؒ ہر روز اس گھر میں حاضری دیتے۔ محمدؒ کو دیکھتے، ان سے پیار محبت کی باتیں کرتے اور واپس تشریف لے جاتے۔ یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ محمدؒ ذرا سن شعور کو پہنچے تو خود بھی اِدھر اُدھر جانا شروع کر دیا۔ ان کی عدم موجودگی میں بوعلی شاہ قلندرؒ تشریف لاتے تو اُس وقت تک واپس نہ جاتے جب تک محمد سے ملاقات نہ ہو جاتی۔ ایک ایسے ہی موقع پر جب بوعلی شاہ قلندرؒ محمد کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا، محمد اپنی زمینوں پر گئے ہوتے ہیں۔ یہ زمینیں وہاں سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھیں۔ بوعلی شاہ قلندرؒ جس گھوڑے پر تشریف لائے تھے۔ اس کا رُخ موڑ دیا اور اس خاندان کے مزرعہ پر روانہ ہو گئے۔ محمدؒ نے انھیں دُور ہی سے آتے ہوئے دیکھ لیا۔ انھوں نے بہت سارا غلہ ایک تھیلی میں بھر لیا اور اسے لے کر استقبال کی نیت سے آگے بڑھے۔ جب یہ ذرا قریب پہنچے تو بوعلی شاہ قلندرؒ نے مسکرا کر دریافت کیا "محمد! اس تھیلی میں کیا ہے؟"

انھوں نے جواب دیا "غلہ"۔

بوعلی شاہ نے دریافت کیا "اسے لے کر ہمارے پاس آنے کا مقصد؟"

انھوں نے جواب دیا "آپ پہلے تو اس ناچیز کے گھر تشریف لے گئے ہوں گے، اس کے بعد یہاں تشریف لائے۔ ظاہر ہے اس سفر میں گھوڑا بھوکا ہو گیا ہو گا۔ یہ غلہ اس کی بھوک مٹانے کی غرض سے لے کر حاضر ہوا ہوں۔"

بوعلی شاہ اب بھی مسکرا رہے تھے، بولے "سعادت مند بچے بخدا تجھے صاحبِ کمال کرے کہ تو نے ہمارے جانور کا اتنا خیال رکھا لیکن دانہ کھلانے سے پہلے گھوڑے سے تو پوچھ لے کہ یہ بھوکا بھی ہے یا نہیں!"

انھیں جانور سے اس قسم کا سوال کرنے میں تامل ہُوا تو بوعلی شاہ نے فرمایا "سوچتا کیا ہے گھوڑے سے سوال کر یہ تجھے جواب دے گا!"

محمد نے مذبذب انداز میں سوال کیا "مویشی! کیا تم بھوکے ہو؟"

گھوڑے نے نفی میں گردن ہلا دی۔ محمد نے تعجب سے دوبارہ سوال کیا "مویشی! کیا تم نے میرے سوال کے جواب میں گردن ہلائی تھی؟"

گھوڑے نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ انھوں نے پھر پوچھا "کیا تم بھوکے ہو؟"

گھوڑے نے پھر نفی میں گردن ہلا دی۔ بوعلی شاہ نے کہا "محمد! تو حیرت نہ کر۔ گھوڑا تیرے سوالوں کے جواب دے رہا ہے خواہ مخواہ گردن نہیں ہلا رہا"

بچے نے کہا "لیکن میں یہ غلہ گھوڑے کے لیے لایا تھا۔ اب میں اس کا کیا کروں؟"

بوعلی شاہ نے جواب دیا "ہم نے یہ غلہ تجھے بخشا۔ خدا تجھے طویل عمر عطا فرمائے اور اسی طرح کثیر اولادوں سے نوازے!"

اس واقعے کو ایک عرصہ گزر گیا۔ محمد نے جوانی میں قدم رکھا، وہ اپنی زمینوں کا گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر دورہ کرتے۔ طبیعت کی بُردباری اور سنجیدگی لوگوں کو مرعوب رکھنے لگی تھی۔ اس دن سُورج طلوع ہوتے صرف دو ساعتیں گزری تھیں۔ نوجوان محمد نے گھوڑے پر زین کسی اور رکاب میں پیر رکھ کے گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گئے۔ وہ اپنی زمینوں پر جا رہے تھے۔ ایک جگہ سڑک کے کنارے ایک درخت کی چھاؤں میں بوعلی شاہ بیٹھے تھے۔ انھوں نے نوجوان محمد کو دیکھتے ہی فرمایا "کیا گھوڑا ہے اور کیسا اس کا سوار ہے!"

ان لفظوں نے نوجوان محمد کے سینے میں ایک آگ سی لگا دی۔ وہ فوراً گھوڑے سے اُتر پڑے اور جوش میں اپنا گریبان چاک کر ڈالا۔ گھوڑا کہیں گیا اور خود کہیں گئے۔ یہ سالہا سال جنگلوں میں خاک چھانتے رہے۔ مدتوں بعد جب ذرا ہوش آیا تو انھوں نے شہر کا رُخ کیا۔ جنگل میں انھیں کچھ اور فقیر بھی ملے۔ ان کے ساتھ انھوں نے بھی شہر کا رُخ کیا۔ جنگل سے قریب ترین شہر ہانسی تھا۔ یہ ہانسی میں داخل ہو گئے۔ اس وقت ہانسی کے مشہور بزرگ شیخ جمال بقیدِ حیات تھے۔ یہ وہی شیخ جمال ہیں جن کا سلسلہ حضرت صابر پیا نے فرمان پھاڑ دینے کی

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

سیر الاقطاب	انوار الاصفیا	تاریخ فیروز شاہی	تاریخ فیروز شاہی
حضرت اللہ دیہ	شیخ غلام علی اینڈ سنز	شمس سراج عفیف	ضیاء الدین برنی

وجہ سے چاک کر دیا تھا۔ شیخ جمال ہانسوی کو ایک غیب کی آواز نے بشارت دی "شیخ جمال! ہوشیار، شیخ محمد جو عنقریب شیخ جلال کبیرالاولیا کہلائیں گے، ہانسی میں آ رہے ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضری دے کر ان سے درخواست کرو کہ وہ خدا سے دُعا کر کے تمھارے سلسلے کو بحال کر دیں۔"

شیخ جمال نے اپنے کئی خادم شہر کی مختلف سمتوں میں روانہ کر دیے اور انھیں حکم دیا کہ اس دوران جو درویش بھی شہر میں داخل ہوں، انھیں احترام کے ساتھ شیخ جمال کے پاس پہنچا دیا جائے!"

خادموں نے نووارد فقرا کو روک لیا اور انھیں اپنے شیخ کی خدمت میں لے آئے۔ شیخ جمال دروازے پر کھڑے نہایت بے چینی سے ان فقرا کے منتظر تھے۔ انھوں نے ہر درویش کو نہایت غور سے دیکھا اور ان میں شیخ محمد کو تلاش کرتے رہے۔ آنکھوں کے ساتھ ہی وہ قوتِ شامّہ سے بھی کام لے رہے تھے۔ ان کی بصارت اور شامّہ نے انھیں مایوس کر دیا۔ فقرا سے پوچھا۔ "اے درویشو میں تم سب سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم یہاں اپنی مجموعی تعداد میں حاضر ہوئے ہو یا ابھی تم میں کا کوئی شخص باقی ہے؟"

ایک عمر رسیدہ درویش نے جواب دیا۔ "ایک نوجوان کے سوا سبھی یہاں آگئے ہیں۔ کیوں، کیا بات ہے؟"

شیخ جمال نے افسوس سے سر پکڑ لیا۔ بولے۔ "وہ نوجوان کہاں ہے؟"

عمر رسیدہ درویش نے جواب دیا۔ "ہم سب نے اپنے سامان کی نگہداشت اور نگرانی کے لیے اس نوجوان کو سرائے میں چھوڑ دیا ہے!"

شیخ جمال نے کہا۔ "درویشو! افسوس کہ ہم نے جس شخص کی وجہ سے تم سب کو بلایا، وہی نہیں آیا!"

اس کے بعد شیخ جمال نے درویشوں کی ایک شاندار ضیافت کی جب یہ لوگ کھانے پینے سے فارغ ہوگئے تو شیخ جمال نے ان سب کو مخاطب کیا۔ "حضرات! اب آپ میں سے کوئی ایک شخص اس نوجوان کی خدمت میں جائے اور اسے عزّت و احترام سے لے آئے!"

ایک درویش نے اس درخواست پر عمل کیا اور شیخ محمد کو اپنے ہمراہ لے آیا۔ شیخ جمال نے اس نوجوان کی شاندار پزیرائی کی اور صدرِ محفل میں بٹھایا۔ درویشوں کو رخصت کر کے شیخ محمد کو کھانا کھلایا اور آخر میں علاءُ الدّین صابر کلیری کا پورا واقعہ سُنا کے گزارش کی۔ "حضرت! حضرت صابر نے جوش میں یہ کہہ دیا تھا کہ میں تمھارا سلسلہ چاک کرتا ہوں، اس کے بعد بابا فرید گنج شکرؒ نے مجھے بشارت دی تھی کہ ایک درویش کی دُعا سے یہ سلسلہ پھر بحال ہو جائے گا اور وہ شخص جس سے میرا سلسلہ جاری ہوگا از روئے کشف مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ آپ کی ذاتِ بابرکات ہے۔ خدا کے لیے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائیے اور میرا سلسلہ جاری فرمائیے"

شیخ محمد نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور جمال ہانسوی کے سلسلے کو دوبارہ جاری کر دینے کی اپنے خدا سے دُعا کرتے رہے۔

یہ جب دوبارہ اپنے ساتھیوں میں واپس پہنچے تو درویشوں نے ان کی بڑی عزّت کی۔ اس بار درویشوں نے اپنا سامان بھی ان کے سر یا کاندھوں پر نہیں رکھا لیکن شیخ محمد نہیں مانے اور انھوں نے اپنی سابقہ خدمات انجام دینے پر اصرار کیا۔ درویشوں نے نہایت معمولی اور ہلکا سامان ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "نوجوان! اگر تم بضد ہی ہو تو اسے اپنے کاندھے پر رکھ لو!"

شیخ محمد نے اس سامان کو اپنے کاندھے پر رکھ لیا۔ درویشوں کو راستے میں یہ کیفیت دیکھ کر بڑی حیرت ہُوئی کہ شیخ محمد کا کاندھا بالکل خالی ہے اور ان کا سامان کاندھے کے ایک یا دو بالشت اوپر ہوا میں معلّق ہے۔ درویشوں کو اپنی لاعلمی اور کم آگہی پر بہت افسوس ہوا۔ انھوں نے شیخ محمد کے قدموں میں گر کر ان سے معافی مانگی۔

یہ لوگ ابھی چند ہی کوس گئے ہوں گے کہ ایک ہانپتا کانپتا آدمی ان کے پاس پہنچا اور شیخ محمد کا راستہ روک کے کہنے لگا۔ "شیخ! مجھے شیخ جمال ہانسوی نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے، براہِ کرم واپس تشریف لے چلیں!"

شیخ محمد نے جانے سے انکار کیا لیکن جمال ہانسوی کا خادم انھیں اپنے ساتھ لے جا کے رہا۔ جب یہ شیخ جمال کی خدمت میں دوبارہ پہنچے تو انھوں نے کہا۔ "شیخ محمد! تم اللہ کے محبوب ہو اور خدا نے تم میں بہت سارے کمالات ودیعت فرمائے ہیں، تمھارا اس طرح مارا مارا پھرنا خدا کو پسند نہیں ہے۔ تم اپنے وطن واپس جاؤ!"

شیخ محمد نے رقّت زدہ آواز میں عرض کیا۔ "بزرگ شیخ! کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اپنی خوشی سے مارا مارا پھر رہا ہوں؟ ایسا نہیں ہے۔ میرے سینے میں ایک بھٹی جل رہی ہے اور تلووں میں آگ دبی ہے جو مجھے اِدھر اُدھر دیوانہ وار بھگائے پھرتی ہے اور ابھی تک میں اس بزرگ ہستی سے محروم ہوں جو میرے پیروں میں اطاعت و مُریدی کی زنجیریں ڈال کے ٹھیراؤ پیدا کرے گا۔"

شیخ جمال نے جواب دیا۔ "عزیزم! تم اپنے گھر پانی پت واپس جاؤ اور اُن بزرگ کا وہیں انتظار کرو۔ اُن صاحب کی بہت جلد تم سے ملاقات ہو جائے گی اور وہ تمھیں تمھاری منزلِ مراد تک پہنچا دیں گے، تم مطمئن رہو!"

شیخ جمال کے ارشاد پر یہ پانی پت چلے گئے اور وہیں کچھ عرصے بعد ان کی ملاقات شمس الدین ترک پانی پتی سے ہوگئی۔ شیخ محمد ان کی مریدی میں چلے گئے۔ انھوں نے اِن کا نام شیخ جلال الدّین رکھ دیا۔

شیخ جلال نے ایک بار پھر سفر اختیار کیا اور اس بار انھوں نے پورب کا رُخ کیا۔ قریبِ شام ایک ایسے گاؤں میں داخل ہوئے جہاں افراتفری مچی ہُوئی تھی۔ لوگ اپنا سامان سمیٹ کے بھاگنے کی تیّاری کر رہے تھے۔ بار بردار مویشیوں کی پیٹھ پر بندھا ہوا سامان رکھا تھا اور عورتوں بچّوں میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس گاؤں پر کسی خونخوار دشمن کا حملہ ہونے والا ہے اور لوگ اپنے جان و مال کی حفاظت کی خاطر ہجرت کر رہے ہیں۔ شام قریب ہونے کی وجہ سے شیخ جلال کو اسی گاؤں میں قیام کرنا تھا۔ انھوں نے لوگوں سے اس افراتفری کا سبب جاننا چاہا لیکن انھوں نے ان کے ہر سوال کا بے رخی سے جواب دیا۔ شیخ جلال ایک سرکش

گھوڑے کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اس کے سوار سے پوچھا "تم لوگ آخر یہاں سے بھاگ کیوں رہے ہو؟"

نوجوان نے گھوڑے کی راس کھینچ لی اور جلدی جلدی غصے میں بولا "اے اجنبی! تم میرا راستہ مت روکو، ورنہ میں تمھیں کچلتا ہوا نکل جاؤں گا"

شیخ جلال نے ناگواری سے کہا "ایسی بھی کیا گھبراہٹ، اگر تم مجھے کچل کے جا سکتے ہو تو ضرور ایسا کرو!"

نوجوان سوار نے ایک بار پھر تنبیہ کی "آخری بار، میرا راستہ چھوڑ دو اور میرا وقت نہ برباد کرو!"

شیخ جلال نے کہا "تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ آخر تم لوگ گاؤں خالی کر کے کیوں بھاگ رہے ہو؟"

نوجوان سوار نے غصے میں کہا "تم حاکمِ علاقہ کے جاسوس معلوم ہوتے ہو جو شاید اس گاؤں میں بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ ہمیں باتوں میں الجھا کے اس وقت تک روکے رکھے جب تک کہ اس کے خونخوار سپاہی یہاں نہ پہنچ جائیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں!" شیخ جلال نے جواب دیا "نوجوان! میں تمھارا مخلص ہوں اور اگر تم لوگ اپنی پریشانی سے مجھے مطلع کر دو گے تو شاید یہ ممکن ہو جائے کہ میں اسے دور کر دوں اور تمھیں یہاں سے بھاگنا نہ پڑے"

نوجوان نے غصے میں گھوڑے کے پیٹ پر گدگدی کی اور راس ڈھیلی چھوڑ کے ایڑ لگاتا ہوا بولا "تم یوں نہیں مانو گے، مجھے کوئی پروا نہیں کہ میرا گھوڑا تمھیں کچل دے۔"

اس کے بعد اس نے گھوڑے کو رہ رہ کر ایڑ لگائی اور اسے بھگانے کی بار بار کوشش کی لیکن وہ تو زمین سے چپک کر رہ گیا تھا۔ شیخ نے مسکراتے ہوئے لاپروائی سے فرمایا "نہیں دیتے میرے سوال کے جواب تو نہ دو، جاؤ، میں بھی تم سے کچھ نہیں پوچھتا، جاؤ مجھے کچلتے ہوئے بھاگ جاؤ!"

نوجوان سوار کی بوکھلاہٹ اور پریشانی قابلِ دید تھی، وہ ذرا سی دیر میں پسینے پسینے ہو گیا اور شیخ جلال نے بے نیازی سے اپنی راہ لی۔ سوار نے انھیں جاتے جو دیکھا تو گھوڑے کی پشت سے پھاند کر ان کی طرف دوڑا اور بھاگ کے ان کے قدموں میں گر گیا۔ بولا "حضرت! میں اپنی گستاخی پر نادم ہوں، آپ ہیں کون؟ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "اب میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمھارے سوالوں کے جواب دوں!"

سوار نے شیخ جلال کے پاؤں پکڑ لیے، بولا "میں اس وقت تک آپ کے پاؤں نہ چھوڑوں گا جب تک آپ مجھے معاف نہ فرما دیں گے۔ حضرت میں اپنی غلطی پر نادم ہوں!"

آپ نے جواب دیا "جاؤ، گاؤں چھوڑ کے بھاگ جاؤ۔ ورنہ حاکمِ علاقہ کے سپاہی کل صبح صبح نازل ہو جائیں گے اور تمھارا سامان چھین کر لے جائیں گے!"

سوار نے آنسو بہاتے ہوئے کہا "حضرت غلطی ہو گئی، معاف فرما دیں"

شیخ جلال نے غصے میں کہا "نادانو! تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ تقدیرِ الٰہی سے بھاگا نہیں جا سکتا، وہ تمھیں ہر جگہ پکڑ سکتی ہے۔ اگر تم میں اتنی طاقت اور اتنا اختیار ہے کہ تقدیرِ الٰہی سے بھاگ جاؤ تو تم یہاں اس گاؤں میں ایک لمحے بھی نہ رکو۔ اسی وقت بھاگ جاؤ، ابھی بھاگ جاؤ۔"

سوار نے بے بسی سے جواب دیا "بھاگ کیسے جاؤں حضرت، میرا گھوڑا تو زمین میں اس طرح گڑ گیا ہے جیسے کوئی میخ، میں گھوڑے کے بغیر کیسے بھاگ سکتا ہوں۔"

"یوں ہی پیدل بھاگ جاؤ، خدا نے تمھیں بھی تو دو پیر دیے ہیں ان سے دوڑ کر گاؤں سے کہیں دور چلے جاؤ!"

سوار نے آپ کے قدموں میں سر رکھ دیا اور روتا ہوا بولا "اب میں یہ پاؤں نہیں چھوڑوں گا۔ آپ مجھے اپنی ٹھوکروں کی ضربات سے ہلاک کر دیں"۔ یہ تماشا دیکھنے کے لیے گاؤں کے دوسرے لوگ بھی آ گئے اور جب انھیں اس نوجوان کی زبانی سارا واقعہ معلوم ہوا تو ان میں ایک عمر رسیدہ اور چھدری داڑھی والا ذرا آگے بڑھا اور کہنے لگا "نوجوانی میں میں بھی بہت بدعقیدہ تھا لیکن جب تجربات اور عقل کی گھنیری چھاؤں میں بیٹھ کر ذرا سستایا تو پتہ چلا کہ جوانی کی سرکشی اور تعجیل پسندی نے مجھے اتنا موقع ہی نہیں دیا تھا کہ میں حقائق دیکھ سکتا۔" پھر نوجوان کو گدی سے پکڑ کر کھڑا کیا اور ڈانٹتا ہوا بولا "تو نے ان کی شان میں کون سی گستاخی کی تھی جس پر تو پچھتا رہا ہے"

نوجوان نے جواب دیا "میں نے آپ کے سوالوں کے جواب نہیں دیے اور آپ کو کچل کر گزر جانے کی دھمکی دی تھی جس کی مجھے یہ سزا ملی کہ میں یہ گاؤں چھوڑنے سے معذور ہو گیا ہوں اور میرا گھوڑا زمین میں میخ کی طرح گڑ کے کھڑا رہ گیا ہے۔"

بوڑھے نے شیخ جلال کی خوشامد کی، اپنی سفید داڑھی مٹھی میں پکڑتا ہوا بولا "حضرت! اس سنتِ رسولؐ کا واسطہ، اس نوجوان کو معاف فرما دیں، یہ نادان ہے اور نہیں سمجھتا کہ آپ کا مرتبہ کیا ہے!"

آپ نے کہا "میں نے اسے سزا ہی کون سی دی ہے جو معاف کر دوں، بس اتنا ہی تو کیا ہے کہ اسے تقدیرِ الٰہی سے بھاگنے نہیں دیا"

بوڑھے نے کہا "بجا ارشاد لیکن اب میں نہ صرف اس کی طرف سے بلکہ پورے گاؤں کی طرف سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ یہاں کا کوئی فرد بھی آپ کی مرضی اور حکم کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے گا۔ آپ جیسا چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔"

آپ نے نرمی سے کہا "تم لوگ جس ڈر سے گاؤں خالی کر رہے ہو، خیال ہے بھاگ کے تم اس آفت سے بچ جاؤ گے؟ حاکمِ علاقہ تم سب کا دور تک پیچھا کر سکتا ہے!"

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ

کے پاس ایک تیرہ سالہ لڑکا اپنے باپ امیر سیف الدین محمود کے ساتھ آیا۔ باپ بیٹے کو اندر لے جانا چاہتا تھا لیکن بیٹے نے اندر جانے سے انکار کر دیا اور باپ سے کہا "آپ اندر تشریف لے جائیں۔ میں یہیں باہر کھڑا آپ کا انتظار کرتا ہوں۔" باپ نے مزید اصرار نہیں کیا بلکہ اندر چلا گیا۔ باپ کے جاتے ہی اُس تیرہ سالہ لڑکے نے فوراً ایک منظوم رقعہ لکھا، اس میں فارسی کے دو شعر اسی وقت موزوں کیے تھے۔

تو آں شاہی کہ بر ایوان قصرت — کبوتر گر نشیند باز گردد

غریبے مستمندے بر در آمد — بیاید اندروں یا باز گردد

(تم وہ بادشاہ ہو کہ اگر تمہارے محل پر کبوتر بیٹھے تو باز بن جائے، ایک غریب حاجت مند دروازے پر باریابی کا منتظر ہے وہ اندر آئے یا واپس جائے)

منظوم رقعہ اندر گیا اور اسی وقت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا لکھا ہُوا منظوم جواب آگیا۔

در آید گر بود مرد حقیقت — کہ با ما ہم نفس ہم راز گردد

اگر ابلہ بود آں مرد ناداں — ازاں راہے کہ آمد باز گردد

(اگر اُمیدوار حقیقت شناس ہے تو اندر آجائے اور ہمارا ہم دم و ہمراز بنے اور اگر ابلہ و ناداں ہے تو جس راہ سے آیا ہے اسی سے واپس جائے۔)

جواب پاتے ہی یہ تیرہ سالہ لڑکا اندر خواجہ نظام الدین اولیا کے پاس چلا گیا اور امیر خسروؒ کے نام سے شہرتِ دوام حاصل کی۔

بوڑھے نے پورے گاؤں کی نمائندگی کی۔ بولا "حضرت! آپ سے کیا چھپانا، آپ بتائے بغیر ہی سب کچھ جانتے ہیں۔۔۔ پھر بھی یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنا دکھڑا آپ کے سامنے بیان کریں اور آپ سے فریاد رس ہوں۔"

پھر ذرا دم لینے کے لیے رُکا اور گاؤں کے دوسرے آدمیوں پر ایک اچٹتی نظر ڈال کے کہنے لگا "شاہ صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ اس علاقے کا حاکم ہم سے مال و اموال کا طالب ہے۔ بادشاہ نے کسی جنگ کے مصارف کی خاطر اس حاکم سے کچھ خاص رقم طلب کی ہے اور حاکمِ علاقہ وہ رقم خود دینے کے بجائے ہم سب سے وصول کر کے دینا چاہتا ہے اور ہم سب عاجز آ کے یہاں سے راہِ فرار اس لیے اختیار کر رہے ہیں کہ کل پرسوں جب حاکمِ علاقہ کے سپاہی یہاں آئیں تو یہ گاؤں انھیں خالی ملے اور ہم لوگ اپنا معمولی سا سامان ان ظالموں سے بچا لینے میں کامیاب ہو جائیں!"

شیخ جلال نے جواب دیا "لیکن فرار ہونے سے پہلے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ معاملہ بادشاہ سے تعلق رکھتا ہے اس سے بھاگ کے تم کہاں جا سکتے ہو۔"

بوڑھے نے بے بسی سے کہا "آدمی اپنی عقل اور اختیار کی حد تک کوشش تو کرتا ہی ہے!"

"ہاں کرتا ہے لیکن انسان کو ایسی تدبیر نہیں اختیار کرنی چاہیے جس میں انجامِ کار اسے شرمندگی اختیار کرنی پڑے!"

"پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" بوڑھے نے سوال کیا۔

شیخ جلال نے کہا "ہمارے پاس ایک تدبیر ہے اور وہ یہ ہے کہ حاکمِ علاقہ کو مطلوبہ مال یا اتنی ہی قیمت کی رقم ملنی چاہیے!"

بوڑھے نے مایوسی سے گردن جھکا لی اور آہستہ سے کہا "یہ ایسی ترکیب ہے جو ہم بھی جانتے تھے!"

شیخ جلال نے کہا "اپنے گاؤں کے سردار کو بلاؤ۔ بقیہ باتیں اسی سے ہوں گی۔"

ذرا سی دیر میں گاؤں کا ادھیڑ عمر گٹھے ہوئے جسم کا سردار بھی دھوتی باندھے سر پہ پگڑی رکھے سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کے مضبوط اور وزنی ہرے والی لاٹھی تھی۔ سردار شیخ جلال کی پُرعظمت اور اہلِ کرامت شخصیت سے پہلے ہی واقف ہو چکا تھا۔ آتے ہی سرداری کے طنطنے سے پوچھا "شاہ جی! مجھ سے کوئی کام ہے؟"

شیخ جلال نے نرمی سے کہا "ہاں تجھی سے چند باتیں کرنا ہیں۔ تو پہلے اپنے دماغ سے سرداری کا طنطنہ نکال دے اس کے بعد ہم سے بات کر۔"

شیخ جلال کے تو تکار کے لہجے سے گاؤں کے سردار کی انا کو بڑا دھکا لگا لیکن مصلحت اندیشی نے اسے مشتعل نہیں ہونے دیا۔ انکسار سے بولا۔ "شاہ جی! اگر میں نے بات چیت میں کوئی غلطی کی ہے تو اس کی معافی چاہتا ہوں!"

شیخ جلال نے کہا "اگر کسی طرح تمھیں اتنی دولت مل جائے کہ حاکمِ علاقہ کو دے کے گاؤں والوں کی جان بچا لو تو کیسا رہے گا؟"

سردار نے خوش ہوتے ہوئے کہا "اگر کسی طرح ایسا ہو جائے تو پھر مزہ ہی نہ آجائے۔"

آپ نے کہا "ہم تمھیں اتنی دولت ضرور دیں گے کہ تم حاکمِ علاقہ کی نظروں میں سرخرو ہو جاؤ۔"

سردار کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ امید اور نا اُمیدی میں مبتلا ہو کے آہستہ سے کہا "ایسی کوئی اُمید نہیں لیکن آپ شاید اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ آپ کی دُعا کے طفیل ہی کچھ ہو جائے تو ہو جائے ورنہ یوں کوئی امید نہیں!"

آپ نے جواب دیا "سردار! تم یہ گاؤں ہمارے حوالے کر دو اور ہمیں یہاں کا مالک و مختار بنا دو۔ تم لوگ اپنا اپنا سامان اپنے اپنے گھروں میں لے جا کے بند ہو کے بیٹھ جاؤ لیکن ایسا کرنے سے پہلے تم لوگ ہمیں رہنے کی ایک جگہ دے دو اور تمھارے پاس لوہے کے جتنے بیکار آلات و اوزار ہیں انھیں ہمارے پاس رکھوا دو!"

سردار کے حکم پر گاؤں والوں نے شیخ جلال کی ہدایت پر پوری طرح

اور ذراسی دیر میں لوہے کے سامان کا شیخ جلال کی اقامت گاہ کے سامنے ڈھیر لگ گیا۔ انھوں نے سب کے سامنے لوہے کے سامان کے چاروں طرف لکڑیوں کا انبار لگوا کے اس میں آگ لگادی اور گاؤں والوں کو حکم دیا کہ "جاؤ اپنے اپنے گھروں میں جاکے کل صبح تک کے لیے بند ہوجاؤ۔"

شیخ جلال کی یہ باتیں گاؤں والوں کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ وہ ان کے حکم پر اپنے اپنے گھروں میں جاکے بند ہورہے۔ ان کی پوری رات نہایت اضطراب میں گزری اور صبح سویرے ہی شیخ جلال کے گھر پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لوگوں نے گھر میں گھس کر دیر تک انھیں تلاش کیا لیکن ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ کہیں جاچکے تھے۔

گاؤں کے سردار نے غصّے میں کہا۔ "یہ شاہ صاحب تو بہروپیے ہی نکلے۔ بڑا شعبدے باز تھا یہ شخص، کیسا دھوکا دے گیا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا ان باتوں سے مقصد کیا تھا؟"

یہاں وہ بوڑھا بھی موجود تھا جس نے شیخ جلال سے لجاجت اور انکسار سے باتیں کی تھیں۔ بولا۔ "سردار! وقت سے پہلے ہی تم ان کے لیے ایسی باتیں مت کرو، میں نے انھیں پہچان لیا تھا وہ مستجاب الدعوات تھے! انھیں تلاش کرو وہ یہیں کہیں ہوں گے!"

سردار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "زمین کے اندر سماگئے ہوں تو اور بات ہے ورنہ گھر کے اندر تو وہ کہیں موجود نہیں!"

بوڑھے نے کہا۔ "انھوں نے لوہے کے سامان کو آگ کیوں لگوائی تھی؟ اس کا کوئی تو مطلب ہوگا۔"

سردار پھر ہنسا، بولا۔ "بڑے میاں عمر کے ساتھ ساتھ تمھاری عقل بھی رخصت ہوتی جارہی ہے کیا تم اتنا بھی نہیں سوچ سکتے کہ ان شاہ صاحب کو اپنی لاف و گزاف پر پردہ ڈالنے کے لیے کسی شعبدے کا انتظام تو کرنا ہی تھا، چنانچہ لوہے کا سامان جمع کرا کے اس کے آس پاس لکڑیوں کا انبار لگا کے اس میں آگ لگا کے وہ شعبدہ دکھایا جس سے تم بس سوچتے ہی رہ جاؤ اور شاہ صاحب تمھیں گھروں میں بند چھوڑ کے اپنی راہ لیں۔"

بوڑھا لاجواب ہو رہا تھا۔ پھر بھی بولا۔ "چلو اپنا اپنا لوہے کا سامان تو اٹھالیں چل کر، اب تو جو ہونا تھا ہو ہی چکا!"

سردار نے کہا۔ "وہ تو تم ٹھیک کہتے ہو لیکن ذرا سی دیر میں حاکمِ علاقہ کے پاس پہنچنے والے ہیں، ان کے لیے کیا سوچا جائے؟"

بوڑھا مسلسل لاجواب ہوتا جارہا تھا۔ وہ اکیلا ہی اس الاؤ کی طرف چلا گیا جسے کل شاہ صاحب نے سلگایا جلایا تھا۔ اس نے اس میں سے لوہے کا سامان نکالنا شروع کیا اور اس وقت تو اس کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں جب اس نے لوہے کی جگہ سنہرے سامان کا ڈھیر لگا ہوا دیکھا۔ اس نے دور ہی سے سردار کو آواز دی۔ "سردار! یہاں آؤ میرے پاس، یہاں آکے شاہ صاحب کا کمال دیکھو!"



مکّے کی مسجد میں یک جا ہوئے۔ دورانِ گفتگو شفیق بلخی نے ابنِ ادھم سے پوچھا۔ "روزی کے بارے میں آپ کیا کرتے ہیں؟"

ابراہیم بن ادھم نے جواب دیا۔ "مل جائے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں ورنہ صبر اختیار کرتا ہوں۔"

شفیق بلخی نے کہا۔ "ہماری گلی کے کتے بھی یہی کرتے ہیں!"

ابراہیم بن ادھم نے پریشان ہوکے سوال کیا۔ "آپ کا طریقہ کیا ہے؟"

شفیق بلخی نے جواب دیا۔ "مل جائے تو صدقہ کردیتا ہوں اور نہ ملے تو صبر سے کام لیتا ہوں!"

سردار آہستہ آہستہ چل کے بوڑھے کے پاس پہنچ گیا۔ بوڑھے نے ایک چمکتی سردار کی طرف بڑھادی، بولا۔ "سردار! لوہے کا سارا سامان سونے کا بن چکا ہے۔ بولو تمھیں کتنی دولت چاہیے۔ یہاں تو ہر طرف سونے کا ڈھیر لگا ہوا ہے تم ان شاہ صاحب کا ابھی تھوڑی دیر پہلے مذاق اڑا رہے تھے۔ بولو اب ان کے لیے کیا کہتے ہو؟"

سردار نے شرمندہ ہوکے اپنی گردن جھکالی۔



سالہا سال کی سیر و سیاحت کے بعد جب یہ اپنے وطن واپس پہنچے تو ان کے پیر و مرشد خواجہ شمس الدین ترک نے ان سے کہا۔ "شیخ جلال اب تمھیں شادی کرلینی چاہیے!"

شیخ جلال نے خاکساری اور عاجزی سے جواب دیا۔ "میں نے اپنے دل میں یہ طے کر رکھا ہے کہ زندگی بھر شادی نہ کروں گا اور اپنی ساری زندگی آپ کی خدمت میں گزاردوں گا!"

شمس الدین نے کہا۔ "ہمیں تمھاری محبّت کا یقین ہے اور ہم تمھیں اپنا فرزند سمجھتے ہیں تم نے عبادت و ریاضت میں جتنی مشقّت برداشت کی ہے ہمیں اس کا بھی اعتراف ہے لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ کل قیامت میں جب تمھارا رسول اللہؐ سے سامنا ہو تو تمھیں ان کے سامنے یہ شرمندگی اٹھانی پڑے کہ تم نے ان کی ایک سنّت پر عمل نہیں کیا!"

شیخ جلال نے شرمندگی سے کہا۔ "آپ کا ارشاد بجا لیکن میں اس بات سے بھی خوفزدہ رہتا ہوں کہ میں اپنی نالائق اولاد کے اعمال سے قیامت کے دن رسول اللہؐ کی نظروں میں شرمندگی نہ اٹھاؤں۔"

شمس الدین ترک نے جواب دیا۔ "تم اس طرف سے بے فکر رہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ نیک اولاد تمھارے نام سے اور بد میرے نام سے منسوب ہوگی اور یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ تمھاری اولاد پر جب بھی [illegible] میں اس کی مدد کروں گا۔ میں نے تمھاری لوح [illegible]

ابراھیم بن ادھم

کے پیرو مُرشد حضرت فضیل بن عیاض کا لوگوں میں بڑا چرچا تھا۔ ہارُن رشید ان سے ملنا چاہتا تھا ـــــ آپ ہمیشہ ٹال جاتے تھے لیکن ایک دن ہارُن رشید کسی اطلاع کے بغیر اُن کی خدمت میں پہنچ گیا اور سلام عرض کرنے کے بعد کہا "حضرت! میں نصیحت سننے آیا ہوں، کچھ ارشاد فرمائیں!"

فضیل بن عیاض نے جواب دیا۔ "ہارون! اللہ سے ڈر اور جسم جہنم کی آگ سے بچا!"

ہارون نے سوال کیا۔ "وہ کس طرح؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اگر تیری وسیع سلطنت میں ایک انسان بھی بھوکا سویا تو اس کا تجھ سے مواخذہ ہوگا۔ جب کوئی شخص خدا سے ایک ایسی شے طلب کرتا ہے جو اس کے مقسوم میں نہیں ہے تو خدا اپنی رحمت کے بے پایاں اظہار کے لیے آخرت کی نعمتوں میں سے عطا فرما دیتا ہے، اس قسم کی فیاضی تم بھی اختیار کرو!"

ہارون رشید نے پوچھا۔ "اور کچھ؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اور دُنیا میں بے عیب دُوستوں کو مت تلاش کرو کیونکہ اس کوشش میں اپنے تمام دوستوں سے محروم ہو جاؤ گے، یاد رکھو دو عادتیں انسان کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ بہت کھانا اور بہت سونا۔ اگر اللہ مجھ سے یہ کہے کہ میں تیری صرف ایک دُعا قبول کروں گا، جو مانگنا ہے مانگ لے تو اس وقت میں بادشاہ کی بہتری کے لیے دُعا مانگوں گا کیونکہ بادشاہ کی درستی اور بہتری ہی سے پورے ملک اور قوم کی بہتری وابستہ ہے۔"

ہارون رشید نے اٹھنے سے پہلے آپ کی خدمت میں ایک تھیلی پیش کی۔ آپ نے ترشی سے کہا۔ "کیا میرے احسان کا یہی بدلہ ہے؟ میں تو تمھیں بچانے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم مجھے مصیبتوں میں پھنسا دینا چاہتے ہو۔"

رو سے اس دنیا میں جتنی تمھاری اولاد پھیلے گی دُوسرا اس کا شمار بھی نہ کر سکے گا۔"

شیخ جلال نے کہا۔ "اس لوحِ محفوظ کا مجھے بھی مشاہدہ کرا دیجیے۔"

شمسُ الدّین ترک نے اپنی ڈھیلی ڈھالی آستین شیخ جلال کی طرف بڑھا دی اور کہا۔ "لو اس میں جھانک کے دیکھ لو۔"

شیخ جلال نے اس آستین میں جو جھانکا تو وہاں لوحِ محفوظ میں بے شمار اولادیں دکھائی دیں، انھوں نے ہاتھ بڑھا کے اس لوح کو مٹا دینا چاہا لیکن شمسُ الدّین ترک نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور کہا۔ "جلال! یہ کیا کرتے ہو کیا تم مشیتِ ایزدی میں دخل دینے کی گستاخی کے مرتکب ہونا چاہتے ہو؟"

شیخ جلال نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور معذرت چاہی۔

شمسُ الدّین نے پوچھا۔ "ہاں تو تم نے اپنی شادی کی بابت کیا فیصلہ کیا؟"

شیخ جلال نے سر جھکا کے عرض کیا۔ "آپ کے حکم پر سر جھکاتا ہوں۔"

شمسُ الدّین نے کہا۔ "شادی سے پہلے کوئی شرط؟"

"ہاں ہے" شیخ جلال نے کہا۔ "میں ایک ایسی لڑکی یا عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں جو بہری بھی ہو، گونگی بھی ہو، اندھی بھی ہو اور ساتھ ہی بھولی بھالی بھی ہو!"

شمس الدّین نے مسکرا کے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم نے یہ شرط کیوں لگائی، تم یہ سمجھتے ہو کہ نہ اس قسم کی کوئی عورت ملے گی اور نہ تم شادی کرو گے۔ کیوں ہے نا یہی بات؟"

شیخ جلال نے مسکرا کے سر جھکا لیا۔ شمسُ الدّین نے کہا۔ "لیکن میں تمھیں ایک ایسی ہی عورت تلاش کر دوں گا!"

شمسُ الدّین ترک نے اپنے مریدوں کو ایسی عورت کی تلاش میں روانہ کر دیا۔ یہ لوگ اپنے پیرو مُرشد کی رہنمائی میں ایسی عورت کو تلاش کرتے ہوئے کرنال پہنچ گئے۔ وہاں کے شیخ زادوں میں ایک ایسی ہی پاکباز خاتون موجود تھیں۔ مریدوں نے معلومات حاصل کر کے اپنے پیرو مُرشد کو مطلع کیا اور شمسُ الدّین ترک، شیخ جلال الدّین کو لے کر وہاں پہنچ گئے۔ شادی میں دُشواری ہی کیا تھی۔ شمسُ الدّین ترک نے گفتگو چھیڑی اور لڑکی والوں نے ہاں کر دی، ہمیں نہایت سادہ طریقے سے ان کی شادی ہو گئی۔ یہ لوگ دُلھن کو رخصت کرا کے وطن پانی پت لے آئے۔

رات کو جب میاں بیوی یک جا ہوئے تو شیخ جلال اپنی اندھی بہری اور گونگی بیوی کو دیر تک دیکھتے رہے۔ بیوی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ اس کا عظیم شوہر اس کے سامنے کھڑا ہے اور اس کی زندگی میں ایک حیرت انگیز انقلاب لانے کا ارادہ کر چکا ہے۔ شیخ جلال آہستہ آہستہ چل کے دُلھن کے قریب پہنچ گئے اور بیوی سے کہا۔ "کیا تم جانتی ہو کہ میں اس وقت نماز پڑھتا ہوں؟"

بہری اور گونگی دلھن اس کا کیا جواب دیتی۔

آپ نے بیوی کو حکم دیا۔ "میں وضو کروں گا میرے لیے پانی لاؤ۔"

دُلھن چُپ چاپ اٹھی اور ابھی وہ جانا ہی چاہتی تھی کہ آپ نے حکم دیا۔ "جانے سے پہلے میری طرف دیکھو!"

اندھی دلھن نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور حیرت اور خوشی سے شوہر کو دیکھنے لگی۔

پھر شیخ جلال نے دُوسرا حکم دیا۔ "وضو کے لیے پانی لاؤ!"

بہری بیوی کو سماعت بھی مل چکی تھی، وہ فوراً پانی لینے چلی گئی۔

جب پانی آ گیا تو شیخ جلال نے اپنا جھوٹا پانی بیوی کو پلا دیا اور حکم دیا۔ "قرآنِ پاک اٹھا لاؤ اور پڑھ کر مجھے سناؤ۔"

بیوی قرآنِ پاک لے آئی اور اسے رحل پر رکھ کے فر فر پڑھنے لگی۔



باہر سے شیخ احمد قلندر نامی ایک بزرگ تشریف لائے ان کی عظمت

[illegible] میں غلغلہ بلند ہوا۔ ان نووارد قلندر کو بھی اس بات کی [illegible] صاحب کمال حضرات کا امتحان لیا جائے تاکہ پتہ [illegible] میں قیام فرمایا اور تمام مشائخ اور فقرا کی دعوت کر دی۔ [illegible] ہو گیا۔ فقرا او مشائخ میں شیخ جلال بھی شامل تھے۔ [illegible] کا دسترخوان بچھا دیا گیا اور جملہ فقرا اور مشائخ اس کے [illegible] بیٹھ گئے۔ شیخ احمد قلندر کے مُریدوں نے دسترخوان پر [illegible] یہ طباق سرپوشوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور ان کے [illegible] گرم کھانے کی ہلکی ہلکی بھاپ نکل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد شیخ احمد

[illegible] مریدیں کو حکم دیا۔ "طباقوں سے سرپوش ہٹا دیے جائیں!"

[illegible] فوری تعمیل ہوئی۔ قلندر نے فقرا اور مشائخ کو حکم دیا۔ "بسم اللہ [illegible]!"

[illegible] فقرا اور مشائخ سکتے میں مبتلا تھے اور ان میں اتنی ہمت نہیں تھی [illegible] کے لیے ہاتھ تک بڑھا سکتے۔

[illegible] نے دوبارہ کہا۔ "بسم اللہ شروع کیجیے۔ آپ سب خاموش [illegible] ہیں؟"

[illegible] درویش نے جواب دیا۔ "یہ کھانے ناشرع اور حرام ہیں۔ ہم [illegible] کھا سکتے ہیں!"

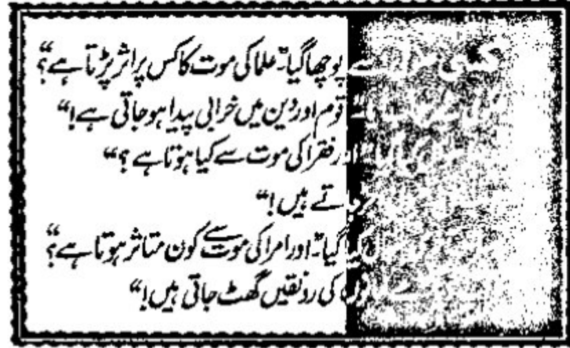
ایک درویش نے شیخ جلال کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "حضرت! اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ ہم سب آپ ہی کو حکم بناتے ہیں۔"

شیخ جلال نے جواب دیا۔ "اس میں حیرانی اور پریشانی کی کیا بات ہے۔" پھر کھانے کی طرف منہ کر کے حکم دیا۔ "اے غذا! جن چیزوں کے کھانے سے خدا نے منع فرمایا ہے وہ دسترخوان پر کیوں موجود ہو! میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ یہاں سے چلی جاؤ۔"

دسترخوان پر دو رویہ بیٹھے ہوئے مشائخ اور فقرا نے یہ عجیب و غریب تماشا دیکھا کہ حرام اور ناشرع چیزیں آہستہ آہستہ دسترخوان سے کھسکنے لگیں۔ وہ وہاں سے کہاں چلی گئیں کسی کو کچھ پتہ نہ چلا۔ شیخ احمد قلندر یہ عجیب و غریب منظر دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں شیخ جلال کی عظمت اور بزرگی کے قائل ہوتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر خاموش رہ کے شیخ احمد قلندر شیخ جلال کے قدموں میں گر گئے اور عاجزی سے عرض کیا۔ "فقیر نے یہاں کے فقرا اور مشائخ کا امتحان لیا تھا اور میں خوش ہوں کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔"

اس کے بعد انھوں نے فقرا اور مشائخ کے لیے واقعی کھانے کا انتظام کیا اور انھیں کھلا پلا کے رخصت کر دیا۔

شیخ جلال نے جواب بھی وہاں موجود تھے، قلندر نے درخواست کی۔



"حضرت! مجھے اپنے مریدوں میں شامل فرمالیں۔ اب تو میں یہاں سے کہیں بھی نہ جاؤں گا!"

شیخ جلال نے انھیں اپنا مُرید بنالیا اور کچھ عرصے بعد شیخ احمد قلندرؒ کو خرقہ و خلافت سے سرفراز کیا۔

ایک بڑی بی اپنے سر پہ پانی کا گھڑا لیے چلی جارہی تھیں۔ ان کے ہاتھ پیروں میں رعشہ تھا اور سجھائی بھی کم ہی دیتا تھا۔ کسی کسی ڈھیلے ٹھوکر کھا کے گرتے گرتے بچتیں۔ سامنے سے شیخ جلال چلے آرہے تھے۔ انھوں نے بڑی بی کو روک لیا اور پوچھا "اماں! کیا آپ کے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے؟"

بڑی بی نے بے بسی سے جواب دیا "بیٹے! اگر گھر میں کوئی مرد ہوتا تو کیا میں خوشی سے یہ دُکھ جھیلتی؟"

شیخ جلال نے کہا "اچھا یہ گھڑا مجھے دیجیے۔"

بڑھیا نے ذرا پس و پیش سے پانی کا گھڑا شیخ جلال کے حوالے کر دیا۔

آپ نے یہ گھڑا بڑھیا کے گھر پہنچا دیا اور گھر سے دوسرا خالی گھڑا ہاتھ میں لے کر کنوئیں کا رُخ کیا۔ گھڑے کو رسّی میں باندھ کے کنوئیں میں ڈال دیا، پھر پانی بھر کے گھڑا کاندھے پر رکھ لیا اور گھر پہنچا کے دُعا دی "اے اللہ! اس پانی میں برکت فرما، میں اس قابلِ رحم ضعیفہ کے اسی طرح کام آسکتا ہوں۔"

بڑی بی نے دریافت کیا "اے بیٹا! تمھاری اس دُعا سے مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟"

آپ نے جواب دیا "اماں! فائدہ آپ خود ملاحظہ فرمالیجیے گا۔"

آپ اتنا کہہ کر چلے آئے۔ دوسرے دن بڑھیا نے جب گھڑے کو بھرنے کے لیے اٹھایا تو پتہ چلا وہ کل جیسا لبالب بھرا رکھا ہے۔ تیسرے دن پھر گھڑے کو ہلا جلا کے دیکھا تو پتہ چلا وہ اب بھی بھرا رکھا ہے۔ اس کے بعد زندگی بھر بڑی بی کو گھڑا بھرنے کی نوبت نہ آئی۔

شیخ جلال اپنی خانقاہ میں تشریف فرما تھے، خاندان میں کسی کے توسط سے ایک کیمیاگر آگیا۔ اس نے اس گھر میں ہر چہار طرف افلاس ہی افلاس کا رفرما دیکھا، خاندان والوں نے کیمیاگر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان میں شیخ جلال کے ایک صاحبزادے بھی موجود تھے۔ کیمیاگر نے ازراہِ ہمدردی خاندان کے بڑوں سے کہا "حضرات! میں نے اس گھر میں ہر طرف افلاس ہی افلاس دیکھا ہے، مجھے آپ سب کی حالتِ زار پر رحم آچلا ہے۔"

خاندان والوں نے دم سادھ لیا وہ چپ چاپ کیمیاگر کی بات سُن رہے تھے۔

کیمیاگر نے مزید کہا "اگر آپ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے گھر کی حالت سدھار لیں اور فقر و فاقے سے نجات ملے تو میں پیش کش کرتا ہوں کہ آپ لوگ مجھ سے فنِ کیمیاگری سیکھ لیں اور اس سے اپنی غربت و افلاس دُور کریں!"

خاندان والوں نے سکوت اختیار کیا۔ شیخ جلال کے صاحبزادے بھاگے بھاگے اپنے باپ کے پاس پہنچے اور خوش ہو کے عرض کیا۔

"بادا جان! آج ہمیں ایک ایسا آدمی میسّر آگیا ہے جو ہماری تنگ دستی اور افلاس کا علاج کر سکتا ہے؟"

شیخ جلال نے چونک کے سوال کیا "غربت و افلاس کا علاج کیا مطلب؟"

صاحبزادے نے جواب دیا "ہاں تنگ دستی اور افلاس کا علاج۔ اس شخص کو فن کیمیاگری آتا ہے اور اس نے ہم سب کو یہ پیش کش کی ہے کہ اس سے کیمیاگری سیکھ کے اپنے دلدّر دُور کریں!"

آپ نے طیش میں آکے دیوار پر تھوک دیا اور فرمایا "کس کیمیا کی بات کر رہے ہو؟ اس کیمیا کی جو مجھے بھی آتی ہے تمھیں کتنا سونا درکار ہے صاحبزادے اس سامنے کی دیوار سے جتنا سونا چاہو لے لو اور اپنی غریبی دُور کرو!"

لڑکے نے دیکھا آپ نے جہاں تھوکا تھا وہاں کی دیوار سونے کی بن چکی تھی، وہ سخت شرمندہ تھا۔

آپ نے مزید فرمایا "بیٹے! جس کیمیا کی تم بات کر رہے تھے وہ کیمیا پیچیدہ اور مشتبہ عمل ہے اور اس میں ہمیشہ ناکامی کا خطرہ رہتا ہے لیکن جس کیمیا سے میں واقف ہوں اُس میں اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں، اس لیے میرا کہنا مانو اور کیمیائے سعادت سیکھ لو!"

بیٹے نے شرمندہ ہو کے گردن جھکالی اور دیر تک معافی طلبی کے انداز میں بیٹھا رہا۔

عبادت و ریاضت میں اتنی زیادتی ہوئی کہ استغراق کا غلبہ رہنے لگا۔ نماز کا وقت آتا تو مرید آپ کے کان میں آہستہ آہستہ حق حق حق جل جلالہ کہتے، آپ ہوش میں آجاتے اور وضو کر کے نماز ادا کرتے۔ اس کے بعد پھر استغراق میں چلے جاتے۔

آپ کے پانچوں صاحبزادے آپ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے اور آپ پر استغراق کا عالم طاری تھا۔ مرید اور صاحبزادگان گھڑیاں گن گن کے وقت گزار رہے تھے۔ عصر کی نماز کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ ابھی لوگ حق حق حق جل جلالہ کان میں کہنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ آپ نے خلافِ توقع خود بخود آنکھیں کھول دیں اور اپنے بڑے صاحبزادے خواجہ عبدالقادر کو مخاطب کیا "بیٹے! مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب حکم دیا ہے!"

عبدالقادر ان کی شکل دیکھنے لگے۔ شیخ جلال نے فرمایا "بیٹے دہلی میں سید جلال مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاری سخت علیل ہیں، اُن کی

سب رنگ

۔۔گی پوری ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ میں اپنی عمر کا کچھ حصہ انھیں بخش
۔۔وں، تمہاری کیا رائے ہے؟"

عبدالقادر نے جواب دیا۔ "باداجان! خدا آپ کو ہماری عمر بھی
۔۔ دے، ہم یہ کس طرح گوارا کریں گے کہ آپ کی عمر میں کچھ کمی ہو جائے"۔

آپ نے اپنے دوسرے بیٹے ابراہیم سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا۔ "بیٹے
ابراہیم! اس سلسلے میں تم کیا کہتے ہو؟"

ابراہیم نے غمزدہ ہو کر جواب دیا۔ "وہی جو ابھی ابھی بھائی عبدالقادر
۔۔ما چکے ہیں!"

اس کے بعد آپ اپنے تیسرے صاحبزادے شبلی سے مخاطب ہوئے
"اور شبلی! تم کیا کہتے ہو؟"

شبلی نے اپنی اندرونی اذیت چھپاتے ہوئے بجبر عرض کیا۔ "باداجان
میرا جواب اپنے دونوں بھائیوں سے مختلف ہے!"

شیخ جلال نے کہا۔ "ہاں ہاں کہو جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہہ
۔۔، شرماؤ نہیں!"

شبلی نے رقت زدہ آواز میں جواب دیا۔ "باداجان! میری دُعا ہے
کہ خدا آپ کی عمر دراز کرے لیکن اگر حکمِ الٰہی یہی ہے کہ آپ اپنی عمر کا کچھ حصہ
حضرت جہانیاں جہاں گشت کو مرحمت فرما دیں تو آپ کو تعمیلِ حکم میں ذرا سی
دیر بھی نہیں کرنی چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ عدم تعمیل کے باعث آپ کو شرمندگی
اٹھانی پڑے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایسی ایسی ہزار
جانیں نثار کر دی جائیں تب بھی کوئی بات نہیں۔"

شیخ جلال شبلی کے اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور کہا۔
"شبلی! ذرا میرے قریب تو آؤ!"

شبلی اٹھ کے باپ کے قریب پہنچ گئے۔ باپ نے بیٹے کا چہرہ ہاتھوں
میں تھام کے قریب کیا اور پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے فرمایا۔ "خدا تمہاری عمر دراز
کرے شبلی، تمہارے جواب نے ہماری طبیعت خوش کر دی۔"

اس کے بعد آپ نے سب کو چلے جانے کا حکم دیا اور خود استغراق
میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھول دیں اور اپنے آس پاس دیکھا۔ بڑے
صاحبزادے عبدالقادر اب بھی موجود تھے۔ آپ نے انھیں مسکرا کے دیکھا اور
دریافت کیا۔ "تم نہیں گئے، ابھی تک بیٹھے ہو؟"

عبدالقادر نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ "باداجان! مجھے آپ کی فکر
پریشان کر رہی ہے!"

شیخ جلال نے کہا۔ "جب تم یہاں بیٹھے ہی رہ گئے ہو تو ذرا میرے
ساتھ چلو"۔

عبدالقادر نے پوچھا۔ "کہاں باداجان؟"

آپ نے جواب دیا۔ "جہاں میں جا رہا ہوں!"

"آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟" عبدالقادر کو حیرت تھی کہ جو

شخص ایک عرصے سے خانقاہ سے باہر نہ گیا ہو اس نے اس وقت کہاں
جانے کا ارادہ کر لیا ہے؟

شیخ جلال کھڑے ہو گئے۔ "اپنا داہنا پیر عبدالقادر کی طرف بڑھاتے
ہوئے کہا۔ "عبدالقادر! میرے پیروں پہ اپنے پیر رکھ دو!"

بیٹے نے باپ کے حکم کی تعمیل کر دی۔

باپ نے مزید حکم دیا۔ "اپنی آنکھیں بند کر لو!"

بیٹے نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد آپ نے حکم دیا۔ "آنکھیں
کھول دو!"

بیٹے نے آنکھیں کھول دیں تو حیرت کی انتہا نہ رہی، یہ پانی پت سے
بالکل مختلف جگہ تھی، ڈرتے ڈرتے باپ سے پوچھا۔ "باداجان! یہ کون سی جگہ ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "دہلی، ہم مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پاس
چل رہے ہیں، سامنے دیکھو وہ ان کا آستانہ ہے!"

بیٹے نے حیرت سے جہانیاں جہاں گشت کے آستانے کی طرف
دیکھا اور باپ کے ساتھ چل دیا۔ جب یہ لوگ آستانے میں داخل ہوئے اس
وقت جہانیاں جہاں گشت پر نزع کا عالم طاری تھا۔ ان کے آس پاس
مریدوں اور عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ ہندوستان کا بادشاہ فیروز شاہ
تغلق بھی جہانیاں جہاں گشت کا مرید تھا۔ اس وقت وہ بھی آیا ہوا تھا لیکن
اپنے پیر کی آخری حالت کا اندازہ کر کے وضو کرنے چلا گیا تھا۔ شیخ جلال نے
جہانیاں جہاں گشت کے سرہانے کھڑے ہو کے آواز دی۔ "مخدوم جلال بخاری"
جہانیاں جہاں گشت نے آنکھیں کھول دیں اور شیخ جلال کو دیکھ
کر مسکرانے لگے۔

آپ نے پوچھا۔ "کیا حال ہے؟"

جہانیاں جہاں گشت نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ "اللہ کا شکر ہے،
ایسا لگتا ہے جیسے چل چلاؤ کا وقت قریب آگیا ہے!"

آپ نے کہا۔ "نہیں ایسا نہیں ہوگا، اٹھو اور وضو کرو!"

جہانیاں جہاں گشت بمشکل اُٹھے، شیخ جلال نے انھیں وضو کرایا اور
دو رکعت نماز پڑھائی۔ اس کے بعد اپنے ہاتھوں کی دسوں انگلیاں ان کے
جسم پر پھیرتے ہوئے فرمایا۔ "مخدوم جلال! میں بحکمِ خدا اپنی زندگی کے دس
سال تمہیں بخشتا ہوں!"

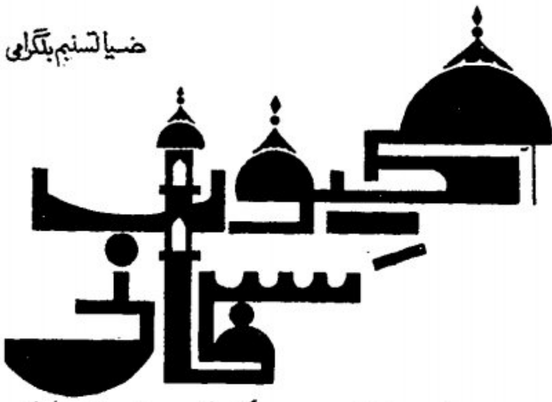
جہانیاں جہاں گشت کو ایسا محسوس ہوا جیسے توانائی کی تیز رو ان
کے جسم میں اچانک داخل ہو گئی ہے۔

شیخ جلال نے اپنے بیٹے عبدالقادر سے کہا۔ "بس بیٹے اب واپسی کی
تیاری کرو، اپنا کام ختم ہو گیا!"

بیٹا باپ کے حکم کی تعمیل میں چُپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ باپ نے حکم دیا
"میرے پیروں پہ اپنے پیر رکھ لو!"

بیٹے نے باپ کے پیروں پر اپنے پیر رکھ دیے حکم ملا "آنکھیں بند کر لو!"
عبدالقادر نے آنکھیں بھی بند کر لیں اس کے بعد پھر حکم ملا۔ "آنکھیں کھول دو"

ضیا تسنیم بلگرامی



سلطان فیروز شاہ تغلق اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ دہلی جا رہا تھا۔ جب یہ لشکر سہرند نامی مقام پر پہنچا تو لوگوں نے یہاں سے بہت جلدی گزر جانا چاہا کیونکہ سہرند کا مطلب تھا شیروں کا مسکن۔ اس غیر محفوظ اور خطرناک جگہ کون رک سکتا تھا۔ یہ لشکر سہرند سے ابھی تھوڑی ہی دور پہنچا ہوگا کہ پتہ چلا، لشکر کے ایک بزرگ شیروں کے مسکن ہی میں رہ گئے ہیں۔ بادشاہ نے ایک دستے کو حکم دیا کہ ان بزرگ کو جبراً لایا جائے۔ یہ دستہ شاہی حکم نامہ لے کر جب ان بزرگ کے پاس پہنچا تو انھوں نے نہایت نرمی سے تعمیلِ حکم سے انکار کر دیا۔ دستے کے افسر نے بزرگ کا احترام کرتے ہوئے کہا: "حضرت سلامت! ہم آپ کو ساتھ لیے بغیر کس طرح واپس جا سکتے ہیں، شاہی حکم کی تعمیل ہم پر فرض ہے، اس ناگوار فرض کی بجا آوری میں، خدا کے لیے ہماری مدد فرمائیں۔"

یہ بزرگ اٹھ کھڑے ہوئے، فرمایا: "اچھا اگر یہ بات ہے تو ہم ساتھ چلتے ہیں اور بادشاہ سے مل کر پھر واپس آ جائیں گے۔"

جب انھیں فیروز شاہ تغلق کے روبرو پیش کیا گیا اور اس نے سہرند میں قیام فرما ہو جانے کا سبب دریافت کیا تو ان بزرگ نے جواب دیا: "سلطان! ہمیں سہرند میں القا ہوا ہے کہ اس جگہ ایک ایسا شخص پیدا ہونے والا ہے جو مجددالامت ہوگا اور دین کو حیاتِ نو بخشے گا، ہم سہرند سے شیروں کو نکال کر اسے انسانی بستی میں تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔"

بادشاہ نے مسکرا کر دریافت کیا: "کیا آپ تن تنہا اس خطرناک جگہ کو آباد کر سکیں گے؟"

بزرگ نے جواب دیا: "انشاء اللہ۔"

بادشاہ ان کی ہمت اور عزیمت پر ششدر رہ گیا، بولا۔ "آپ ہمارے ساتھ رہیں اور مطمئن رہیں، اگر اللہ کو یہی منظور ہے کہ سہرند آباد ہو اور یہاں اس کا ایک محبوب بندہ پیدا ہو تو اس جگہ کو وہ ہمارے ذریعے انسانی بستی میں تبدیل فرما دے گا۔"

یہ بزرگ بادشاہ کی ہمت افزا گفتگو سے مطمئن ہو کر اس کے ساتھ دہلی چلے گئے۔ ابھی دہلی پہنچے ہوئے انھیں چند ہی دن گزرے تھے کہ بادشاہ کو مطلع کیا گیا: "اوچہ سے جہاں پناہ کے پیر مرشد حضرت جلال الدین بخاری تشریف لانے والے ہیں۔"

بادشاہ ان کی پیشوائی کو نکل کھڑا ہوا اور سونی پت سے آگے کنور تک ان کے استقبال کو پہنچ گیا۔ بادشاہ اپنے پیر و مرشد کو دیکھتے ہی ادب سے جھک گیا اور مصافحے کو بڑھے ہوئے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا: "حضرت کی تشریف آوری کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں؟ کیا یہ گناہگار مقصدِ تشریف آوری سے آگاہ کیا جائے گا؟"

مخدوم جلال الدین بخاریؒ نے دنیاداری اور آدابِ سلطانی کا خیال کیے بغیر جواب دیا: "سلطان! اوچہ کے آس پاس کے لوگ مالیے کی رقم دہلی پہنچانے میں قباحت اور دشواری محسوس کرتے ہیں۔"

بادشاہ نے التجا آمیز لہجے میں کہا: "پھر جیسا حضورِ والا حکم دیں اس پر عمل کیا جائے!"

مخدوم جلال الدین بخاری نے جواب دیا: "ہم چاہتے ہیں، دہلی اور اوچہ کے درمیان ایک نیا شہر بسایا جائے اور شاہی مالیہ اس نئے شہر میں جمع کرایا جائے۔"

بادشاہ کو سہرند کا واقعہ یاد آ گیا۔ معنی خیز ہنسی ہنستے ہوئے کہا: "حضرت کے حکم کی تعمیل کی جائے گی اور سہرند میں ایک نئی آبادی بسا دی جائے گی۔"

چنانچہ بادشاہ نے اسی وقت خواجہ فتح اللہ نامی مقربِ خاص کو دو ہزار سوار دے کر حکم دیا: "سہرند کی آبادکاری اور قلعے کی تعمیر کا کام فوراً شروع کرا دیا جائے۔"

خواجہ فتح اللہ دھاوے مارتے سہرند پہنچے اور آس پاس کی آبادیوں سے مزدور فراہم کر کے جنگل کی صفائی شروع کرا دی۔ ان

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

حضرت مجدد الف ثانی، مولانا سید زوار حسین شاہ ○ رودِ کوثر، شیخ محمد اکرام ○ انوارِ اولیاء، رئیس احمد جعفری ○ انوارِ اصفیاء، غلام علی اینڈ سنز ○ تزکِ جہانگیری، جہانگیر ○ منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ○ مآثر الامراء، صمصام الدولہ

میں بہت سے آدمیوں کو فوجیوں نے بیگار میں پکڑ کر کام سے لگا دیا۔ ان سب کے ذمے پہلا کام تھا قلعے کی تعمیر۔ ہزاروں آدمی قلعے کی فصیل صبح سے شام تک تعمیر کرتے اور جب دُوسرے دن صبح پھر وہاں پہنچتے تو وہ فصیل منہدم ہو چکی ہوتی۔ دو چار دن تک تو لوگ یہی سمجھتے رہے کہ یہ محض اتفاق کا کرشمہ ہے لیکن جب ہفتے بھر یہی ہوتا رہا تو لوگوں کے کان کھڑے ہوتے۔ خواجہ فتح اللہ نے بادشاہ کو اس نئی افتاد سے مطلع کرتے ہوئے لکھا۔

"ہر روز قلعے کی فصیل اٹھائی جاتی ہے اور رات کو ڈھے جاتی ہے۔ ہم لوگ سخت پریشان ہیں کہ یہ کیا اسرار ہیں۔ اگر یہ عمل یوں ہی جاری رہا تو یہ کام قیامت تک جاری رہے گا اور قلعے کی تعمیر کبھی بھی مکمل نہ ہو سکے گی۔ حضورِ والا سے التماس ہے کہ وہ اپنے گراں قدر مشورے اور تدبیرِ عالی سے بندگانِ خدا کو سرفراز فرمائیں کہ یہ کام اپنے انجام کو پہنچے۔ ورنہ یہاں وقت ضائع کرنے کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔"

بادشاہ نے فتح اللہ کا مراسلہ مخدوم جلال الدین بخاری کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے عرض کیا۔ "حضرت! اس مشکل کا حل ہم گناہگاروں کے بس کا کب ہے، اسے بھی آپ ہی دُور فرمائیں۔"

مخدوم بخاری نے آنکھیں بند کر لیں اور مراقبے میں چلے گئے، ذرا دیر بعد آنکھیں کھولیں اور اپنے خلیفہ اور امامِ نماز رفیع الدین کو طلب کیا۔ جب یہ آگئے تو انھیں حکم دیا۔ "رفیع الدین! اپنے بھائی خواجہ فتح اللہ کے پاس سہرند تم جاؤ اور اپنی نگرانی میں قلعے کی تعمیر کا کام انجام دو!"

رفیع الدین بھی اس مشکل سے آگاہ ہو چکے تھے کیونکہ خواجہ فتح اللہ ان کے حقیقی بڑے بھائی تھے اور انھوں نے رفیع الدین کو سب کچھ پہلے ہی سے بتا رکھا تھا۔ رفیع الدین اپنے پیر و مرشد کا حکم پا کر سہرند جانے کی تیاری کرنے لگے۔ روانگی سے پہلے حضرت مخدوم بخاری نے انھیں ایک اینٹ دی اور فرمایا۔ "بنیاد میں اسے رکھ دینا، یہ اینٹ تمھاری مشکلات دُور کر دے گی اور وہ صاحب بھی سامنے آجائیں گے جو فصیل کی تعمیر میں مزاحم ہو رہے ہیں۔"

رفیع الدین اسی وقت سہرند روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر اینٹ قلعے کی بنیاد میں رکھ کر تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ وہ پہلی رات بڑی بے چینی کی تھی۔ خواجہ فتح اللہ اور امام رفیع الدین کو نتیجے کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔ دُوسرے دن صبح فصیل کی دیوار جوں کی توں کھڑی تھی مزدور کام میں لگ گئے اور فصیل کا کام مکمل کیا جانے لگا۔ رفیع الدین کام کا جائزہ لیتے ہوئے جب اس حصّے میں پہنچے جہاں بیگار کے لوگ کام کر رہے تھے تو ذرا ٹھٹک گئے۔ انھوں نے دیکھا ایک شخص انھیں نہایت خشمناک نظروں سے گھور رہا ہے۔ امام رفیع الدین نے اس شخص کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور کہا۔ "حضرت! آپ یہاں کہاں؟ ادھر میرے پاس آجایئے۔"

اس شخص نے غصّے سے جواب دیا۔ "مخدوم سے کہہ دینا، ہم نے تیرا خیال کیا ہے ورنہ تیری ایک اینٹ کی حیثیت ہی کیا تھی، اسے بھی اکھاڑ پھینکتے۔"

رفیع الدین نے عاجزی سے کہا۔ "حضرت! آپ اتنے برہم کیوں ہیں، آخر ہم گناہگار موردِ عتاب کیوں ہیں؟ کیا آپ اس شہر کی تعمیر سے ناخوش ہیں؟"

ان صاحب نے جواب دیا۔ "یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تیرے بھائی فتح اللہ کے آدمی ہمیں بھی بیگار میں پکڑ لائے، ہم نے بھی یہ سوچا کہ چلو بیگار میں کام لینے ہو تو لیتے رہو، کب تک لوگے، آخر عاجز آکر بھاگ کھڑے ہو گے۔"

رفیع الدین نے عجز و انکسار سے جواب دیا۔ "یہ لوگوں کی بدنصیبی اور کور چشمی ہے کہ وہ حضرت شیخ شرف الدین بو علی قلندر سے واقف نہیں۔ اگر انھیں آپ کی ذاتِ اقدس کا علم ہوتا تو وہ ایسی غلطی ہرگز نہ کرتے، اب آپ انھیں معاف فرما دیں اور قلعے کی تعمیر کا کام مکمل ہو جانے دیں۔"

بُو علی شاہ قلندر نے فرمایا۔ "رفیع الدین! تو وہ صحیح آدمی ہے جو اس کام پر متعین کیا گیا ہے شاید تجھے نہیں معلوم کہ وہ شخص جس کے لیے یہ قلعہ بن رہا ہے اور شہر تعمیر ہو گا تیری ہی نسل سے پیدا ہو گا۔ اب ہم خود بھی اس قلعے اور شہر کی تعمیر میں تیرا ہاتھ بٹائیں گے۔"

اس کے بعد امام رفیع الدین اور بُو علی شاہ قلندر کی نگرانی میں قلعے اور شہر کی تعمیر کا کام شب و روز انجام پانے لگا اور جو پہلے سہرند (شیروں کا مسکن) تھا۔ ایک مدت گزرنے پر سرہند ہو گیا اور پھر ایسا وقت آیا کہ اسے سرہند شریف کہا جانے لگا۔

امام رفیع الدین سرہند میں آباد ہو گئے اور ان کی چھٹی نسل میں شیخ عبدالاحد کے گھر میں ایک بچّہ پیدا ہوا، جس دن یہ بچّہ پیدا ہوا، اسی رات مغل فرماں روا اکبرِ اعظم نے ایک وحشت ناک خواب دیکھا۔ اس نے

خواب میں دیکھا کہ شمال سے ایک تیز و تند آندھی اٹھی اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اکبرِ اعظم کو تخت سمیت اپنی گرفت میں لے لیا۔ بادشاہ نے بڑے ہاتھ پیر مارے لیکن بس نہ چلا۔ تند و تیز آندھی نے بادشاہ کو تخت سمیت زمین پر پٹخ دیا۔

اکبر نے بیدار ہوتے ہی معبروں (خواب کی تعبیر بتانے والوں) کو طلب کیا اور خواب بیان کر کے تعبیر دریافت کی۔ کسی معبر نے ڈرتے ڈرتے تعبیر بیان کی۔ "آج کسی ایسے بچے کی ولادت ظہور میں آئی ہے جو بڑا ہو کر آپ کے آئینِ سلطنت کو متزلزل کر دے گا۔"

تعبیر تشویش ناک تھی لیکن یہ کام بھی بہت دشوار تھا کہ پورے ہندوستان کے ان بچوں کا پتہ چلایا جاتا جو اس رات (۱۴ شوال ۹۷۱ھ، ۱۵۶۴ء شبِ جمعہ) کو پیدا ہوتے تھے اور اگر ان بچوں کا کسی طرح پتہ بھی چلا لیا جاتا تو ان میں اس تشویش ناک بچے کی شناخت کس طرح عمل میں آتی۔

عبدالاحد اس بچے کو شاہ کمال کیتھلی کی خدمت میں لے گئے۔ آپ نے بچے کو دیکھتے ہی فرمایا: "عبدالاحد! تیرے گھر میں تو عالمِ باعمل اور عارفِ کامل پیدا ہوا ہے۔ اس کی ہدایت و ارشاد کا نور بدعت و گمراہی کی تاریکیوں کا خاتمہ کر دے گا۔"

اس کے بعد شاہ کمال نے بچے کے منہ میں اپنی انگلی دے دی۔ بچہ انگلی چوسنے لگا۔ یہاں تک کہ کچھ دیر بعد شاہ کمال نے اپنی انگلی کھینچ لی اور فرمایا: "بابا بس کرو، بس اتنا ہی کافی ہے، کچھ ہماری اولاد کے لیے بھی تو چھوڑ دو، تم نے تو ہماری نسبت ہی کھینچ لی!"

بچے کا نام شیخ احمد رکھا گیا جو بعد میں شیخ احمد سرہندی مجددِ الفِ ثانی کے نام سے مشہور ہوا۔

اس بچے کی ابتدائی تعلیم تو عبدالاحد کے ذمے رہی لیکن بعد میں مولانا کمال الدین کشمیری اور شیخ یعقوب کشمیری کا شرفِ تلمذ حاصل رہا۔ مولانا کمال الدین کشمیری نے معقولات کی چند مشکل کتابیں پڑھائیں، یہ وہ بزرگ ہیں جنھیں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے استاد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ شیخ یعقوب کشمیری نے احادیث کا درس دیا۔

شیخ احمد نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہ زہد و ورع کا ماحول تھا لیکن اس سے ہٹ کر، دور دور تک اکبری عہد کی ساری خرابیاں موجود تھیں۔ اکبر کو علمائے وقت نے انسانِ کامل قرار دے دیا تھا۔ بادشاہ کو سجدہ کرنا فرضِ عین قرار پا گیا۔ چہرۂ شاہی کو کعبۂ مراد اور قبلۂ حاجات کہا جانے لگا۔ دینِ الٰہی وجود میں آچکا تھا۔ عربی مہینے موقوف ہو چکے تھے۔ ان کی جگہ اکبری سالِ جلوس سے دینِ الٰہی کا نیا سن جاری ہوا تھا۔ زرتشتیوں کی طرح سال میں چودہ عیدیں منائی جانے لگی تھیں۔ مسلمانوں کی عیدیں اپنی رونق کھو بیٹھیں لیکن جمعے کی نماز اور خطبے کا التزام یوں باقی رکھا گیا کہ خطبے میں بادشاہ کا نام پڑھا جاتا تھا۔ نئی تقویم میں سال کو سنِ الٰہی اور مہینوں کو ماہِ الٰہی کا نام دیا گیا۔ سکوں پر تاریخ "الف" ثبت کرائی گئی جس کا مطلب تھا اسلام کے ایک ہزار سال بیت جانے کی وجہ سے یہ مذہب ختم ہو چکا ہے، اس کی جگہ دینِ الٰہی نے لے لی ہے۔ تاریخِ اسلام ازسرِ نو ترتیب دی جانے لگی اور اس کا نام تاریخِ الٰہی رکھا گیا۔ اکبر نے مورخین کو حکم دیا کہ سنِ ہجری کی جگہ سنِ رحلت لکھا جائے۔ بادشاہ صبح سے شام تک چار مرتبہ آفتاب کی پرستش کرتا۔ آفتاب کے ایک ہزار ایک ہندی ناموں کا وظیفہ پڑھتا۔ یہ وظیفہ دوپہر کے وقت پڑھتا تھا۔ وظیفہ پڑھنے کے دوران بادشاہ اپنے دونوں کانوں کو پکڑ لیتا اور اپنا سر ادھر ادھر ہلا کر کان کی لو پر مکے لگاتا۔ یہ توبہ و استغفار کی ایک شکل تھی۔ گاؤ کشی ممنوع قرار پائی۔ سور اور کتے حلال قرار دیے گئے۔ کتوں اور سوروں کو شاہی محل کے نیچے اس غرض سے رکھا جاتا کہ بادشاہ علی الصباح ان کے دیدار کو عبادت تصور کرتا تھا۔ سور کی نسبت ہندوؤں نے بادشاہ کو یہ باور کرا رکھا تھا کہ سور ان دس مظاہر میں سے ہے جن میں بھگوان نے حلول کیا ہے۔ کتوں کی نسبت بعض مسلمان عارفوں نے یہ باور کرا دیا تھا کہ اس میں دس ایسی صفات پائی جاتی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی کسی انسان کو حاصل ہو جائے تو وہ ولی ہو جائے۔ فیضی اپنے دسترخوان پر کتوں کو ساتھ لے کر بیٹھنے لگا۔ بادشاہ کی کتوں سے عقیدت اور فیضی کی پیروی میں ہندوستان اور عراق کے بعض شعرا فخریہ کتوں کی زبانیں اپنے منہ میں لے کر پیار کیا کرتے تھے۔ غسلِ جنابت حرام قرار پایا اور دلیل یہ دی گئی کہ بول و براز کے اخراج پر تو غسل واجب نہیں ہے۔ پھر اس پاکیزہ اور لطیف مادے کے اخراج پر غسل کیوں واجب قرار دیا جائے جس سے انسان وجود میں آیا اور جس پر انسانی اور حیاتِ حیوانی کے استقرار اور تسلسل کا انحصار ہے۔ سود اور جوا حلال قرار پائے۔ دربار میں قمار خانہ تعمیر ہوا۔ جواریوں کو شاہی خزانے سے سود پر قرض دینے کا حکم دیا گیا کیونکہ اس سے خزانے کی دولت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ عربی زبان ممنوع قرار پائی۔ عربی پڑھنا یا جاننا مطعون اور مردود قرار دیا گیا۔ بادشاہ نے عربی کے خاص حروف، ث، ح، ع، ص، ض اور ط، ظ کو بول چال سے نکال دیا چنانچہ عبداللہ کو ابداللہ، احمد کو اہمد، علم کو الم، ثواب کو سواب وغیرہ لکھا یا بولا جاتا تو بادشاہ بہت خوش ہوتا۔ السلام علیکم کی جگہ "اللہ اکبر" کہا جاتا کیونکہ اس میں بادشاہ کا نام بھی شامل تھا۔ جواب

میں لوگ "جلّ جلالہ" کہتے کیونکہ اس میں بھی جلال الدین کا ایک جزو موجود
تھا۔ یہ وہ حالات ہیں، جن میں شیخ احمد سرہندی پرورش پا رہے تھے۔
تعلیم سے فراغت حاصل کرکے آپ اکبر آباد تشریف لے گئے
وہاں ان کی بڑی بڑی یگانۂ روزگار اور نادرہ صفات شخصیات سے
روابط قائم ہوئے۔ ان میں ابوالفضل اور فیضی کا نام بھی شامل ہے۔ یہ
دونوں بھائی شیخ احمد کی علمیت اور قابلیت کے بڑے معترف رہے یہاں
تک کہ فیضی کو قرآن پاک کی بے نقط تفسیر میں بعض جگہ حروفِ غیر منقوطہ
کا سہارا نہ ملا تو اس نے شیخ احمد سے رجوع کیا اور انھوں نے وہ
مشکل حصّہ خود مکمل کر دیا۔
بیٹے کو اکبر آباد میں رہتے ہوئے جب ایک مدّت ہو گئی تو شیخ
عبدالاحد کی شفقتِ پدری کے لیے ان کی جدائی ناقابلِ برداشت ہو گئی
اور وہ بیٹے کو سرہند واپس لانے کے لیے اکبر آباد پہنچ گئے، وہاں کا
ایک بڑا حلقہ ان کی بزرگی اور فضیلت کا معتقد اور معترف تھا۔ چنانچہ عبدالاحد
کے گرد لوگ پروانہ وار جمع ہونے لگے اور بعض نے ازراہِ عقیدت مؤدبانہ
عرض کیا کہ "اس ضعفِ پیری میں بُعدِ مسافت کی یہ مشقت کیوں اختیار فرمائی؟"
عبدالاحد نے جواب دیا "کیا کروں شیخ احمد کی محبّت یہاں کھینچ
لائی ہے۔"
کچھ دن قیام فرما کر عبدالاحد نے بیٹے کو ساتھ لیا اور سرہند
واپس ہوئے۔ راہ میں تھانیسر میں قیام کیا اور وہاں کے حاکم اور رئیس
شیخ سلطان کے مہمان ہوئے۔ شیخ سلطان علم و فضیلت میں بلند مقام
رکھتے تھے اور انھیں بادشاہ کا قرب بھی حاصل تھا لیکن بادشاہ کے عقائد
اور مروّجات سے انھیں نفرت تھی اسی لیے دُور دُور رہنے لگے تھے۔
عبدالاحد اور شیخ احمد کی تشریف آوری سے پہلے انھوں نے ایک رات
خواب میں دیکھا کہ رسُولِ مقبولؐ فرما رہے ہیں۔
"شیخ سلطان! تیری بیٹی اس عہد کی سب سے زیادہ نیک خاتون ہے،
تو اُس کا نکاح میرے فرزند اور نائب شیخ احمد سے کر دے اس میں خود
تیرے اور تیری بیٹی کے لیے بڑی سعادتیں ہیں۔"
شیخ سلطان شیخ احمد سے واقف بھی نہ تھے۔ پورا دن اسی فکر
میں گزار دیا کہ آخر یہ شیخ احمد کون بزرگ ہیں جن کی بابت رسُول اللہؐ بیٹی
کی شادی کا حکم فرما رہے ہیں۔ دوسری رات پھر یہی خواب دیکھا اور دوسرا
دن بھی اسی فکر میں گزر گیا۔ تیسری رات پھر یہی خواب نظر آیا اور آخر شیخ
سلطان نے رسُول اللہؐ سے پوچھ لیا "حضور! یہ گناہ گار شیخ احمد سے
واقف نہیں ہے، براہِ کرم ان سے ملوا دیا جائے اور انھیں پہنچوا دیا جائے۔"

خواب ہی میں رسُول اللہؐ نے شیخ احمد کو ان کے روبرو کھڑا کر دیا
اور فرمایا "لے انھیں پہچان لے، یہ ہے ہمارا فرزند اور نائب شیخ احمد۔"
شیخ سلطان نے ان کی شکل خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لی۔
چنانچہ جب شیخ احمد اپنے والد کے ساتھ ان کے گھر مہمان ہوئے تو شیخ
سلطان نے انھیں پہچان لیا اور بے چین ہو گئے۔ پھر بھی مزید تحقیق
اور تفتیش کے پیشِ نظر کئی دن خاموش رہے اور ان کے روز و شب کے
لمحات کا بہ نظرِ غائر جائزہ لینے لگے کہ وہ کن نیک و بد امور میں گزرتے ہیں
اور چند ہی دن میں ان پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ شیخ احمد وہی ہیں
جن کی انھیں بشارت اور ہدایت مل چکی ہے۔ پھر بھی وہ بیٹی والے تھے
اپنی طرف سے بات کرنے میں ذرا تأمل اور ندامت محسوس ہوئی لیکن
رسُول اللہؐ کی محبت اور ہدایت شرم و ندامت پر غالب آئی اور سب کچھ
عبدالاحد کے سامنے عرض کر دیا۔ باپ نے سرِ تسلیم خم کر دیا، کہا "کس میں
اتنی ہمت ہے کہ رسُول اللہؐ کے حکم سے سرتابی اور انحراف کرے،
میں تیار ہوں۔"
شادی کا اہتمام ہوا اور شیخ احمد رشتۂ ازدواج سے وابستہ کر
دیے گئے اور یہ اپنی بیوی کو لے کر سرہند چلے گئے۔ شادی کے وقت
آپ کی عمر تقریباً پچیس ۲۵ سال تھی۔ شادی کے بعد آپ کو اتنا مال میسّر آیا کہ
صاحبِ مال بھی ہو گئے۔
شیخ عبدالاحد انھیں فقر و سلوک کا درس دے رہے تھے اور
شیخ احمد کے اندر ایک اور ہی انقلاب برپا تھا۔ وہ عہدِ اکبری کے فتنوں
سے نبرد آزما ہونے کے ارادے کر رہے تھے لیکن شاید ابھی وہ وقت
نہیں آیا تھا کیونکہ ان کا ہر کام "اُدھر کے اشارے" کا تابع تھا۔
آپ کو ذہنی سکون حاصل نہ تھا۔ اُمّتِ محمّدیہ کی بے بسی اور
مظلومی پر آپ کا دل کڑھتا رہتا اور اس کا سب سے زیادہ افسوس ناک
اور تکلیف دہ یہ پہلو تھا کہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا مسلمانوں ہی کے ہاتھوں
ہو رہا تھا۔ ہندو جو چاہتے، وہی ہو کر رہتا اور ان کا رویّہ جارحانہ تھا۔
آپ کے خسر حاجی سلطان تھانیسری بادشاہ کے زیرِ عتاب آ گئے۔ تھانیسر
کے ہندوؤں نے ان کے خلاف بادشاہ سے بار بار شکایتیں کی تھیں کہ
وہ گاؤ کشی کرتے رہتے ہیں۔ بادشاہ نے انھیں اس جرم میں بھکر
جلاوطن کر دیا تھا لیکن کچھ عرصے بعد خانخاناں کی سفارش پر دوبارہ
تھانیسر واپس بلا لیے گئے لیکن بادشاہ کا دل ان سے صاف نہ تھا۔
یہ ساری باتیں شیخ احمد کے آس پاس پیش آ رہی تھیں اور ان کے دل
پر ان کا گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ اسی دوران ایک نہایت تلخ و ناگوار واقعہ

پیش آیا۔

بادشاہ لاہور سے واپس آرہا تھا۔ راہ میں تھانیسر پڑتا تھا چند دنوں کے لیے یہاں بھی قیام کیا۔ حاجی سلطان نے بادل ناخواستہ حاضری دی۔ بادشاہ کو ان سے بڑی شکایتیں تھیں۔ اس نے حاجی سلطان سے کہا: "سلطان! ہم نے تم سے ایک بار کہا تھا کہ تم ہمارے لیے قرآن لکھو، کیا بات ہے تم نے اب تک اس کی تعمیل کیوں نہیں کی؟"

حاجی سلطان نے دلیرانہ جواب دیا: "تم جبریل کو آسمان سے بلاؤ، یا وہ تمہارے لیے قرآن لائے تو میں بھی بادشاہ کے حکم کی تعمیل کروں۔"

خوشامدی مصاحبین نے بادشاہ کو چڑھایا اور حاجی سلطان کے جواب کو گستاخی قرار دیا۔ بادشاہ نے برہمی سے سوال کیا: "اور اس بات کا تیرے پاس کیا جواب ہے کہ تو نے بارہ سال سے سرکاری خزانے میں ایک پیسہ بھی داخل نہیں کیا، وہ بارہ سالہ خراج کہاں گیا؟"

حاجی سلطان نے اسی شانِ بے نیازی اور دلیری سے جواب دیا: "تو مُرتد ہوگیا ہے اور مرتد کا مال علما، فقرا اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دینا جائز ہے۔ میں نے بارہ سالہ لگان اور مالیے کی رقم فقرا اور مساکین میں تقسیم کر دی۔"

بادشاہ کی پیشانی پر شکنیں پڑگئیں اور وہ جوشِ غضب میں کوئی حکم دینے ہی والا تھا کہ حاجی سلطان نے ایک پتھر اٹھا کر تاک کے بادشاہ کے چہرے پر کھینچ مارا۔ اکبر کی شکن آلود پیشانی لہولہان ہوگئی۔ اکبر نے اسی وقت حاجی سلطان کو سُولی پر چڑھا دینے کا حکم صادر کر دیا، جس پر فوراً عمل درآمد ہوا اور حاجی سلطان کو سُولی پر چڑھا دیا گیا۔

شیخ احمد کے دل پر ایک اور زخم لگا۔ خسر کی موت کے پچیس[25] دن بعد شیخ عبدالاحد کا انتقال ہوگیا۔ یہ صدمہ بھی جھیلا اور حج کے ارادے سے دہلی چلے گئے۔ وہاں مشہور بزرگ خواجہ باقی باللہ سے ملاقات ہوگئی اور دونوں میں ربط و ارتباط اتنا بڑھا کہ شیخ احمد نے خواجہ باقی باللہ سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ خواجہ باقی باللہ کے اپنے اس مُرید کی بابت کیسے احساسات تھے؟ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ آپ نے اپنے کسی دوست سے شیخ احمد کا اس طرح تعارف کرایا۔

"اہلِ سرہند سے ایک بزرگ شیخ احمد بڑے عالم فاضل ہیں جو قوتِ عمل سے بھی متصف ہیں۔ فقیر نے چند روز ان کی صحبت میں نشست و برخاست کر کے بہت سے عجائبِ روزگار کا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ ایک چراغ ہیں جو ایک عالم کو منور کر دیں گے۔"

مامون رشید کے مشہور جنرل طاہر بن حسین کو ایک شخص نے بڑی گالیاں دیں اور یہ خاموشی سے سُنتا رہا۔ اس کے ایک دوست نے کہا: "طاہر! تم عہدِ مامون کے سب سے بڑے جنرل ہو، اس شخص کو تم کوئی سزا کیوں نہیں دیتے؟"

طاہر نے جواب دیا: "مچھر کو مارنے کے لیے طاقت کا استعمال فضول سی بات ہے۔"

دوست نے کہا: "تب پھر تم جوابی گالیاں دے کر اس کی زبان بند کر سکتے ہو!"

طاہر ہنسا، جواب دیا: "میں ایسی لڑائی میں حصہ نہیں لینا چاہتا جس میں غالب مغلوب سے زیادہ ذلیل ہو جاتا ہے۔"

آپ نے خواجہ باقی باللہ کی زیرِ تربیت سلوک کی منزلیں طے کیں اور ان کی ایما پر لاہور تشریف لے گئے۔ کشف و کرامات کا ظہور اور نزول شروع ہو چکا تھا۔

دورانِ سفر آپ اپنے احباب اور عقیدت مندوں کے ساتھ ایک سرائے میں فروکش ہوئے۔ آپ نے قدرے سکوت اور مراقبہ اختیار کیا پھر فرمایا: "لوگو! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج اس سرائے پر کوئی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔"

حاضرینِ صحبت نے دریافت کیا: "حضرت اس سے مفر اور بچت کی تدبیر بھی ارشاد فرمائیں۔"

آپ نے ارشاد فرمایا: "اس دُعائے ماثورہ کا ورد جاری رکھو:

بسم اللّٰہ الّذی لا یضرّ مع اسمہٖ شیءٌ فی الارض ولا فی السّمآء اور اعوذ بکلمات اللّٰہ التّامّات من شرّ ما خلق۔" آپ نے مزید فرمایا: "جو اس دُعا کا ورد رکھے گا، اس مصیبت سے محفوظ رہے گا۔"

تھوڑی دیر بعد ہی سرائے میں آگ لگ گئی اور یہ اتنی پھیلی کہ بجھانے کی جتنی کوشش کی گئی آگ بڑھتی چلی گئی اور سرائے کا سب کچھ جل گیا لیکن جن لوگوں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا تھا، ان کا سامان حیرت انگیز طور پر محفوظ رہا۔

لاہور کے جس مکان میں آپ قیام فرما تھے ایک دن نمازِ عشا کے بعد آپ نے اس مکان کی ایک دیوار کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا

"میں گھر کے جملہ افراد کو مطلع کرتا ہوں کہ کوئی شخص بھی اس دالان کے نزدیک نہ آئے اور نہ اس کے نزدیک سوئے۔"

کسی نے سوال کیا۔ "حضرت! یہ کیوں؟ یہ دیوار تو اچھی خاصی مضبوط ہے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے کشف میں اس دیوار کو گرا ہوا دیکھ لیا ہے۔"

کسی شخص نے خوش طبعی کے طور پر کہا۔ "حضرت معلوم نہیں کیا فرما رہے ہیں۔ میں نے تو اس سے زیادہ شکستہ اور کمزور دیواریں دیکھی ہیں، یہ تو بہت مضبوط ہے۔"

ایک خادمہ بھی یہ باتیں سن رہی تھی، اس نے بھی یہی سوچا کہ شیخ صاحب معلوم نہیں کیا فرما رہے ہیں، اچھا خاصا مضبوط دالان اچانک کیوں گرنے لگا۔ وہ اسی دالان میں سو گئی۔ ایک دوسری خادمہ نے بھی اس کی دیکھا دیکھی مگر ڈرتے ڈرتے اس دالان سے ذرا دور سونے کا انتظام کیا اور پڑ رہی۔ نصف شب کے بعد دالان اچانک گر گیا۔ گرنے کی آواز سن کر لوگ بھاگ کر شکستہ دالان کے پاس پہنچے اور اس میں سوئی ہوئی خادمہ کو آوازیں دینی شروع کر دیں لیکن اب وہ اس دنیا میں تھی ہی کب جو جواب دیتی، ہاں دوسرے دالان کے قریب سوئی ہوئی خادمہ کی چیخ پکار البتہ سنائی دے رہی تھی۔ دالان کی اینٹوں نے اس کی ایک ٹانگ زخمی کر دی تھی اور شدتِ کرب سے چلا رہی تھی۔

آپ بھی وہیں پہنچ گئے اور غصے میں فرمایا۔ "کیا ہم نے اس آفتِ ناگہانی سے سب کو عشا کے وقت آگاہ نہیں کر دیا تھا؟"

لوگوں نے مسکینوں کی طرح تائید میں گردنیں ہلا دیں۔ آپ نے حکم دیا۔ "اس زخمی خادمہ کو نکالا جائے۔"

خادمہ نکالی گئی اور اس وقت تو لوگوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے یہ دیکھا کہ خادمہ چوٹ چپیٹ سے بالکل محفوظ تھی اور ٹانگ کا جو حصہ اینٹ سے زخمی ہوا تھا، وہاں اب خراش تک نہ تھی۔



دہلی میں پیر و مرشد خواجہ باقی باللہؒ رحلت فرما چکے تھے۔ یہ تیزی سے دہلی چل پڑے۔ سرہند راہ میں پڑتا تھا لیکن آپ وہاں نہیں رُکے۔ دہلی میں پیر کے مزار پر حاضری دی اور سرہند واپس تشریف لے گئے۔ خواجہ باقی باللہؒ کے وصال کے دو سال بعد اکبرِ اعظم بھی چل بسا اور ہندوستان کے اقتدار کی باگ ڈور جہانگیر کے ہاتھ میں آئی۔ آپ نے اپنے مکاتیب کے ذریعے تجدیدِ اُمت کا کام شروع کر دیا تھا۔ آپ نے اپنے ہزاروں حلقہ بگوشوں کو خطوط لکھ کر تبلیغ و تلقین کا کام شروع کر دیا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آپ کی تجدید کا آغاز ۱۲ ربیع الاوّل ۱۰۱۱ھ سے ہوتا ہے جبکہ رسول اللہ صلعم کا سنِ وفات ۱۱ھ ہے۔ گویا ٹھیک ایک ہزار سال بعد۔ اسی دوران کیتھل سے شاہ سکندر تشریف لائے۔ یہ حضرت شاہ کمال کے پوتے تھے۔ اس وقت حضرت شیخ سرہندی مراقبے میں تھے۔ شاہ سکندر نے اپنا خرقہ ان کے کاندھے پر ڈال دیا۔ حضرت شیخ سرہندی نے آنکھیں کھول دیں اور دریافت فرمایا۔ "یہ کیا ہے؟"

شاہ سکندر نے جواب دیا۔ "رات حضرت شاہ کمال خواب میں تشریف لائے تھے۔ انھوں نے مجھے ہدایت کی کہ وہ جو خرقہ میرے پاس چھوڑ گئے ہیں، میں اسے آپ تک پہنچا دوں کیونکہ یہ خرقہ حضرت عبدالقادر جیلانی کی امانت تھا جو کئی واسطوں سے آپ کے لیے مجھ تک پہنچا تھا۔"

حضرت شیخ سرہندی نے وہ جبّہ اسی وقت پہن لیا اور اسی حالت میں زنان خانے میں تشریف لے گئے۔

اسی دوران مشہور اور معزز امرا، خانِ خاناں، خانِ اعظم، سید صدر جہاں، مرتضیٰ خاں اور مہابت خاں وغیرہ حلقۂ ارادت مندان میں داخل ہو چکے تھے۔ آپ انھیں مکاتیب کے ذریعے اس بات پر آمادہ کرتے رہتے کہ وہ بادشاہ کو خلافِ شرع اور مرتدانہ روش سے باز رکھیں لیکن ان کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔

آپ اپنے چند ساتھیوں کی معیت میں پا پیادہ ایک جنگل میں تشریف لے گئے۔ گرمی اور گرد و غبار کے زور نے لوگوں کے منہ پھیر دیے۔ ان میں کچھ تو حالات اور مشکلات پر قانع رہے لیکن ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو زبان پر حرفِ شکایت لائے بغیر نہ رہ سکے۔ آپ نے اپنے پیر بھائی مولانا یوسف سمرقندی سے ارشاد فرمایا۔

"گرمی شدید ہے اور گرد و غبار الگ، دوستوں کو بڑی تکلیف پہنچ رہی ہے۔"

مولانا یوسف نے جواب دیا۔ "آپ کو سارا حال خود معلوم ہے، کسی استفسار کی ضرورت ہی کہاں ہے۔"

آپ نے متبسّم ہو کر نیم وا آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور معلوم نہیں چپکے چپکے کیا کچھ کہتے رہے، ابھی آپ اسی کیفیت میں تھے کہ اوپر فضا میں ابر کا ایک ٹکڑا نمودار ہو کر ان سب پر سایہ فگن ہو گیا اور شمالی ہوا نہایت اعتدال سے چلنے لگی۔

آپ کے بھائی شیخ مسعود قندھار کے لیے سامانِ تجارت لے کر قافلے کے ساتھ ہو لیے۔ انھیں گئے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ ایک دن علی الصباح آپ نے لوگوں سے فرمایا "عجیب معاملہ ہے، آج میں شیخ مسعود کے احوال کی طرف متوجہ ہوا، ہر چند میں نے چشمِ مکاشفہ سے انھیں تلاش کیا لیکن وہ زمین پر کہیں بھی نظر نہ آئے اس کے بعد میں نے انھیں زمین کے اندر تلاش کیا تو قندھار کے باہر ان کی قبر دکھائی دی، غالباً انھوں نے آج ہی وفات پائی ہے۔"

سامعین نے وقت، دن اور تاریخ نوٹ کر لی۔ ایک مدت بعد جب قافلہ واپس آیا تو لوگوں سے وہی کچھ معلوم ہوا جس کا آپ ذکر کر چکے تھے۔ شیخ مسعود کی وفات اُسی دن، وقت اور تاریخ کو واقع ہوئی تھی۔

آپ سے عجیب و غریب کرامتیں واقع ہو رہی تھیں، ایک عالم، جو اپنا بیشتر وقت آپ ہی کی صحبت میں گزارا کرتا تھا، ایک دن پریشان حال اور اداس آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے دریافت فرمایا "یہ آج تم اتنے اداس اور پریشان کیوں ہو؟"

اس نے غمزدہ آواز میں جواب دیا "حضرت! میرا ایک عزیز بہت سخت بیمار ہے اور میں اس کی زندگی چاہتا ہوں اور آپ سے دعا کا خواہش مند ہوں۔"

آپ نے آنکھیں بند کرلیں اور مراقبے میں چلے گئے، پھر آنکھیں کھول دیں اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ کچھ آہستہ آہستہ پڑھتے رہے اور پھر باآوازِ بلند فرمایا "ہم نے اس کے لیے دعائے مغفرت کر دی ہے۔"

عالم نے المناک نظروں سے آپ کو دیکھا، گویا سوال کر رہا ہو۔ "حضرت! یہ کیا بات ہوئی، میں نے دعائے درازیٔ عمر کی درخواست کی تھی۔"

آپ نے ارشاد فرمایا "مشیتِ ایزدی اور تقدیرِ الٰہی کو کون بدل سکتا ہے؟"

وہ عالم گھر گیا تو پتہ چلا کہ اس عزیز کا انتقال ہو چکا ہے۔

ایک دن آپ اپنے ارادت مندوں کو مکاتیب لکھ رہے تھے کہ ایک نوجوان نے باریابی کی اجازت چاہی۔ آپ نے اسے اپنے قریب بلایا اور دریافت فرمایا "کہو کیسے آنا ہوا؟"

نوجوان نے جواب دیا "بندے کو جمال الدین حسین کہتے ہیں، والدِ بزرگوار کا نام خواجہ حسام الدین احمد ہے جن سے حضرت بخوبی واقف ہوں گے۔"

آپ نے فرمایا "خوب اچھی طرح۔ وہ تو خود بھی خدا کے محبوب بندوں میں ہیں، تمھیں ہمارے پاس کیوں بھیجا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا "والدِ بزرگوار نے فرمایا ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ مجھے ذکر کی تعلیم سے سرفراز فرمائیں۔"

آپ نے کچھ سوچتے ہوئے فرمایا "اچھا تو یہ بات ہے۔" اس کے بعد آنکھیں بند کر لیں اور ذرا دیر بعد نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا "نوجوان! کیا بات ہے؟ ہم نے آنکھیں بند کر کے چشمِ مکاشفہ سے تمھارا دل ملاحظہ کیا۔ وہاں ہم نے ایک عورت کی محبت کا نقش اس طرح جما ہوا دیکھا جس طرح پتھر مٹی میں پیوست ہو جاتا ہے۔ ہمیں سچ سچ بتاؤ کہ بات کیا ہے اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ عورت اور خدا کے نقوش ایک ہی دل میں ایک ہی جگہ موجود رہیں جب تک عورت کی محبت کا نقش دل میں رہے گا، خدا کی محبت سے محروم رہو گے۔"

اب نوجوان کے لیے دل کی بات چھپانا بہت مشکل تھا۔ اس نے نظریں جھکالیں اور آہستہ آہستہ کہنے لگا "حضرت! میں اپنی پھوپھی کی ایک کنیز پر فریفتہ ہوں، لاکھ کوشش کرتا ہوں کہ اس کی محبت دل سے نکال دوں لیکن ناکام ہو جاتا ہوں، کچھ آپ ہی مدد فرمائیں۔"

آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک نظر نوجوان کے سینے پر ڈالی اور پھر اس کے چہرے کو بغور دیکھا اور نظریں ہٹالیں۔ نوجوان کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل سے کوئی کانٹا کھینچ لیا گیا ہو۔ اس کے بعد اس کے دل میں کبھی کنیز کا خیال تک نہ آیا۔

اس دوران آپ اجمیر تشریف لے گئے۔ وہاں جس مسجد میں آپ نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ اس کی جنوبی دیوار بہت کمزور تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اب گری اور جب گری۔ آپ کے مُرید ہر وقت خوفزدہ رہتے تھے اور بار بار درخواست کرتے رہتے تھے کہ "آپ اس دیوار سے دور رہیں۔"

آپ نے ہنس کر فرمایا "تم لوگ کیوں ڈرتے ہو، جب تک ہم اور ہمارے فقرا یہاں موجود ہیں۔ یہ دیوار نہیں گرے گی۔"

اور واقعی آپ جیسے ہی وہاں سے واپسی کی نیت سے ہٹے دیوار گر گئی۔

اسی دوران ایک صوفی خوش خوش آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے سوالیہ انداز میں صوفی کو دیکھا۔ صوفی نے جواب دیا "حضورِ والا! میں حج کرنے جا رہا ہوں، اجازت طلب کرنے آیا ہوں اُمید ہے سفرِ حج کی اجازت مرحمت فرمائی جائے گی۔"

آپ نے آہستہ سے کہا "اچھا" اور آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ

دیر بعد آنکھیں کھول دیں اور فرمایا: "میں تمھیں حج کے میدان میں تلاش کرتا رہا لیکن تم مجھے وہاں کہیں بھی نظر نہ آئے۔"

صوفی اداس ہو گیا۔ وہ حج پر جانے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا لیکن وہ ہر سال جانے کا ارادہ کرتا اور یہ ارادہ کسی نہ کسی طرح ٹوٹ جاتا۔ اسی طرح تیس سال گزر گئے اور وہ زندگی کی آخری سانسوں تک حج نہ کر سکا۔



طاعون کی وبا پھیلی۔ یہ تجدد کا چودھواں سال تھا۔ اس وبا میں آپ کے تین صاحبزادگان اور ایک صاحبزادی نے داغ مفارقت دیا۔ یہ ایسی مصیبت تھی کہ آدمی اندر سے منتشر ہو کر رہ جاتا ہے لیکن آپ نے صبر و استقلال سے کام لیا۔ اس سانحے کے دو سال بعد آپ نے اپنے ایک مرید خاص شیخ بدیع الدین سہارنپوری کو اپنی خلافت سے نوازا اور حکم دیا کہ "اکبر آباد جاؤ اور شاہی لشکر میں تبلیغ و تلقین کا کام شروع کرو۔" آپ نے یہ بھی فرمایا کہ وہاں تمھیں بڑی عزت حاصل ہوگی اور لوگ تمھیں بے حد پسند کریں گے۔" لیکن ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ "اگر وہاں کسی وجہ سے تمھیں تکلیف پہنچے تو اس کی پروا نہ کرنا، مستقل مزاجی سے اپنا کام کرتے رہنا، ہماری اجازت کے بغیر وہاں سے حرکت بھی نہ کرنا۔"

شیخ بدیع الدین نے پوچھا: "حضرت! اگر کسی وجہ سے میرے پائے ثبات میں لغزش آجائے تو کیا ہوگا؟"

آپ نے ناگواری سے جواب دیا: "اگر تم مستقل مزاج نہ رہو گے تو اس سے خود تمھیں بھی تکلیف اٹھانی پڑے گی اور ہمیں بھی تکلیف پہنچے گی۔"

شیخ بدیع الدین اکبر آباد چلے گئے اور وہاں اپنا کام نہایت ہی تن دہی اور انہماک سے انجام دینے لگے۔ اکبر آباد میں انھیں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہزاروں لشکری آپ کے مرید ہو گئے اور ہر روز اتنا ہجوم رہنے لگا کہ بڑے بڑے امرا کو شیخ کی زیارت سے محروم رہنا پڑتا۔

سرہند میں حضرت شیخ سرہندی خوش تھے کہ کام حسب دلخواہ انجام پا رہا تھا اور دین کی تجدید ہو رہی تھی لیکن ایک دن آپ نے مراقبے سے سر اٹھا کر اپنے ارادت مندوں سے فرمایا: "لوگو! کیا تمھیں معلوم ہے کہ میں ابھی تک کس تربیت سے محروم ہوں؟"

کسی نے سوال کیا: "حضرت! آپ کس تربیت کا ذکر فرما رہے ہیں، وہ کون سی تربیت ہے جس سے آپ جیسی ہستی محروم رہ سکتی ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "تم نہیں جانتے، ابھی تک میں تربیت جمالی سے بہرہ اندوز ہوتا رہا ہوں لیکن اب وہ وقت آگیا ہے کہ میری تربیت جلالی کا بھی انتظام کیا جائے اور یہ حق تعالیٰ کا فیصلہ ہے جس کے سامنے میں اپنا سر جھکاتا ہوں۔"

لوگ سناٹے میں آگئے کہ معلوم نہیں ان ارشادات کا اصل مفہوم کیا ہے؟

آپ نے کسی کے سوال کا انتظار کیے بغیر وضاحت فرمائی۔

"لوگو! تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ مجھ پر ایک مصیبت نازل ہونے والی ہے اور یہ مصیبت میرے حق میں مدارج قرب کی ترقیات کا سبب بنے گی۔"

اس وضاحت کے باوجود لوگ آپ کا اصل مفہوم نہ پا سکے۔

دوسری طرف اکبر آباد میں ملکہ نور جہاں کا بھائی اور سلطنت مغلیہ کا معزز اور با اثر امیر آصف خان اور اس جیسے دوسرے امرا بادشاہ کو ورغلا رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے: "جہاں پناہ سرہند کے ایک مشائخ زادے نے مجددیت کا دعوا کیا ہے۔ یہ شخص علوم عربیہ کا ماہر ہے اس نے اپنے صدہا خلفا مختلف دور دراز ملکوں میں بھیج دیے ہیں اور لاکھوں آدمی اس کے اور اس کے خلفا کے مرید ہو چکے ہیں۔ بعض غیر ممالک کے فرماں روا بھی ان کے مرید ہو چکے ہیں جس سے مغلیہ سلطنت کو خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔"

جہانگیر کو تشویش پیدا ہو گئی۔ امرا نے اس کے چہرے سے سمجھ لیا کہ بات کارگر ہو چکی ہے، گرم لوہے پر مزید چوٹ لگائی اور زیادہ خوف زدہ کرنے کے لیے سلسلۂ شکایات جاری رکھا: "ہمارے لشکر میں بھی اس کا ایک خلیفہ موجود ہے اور اکثر امرائے سلطانی بھی اس کے حلقہ بگوش ہو چکے ہیں۔"

جہانگیر نے سوال کیا: "مثلاً کون کون؟"

چغل خور امرا میں سے ایک نے جواب دیا: "مثلاً خان خاناں، سید صدر جہاں، خان جہاں، خان اعظم، مہابت خان، سکندر خان، دریا خان، مرتضیٰ خان......"

جہانگیر نے گھبرا کر مزید نام لینے سے روک دیا: "بس بس۔"

امیر نے کہا: "حضور والا! یہ نام ایسے نہیں ہیں کہ تساہل سے کام لیا جائے۔ اگر مزید غفلت اختیار کی گئی تو معلوم نہیں کیا فتنہ اٹھ کھڑا ہو۔"

اس کے بعد انھوں نے حضرت شیخ سرہندی کے بعض مکاتیب کے وہ حصے پڑھ کر سنائے جن سے قابل اعتراض عقائد مترشح ہوتے تھے۔

جہانگیر پر ان باتوں کا یہ اثر ہوا کہ اس نے فوراً ہی خان خاناں کو دکن، خان جہاں لودھی کو مالوہ، خان اعظم کو گجرات اور مہابت خان کو کابل کی صوبے داری پر متعین کر دیا۔ اس طرح بادشاہ ان امرا کے

اتحاد اور یک جہتی کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد بادشاہ نے ایک حکم جاری کیا اور فوجیوں پر پابندی عاید کردی کہ وہ شیخ بدیع الدّین سے نہیں ملیں گے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی مشہور کی گئی کہ شیخ صاحب جادوگر ہیں اور اپنے سحر کے زور سے لوگوں کو گمراہ اور متاثر کر رہے ہیں؛ اس غلط تشہیر نے کچھ لوگوں کو شیخ صاحب سے برگشتہ کر دیا لیکن زیادہ لوگ برابر آتے جاتے رہے۔ بادشاہ نے ان آنے جانے والوں کے لیے جاسوس مقرر کر دیے چنانچہ جس کی بابت بھی اسے یہ معلوم ہوتا کہ اس نے شیخ صاحب سے ملاقات کی ہے، اس پر شاہی عتاب نازل ہوتا۔ شیخ بدیع الدّین بھی زمانے کی بدلی ہوئی ہوا صاف محسوس کر رہے تھے۔ انھوں نے جب یہ یقین کر لیا کہ ان کی خدمت میں حاضری دینے والے موردِ عتاب آجاتے ہیں تو خود ہی ملاقات اور باریابی سے منع کرنے لگے۔ ان حالات کی اطلاع انھوں نے شیخ سرہندی کو بالتفصیل دی۔ حضرت شیخ سرہندی نے جواب میں انھیں تسلّی دی اور حکم دیا کہ وہ اپنے کام میں لگے رہیں اور ذرا بھی نہ گھبرائیں۔

اس دوران اکبر آباد میں یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ حضرت شیخ سرہندی کو عنقریب دربار میں بلا کر قتل کر دیا جائے گا۔ افواہوں کے جھکڑ اتنے زور شور سے چلے کہ شیخ بدیع الدّین گھبرا گئے اور اکبر آباد سے سہارنپور چلے گئے۔ کچھ دن سہارنپور میں رہے پھر سرہند میں شیخ سرہندی کی خدمت میں حاضری دی۔ شیخ سرہندی ان پر بہت ناراض ہوئے اور ڈانٹ کر کہا "جب ہم نے تمھیں منع کیا تھا کہ وہاں سے ہماری اجازت کے بغیر حرکت بھی نہ کرنا پھر تم کیوں چلے آئے، تم اس لائق نہیں تھے کہ خلیفہ بنا کے شاہی لشکر میں بھیجے جاتے، اب تم اکبر آباد ہرگز نہ جانا۔"

شیخ بدیع الدّین کانپ گئے اور چپ چاپ دوبارہ اکبر آباد روانہ ہو گئے۔ ان کا اکبر آباد میں دوبارہ داخلہ بڑا رنگ لایا، افواہ طرازوں نے بادشاہ کو یہ باور کرا دیا کہ شیخ بدیع الدّین، شیخ سرہندی سے مشورے کر کے، کوئی خطرناک منصوبہ لے کر واپس آئے ہیں اور فوج میں بغاوت اور انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

بادشاہ مہابت خان اور خان خاناں وغیرہ کے بارے میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ اپنے اپنے صوبوں میں پہنچ کر اپنے عہدے سنبھالے ہوئے ہیں یا بغاوت پر آمادہ ہیں۔ چنانچہ بادشاہ کو جیسے ہی ادھر سے اطمینان ہوا اس نے شیخ احمد سرہندی کے نام فرمان جاری کر دیا کہ "وہ اپنے صاحبزادگان اور مریدوں کے ساتھ بادشاہ کے روبرو حاضر ہوں، کیونکہ بادشاہ ان سے ملنے کا متمنی اور خواہش مند ہے۔"

اس کے ساتھ ہی حاکمِ سرہند کو حکم دیا کہ جس طرح بھی ہو سکے شیخ سرہندی کو اکبر آباد روانہ کر دیا جائے۔ اس حکم سے آپ کے متعلقین اور مرید گھبرا گئے۔ آپ نے انھیں سمجھایا کہ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔

لوگوں نے تشویش ظاہر کی کہ "دربار میں بادشاہ ان سب کے ساتھ معلوم نہیں کیا سلوک کرے۔"

آپ نے اپنے صاحبزادگان خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کو کسی پہاڑی مقام پر بھیج دیا اور اعزا سے فرمایا "گھبراؤ مت، بادشاہ میرا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا، یہ تکلیف ایک سال کی ہے اس کے بعد آرام ہی آرام ہے۔"

آپ نے پانچ مریدوں کو ساتھ لیا اور اکبر آباد روانہ ہو گئے۔ ابھی یہ راستے ہی میں تھے کہ اس عہد کے مشہور عالم علّامہ، افضل خان اور خواجہ عبدالرحمٰن مفتی فقہ کی کتابوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ آپ نے ان کی عزت سے پزیرائی کی اور پوچھا "آپ حضرات نے کیوں زحمت فرمائی؟"

خواجہ عبدالرحمٰن مفتی نے جواب دیا "سنا ہے بادشاہ نے آپ کو طلب فرمایا ہے اور یہ بھی سُننے میں آیا ہے کہ بادشاہ کے ارادے کچھ اچھے نہیں ہیں؟"

آپ نے دریافت کیا "اگر ایسا ہے تو آپ صاحبان اس معاملے میں میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

مفتی نے جواب دیا "ہمیں شہزادے خرّم (شاہجہان) نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ شہزادے کو آپ سے جتنی عقیدت اور محبت ہے، کسی سے چھپی نہیں ہے۔ شہزادے کا خیال ہے کہ دربار میں جو چیز آپ کے حق میں سب سے زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہو گی وہ سجدۂ تعظیمی ہے، بادشاہ آپ سے اس رسم کی ادائیگی کا خواہش مند ہو گا اور آپ انکار کریں گے اور اس اختلاف کا جو نتیجہ بھی نکلے گا اس کے تصوّر ہی سے شہزادہ پریشان ہے۔"

آپ نے سوال کیا "شہزادے کے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

مفتی نے جواب دیا "ہم فقہ کی کتابوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، شہزادے کا مشورہ ہے کہ آپ زندگی کے تحفّظ کی خاطر سجدۂ تعظیمی ادا کر دیں۔ اس کے بعد شہزادہ آپ کی پوری ذمّہ داری قبول کرنے کو تیار ہے۔"

آپ نے نفرت کا اظہار کیا، بولے "یہ کس طرح ممکن ہے؟"

مفتی نے کہا "فقہ بھی ایسے سجدے کو جائز قرار دیتی ہے جو

زندگی کو بچانے کے لیے کسی جابر سُلطان کو کیا گیا ہو، ان حالات میں تعظیمی سجدہ حرام نہیں رہتا۔"

آپ نے جواب دیا: "یہ حکم بطور رخصت (مصلحت) ہے، جان بچانے کے لیے۔ لیکن بطور عزیمت یہ حکم ہے کہ غیر حق کو ہرگز سجدہ نہ کیا جائے۔"

مفتی اور علاّمہ کی ہر ممکنہ کوششوں کے باوجود آپ سجدۂ تحیتِ سلاطین پر آمادہ نہ ہوئے۔

آپ کی تشریف آوری کی خبر سُن کر جہانگیر نے امرا کو آپ کے استقبال کے لیے بھیجا اور آپ کا خیمہ اپنے محل کے قریب نصب کرایا۔ اس کے بعد آپ ملاقات کے لیے دربار میں طلب کیے گئے۔ آپ دربار میں اس شان سے داخل ہوئے کہ آدابِ شاہی کا کوئی خیال نہ رکھا۔ بادشاہ اس دلیر شخص کو حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ امرا کا خیال تھا کہ بادشاہ کا عتاب نازل ہونے ہی والا ہے لیکن جب بادشاہ نے حیرت اور سکوت کی روش اختیار کی تو ایک امیر نے بادشاہ سے کہا: "حضور! یہی وہ شخص ہے جو خود کو تمام انبیا سے افضل بتاتا ہے اور اس کا وہ خط بھی ہمارے پاس موجود ہے جس میں یہ خود کو حضرت ابوبکر صدّیق رضؓ سے بلند تر لکھتا ہے۔"

اس کے بعد وہ خط بادشاہ کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ آپ نے یہ خط اپنے پیر مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ کو تحریر فرمایا تھا اور اس میں آپ کے روحانی سیرِ عروج کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس میں اپنی اس عجیب و غریب روحانی کیفیت اور سیر کا حال بیان کیا گیا تھا جس میں آپ حضرت عثمان کے مقام سے گزر کر حضرت فاروق کے مقام پر پہنچے تھے اور پھر یہاں سے اور بلندی پر اُٹھ گئے اور حضرت صدّیق کے مقام پر پہنچ گئے۔ پھر یہاں سے حضرت محمد رسُول اللہ صلعم کے مقام پر پہنچے۔ یہ ایک روحانی کیفیت کا اظہار تھا۔ خط کی آخری سطور میں آپ نے لکھا تھا: "اس کے بعد اسی کیفیت میں اپنے آپ کو لطیف پایا اور ہوا یا بادل کے ٹکڑے کی طرح اطراف میں پھیل گیا۔"

بادشاہ نے برہمی سے پوچھا: "کیا یہ درست ہے کہ تم خود کو حضرت صدّیق اکبر سے بلند مرتبہ سمجھتے ہو؟"

آپ نے جواب دیا: "ہرگز نہیں، یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں اس گستاخی کا مرتکب ٹھیروں۔"

بادشاہ نے کہا: "پھر آپ کی اس تحریر کا مطلب کیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "اس میں مَیں نے سیرِ عروج کا حال لکھا ہے اور یہ وہ کیفیت ہے جس سے اکثر صوفیا کو گزرنا پڑتا ہے اور انھیں پھر اپنے مرتبے اور حال میں واپس آنا پڑتا ہے۔" پھر آپ نے اس کی ایک شاندار مثال دی، آپ نے دس ہزاری، پنج ہزاری امرا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "اب اگر ان معزز امرا کی موجودگی میں بادشاہ ان سے کم مرتبہ شخص کو اپنے قریب بلائے اور اس سے کچھ راز کی باتیں کہہ کر واپس کر دے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ان امرا کا مرتبہ گھٹ گیا اور اس کم مرتبہ شخص کا مرتبہ بڑھ گیا۔"

بادشاہ اس دلیل سے بہت خوش ہوا اور اس کا وہ جذبہ سرد پڑ گیا جو آپ کے خلاف کچھ دیر پہلے موجزن تھا لیکن اسی وقت ایک امیر نے بادشاہ سے عرض کیا: "حضورِ والا! اس شخص کے تکبّر اور رعونت کو تو ملاحظہ فرمائیں، دُنیا جانتی ہے کہ آپ ظلّ اللہ اور خلیفۃ اللہ ہیں اور یہ خود بھی آپ کے اس مرتبے سے خوب واقف ہے لیکن حال یہ ہے کہ سجدۂ تعظیمی تو بہت دُور رہا، معمولی احترام و تواضع بھی نہیں بجا لایا۔"

بادشاہ نے آپ سے ناخوشگوار لہجے میں کہا: "شیخ صاحب! آپ کو آدابِ شاہی کا تو خیال کرنا ہی پڑے گا، اور بہتری اسی میں ہے کہ اسی وقت تعظیمی سجدے میں جُھک جائیں!"

آپ نے سختی سے جواب دیا: "ہرگز نہیں، ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا، غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے۔"

جہانگیر نے کہا: "اچھا ہم آپ کو اتنی رعایت دینے کو تیار ہیں کہ آپ اپنا سر بس یوں ہی ذرا سا جھکا دیں، ہم اسے سجدۂ تعظیمی میں شمار کر لیں گے۔"

آپ نے اسی سختی سے جواب دیا: "یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔"

جہانگیر کی تیوریوں پر بل پڑ گئے، بولا: "ہم آپ کو یوں شاید اس پر مجبور نہ کرتے لیکن اب ہماری زبان سے جو نکل چکا ہے ہم اس کی تعمیل چاہتے ہیں، اسے پورا ہونا چاہیے۔"

آپ نے جواب دیا: "تیرے حکم کی تعمیل سے زیادہ اللہ کے حکم کی تعمیل ضروری ہے، کیا تجھے یہ معمولی بات بھی نہیں معلوم کہ اللہ کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں۔" پھر آپ نے ذرا زیادہ پُرجوش لہجے میں فرمایا: "جہانگیر! کیا یہ ایک انسان کی کھلی ہوئی حماقت نہیں ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے کسی دُوسرے انسان کو سجدہ کرے۔"

جہانگیر پر اس تقریر کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے چند قوی ہیکل امرا کو حکم دیا: "ان کا سر بہ جبر ہمارے سامنے جُھکا دیا جائے، اس کے بعد انھیں تحفے تحائف دے کر رخصت کر دیا جائے۔"

چند پیل تن امرا آگے بڑھے اور آپ کے سر اور گُدّی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ آپ نے پوری قوت سے خود کو اکڑا لیا اور گردن

اٹھاکر کھڑے ہوگئے۔ سرکشوں نے پوری قوت سے سر جھکا دینے کی کوشش کی لیکن ذرا بھی نہ جھکا سکے۔ اس دن لوگوں نے یہ عجیب و غریب معرکہ برپا دیکھا کہ ایک طرف بادشاہ تھا اُس کا جاہ و جلال تھا، امرا تھے، درباری دبدبہ تھا، وسیع اختیارات تھے اور اقتدار کلی تھا اور دوسری طرف ایک تنہا شخص تھا جو خودی، خودشناسی اور حق آگاہی کی قوت اور ہتھیار سے وقت کی سب سے بڑی طاغوتی طاقت سے نبرد آزما تھا۔ امرا بزور حضرت شیخ سرہندی کی گردن جھکا دینے کی کوشش کرتے رہے مگر ناکام رہے۔ اس کشمکش میں حضرت شیخ سرہندی کی ناک سے خون جاری ہوگیا۔

بادشاہ کو کچھ رحم آیا لیکن راج ہٹ کا جذبہ اب بھی سرد نہ ہوا تھا۔ حکم دیا "انھیں اس چھوٹے سے دروازے سے گزارا جائے تاکہ یہ جب اس میں سے جھک کر سامنے آئیں تو اسی کو سجدۂ تعظیمی تصور کر لیا جائے۔"

اس نئے حکم کی تعمیل میں آپ کو اُمرا دوسری طرف لے گئے اور اس چھوٹے سے دروازے سے گزر کر بادشاہ کے رُوبرو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ آپ نے اس دروازے میں پہلے تو ایک پَیر داخل کیا اس کے بعد سر کو پیچھے پشت پر جھکا کر دروازے سے نکل گئے۔ اس سخت رویے کو دیکھ کر امرا نے بادشاہ سے کہا: "حضورِ والا! اس شخص کا تمرد ملاحظہ فرمایا۔ اس تکبر اور سرکشی سے کیا بعید ہے کہ دربار سے نکلتے ہی شورش نہ برپا کر دے۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ اس شخص کے خلاف جو قدم بھی اٹھایا جائے اسی وقت اٹھایا جائے ورنہ بعد میں پچھتانا پڑے گا۔"

بادشاہ نے انھیں گوالیار کے قلعے میں قید کر دینے کا حکم صادر کر دیا۔ آپ اسی وقت گوالیار روانہ کر دیے گئے۔

اگر بات قید و بند ہی تک رہتی تو اتنی بڑی بات نہ ہوتی لیکن شاہی فرمان کے ماتحت حضرت شیخ سرہندی کا سارا سامان اور جائداد کی ضبطی کا کارنامہ بھی انجام پا گیا۔ آپ کے ساتھ ہی پانچوں مُرید بھی قید کر دیے گئے۔ حاکمِ قلعہ غیر معمولی سختی سے پیش آیا۔ آپ کے ایک مُرید سے ضبط نہ ہو سکا اور غصّے میں حاکمِ قلعہ سے کہا: "او ظالم! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ نے ہمیں یہاں قید کر رکھا ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یاد رکھ ہم یہاں حکم الٰہی سے آئے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اسی وقت یہاں سے جا سکتے ہیں اور تو ہمیں کسی طرح بھی نہیں روک سکتا۔"

اس نے یہ کہا اور اچھل کر قلعے کی بلند و بالا دیوار پر جا بیٹھا۔ حاکمِ قلعہ اور پاسبان حیران اور پریشان اسے دیکھنے لگے۔ حضرت شیخ سرہندی نے مُرید کو جھڑک دیا۔ فرمایا: "کیا مجھ میں اظہارِ کرامت کی قدرت نہیں ہے جو تم دکھا رہے ہو۔ مشیتِ ایزدی یہ ہے کہ ہم زمانے کے جور و جفا

مولوی صاحب اپنے ذہین شاگرد کے سوال و جواب سے بہت پریشان تھے۔ ایک دن اُنھوں نے اپنی دانست میں شاگرد سے لاجواب سوال کر دیا۔ پوچھا "بیٹے اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ خدا کہاں ہے تو میں تمھیں ایک گھڑی انعام میں دُوں گا۔"

ذہین شاگرد نے جواب دیا۔ "اگر آپ مجھے یہ بتا دیں کہ خدا کہاں نہیں ہے تو میں آپ کو دو گھڑیاں انعام میں دُوں گا۔"

برداشت کریں۔"

پاسبان اور حاکمِ قلعہ بے حد شرمندہ ہوتے اور معافی کے خواستگار ہوتے۔

آپ نے قلعے میں محبوس قیدیوں میں تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ ہزارہا ہندو مسلمان ہو گئے اور سینکڑوں مسلمانوں نے مُریدی اختیار کی۔

آپ کی گرفتاری اور قید سے پُورے ملک میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ خان خاناں، خان اعظم، خان جہاں لودھی اور دوسرے نامی گرامی امرائے مہابت خان کو اپنا سردار مان لیا اور اسے اختیار دیا کہ وہ بادشاہ کے خلاف فوجی کارروائی کرے۔ مہابت خان کابل سے فوج لے کر چل پڑا، اس نے خطبے اور سکّے سے بادشاہ کا نام نکال دیا۔ مہابت خان کے ارادے کی خبر حضرت شیخ سرہندی کو بھی ہو گئی۔ انھوں نے مہابت خان کو منع کرا دیا کہ وہ ان کی رضامندی اور منظوری کے بغیر کوئی قدم نہ اُٹھائے۔ مہابت خان کی فوجی تیاریوں اور ارادوں کی خبر پاکر بادشاہ بھی مقابلے پر چل پڑا۔ دریائے جہلم پر دونوں کا آمنا سامنا ہوا اور مہابت خان نے نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے بادشاہ کو گرفتار کر لیا۔ دوسری طرف گوالیار میں یہ کوشش کی گئی کہ حضرت شیخ سرہندی ہندوستان کی حکومت سنبھال لیں لیکن آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور مہابت خان کو سختی سے ہدایت کی کہ "فتنہ و فساد ختم کرو اور بادشاہ کی اطاعت کرو۔"

مہابت خان نے بادشاہ کو رِہا کر دیا اور اس گستاخی کی معافی مانگی۔ جہانگیر نے اسے معاف کر دیا۔ مہابت خان نے کہا "لیکن حضور، حضرت شیخ سرہندی کو رِہا فرمائیں، میں یہ نہیں برداشت کر سکتا۔"

جہانگیر نے وعدہ کر لیا۔ اسی دوران وہ بہت سخت بیمار ہو گیا اور ایک رات خواب میں دیکھا کہ کوئی صاحب فرما رہے ہیں "جہانگیر! تُو نے شیخ سرہندی پر بڑا ظلم کیا۔ وہ امامِ وقت اور مجدّدِ اسلام ہیں اور تیری بیماری کا اصل سبب بھی وہ ہیں۔ انھیں رِہا کر کے شفا حاصل کر۔"

جہانگیر نے فوراً رہائی کا فرمان جاری کر دیا اور حضرت شیخ سرہندی سے درخواست کی کہ رہائی کے بعد بادشاہ سے ملاقات ضرور کریں۔

آپ نہایت عزّت و احترام سے رِہا کر دیے گئے۔ سرہند پہنچے اور تین دن قیام فرما کر اکبر آباد چلے گئے۔ وہاں شہزادہ خرّم (شاہجہاں) نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ شاہی محل میں قیام کا انتظام کیا گیا۔ بادشاہ نے آپ کی مندرجہ ذیل شرائط پوری کر دیں۔

۱۔ سجدۂ تعظیمی یک قلم موقوف ہوا۔ ۲۔ گاؤکشی کا فرمان جاری ہو گیا بازاروں میں کھلے عام گائے کا گوشت فروخت ہونے لگا۔ ۳۔ بادشاہ اور کارکنانِ مملکت نے اپنے اپنے ہاتھ سے گائے ذبح کی اور کباب تیار کرا کے کھائے۔ ۴۔ ملک کے جس جس حصّے میں مسجدیں شہید کی گئی تھیں انھیں دوبارہ تعمیر کرنے کا فرمان صادر ہوا۔ ۵۔ دربارِ عام کے قریب مسجد تعمیر کرائی گئی۔ ۶۔ مذہبی تعلیم پھر سے عام کی گئی۔ ۷۔ شہروں میں مُفتیوں اور قاضیوں کی تقرری عام ہوئی۔ ۸۔ خلافِ شرع قوانین منسوخ اور شرعی قوانین کا نفاذ عمل میں آیا۔

کہتے ہیں جہانگیر اپنی گزشتہ گستاخیوں پر ہمیشہ شرمندہ رہا۔ اس کی افسردگی اور ندامت کے پیشِ نظر ایک دن حضرت شیخ سرہندی نے جہانگیر سے فرمایا "تم خاطر جمع رکھو، میں اس وقت تک بہشت میں نہیں داخل ہوں گا جب تک تمھیں بھی اپنے ساتھ نہ لے لوں۔"

یہ بھی کہتے ہیں کہ شیخ سرہندی کے اس قول کے پیشِ نظر بادشاہ اپنی آخری عمر میں کہا کرتا تھا "ہم نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے نجات اور بخشش کی امید کی جا سکے ہاں شیخ سرہندی کا یہ قول ایک ایسی دستاویز ہے جسے میں حق تعالیٰ کے سامنے پیش کر کے نجات کا طالب ہوں گا۔"



شہزادے خرّم کو یہ معلوم ہوا کہ جہانگیر اس کی جگہ نورجہاں کے داماد شہریار کی ولی عہدی کا اعلان کرنے والا ہے تو وہ بدرجۂ مجبوری باپ کے خلاف میدانِ جنگ میں اُتر آیا۔ شہزادے خرّم کی فوجی قوت غیر معمولی تھی۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ عین جنگ کے دوران چند فوجی دستے شاہی فوج سے نکل کر شہزادے خرّم سے جا ملے۔ جہانگیر پریشان ہو گیا اس نے شیخ سرہندی سے دُعا کی درخواست کی۔ آپ نے دُعا کرتے ہوئے فرمایا "تم مطمئن رہو، تم کامیاب رہو گے۔"

ابھی بادشاہ کو یہ نوید سنائی ہی تھی کہ شہر کے باکمال بزرگوں نے حضرت شیخ سرہندی کو خفیہ پیغام بھیجا "حضرت ہم پر کشف ہوا ہے کہ اس معرکے میں شہزادہ غالب آئے گا اور باپ مغلوب، آپ کیا فرماتے ہیں ــــ؟"

آپ نے جواب دیا: "ہم پر کچھ اور ہی کشف ہوا ہے، شہزادے کو شکست ہوگی لیکن بالآخر شہزادہ کامیاب ہوگا۔"

یہ عجیب و غریب پیش گوئی تھی۔ جنگ ہوئی، بادشاہ فاتح ہوا اور بیٹا مفتوح۔

آپ تنہا بیٹھے تھے کہ شہزادہ خرم چھپتا چھپاتا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایتاً کہا: "حضرت! یہ عجیب بات ہے کہ یہ ناچیز ہمیشہ آپ کے حق میں لڑتا جھگڑتا رہا اور آپ نے میرے حق میں تو دُعا فرمائی نہیں، بادشاہ کے حق میں دُعا گو ہو گئے۔"

آپ نے جواب دیا: "مت گھبرا شہزادے، مجھے حق تعالیٰ کی طرف سے معلوم ہوا ہے کہ تو عنقریب تخت پر بیٹھے گا اور تیرا لقب شاہجہاں ہوگا۔"

شہزادہ بہت خوش ہوا اور اس نے تبرک کے طور پر آپ کی دستار لے لی جو بعد میں عرصے تک شاہانِ مغلیہ کے خزانے میں محفوظ رہی۔

آپ نے اپنے مکاتیب کے ذریعے وہ کام لیا جو آج اس ترقی یافتہ دور میں پمفلٹ اور ارزاں لٹریچر شائع کر کے لیا جا رہا ہے۔ آپ اس نکتے سے خوب واقف تھے کہ تحریر کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے ایک مکتوب میں بادشاہ کی حیثیت کے بارے میں تحریر فرمایا۔

"دُنیا کے ساتھ بادشاہ کا تعلق ایسا ہے جیسا دل کو جسم سے۔ اگر دل اچھا ہے تو بدن بھی اچھا رہے گا اور اگر دل بگڑ جائے تو بدن بھی بگڑ جائے گا بالکل اسی طرح دُنیا کی بہتری بادشاہ کی بہتری پر منحصر ہے اگر بادشاہ بگڑ جائے تو جہان کا بگڑ جانا لازم ہے۔"

ہردے رام نامی ایک ہندو نے رام اور رحمان کو ایک ہی قرار دیا تو آپ نے اسے تحریر فرمایا۔

"ہندو جس رام اور کرشن کی پرستش کرتے ہیں، وہ تو ماں باپ سے پیدا ہوئے تھے۔ رام دسرتھ کا بیٹا تھا" لچھمن کا بھائی اور سیتا کا خاوند تھا، رام جب اپنی سیتا کو نہ بچا سکا تو وہ دوسروں کی مدد کیا کرے گا۔ پس یہ کہنا کہ رام اور رحمان ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں، کسی طرح بھی ٹھیک نہیں۔ جب تک یہ رام اور کرشن پیدا نہ ہوئے تھے، خدا کو رام اور کرشن نہیں کہا جاتا تھا۔ ان کی پیدائش کے بعد لوگوں نے ذاتِ احدیت پر رام اور کرشن کا اطلاق کیا۔"

آپ بہت زیادہ کام انجام دے چکے تھے۔ عمر کے تریسٹھویں سال میں داخل ہوئے تو انھیں اپنی زندگی کا اختتام نظر آنے لگا۔ سردیوں کے دن تھے۔ آپ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ آپ نے حاضرین سے فرمایا: "آئندہ جاڑوں میں ہم یہاں نہیں ہوں گے۔"

لوگوں نے پوچھا: "پھر کہاں؟ حضرت کہیں اور قیام فرما ہوں گے؟"

آپ نے جواب دیا: "نہیں، ایسا بھی نہیں ہوگا۔"

لوگ مختلف مکانوں کے نام لیتے گئے اور آپ نفی میں سر ہلاتے رہے۔ آخر لوگوں نے پوچھا: "حضرت آپ بتلاتے کیوں نہیں کہ کہاں رونق افروز ہوں گے؟"

آپ نے جواب دیا: "ان مکانوں میں سے کسی میں بھی نہیں، انتظار کرو کہ کیا ظاہر ہوتا ہے۔" پھر فرمایا کہ "لوگو! اب میں تم سے جدا ہو جاؤں گا۔ میری اور تمھاری ملاقات قیامت کے دن ہوگی۔ وہاں رسولِ مقبول دریافت فرمائیں گے کہ شیخ احمد! تو نے کیا خدمات انجام دیں؟ اس وقت تمھیں یہ شہادت دینی ہوگی کہ میں نے رسولِ مقبول کی اُمت کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔"

لوگوں نے یک آواز کہا: "ہم قیامت میں گواہی دیں گے کہ آپ نے اپنے فرائض پوری دیانت داری اور محنت سے انجام دیے۔"

آپ نے سکون کی سانس لی اور آب دیدہ ہو گئے۔

آپ کو سب سے پہلے جس ذات نے "مجدد الف ثانی کا لقب دیا" اس کا نام ملا عبدالحکیم سیالکوٹی ہے۔ ملا عبدالحکیم نے انھی استاد سے تعلیم حاصل کی تھی جن سے حضرت شیخ سرہندی نے درس لیا تھا۔

زندگی کے آخری دنوں میں صدقات وخیرات میں زیادتی ہو گئی تھی۔ کسی مخلص نے دبے لفظوں میں سوال کیا: "حضورِ والا! یہ عاصی محسوس کر رہا ہے کہ اب اس عالمِ معاصی اور دنیائے کثیف میں حضرت کا قیام زیادہ دن تک نہیں رہے گا پھر یہ خیرات اور صدقات میں زیادتی کا سبب؟"

آپ نے جواب دیا۔

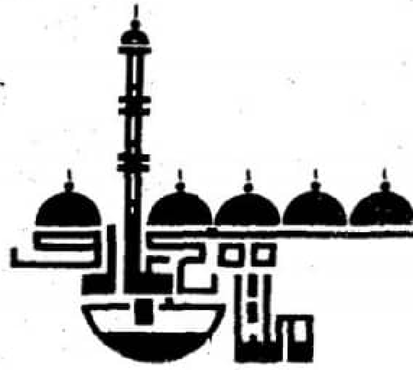
"آج بلاوا کنت سوں سکھی سب جگ دیجوں وار"

(آج دوست سے ملنے کا دن ہے اس لیے اے میرے دوست! میں اس کی خوشی میں تمام دُنیا کو قربان کرتا ہوں۔)

اور آخر تریسٹھ سال کی عمر میں منگل کے دن ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ (۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء) کو بوقت اشراق آپ نے وصال فرمایا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ کی شخصیت اور کام کی اہمیت بڑھتی چلی گئی اور آج حضرت شیخ احمد سرہندی کو دُنیا امامِ ربانی، محبوبِ سبحانی اور مجدد الف ثانی کے نام سے یاد کرتی ہے۔





ضیا تسنیم بلگرامی

اللہ کے ایک برگزیدہ بندے کی سوانح مبارک

آپ کی روح کی تازگی کے لیے ہمارے عظیم اور مقدس بزرگوں کی پاکیزہ باتیں

حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی کا وصال ہوا تو ان کے سات بیٹوں میں مال و اسباب اور ترکہ تقسیم ہو گیا۔ شیخ مرحوم کے بڑے صاحبزادے شیخ صدر الدین عارف کے حصے میں جو کچھ آیا، اس میں سات لاکھ تنکے نقد بھی شامل تھے۔ باپ کی زندگی ہی میں شیخ صدر الدین عارف کو نمایاں مقام حاصل ہو گیا تھا اور ان کے آس پاس عقیدت مندوں اور ارادت مندوں کا اجتماع رہنے لگا۔ اپنے کامل باپ کے وصال کے غم میں شیخ عارف نے اپنے متعلقین اور مریدین سے فرمایا کہ: "اب جب کہ مجھے اپنے باپ کے مال و اسباب میں سے اپنا حصہ مل چکا ہے، میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ افسوس کہ میں اپنے باپ کے نقش قدم پر نہیں چل سکوں گا!"

لوگوں کو اس اعلان نے حیرت میں ڈال دیا۔ "شیخ! یہ کیسی بات کر رہے ہیں؟"

کسی مرید نے پوچھا۔ "شیخ! کیا دنیا داری میں پڑ جانے کا ارادہ ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "نہیں، ایسا بھی کوئی ارادہ نہیں، میں اپنے کامل و بزرگ باپ کی محض ایک معاملے میں اتباع نہیں کروں گا!"

ایک بھائی نے پوچھا۔ "کس معاملے میں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "ملتان میں اعلان کر دیا جائے کہ حاجت مند یہاں آ جائیں، آج میں انہیں کچھ دینا چاہتا ہوں!"

شیخ عارف کی باتیں کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ ان کے بے حد اصرار اور ضد پر ملتان میں اعلان کر دیا گیا کہ شیخ صدر الدین عارف حاجت مندوں کو کچھ دینا چاہتے ہیں!

اس اعلان نے ملتان کے غریبوں اور حاجت مندوں کو آپ کے دروازے پر جمع کر دیا۔ ہر طرف آدمیوں کا میلہ سا نظر آنے لگا۔ شیخ عارف نے سات لاکھ تنکوں کا ڈھیر اپنے سامنے لگا لیا اور آنے والوں کو قطار میں کھڑا کر کے تنکوں کی تقسیم شروع کر دی۔ جو ان کے پاس پہنچا اور جس کی بھی باری آئی، شیخ عارف نے مٹھی بھر بھر کے نقد تنکے اس کے دامن میں ڈال دیئے۔ شام تک سارے تنکے تقسیم ہو گئے اور شیخ عارف کے پاس ایک بھی تنکہ نہ رہا۔ ان کے متعلقین ان کی سخاوت اور دریا دلی پر افسوس کرتے رہے۔ ان کے بھائی بھی پریشان ہو گئے تھے۔ انہیں اس بات کا افسوس تھا کہ صدر الدین عارف نے اس دولت کو گھنٹوں میں لٹا دیا تھا جنہیں ان کے باپ نے ہمیشہ نہایت احتیاط سے خرچ کیا تھا!

جب شیخ عارف نقد رقم تقسیم کر دینے کے بعد اپنے حجرے میں گئے، تو ان کے دو بھائی اور چند بزرگ ارادت مند ان کے حجرے میں ادب سے داخل ہوئے اور نہایت ادب سے ان کے روبرو کھڑے ہو گئے۔ شیخ عارف سجدے میں سر رکھے گڑگڑا رہے تھے۔ وہ کچھ کہہ رہے تھے لیکن اتنی آہستہ آواز میں کہ دوسرا سمجھ نہیں سکتا تھا!

کچھ دیر بعد جب انہوں نے سر اٹھایا تو ان کی آنکھیں بہت زیادہ گریہ و زاری کی وجہ سے سوج چکی تھیں اور پپوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ آنکھوں کے نیچے دور تک آنسوؤں کی نمی موجود تھی۔ انہوں نے اپنے سامنے کسی کی موجودگی محسوس کی تو سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور لاپروائی سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ تم لوگ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟"

ایک بھائی نے عرض کیا۔ "بھائی صاحب! ہم آپ سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں!"

آپ نے فرمایا۔ "تو یہ ناحق لوگ یہاں کیوں آن کھڑے ہوئے ہیں؟"

ایک ارادت مند بزرگ نے اجازت طلب کی۔ "حضرت! اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں!"

آپ نے جواب دیا۔ "اجازت کس بات کی؟ جو بات کرنا ہے بے تکلفانہ شروع کردو!"

ارادت مند نے پوچھا: "حضرت! آپ کے حصے میں سات لاکھ نقد سکے آئے تھے آپ نے انہیں آناً فاناً تقسیم کردیا۔ کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں خود کو حبِ دنیا سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا...!"

ارادت مند نے عرض کیا: "حضرت! کیا آپ کے والد میں حبِ دنیا تھی؟"

انہوں نے جواب دیا "نہیں، ان میں حبِ دنیا نام کو بھی نہ تھی!"

ایک بھائی نے عرض کیا: "جب یہ بات آپ خود بھی تسلیم کر رہے ہیں کہ ان میں حبِ دنیا نام کو بھی نہ تھی، تب پھر آپ اپنے بزرگ باپ کی اتباع کیوں نہیں کرتے؟"

شیخ عارف نے جواب دیا۔ "یہی بات تو میں بھی دُنیا کو بتا رہا ہوں کہ میں دولت جمع کرنے کے معاملے میں اپنے باپ کا اتباع نہیں کروں گا۔ حبِ دُنیا کو میں اپنے دل سے نکال باہر کرچکا ہوں۔ چنانچہ ایک طرح سے تو یہی کہا جائیگا کہ میں نے اپنے باپ کی اتباع نہیں کی لیکن دوسری طرف یہ بھی کہا جائیگا کہ میں اپنے باپ کا متبع ہوں، کیونکہ میں اپنے دل میں حبِ دُنیا نہیں رکھتا!"

دُوسرا بھائی اکتا کر بولا: "بھائی صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہماری سمجھ میں تو ایک بات بھی نہیں آرہی، معلوم نہیں کیا فرما رہے ہیں آپ!"

ایک مرید نے ناگواری سے کہا۔ "شیخ صاحب! آپ کے والد بزرگوار خرچ کے معاملے میں نہایت محتاط تھے، وہ نہایت احتیاط سے آہستہ آہستہ خرچ کیا کرتے تھے لیکن آپ نے ان کی اتباع نہیں کی اور جو کچھ آپ کو نقد ملا تھا، سارا کا سارا لٹا دیا۔ معلوم نہیں اس سلسلے میں آپ نے کیا سوچا تھا.....؟"

شیخ عارف نے جواب دیا۔ "والد مرحوم اپنے نفس پر قابو رکھتے تھے۔ ان کے دل میں حبِ دُنیا نام کو بھی نہ تھی۔ وہ ہمیشہ دُنیا پر غالب رہتے تھے اور اس کو مغلوب رکھ کر خرچ کیا کرتے تھے۔ مگر میری حیثیت ان سے مختلف ہے۔ میں دُنیا پر اتنا غالب نہیں ہوں۔ کبھی کبھی میں مساوی ہو جاتا ہوں یعنی یہ کہ حبِ دُنیا اور نقودِ دُنیا برابر برابر ہو جاتے ہیں۔ میری اپنی یہ کیفیت مجھے خوفزدہ اور پریشان کردیتی ہے۔ میں نے اپنی اس حالت پر کئی بار غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر نقد رقم میرے پاس رہی اور حبِ دُنیا میں توازن برقرار نہ رہا تو میں کیا کروں گا۔ چنانچہ میں نے خطرے کی چیز کو چند ساعتوں میں تقسیم کرکے خود کو محفوظ کرلیا۔ اب میں بالکل مطمئن اور خوش ہوں کہ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں رہ گئی جو مجھے تباہ و برباد کردے!"

ان کے بھائی اور ارادت مند اپنا سا منہ لے کر واپس چلے گئے۔ شیخ عارف کا شہرہ دن دونا رات چوگنا ہوتا رہا، انہیں عارف اس لئے کہا جانے لگا کہ قرآنی آیات کے معانی و مطالب ان پر القا ہوتے تھے اور انہیں قرآن پاک کا جتنا عرفان حاصل تھا، دوسرا کوئی ان کا مدِمقابل نہیں تھا۔ آپ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کو آیاتِ ربانی کے اسرار و معارف سے آگاہ فرمایا کرتے تھے۔ آپ کے ارادت مندوں میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ امراء بھی، غرباء بھی، طالب علم بھی، اساتذہ، تاجر بھی اور اہلِ حرفہ بھی۔ ایک دن آپ صراطِ مستقیم پر وعظ فرما رہے تھے، سامعین میں مولانا عزیز اللہ ملتانی بھی موجود تھے۔ یہ ملتان کے مشہور ترین مدرس تھے اور اپنا وہ وقت جو درس و تدریس سے بچ جاتا تھا آپ کی صحبت میں گزار دیتے تھے!

جب شیخ عارف وعظ فرما چکے تو مولانا عزیز اللہ نے عرض کیا "حضرت! آپ کا وعظ جو بھی سنتا ہے، اس پر حیرت انگیز اثر ہوتا ہے لیکن افسوس کہ جو لوگ آپ کے حلقے میں شریک نہیں ہوتے، وہ ہدایت سے محروم رہ جاتے ہیں، خدارا ان کے لئے بھی کچھ کیجئے!"

آپ نے دریافت کیا "عزیز اللہ! جو کچھ کہنا چاہتے ہو، کھل کر کہہ دو، تاکہ اس کا بھی انتظام کر دیا جائے!"

مولانا عزیز اللہ نے کہا۔ "حضرت! ملتان میں شیخ احمد نامی ایک قندھاری تاجر رہتا ہے۔ خدا نے اسے بڑی ترقی دے رکھی ہے مگر وہ آدمی جوان ہے، اس لئے شراب کباب میں مست رہتا ہے، دین کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دیتا!"

آپ نے فرمایا "کسی دن اس کو ہمارے پاس لے آؤ، ذرا ہم بھی اسے دیکھ لیں!"

مولانا نے مایوسی سے کہا۔ "ہم لے تو اس وقت آئیں جب وہ دین کی طرف راغب ہو، اس کا دین کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں، رات کو شراب میں مست رہتا ہے، دن میں اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے!"

شیخ عارف نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا "وہ کاروبار کہاں کرتا ہے؟"

مولانا نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا "جب آپ سلطان المشائخ حضرت زکریا ملتانی کے مزار کی زیارت کے لئے تشریف لے جاتے ہیں، تو اس شخص کی دُکان راہ میں پڑتی ہے اور وہ وہاں موجود ہوتا ہے!"

شیخ نے کہا "اچھا، کل جب اُدھر سے گزریں گے تو اس کو بھی اپنے ساتھ لے لیں گے!"

مولانا نے حیرت سے کہا۔ "لیکن حضرت! وہ آپ کے ساتھ جائے گا ہی کیوں؟"

آپ نے کہا "وہ کس طرح ہمارے ساتھ جائیگا، یہ تمہارے نہیں، ہمارے سوچنے کی بات ہے، تم مت فکر کرو!"

مولانا خاموش ہوگئے لیکن اس کے بعد دوسرے دن تک وہ یہی سوچتے رہے کہ اس دُنیا دار خرابات کو شیخ عارف آخر کس طرح اپنے ساتھ لے جائیں گے؟ کیا شیخ احمد ان کا کہنا مان لے گا؟ اس کا جواب نفی میں تھا۔

دوسرے دن اوّل پہر شیخ عارف نے اپنے کسی مرید سے پوچھا۔

"کیا مولانا عزیز اللہ تشریف رکھتے ہیں؟"

مرید نے عرض کیا۔ "جی پیر و مرشد! وہ موجود ہیں۔"

شیخ عارف نے کہا۔ "بلالو انہیں!"

مرید نے مولانا کو حاضر کردیا۔ آپ نے فرمایا۔ "مولانا! یاد ہے نا میں اس خرابات کو پہچانتا نہیں، آپ ہمارے ساتھ چلیں گے اور ہمیں اس کی شناخت کرائیں گے؟"

مولانا نے عرض کیا۔ "جی پیر و مرشد! میں اسی لئے تو حاضر ہوا ہوں!"

کچھ دیر بعد شیخ عارف اپنے مریدوں کے ہجوم میں اپنے والد کی آخری آرام گاہ کی زیارت کو روانہ ہوئے تو مولانا عزیز اللہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

شیخ عارف کی سواری جب بازار سے گزرنے لگی تو مولانا عزیز اللہ نے ایک دکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "حضرت! وہ رہا خراباتی تاجر شیخ احمد!"

آپ نے دیکھا، دکان میں ایک جوان ہنس ہنس کر کسی سے باتیں کر رہا ہے۔ آپ نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور مولانا سے کہا۔ "مولانا! جائیے اور اسے میرے پاس بلا لائیے!"

مولانا نے تذبذب میں سوال کیا۔ "کیا وہ میرے بلانے سے آ جائیگا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "آپ جائیں تو سہی، اس سے کہیئے تمہیں شیخ عارف بلا رہے ہیں؟"

مولانا شیخ احمد کے پاس گئے اور ان کا شانہ ہلا کر کہا۔ "بھائی! آپ کو شیخ عارف نے یاد فرمایا ہے!"

شیخ احمد نے قہر آلود نظروں سے مولانا کو گھورا۔ "کون شیخ عارف؟"

مولانا نے انگلی سے شیخ عارف کی طرف اشارہ کیا، شیخ عارف کی نظریں شیخ احمد پر جمی ہوئی تھیں، دونوں کی نظریں جو ملیں تو شیخ احمد کی گویا قوتِ گویائی سلب ہو گئی۔ دکان سے اٹھے اور مولانا کے ساتھ شیخ عارف کی خدمت میں پہنچ گئے۔ شیخ احمد مولانا عزیز اللہ کے پاس بیٹھ گئے اور شیخ عارف سے پوچھا تک نہیں کہ آپ نے مجھے کیوں یاد فرمایا ہے۔ مولانا کو حیرت تھی کہ شیخ احمد کو آخر ہو کیا گیا ہے؟

کچھ دیر بعد ان کی سواری حضرت زکریا ملتانی کے مزار کے سامنے جا کر رک گئی۔ یہ لوگ گاڑی سے اتر کر مزار کے سامنے پہنچ گئے۔ شیخ عارف نے فاتحہ پڑھی اور کچھ دیر ساکت و صامت کھڑے رہے، اس کے بعد فرمایا۔ "آؤ گھر واپس چلیں!"

ہر کوئی باہر کی طرف چل پڑا۔ شیخ احمد کسی معمولی انسان کی طرح شیخ عارف کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

باہر نکل کر شیخ عارف نے شیخ احمد سے پوچھا۔ "کہو شیخ احمد! کچھ مزہ آیا؟"

شیخ احمد نے جواب دیا۔ "حضرت! میرے پورے جسم میں آگ سی لگی ہوئی ہے!"

شیخ عارف نے فرمایا۔ "صبر کرو، بس ذرا سی دیر کے لئے صبر کرو!"

یہ لوگ گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف چل دیئے، کچھ دیر بعد گھر آگیا اور یہ لوگ گاڑی سے اتر کر اندر چلے گئے۔ شیخ عارف نے اپنے ایک خادم کو آواز دی اور حکم دیا۔ "برادرِ عزیز! سخت گرمی پڑ رہی ہے اور میرا مہمان اندر سے بالکل پھنکا جا رہا ہے، اس لئے ہمارے لئے شربت لاؤ!"

خادم شربت بنا کر لایا۔ آپ نے اس میں سے تھوڑا سا پی کر شیخ احمد کی طرف بڑھا دیا۔ فرمایا: "او ناکارہ اور راندۂ درگاہ شخص! یہ تو کیا شراب خوری میں لگا رہتا ہے، کچھ عاقبت کا بھی خیال کر!"

شیخ احمد کو شربت لینے میں تامل ہوا۔ پوچھا۔ "کیا میں یہ شربت پینے پر مجبور ہوں یا اس کا اختیار حاصل ہے کہ میں چاہوں تو پیوں نہ چاہوں تو نہ پیوں!"

شیخ عارف نے فرمایا۔ "تجھ کو اختیار حاصل ہے کہ جی چاہے تو پی لے، ورنہ رہنے دے!"

شیخ عارف کا اتنا کہنا تھا کہ وہ بالکل مجبور ہو گیا اور شربت کا پیالہ لے کر سب پی گیا، شربت کے پیتے ہی اس کی حالت ہی بدل گئی، مست ہو گیا، فرطِ جوش میں خود کو شیخ عارف کے قدموں میں گرا دیا اور عاجزی سے کہا۔ "شیخ! یہ آپ نے کیا کر دیا؟ میں تو دنیا کے کام کا بالکل ہی نہ رہا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اس نے خوشامدانہ درخواست کی۔ "اب میں اس در کو نہیں چھوڑ سکتا، یہیں آپ کے قدموں میں پڑا رہوں گا!"

شیخ عارف نے پوچھا۔ "تو میرے قدموں میں کیوں پڑا رہے گا؟ جا اور شراب کباب میں مست رہ!"

وہ رونے لگا، بولا۔ "حضرت! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ مجھے کیوں شرمندہ کر رہے ہیں!"

شیخ عارف نے مزید فرمایا۔ "اور تیری تجارت کا کیا بنے گا؟ وہ تو بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہے!"

شیخ احمد نے بدستور روتے ہوئے کہا۔ "پیر و مرشد! آپ چاہتے کیا ہیں؟ کیا میں خودکشی کر لوں؟"

شیخ عارف نے جواب دیا۔ "خودکشی کیوں؟ زندہ رہ اور دین کی فکر کر۔ تو پسند کرے تو میری صحبت میں کچھ وقت گزارا کر!"

شیخ احمد نے کہا۔ "میں اپنا مال اور اثاثہ یا جائداد اور رقم سب کچھ راہِ خدا میں لٹا دینے کو تیار ہوں۔ آہ! آپ نے میرے سینے میں یہ کیسی آگ جلا دی ہے؟ میں اس میں پھنک جاؤں گا، جل مروں گا!"

شیخ عارف نے کہا۔ "اچھا پہلے تو اپنی جائداد اور کاروبار کا حساب کتاب چکا دے، اس کے بعد بات ہوگی!"

شیخ احمد اسی وقت اپنے گھر چلے گئے اور کئی دن تک غیر حاضر رہے، پانچویں دن واپس آئے تو شیخ عارف نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "تو یہ غائب کہاں ہو گیا تھا؟ میں تو تیرا انتظار ہی کرتا رہ گیا!"

شیخ احمد نے جواب دیا۔ "حضرت! آپ کے شربت نے تو مجھے کہیں

سے کہیں بہنچا دیا۔ میں نے اپنا سارا مال و اسباب اور نقد رقم راہِ خُدا میں لُٹا دی اور اب میں ایک عجیب سی فرحت اور خوشی محسوس کر رہا ہوں۔"

شیخ عارف نے پوچھا۔ "اپنا سب کچھ راہِ خُدا میں دے دینے کے بعد کیا تو واقعی فرحت اور خوشی محسوس کر رہا ہے؟"

شیخ احمد نے جواب دیا۔ "ایک عجیب سی لذت محسوس کر رہا ہوں۔ ایک عجیب سا مزہ! میں کس طرح بیان کروں؟"

شیخ عارف نے پوچھا۔ "کسی چیز کی خواہش محسوس کر رہے ہو یا نہیں؟"

شیخ احمد نے جواب دیا۔ "کسی چیز کی بھی نہیں، بلکہ میں خود کو دنیا کی ہر شئے سے متنفر محسوس کر رہا ہوں، یہاں تک کہ میرے جسم پر جو لباس ہے، یہ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔"

شیخ عارف نے اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دی۔ "تم چاہو تو میرے پاس رہ سکتے ہو!"

شیخ احمد کیف و مستی میں ڈوب چکے تھے، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ کبھی ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتے تھے۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں اور ان پر ایک مستقل مستی سی طاری رہتی تھی۔ جو لوگ شیخ احمد کے ماضی سے واقف تھے، انہیں اس کی کایا پلٹ پر بڑی حیرت ہوتی تھی۔ ایک دن کسی مرید نے شیخ احمد کو عجیب حالت میں دیکھا، سردی کا موسم تھا، سرد ہوا چل رہی تھی، دریا کا پانی یخ ہو رہا تھا۔ شیخ احمد اس پانی میں کھڑے مناجات میں مشغول تھے۔ "اے اللہ! تو حقیقی بادشاہ ہے اور اپنے بندوں کی اطاعت سے بے نیاز ہے، تو وہ ہے جو اپنے انتہائی لطف و عنایت سے اپنے بے بضاعت مخلص بندوں کو اپنی اطاعت کی توفیق دیتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے اپنی عبدیت کے بارے میں اپنا مقام معلوم ہو جائے۔ میں نے عہد کر لیا ہے کہ جب تک مجھے اپنے مرتبے کا علم نہیں ہوگا، میں اس پانی سے باہر نہیں نکلوں گا!"

ہواتف سے سرگوشی میں ایک آواز سُنائی دی۔ "شیخ احمد! تیرا مرتبہ یہ ہے کہ بہت سی مخلوق کو تیری وجہ سے بخش دیا جائیگا! تو تنہا جنت میں نہیں جائیگا، اپنے ساتھ بہتوں کو جنت میں لے جائیگا!"

شیخ احمد نے عرض کیا۔ "خُدایا! تیری نعمت اور عطا کی کوئی حد نہیں اور تیری عنایتوں کا کوئی شمار نہیں، میں اس پہ اکتفا نہیں کر سکتا میں اپنا مقام، اپنا درجہ جاننا چاہتا ہوں۔"

اسی طرح سرگوشی میں جواب ملا۔ "شیخ احمد! تجھے تمام طالبان کا معشوق بنایا گیا!"

شیخ احمد پانی سے باہر نکلے۔ کپڑے پہنے اور ایک طرف چل دیئے۔ جدھر جاتے "شیخ احمد معشوق، شیخ احمد معشوق" کی آواز سُنائی دیتی۔ اس آواز نے انہیں اور زیادہ مست و بے حال کر دیا۔

شیخ عارف کو مطلع کیا گیا کہ شیخ احمد خود کو معشوق کہتے ہیں اور اتنے مست اور بے حال ہو چکے ہیں کہ کسی کام کا ہوش ہی نہیں رہا۔ یہاں تک کہ نماز تک نہیں پڑھتے۔

شیخ عارف نے فرمایا۔ "اللہ اس پر رحم کرے، میں کیا کر سکتا ہوں؟"

مولانا عزیز اللہ نے عرض کیا۔ "حضرت! شیخ احمد کو نماز تو پڑھنی ہی چاہیئے۔"

شیخ عارف نے فرمایا۔ "مولانا! تمہیں کسی طرح بھی چین نہیں ہے جب وہ شخص اپنے ہوش و حواس میں تھا تو تمہیں یہ شکایت تھی کہ وہ دنیا کے کاموں میں منہمک ہے اور جذب و مستی سے یکسر محروم ہے۔ اب جب کہ وہ دُنیا کو فراموش کر کے خود کو بھی بُھلا چکا ہے تو تم اس کی مجھ سے شکایت کر رہے ہو!"

مولانا نے کہا۔ "حضرت! غور طلب بات یہ ہے کہ شیخ احمد خود کو معشوق کہتے ہیں!"

شیخ عارف نے جواب دیا۔ "اس میں کیا بات غور طلب ہے، شیخ احمد خود کو کیا معشوق کہیگا! اس کو تو خُدا نے معشوق کہا ہے۔ اب وہ شیخ احمد سے شیخ احمد معشوق ہو چکا ہے!"

مولانا نے عرض کیا۔ "چلیئے جناب! یہ بات بھی گوارا لیکن اس کا کیا جواز بیان فرمائیں گے کہ شیخ احمد نے نماز تک ترک کر دی ہے!"

آپ نے جواب دیا۔ "نماز تو ہوشمندوں پر فرض ہے لیکن شیخ احمد تو اپنے ہوش و حواس ہی میں نہیں، پھر وہ نماز کس طرح ادا کرے گا!"

مولانا نے تشویشناک آواز میں کہا۔ "پیرو مرشد! وہ آپ کا مرید ہے، اس کا وبال آپ پر آئیگا۔ آپ کو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ نماز پڑھنے لگے!"

آپ نے جواب دیا۔ "تم لوگ شیخ احمد کے پاس جاؤ اور انہیں نماز پڑھنے پر مجبور کرو!"

مولانا عزیز اللہ چند دوسرے لوگوں کو ساتھ لے کر شیخ احمد کے پاس لے گئے اور انہیں نماز پڑھنے پر مجبور کرنے لگے۔ مولانا نے شیخ احمد سے پوچھا۔ "شیخ احمد! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

شیخ احمد نے جواب دیا۔ "میں نے کوئی حالت نہیں بنا رکھی، خُدا جس حال میں رکھے، بندے کو خوش رہنا چاہیئے!"

مولانا نے کہا۔ "تم نماز کیوں نہیں پڑھتے؟"

شیخ احمد نے جواب دیا۔ "لوگو! میں جس حال میں ہوں، اس میں نماز جائز نہیں ہے۔"

مولانا نے کہا۔ "شیخ احمد! تم باتیں تو بڑی ہوشمندی کی کر رہے ہو!"

شیخ احمد نے جواب دیا۔ "نہایت ضبط و احتیاط سے، صرف اس لئے کہ خُدا مجھے مورد الزام نہ ٹھہرا دے کہ شیخ احمد! میں نے تجھ کو اتنا ہوش تو دیا ہی تھا کہ تو نماز پڑھنے اور نہ پڑھنے کا فیصلہ کر سکے!"

مولانا نے کہا۔ "شیخ احمد! علمائے ملتان تمہارے نماز نہ پڑھنے کے خلاف ایک فتویٰ پر غور کر رہے ہیں، اس لئے میں تمہیں ایک مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ تم آج ہی سے پانچوں وقت کی نماز پڑھنا شروع کر دو، ورنہ

عنقریب کیسی سزا کے مستحق قرار پاؤ گے؟

شیخ احمد خاموش ہو گئے، کچھ دیر چپ رہنے کے بعد جواب دیا۔ "مولانا عزیز اللہ! مجھے نہیں معلوم کہ علمائے ملتان میرے خلاف فتویٰ دینے میں اتنے بے قرار کیوں ہیں؟ بہرحال ان سے جا کر کہہ دیجئے کہ میں نماز پڑھنے کو تیار ہوں، مگر مجھے اجازت دی جائے کہ میں سورۃ فاتحہ کے بغیر نماز پڑھوں۔"

مولانا نے جواب دیا۔ "ایسا کس طرح ہو سکتا ہے، سورۃ فاتحہ کے بغیر نماز کا کوئی تصور ہی نہیں۔"

شیخ احمد نے کہا۔ "پھر تو میں بھی مجبور ہوں، میں نماز نہیں پڑھ سکتا۔"

مولانا نے بہ اصرار کہا۔ "شیخ احمد! ایک بار پھر غور کر لو، نماز بہرحال پڑھنی پڑے گی۔"

شیخ احمد نے کہا۔ "اچھا، اپنے علماء کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو کہ اگر میں سورۃ فاتحہ پڑھوں اور اس کے بعد ایاک نعبد و ایاک نستعین والے حصے کو چھوڑ دوں تو میری نماز ہو جائے گی یا نہیں؟"

مولانا نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "شیخ احمد! واقعی تم اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہو، تمہارا دماغ چل گیا ہے، یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟"

شیخ احمد نے فوراً جواب دیا۔ "مولانا! یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ ایک طرف تو تم مجھے نماز کی تلقین کر رہے ہو اور دوسری طرف مجھے دیوانہ کہہ رہے ہو، پتہ نہیں میں کیا ہوں۔"

مولانا نے ضد کی۔ "جناب! میں آپ سے نماز پڑھوا کر رہوں گا۔ میں بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔"

شیخ احمد نے جواب دیا۔ "میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں، تم لوگ مجھ کو اپنی مرضی اور اپنے حکم پر نہیں چلا سکتے۔ میں اگر نماز پڑھوں گا تو سورۃ فاتحہ کے مذکورہ حصے کو چھوڑ کر، ورنہ نہیں پڑھوں گا!"

مولانا نے کہا۔ "میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم میری بات نہیں مانو گے، اب میں علماء اور فقہاء کو لے کر تمہارے پاس آؤں گا۔ کیونکہ تم انہی کی بات مانو گے جو اپنی بات جبر سے بھی منوا سکیں گے۔"

شیخ احمد خاموش ہو گئے۔ مولانا عزیز اللہ اپنے آدمیوں کے ساتھ واپس چلے گئے۔

کئی دن بعد علماء اور فقہاء نے شیخ احمد کو گھیر لیا۔ ظہر کے وقت کو چند ساعتیں باقی تھیں۔ علماء میں سے ایک نے پوچھا۔ "کیا تجھے معلوم ہے کہ ہم لوگ تیرے پاس کیوں آئے ہیں؟"

شیخ احمد نے جواب دیا۔ "مجھے نماز کی تلقین کرنے، تم سب مجھے نماز پڑھنے پر مجبور کرو گے۔"

دوسرے عالم نے پوچھا۔ "ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تو نماز سے کیوں بھاگتا ہے؟"

شیخ احمد نے جواب دیا۔ "یہ کس نے کہہ دیا کہ میں نماز سے بھاگتا ہوں۔ میں نماز سے قطعاً نہیں بھاگتا، کوئی دیوانہ نماز سے کیوں بھاگے گا۔"

عالم نے پوچھا۔ "کیا تو دیوانہ ہے؟"

شیخ احمد نے جواب دیا۔ "میں دیوانہ نہیں ہوں، لیکن تم لوگ مجھے دیوانہ سمجھتے ہو!"

اس عالم نے کہا۔ "تجھ کو کوئی دیوانہ ہی دیوانہ کہہ سکتا ہے۔ ہم تو تجھے ہوشیار اور دانا سمجھتے ہیں، اس لئے نماز پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔"

شیخ احمد نے کہا۔ "میں نے نماز پڑھنے سے کب انکار کیا، میں اس شرط پر نماز پڑھنے کو تیار ہوں کہ سورۃ فاتحہ کا، ایاک نعبد و ایاک نستعین کا حصہ نہیں پڑھوں گا۔"

دوسرے تیز مزاج عالم نے سخت لہجے میں کہا۔ "تیری یہ مجال کہ تو نماز میں اپنی مرضی سے تبدیلی کرنا چاہتا ہے؟"

شیخ احمد نے کہا۔ "افسوس کہ تم لوگ صاحب حال نہیں ہو۔۔۔ قیل و قال کے لوگ ہو، اس لئے میری باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔"

کئی عالموں نے ایک ساتھ یورش سی کر دی، بولے۔ "بحث بند کر، اور ہمارے ساتھ ظہر کی نماز پڑھنے کے لئے تیار ہو جا اور یاد رکھ کہ نماز کی جملہ سورتیں پڑھی جائیں گی، کیونکہ آیت کے کسی حصے کو اپنی مرضی سے چھوڑ دینا کسی انسان کے اختیار اور بس کی بات نہیں ہے۔"

شیخ احمد نے انتہائی آزردگی سے کہا۔ "افسوس کہ تم دنیا کی اصطلاح اور زبان میں ایک حائضہ کو نماز پڑھنے پر مجبور کر رہے ہو، کیا حائضہ پر نماز واجب ہے؟"

کئی عالم قہقہہ مار کر ہنس دیے۔ ایک نے کہا۔ "واللہ! کچھ کھسکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے اس کو نماز پر مجبور نہ کیا جاتا تو بہتر ہے کیونکہ باتیں کرتے کرتے یہ بہک سا جاتا ہے۔"

دوسرے عالم نے کہا۔ "یہ بنتا ہے، ورنہ بالکل صحیح ہے۔"

ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ سب نے نماز کی تیاری کی۔ وضو کرنے لگے۔ شیخ احمد بھی وضو کرنے لگے۔ وضو کرنے کے بعد کہا۔ "علمائے کرام و فقہائے عظام! میں تنہا نماز پڑھوں گا، تم لوگ بعد میں پڑھ لینا۔"

کسی عالم نے کہا۔ "شیخ احمد باتیں بہت کرتا ہے۔ بھلا تنہا پڑھنے سے کتنا ثواب ملے گا؟"

شیخ احمد نے جواب دیا۔ "میں نماز ثواب کے لئے نہیں پڑھوں گا، بلکہ یہ بتانے کے لئے پڑھوں گا کہ حائض پر نماز فرض نہیں۔"

علماء اور فقہاء ان کی بات سمجھنے سے قاصر تھے۔ انہوں نے ظہر کی نماز کے لئے شیخ احمد کو کھڑا کر دیا۔

شیخ احمد نے ظہر کی نیت باندھی اور سورۃ فاتحہ شروع کر دی۔ مالک یوم الدین تک پہنچ کر رک گئے۔ ان کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ علماء نے زور دیا۔ "اور آگے، آگے پڑھو، رک کیوں گئے؟"

شیخ احمد کے چہرے کی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ بہت خوفزدہ ہیں۔ علماء کے اصرار پر انہوں نے انتہائی کرب میں پڑھا۔ ایاک نعبدُ وایاک نستعین۔ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں)

اس کے بعد شیخ احمد کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ علماء و فقہاء نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا کہ شیخ احمد کے کپڑے سرخ ہو چکے تھے اور ان کے ہر بن مُو اور مسام سے خون جاری ہو چکا تھا۔ شیخ احمد نے نیت توڑ دی اور تہرآلود نظروں سے علماء و فقہاء کو دیکھا اور کربناک آواز میں پوچھا۔ "اب تو تم لوگ خوش ہو، میرا ہر بُن مو اور ہر مسام خُدا کی عبادت کرنے لگا۔ کیا میرا پورا جسم حائضہ عورت کی طرح نہیں ہو گیا؟ کیا اس حال میں بھی نماز جائز ہے؟"

علمائے کرام اور فقہائے عظام منہ لٹکا کر چلے گئے۔ یہ جھگڑے بھاگے پیر مرشد صدرالدین عارف کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا۔ "پیر و مرشد! شہر کے عالموں اور فقیہوں نے مجھے کہیں کا بھی نہیں رکھا!"

شیخ عارف نے شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تسلی دی۔ "شیخ احمد! مت پریشان ہو، خُدا نے تمہیں جو جذب اور جو کیف بخشا ہے، وہ قابلِ رشک ہے۔ یہ علمائے ظاہر اس کو کیا سمجھیں گے؟"

شیخ عارف کے جسم سے رسنے والا خون رُک گیا، بہنا بند ہو گیا۔ لیکن ان کے جسم میں کمزوری پیدا ہو گئی اور وہ کئی دن تک اس لائق نہیں رہے کہ کہیں دُور تک چل پھر سکتے!



شیخ عارف کے عقیدت مندوں میں ایک صاحب قطب الدین بہرام بھی تھے۔ یہ بوڑھے ہو چکے تھے مگر اولاد سے محروم تھے۔ یہ حافظ بھی تھے اور ان کا قاعدہ تھا کہ ہر روز قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہتے تھے اور یہ تلاوت اس طرح ہوتی تھی کہ جب تک چار پانچ پارے نہ پڑھ لیتے، انہیں چین نہ آتا تھا اور ہر جمعہ کو شیخ المشائخ زکریا ملتانی کے مزار پر جاتے اور قرآن پاک کا ثواب انہیں بخش دیتے اور دُعا مانگتے کہ اللہ انہیں اولادِ نرینہ عطا فرمائے!

اس معمول پر عمل کرتے ہوئے کئی ماہ گزر گئے۔

کئی ماہ بعد ایک جمعہ جو آیا تو انہوں نے گڑگڑا کر حضرت زکریا ملتانی سے عرض کیا۔ "حضرت! اب پیمانۂ صبر لبریز ہوتا جا رہا ہے، اور میں مایوس ہوتا جا رہا ہوں۔ اگر اولادِ نرینہ میری قسمت میں ہے تو عطا کی جائے، ورنہ مجھے مطلع کر دیا جائے کہ میں امیدیں توڑ دوں!"

اس دن قطب الدین بہرام نے قرآن پاک ختم کیا تھا۔ انہیں ہلکی ہلکی نیند آ رہی تھی۔ اچانک نیند نے غلبہ کیا اور ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ غنودگی میں انہوں نے دیکھا کہ شیخ عارف تشریف لاتے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ "قطب الدین! تم نے میرے والد بزرگوار سے کیا چیز مانگ رکھی ہے؟"

قطب الدین نے عرض کیا۔ "اولادِ نرینہ! میں نے یہ چیز اُن سے نہیں مانگی ہے، بلکہ اُن کے وسیلے سے خُدا سے مانگی ہے!"

شیخ عارف نے فرمایا۔ "تو مبارک ہو، تمہاری قسمت میں اولادِ نرینہ موجود ہے اور یہ ضرور ملے گی۔ بس ذرا صبر سے کام لو!"

قطب الدین نے کہا۔ "لیکن حضرت! کب تک صبر کروں؟ میں اپنے رب کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں مگر اس کی تاخیر سے پریشان ہو چکا ہوں!"

شیخ عارف نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا ہاتھ قطب الدین کی طرف بڑھا دیا۔ ان کی مٹھی بند تھی، فرمایا۔ "قطب الدین! اپنا دامن/ہاتھ میری طرف تو بڑھانا!"

قطب الدین نے تامل سے اپنا ہاتھ شیخ عارف کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔ "جی فرمائیے! اس ہاتھ سے کیا کام آن پڑا؟"

شیخ عارف نے جواب دیا۔ "میرے ہاتھ میں دو کھجوریں ہیں۔ ان میں سے ایک تم کھا لو اور دوسری اپنی بیوی کو کھلا دو، اللہ نے چاہا اولادِ نرینہ سے شاد کام ہو گے!"

قطب الدین کی آنکھ کھل گئی تو حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، وہاں کوئی بھی نہ تھا، یہ سیدھے زکریا ملتانی کے مزار پر پہنچے اور ایک قرآن کا ثواب انہیں بخش کر باہر نکلنے لگے، تو ایک بزرگ نے ان کا راستہ روک لیا، پوچھا۔ "کیا قطب الدین بہرام تمہارا ہی نام ہے؟"

قطب الدین نے جواب دیا۔ "جی بزرگوار۔ فرمائیے، مجھ سے کوئی کام....؟"

بزرگ نے کہا۔ "ہاں، میں یہاں کسی کا بھیجا ہُوا آیا ہوں!"

قطب الدین نے کہا۔ "فرمائیے میرے لائق کوئی خدمت؟"

بزرگ نے جواب دیا۔ "تم سے میں کیا خدمت لوں گا، میں تو خود کسی کا بھیجا ہُوا یہاں آیا ہوں!" اس کے بعد اپنی بند مٹھی قطب الدین کی طرف بڑھا دی۔ کہا۔ "یہ دو کھجوریں ہیں، ایک تم کھا لو اور دوسری اپنی بیوی کو کھلا دو۔ اللہ نے چاہا تو مُراد کو پہنچو گے!"

قطب الدین اتنے خوش تھے کہ دونوں کھجوریں لے کر چلتے بنے اور ان بزرگ کا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔

گھر پہنچ کر ایک کھجور تو خود کھا لی اور دوسری بیوی کو کھلا دی۔ بیوی نے کھجور کھا تو لی، مگر حیرت سے پوچھا۔ "جناب یہ چکر کیا ہے؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "چکر وکر کچھ نہیں، ان کھجوروں سے ہمیں وہ دولت مل جائے گی جس کی برس ہا برس سے ہم آرزو کر رہے ہیں!"

بیوی غریب چُپ ہو گئی، مگر نو ماہ بعد وہ حیرت زدہ رہ گئی کہ وہ ایک لڑکے کی ماں بن گئی، قطب الدین خوشی سے پاگل ہو گئے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کا نام فتح اللہ رکھا!



اُن دِنوں ملتان میں غیاث الدین بلبن کا بیٹا شہزادہ محمد

حکومت کر رہا تھا۔ شہزادے کو چتر و مسند بھی عطا ہوئی۔ یہ شیخ عارف کی خدمت میں حاضری دیتا اور ان کی دعائیں لے کر واپس جاتا!

شہزادہ محمد بہت خوش مزاج اور خوش مذاق نوجوان تھا، وہ ہر ایک سے بہت اچھی طرح پیش آتا۔ ان دنوں خواجہ حسن اور خواجہ خسرو بھی اسی شہزادے کے دربار ہی میں رہتے تھے۔ شہزادہ محمد کی بیوی بہت حسین تھی اور شہزادہ اس سے عشق کی حد تک محبت کرتا تھا۔ وہ شراب کے نشے میں دھت جب اپنی بیوی کے پاس جاتا تو وہ بہت ہی بری طرح پیش آتا، بیوی پوچھتی "شہزادے! آج پھر پی آئے؟"

شہزادہ جواب دیتا "ہاں، میں پی تو آیا مگر اس میں ہرج ہی کیا ہے؟"

بیوی بہت کوفت سے جواب دیتی "شہزادے! میں نیک بد سے واقف ہوں۔ شراب حرام ہے، خدا کے لئے اس کو چھوڑ دیجئے۔ ورنہ ہم دونوں کے تعلقات خراب ہو جائیں گے؟"

شہزادے نے غصہ سے بیوی کو گھورا، بولا "ہمارے تعلقات کیوں خراب ہونے لگے؟ کیا تو خود کو اتنا ہی صاحب اختیار سمجھتی ہے؟"

بیوی نے جواب دیا "شہزادے! میں نے جو کچھ بھی کہا اس میں بناوٹ اور جل فریب نام کو بھی نہیں، البتہ اللہ نے مجھے اتنا حوصلہ بخشا ہے کہ میں کسی بات سے بھی پریشان نہیں ہوتی!"

شہزادہ غصے میں کھڑا ہو گیا "عورت! میں اس لب و لہجے میں بات سننے کا عادی نہیں ہوں۔ تو شاید یہ بات بھول گئی کہ میں سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا بھی ہوں!"

بیوی نے جواب دیا "اور آپ بھی یہ نہ بھول لیجئے کہ میں ہندوستان کے نامور متقی پرہیزگار سلطان شمس الدین التمش کی بیٹی ہوں!"

شہزادے نے بگڑ کر کہا "تیرا باپ مرحوم ہو چکا جب کہ میرا باپ ابھی موجود ہے۔ اب مجھ سے بڑھ چڑھ کر بات نہ کرنا ورنہ میں اس کا بہت برا جواب دوں گا!"

بیوی شوہر کے تیور دیکھ کر چپ ہو گئی۔

شہزادہ شیخ عارف سے ملا اور ان سے دعا کی درخواست کی، شیخ نے فرمایا "شہزادے! خدا کے نیک بندوں کے دل نہ دکھاؤ، کیوں کہ دل کے دکھ جانے سے عرش ہلنے لگتا ہے!"

شہزادے نے کہا "میں اپنی بیوی کی تند مزاجی برداشت نہیں کر سکتا!"

شیخ عارف نے جواب دیا "پتہ نہیں کون کس کو برداشت کرتا ہے مگر میری ایک بات گرہ میں باندھ لو، غصے اور اشتعال میں کوئی الٹا سیدھا قدم نہ اٹھانا، ورنہ بہت پچھتاؤ گے!"

شہزادے نے جواب دیا "حضرت! میں نہایت محتاط اور صابر انسان ہوں۔ غصے یا اشتعال میں ایک کمرے میں بند ہو جاتا ہوں، اور اس وقت اندر سے نکلتا ہوں جب میں معمول پر آ چکا ہوتا ہوں!"

شیخ نے کہا "میرا کام سمجھانا تھا، سو سمجھا دیا۔ اب تم جانو، اور تمہارا کام جانے!"

شہزادے نے معذرت کی اور جانے کے لئے تیار ہو گیا، جاتے جاتے بولا "حضرت! میں تو آپ کا مطیع اور تابع ہوں، مجھے کسی اور سے کیا غرض؟ آپ نے مجھے غصے اور اشتعال سے روکا ہے، میں اس پر ہمیشہ عمل کروں گا!"

آپ نے فرمایا "اگر اس پر عمل کرے گا تو خوش رہے گا، نہیں عمل کرے گا تو غمگین اور رنجیدہ رہے گا!"

شہزادہ چلا گیا۔

ایک دن نشے میں دھت شہزادہ اپنی بیوی کے پاس گیا تو اس نے کراہت سے اپنا منہ پھیر لیا۔

شہزادے نے غصہ میں کہا "اے عورت! کیا میں اتنا برا ہوں کہ تو مجھے دیکھ کر اپنا منہ پھیر رہی ہے!"

بیوی نے جواب دیا "شراب کے نشے میں دھت رہنے والا اچھا کس طرح ہو سکتا ہے؟"

شہزادے کو اور زیادہ غصہ آ گیا، چیخ کر بولا "عورت تو میری شان میں گستاخی کر رہی ہے، اپنی زبان کو قابو میں رکھ! ورنہ زبان کھینچ لوں گا!"

بیوی نے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا "میں اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتی۔ میں خود بھی تجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی لیکن تو مجبور کر رہا ہے تو جواب دینا پڑ رہا ہے!"

شہزادے نے کہا "اگر یہ بات ہے تو میں تجھ کو اپنے پاس نہیں رکھوں گا، تو میرے لائق نہیں ہے، میں نے تجھ کو طلاق دی، میں نے تجھ کو طلاق دی، میں نے تجھ کو طلاق دی!"

بیوی فوراً ہی اٹھ کر محل کے دوسرے حصے میں چلی گئی، جاتے جاتے کہہ گئی "شہزادے! اب تم میرے سامنے نہ آنا، کیوں کہ تم مجھے طلاق دے چکے ہو اور میں تمہارے لئے نامحرم ہو چکی ہوں!"

شہزادے نے بیوی پر الوداعی نظر ڈالے بغیر ہی باہر کی راہ لی، اور دو تین دن تک کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔ جب ذرا ہوش آیا تو بیوی یاد آئی، بیوی کا حسن و جمال اور دانائی یاد آنے لگی۔ اس نے کسی کنیز سے پوچھا "وہ اس وقت کہاں ہو گی؟"

کنیز نے جواب دیا "محل کے اندر ہیں، لیکن وہ آپ کے سامنے نہیں آئیں گی؟"

شہزادے نے پوچھا "سامنے کیوں نہیں آئے گی؟ اس کی کوئی وجہ؟"

کنیز نے عرض کیا "آپ نے انہیں طلاق دے دی ہے، اب وہ عدت کے دن گزار رہی ہیں، اور آپ کو نامحرم سمجھتی ہیں!"

شہزادے نے بڑی بے چینی سے کہا۔ "لیکن میں نہیں مانتا کہ اس کو طلاق ہو گئی۔ میں اب بھی اس کو اپنی بیوی ہی سمجھتا ہوں، اس سے کہہ دے کہ وہ خواہ مخواہ عدت کے دن گزار رہی ہے۔ طلاق ہوئی ہی کب ہے؟ اس سے کہہ دے جاکر کہ وہ میرے پاس آجائے، میں ہر قسم کا گناہ عذاب اپنے سر لینے کو تیار ہوں!"

کنیز نے جب یہ بات اندر جاکر کہی تو وہاں سے جواب ملا۔ "شراب نے شہزادے کا تو دماغ ہی خراب کر دیا ہے، اس نے مجھ پر تین طلاقیں بھیج دیں۔ اس لئے طلاق تو ہو چکی ہے۔ اب میں شہزادے کے پاس کسی حالت میں بھی نہیں جاؤں گی!"

جب کنیز نے یہ بات شہزادے کے گوش گزار کی تو وہ بہت پریشان ہو گیا۔ اس کے بعد شہر کے کئی عالم طلب کئے اور ان سے اس بارے میں فتویٰ مانگا۔

علماء نے متفقہ طور پر صاف صاف بتا دیا۔ "شہزادۂ معظم! اب حلالہ لازم ہو چکا ہے، بلکہ فرض ہو چکا ہے۔ آپ کی بیوی کو طلاق ہو چکی ہے! اب پہلے وہ عدت کی مدت گزارے، اس کے بعد کسی اور مرد سے شادی کرے اور شبِ عروسی کے مراحل سے گزرے، اس کے بعد اس کا شوہر طلاق دے، اور وہ ایک بار پھر عدت میں بیٹھے اور عدت کی مدت گزارنے کے بعد آپ سے دوبارہ شادی کرے۔"

شہزادے کو بہت دکھ ہو رہا تھا، پوچھا۔ "اس کے علاوہ کوئی ترکیب نہیں نکل سکتی؟"

علماء نے جواب دیا۔ "مذہب اور فقہ میں ترکیبیں نہیں چلتیں! افسوس کہ ابھی ابھی آپ کو جو کچھ بتایا گیا، یہی مسئلہ ہے!"

شہزادہ بہت زیادہ غمگین ہو گیا، اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بولا۔ "میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے، بلکہ زیادتی کی ہے، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا، میں اس سے محبت کرتا ہوں، عشق کرتا ہوں، اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے --- اسی کی شکل نظروں کے سامنے گھومتی رہتی ہے۔"

علمائے کرام کو شہزادے کی ان باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی وہ خاموش رہے اور شہزادے کی نزاعی کیفیت پر کفِ افسوس ملتے رہے۔ شہزادے نے ایک بار پھر علماء سے سوال کیا۔ "تو آپ لوگوں کے پاس اس جواب کے سوا کچھ بھی نہیں، یعنی میں اس سے مایوس ہو جاؤں .....!"

علماء نے کہا۔ "افسوس کہ ہم صرف وہی بتائیں گے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے!"

شہزادے نے سرد مہری سے کہا۔ "اب آپ لوگ جا سکتے ہیں، میں خود ہی کوئی حل نکالوں گا، اس سلسلے میں مجھے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے!"

علماء چلے گئے تو شہزادہ بھاری قدموں سے اندر چلا گیا اور وہاں ایک خدمت گزار کو حکم دیا۔ "جا قاضی اثیر الدین خوارزمی کو بلا لا، اب میں اس سے مشورہ کروں گا اور اس سے مدد طلب کروں گا!"

قاضی اثیر الدین خوارزمی کو اسی وقت حاضر کر دیا گیا۔ شہزادے نے کہا۔ "قاضی! تو خوب جانتا ہے کہ میں تیرا احترام کرتا ہوں، اور میرے دل میں تیری بڑی قدر و منزلت ہے!"

قاضی نے جواب دیا۔ "جی! خوب جانتا ہوں، آپ فرمائیے آخر کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

شہزادے نے ساری تفصیل قاضی کو بتا دی، آخر میں بولا۔ "اب بتاؤ، ان حالات میں میں کیا کروں؟ اور مجھے کیسے کرنا چاہیئے؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "اس کا وہی جواب ہے جو مجھ سے پہلے علمائے کرام عرض کر چکے ہیں۔ کیونکہ یہ فقہی مسئلہ ہے اور اس کا ہر جگہ ایک ہی جواب ہے!"

شہزادہ روہانسو ہو رہا تھا۔ "قاضی! اگر میں چاہوں تو اس عورت کو زبردستی بلوا لوں، لیکن کل قیامت میں مجھے سب کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑے گی اور اگر اس سے دور اور لاتعلق رہتا ہوں تو جینے کا مزہ جاتا رہے گا، اب آپ ہی بتائیے، کہ میں کیا کروں؟"

قاضی نے کہا۔ "دیکھئے جناب! ملتان میں ایک ایسی ہستی بھی موجود ہے جس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے اور وہ ہستی ہے جناب صدر الدین عارف کی۔ میں ان سے آپ کی طرف سے بات کئے لیتا ہوں اور آپ کی مطلقہ کا ان سے نکاح پڑھائے دیتا ہوں، نکاح پڑھانے سے پیشتر شیخ کو صورتِ حال سے مطلع کر دوں گا اور ان سے یہ وعدہ لے لوں گا کہ وہ اس کے بعد طلاق دے دیں تاکہ آپ ان سے دوبارہ شادی کر سکیں؟"

شہزادہ بہت خوش ہوا، بولا۔ "یہ بڑی عمدہ ترکیب ہے اور اس سے ہر کوئی اتفاق کرے گا!"

چنانچہ قاضی اثیر الدین شیخ عارف کے پاس پہنچے اور انہیں سارا واقعہ بتا کے وعدہ لیا کہ وہ نکاح کے بعد اس کو طلاق دے دیں، تاکہ شہزادہ اس سے دوبارہ شادی کر لے۔ یہ تیار ہو گئے۔ قاضی نے اس مطلقہ کا نکاح شیخ سے پڑھا دیا۔ یہ کام اتنی خاموشی اور پردہ داری سے ہوا کہ قاضی اور شہزادے کے سوا کسی اور کو اس کا علم ہی نہ ہو سکا!

شادی کی پہلی ہی رات کو شیخ نے اس عورت کو ساری صورتِ حال سے باخبر کر دیا اور کہا۔ "میں نے تو بس ضرورتاً اور مصلحتاً تجھ سے شادی کی ہے، صبح کو طلاق دے دوں گا!"

عورت زار و قطار رونے لگی۔ بولی۔ "شیخ! خدا اور اس کے رسول کے لئے ایسا نہ کیجئے۔ میں شہزادے سے عاجز آچکی ہوں، اس جہنم میں مجھے دوبارہ نہ دھکیلئے!"

آپ نے فرمایا۔ "لیکن میں نے تو قاضی سے وعدہ کر لیا ہے!"

عورت نے جواب دیا۔ "جب میں خود اس شہزادے کے پاس جانے کو تیار نہیں تو کیا آپ اپنی مرضی سے زبردستی وہاں بھیج دیجیے گا!"

آپ نے فرمایا۔ "میں طلاق دینے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتا!"

عورت نے کہا۔ "آپ جیسے ہی مجھے طلاق دیں گے، میں فوراً ہی خودکشی کرلوں گی اور اس کا وبال آپ کے سر رہے گا!"

شیخ بہت پریشان ہوگئے۔ پوچھا۔ "پھر میں کیا کروں، قاضی تو کل علی الصباح آتے ہی طلاق کے لئے درخواست کرگزرے گا، میں اس کو کیا جواب دوں گا؟"

عورت نے جواب دیا۔ "آپ قاضی کو میری طرف سے صاف صاف کہہ دیجئے کہ میں طلاق نہیں لینا چاہتی اور اب شہزادے کی صورت تک نہیں دیکھنا چاہتی!"

شیخ نے کہا۔ "لیکن قاضی میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوگا، وہ میری بات نہیں مانے گا!"

عورت نے کہا۔ "اگر وہ آپ کی بات نہیں مانے گا تو نہ مانے آپ اس کی بات کیوں مانیں؟"

شیخ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "خیر جیسا تو چاہتی ہے، ویسا ہی ہوگا تجھے معصیت کے غار میں دھکا نہیں دیا جاسکتا!"

دوسرے دن علی الصباح قاضی اثیر الدین شیخ عارف کی خدمت میں پہنچ گئے اور کہا۔ "حضرت! اب اس کو طلاق دے دیجئے!"

شیخ نے جواب دیا۔ "افسوس کہ میں اس کو طلاق نہیں دے سکتا!"

قاضی کے ہوش جاتے رہے۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین سرکنے لگی۔ بے چینی سے پوچھا۔ "وہ کیوں؟ میں نے تو اسی شرط پر نکاح پڑھایا تھا!"

آپ نے جواب دیا۔ "وہ عورت خود بھی اب شہزادے کے پاس جانے کے لئے تیار نہیں ہے، میں نے جو جواب دیا ہے، یہ عورت کا جواب ہے!"

قاضی کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی، بے اختیار بولا۔ "عورت کو کہنے دیجئے، آپ نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا، اس کو پورا کیجئے!"

شیخ عارف نے جواب دیا۔ "میں اپنا وعدہ پورا کرسکتا ہوں، مگر اس میں ایک نقص شرعی ہے جب عورت شہزادے کی صورت تک نہیں دیکھنا چاہتی اور صاف صاف یہ کہہ رہی ہے کہ اگر ایسا کیا گیا تو وہ خودکشی کرلے گی، پھر میں اس کو حرام فعل کا کس طرح موقع دے سکتا ہوں؟"

قاضی نے سختی سے کہا۔ "شیخ! اگر آپ نے میری بات نہ مانی، تو جانتے ہیں، اس کا انجام کیا ہوگا؟"

شیخ نے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا کہ میرا کیا انجام ہوگا، لیکن میں ایک نیک کام کی خاطر ہر انجام کے لئے تیار ہوں۔ میری طرف سے آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے!"

قاضی نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ "تو میں جاؤں؟"

شیخ نے جواب دیا۔ "میں نے تو آپ کو نہیں روکا ہے؟"

قاضی اثیر الدین یہاں سے اٹھ کر شہزادے کے پاس پہنچا ان کے ہوش و حواس بجا نہیں تھے، یہاں تک کہ شہزادے کے روبرو ان کی آنکھ تک نہیں اٹھ رہی تھی۔ شہزادے نے قاضی کے نظریں چرانے سے اندازہ لگالیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ قاضی سے پوچھا۔ "آخر معاملہ کیا ہے؟ تو مجھ سے نظریں کیوں چرا رہا ہے؟"

قاضی نے سارا احوال بیان کردیا۔ شہزادے نے غصے میں تلوار کو نیام سے کھینچ لیا اور قاضی کو برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ "اس کام کی تو نے ہی صلاح دی تھی، پھر کیوں نہ تیری ہی گردن اُڑا دوں؟"

قاضی نے عرض کیا۔ "بے شک میں آپ کا گنہگار ہوں، لیکن جو کچھ ہُوا یا ہو رہا ہے، اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے، میں شیخ عارف کے تصوف سے دھوکہ کھا گیا ہوں!"

شہزادے نے تلوار بلند کی اور کچھ سوچ کر دوبارہ میان میں رکھ لی۔ بولا۔ "بے شک اس معاملے میں یہ شیخ ہی سرتاپا خطاکار ہے، اور اس کو اس کے فریب کی سزا ضرور ملے گی، میں اس کو معاف نہیں کروں گا!"

قاضی نے پوچھا۔ "پھر آپ نے کیا سوچا؟"

شہزادے نے جواب دیا۔ "میں نے ابھی ابھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ کل سہ پہر تک شیخ کو اپنے ہاتھ سے قتل کردوں گا اور اس عورت کو اپنے محل میں لے آؤں گا، اگر میں ایسا نہ کرسکا تو تم یہ سمجھ لینا کہ میں اس عورت سے زیادہ گرا پڑا انسان ہوں!"

اس کے بعد شہزادے نے تالی بجاکر کسی کو طلب کیا۔ جب کئی خدمت گار ایک ساتھ اندر داخل ہوئے، تو ان میں سے ایک کو شہزادے نے حکم دیا۔ "فوجی سردار سے کہہ دیا جائے کہ مجھے کو کل صبح تک دس ہزار سوار درکار ہیں۔ اگر وہ ملاحظہ میں دس ہزار سوار نہ پیش کرسکا تو میں اس کی گردن اُڑا دوں گا!"

اس دن شہزادہ اس قدر غصے میں تھا کہ کھانا اور شراب تک بھول گیا۔ یہ خبر معلوم نہیں کس طرح محل سے باہر پہنچی اور پھر وہاں سے گشت کرتی ہوئی پورے ملتان میں گونجنے لگی۔ ملتان کا ہر شخص پریشان اور بدحواس سا نظر آنے لگا۔

شہزادہ محل میں سر جھکائے فکرمند بیٹھا تھا، عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا، اسی عالم میں شہزادہ اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا، وہ بہت پریشان تھا، اتنے میں ایک شخص دوڑتا ہُوا آیا اور شہزادے کے قدموں میں گر گیا۔ اس نے اس شخص کو سنبھالنے کی کوشش کی تو پتہ چلا، وہ بہت زیادہ زخمی ہے۔

شہزادے نے اس کا مُنہ اپنی طرف کر لیا اور پوچھا: "یہ تجھے کیا ہُوا، تجھ کو کس نے زخمی کر دیا؟"

زخمی نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔ "جنابِ والا! منگولی لشکر ملتان میں داخل ہو چکا ہے اور اِدھر اُدھر لوٹ مار کرتا پھر رہا ہے۔"

شہزادے کے دل و دماغ میں کچھ اور ہی تھا۔ منگولوں کی غیر متوقع آمد نے شہزادے کو بدحواس کر دیا۔ اس کو کچھ پتہ نہ تھا یہ کیا ہو رہا ہے اور کون کر رہا ہے؟

شہزادے نے زخمی سے پوچھا۔ "پھر ان منگول حملہ آوروں کو کسی نے روکا کیوں نہیں؟"

زخمی نے جواب دیا۔ "ہم نے انہیں روکنے کی کوشش ہی میں تو یہ حال کیا ہے اپنا؟"

شہزادہ کچھ سوچتا ہُوا بولا۔ "بہرحال وہ جہاں ہیں انہیں وہیں روک دیا جائیگا! انہیں مزید آگے نہیں بڑھنے دیا جائیگا!"

زخمی نے شہزادے کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا، اس نے زخمی کو ڈانٹ کر پوچھا: "سچ سچ بتا وہ کتنے ہیں؟"

مگر دوسری طرف سے پھر کوئی جواب نہیں ملا۔ شہزادے نے اس کو ایک بار پھر ڈانٹا کر تو بولتا کیوں نہیں؟ کیا بہرا ہو گیا؟

لیکن کسی خدمت گزار نے شہزادے کو مطلع کیا کہ زخمی مر چکا ہے۔ شہزادے کو ایک جھٹکا سا لگا۔

کچھ دیر بعد یکے بعد دیگرے کئی زخمی اور آئے اور ان سے بھی یہی خبر ملی کہ بیس ہزار جنگجو، خونخوار ملتان میں داخل ہو چکے ہیں اور شہر کے سرحدی حصّوں کا سکون برباد ہو چکا ہے۔ شہزادے نے پوری رات تیاری میں گزار دی اور صبح فجر کی نماز کے بعد اپنی سپاہ کے ساتھ حملہ آوروں کے مقابلے پر روانہ ہونے لگا۔ قاضی نے پوچھا: "شیخ عارف کے بارے میں کیا فیصلہ فرمایا آپ نے؟"

شہزادے نے جواب دیا۔ "پہلے حملہ آوروں سے نمٹوں گا، اس کے بعد شیخ عارف کو ٹھکانے لگاؤں گا!"

شہزادہ اپنی فوج کو لے کر حملہ آور مغلوں کے مقابل جا ڈٹا، زبردست جنگ چھڑ گئی، یہاں تک کہ مغلوں کے دانت کھٹے کر دیئے، انہوں نے راہِ فرار اختیار کی، شہزادے نے پانچ سو سوار روک لئے اور بقیہ کو مغلوں کے تعاقب میں روانہ کر دیا۔ شہزادہ ایک حوض کے کنارے پہنچا، وضو کیا اور اپنے سپاہیوں کے ساتھ نماز پڑھنے لگا۔ اسی عالم میں دو ہزار مغل کسی طرف سے نمودار ہوئے اور شہزادے پر حملہ کر دیا۔ ذرا سی دیر میں شہزادے کو اس کے پانچ سو آدمیوں سمیت قتل کر دیا۔ مغلوں نے شہزادے کے سامان کو اپنے قبضے میں کیا اور ملتان اور ملتان والوں کو کوئی گزند پہنچائے بغیر واپس چلے گئے۔ شام تک یہ خبر عام ہو چکی تھی کہ مغلوں نے شہزادے کو قتل کر کے اپنی راہ لی۔ جب یہ خبر شہزادے کی مطلقہ بیوی کو پہنچی تو وہ فرطِ عقیدت سے شیخ عارف کے قدموں میں گر گئی اور روتے ہوئے عرض کیا: "حضرت! میں آپ کا کن زبان سے شکریہ ادا کروں کیونکہ شہزادہ اگر زندہ رہتا تو میں آپ کے پاس نہیں رہ سکتی تھی اور آپ کی ہلاکت یقینی ہو جاتی!"

شیخ نے جواب دیا: "عورت! رب کے بھید رب ہی جانے، کسی کو دَم مارنے کی بھی مجال نہیں ... شہزادہ بے چارہ اس کی مرضی کے خلاف کیا کر سکتا تھا!"



سکندر لودھی کا انتقال ہُوا تو اس کا بیٹا ابراہیم لودھی اس کا جانشین قرار پایا۔ ابراہیم لودھی نے اپنے باپ کے برعکس جن لوگوں کو اپنے آس پاس جمع کیا تقریباً سبھی شرّی اور مفسد تھے۔ سلطان ابراہیم لودھی نے اپنے وزیر میاں بہوہ کو الگ کر دیا۔ اور اس کی جگہ اپنے استاد فرید کو وزیر بنا دیا۔ یہ شخص بلا کا عیّار اور فریبی تھا۔

سابق وزیر میاں بہوہ شیخ عارف کے ایک مرید جمالی کے پاس پہنچے اور ان سے کہا: "جمالی! میں بہت پریشان ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھے وزارت دوبارہ مل جائے، بلکہ میں فرید کے شر سے محفوظ رہنا چاہتا ہوں، دُعا کیجئے اور اپنے پیر و مرشد سے کہیئے کہ وہ میرے حق میں دعا فرمائیں!"

جمالی نے کہا: "میں مرحوم بادشاہ کا مرثیہ اور موجودہ بادشاہ کا قصیدہ لکھ رہا ہوں، اس سے فارغ ہونے کے بعد ہی میں آپ کے لئے کچھ کر سکتا ہوں!"

میاں بہوہ بہت مایوس ہوئے۔ بولے۔ "اچھا، میں کچھ دنوں کے لئے روپوش ہُوا جاتا ہوں!"

جمالی نے مرثیے اور قصیدے میں جو اشعار کہے، ان میں کا ایک شعر تھا:

اے سلیمان زماں آہ کجائی آخر
تا کنم پیش تو از فتنۂ دیوان فریاد!

ابراہیم لودھی کے مفسد درباری اس شعر کو لے اڑے اور بادشاہ کے کان بھر دیئے: "بادشاہ سلامت! آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ جمالی نے اپنے شعر میں آپ کو دیو و شیطان کہہ دیا ہے، وہ بھی اس لئے کہ ... میاں بہوہ ان کی صحبت میں رہتے ہیں اور انہیں ورغلاتے اکساتے رہتے ہیں!"

ابراہیم لودھی کو ملال تو ہُوا مگر اس نے شیخ جمالی سے صرف اتنا کہا۔ "جنابِ! آپ نے مجھے اپنی طرف سے بدظن کر دیا۔ آپ کو میری بابت ایسا شعر نہیں کہنا تھا!"

جمالی نے عرض کیا: "شعر کا غلط مفہوم آپ کے ذہن نشین کرایا جا رہا ہے۔ حالانکہ میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا جو حضور کے درباری

اور خوشامدی حضور کو بتا رہے ہیں!"

ابراہیم لودھی نے جواب دیا "میں تو ایک بات جانتا ہوں کہ اگر کسی شاعر کو اپنے فن پر اتنی دسترس نہ ہو کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے بہ خوبی نہیں کہہ سکتا اور لوگ اس کے معانی اور مطالب اپنی مرضی سے نکالنے میں قادر ہوں تو ، ایسے شخص کو شاعری کرنے کا کوئی حق نہیں!"

جمالی شرمندہ تھے بولے "جیسا آپ فرما رہے ہیں میں ویسا عمل کروں گا۔ لیکن جس شعر نے آپ کو میرے خلاف بدظن کر دیا ہے ، اگر آپ فرمائیں تو میں اس کو اپنے اشعار میں سے حذف کر دوں!"

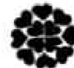
ابراہیم لودھی نے جواب دیا "چند دن صبر کیجئے ، میں بعد میں بتاؤں گا کہ آپ کو کیا کرنا چاہئے"

جمالی کی کوشش تھی کہ وہ بادشاہ کے دل سے کدورت کی گرد و غبار نکالنے میں کامیاب ہو جائیں اور بادشاہ اس حساب کتاب کو اپنی تحویل میں رکھنا چاہتا تھا اور جمالی کو اتنی آسانی سے نہیں معاف کرنا چاہتا تھا۔

جمالی کی نیند اڑ گئی اور بھوک پیاس جاتی رہی ۔ اسی عالم میں انہیں نیند آ گئی ۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ان کے پاس آئے ہوئے ہیں ، ان کے ہاتھ میں ایک چادر ہے ۔ اس چادر کو جمالی کے حوالے کر دیا اور کہا "جمالی ! تو بہت فکرمند تھا ، شیخ عارف نے یہ چادر تیرے پاس اس غرض سے بھیجی ہے کہ اس کو اوڑھ لے اور سلطان کے خوف سے نجات حاصل کر لے!"

جمالی نے عرض کیا "اگر ایسا ممکن ہے تو میں اس کے دن کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں"

جمالی نے چادر مذکورہ بزرگ سے لے لی اور اس کو اوڑھ کر بیٹھ گئے ۔ چادر کے اوڑھتے ہی دل کا تردد رخصت ہو گیا اور طمانیت قلب سے ان کے دل و دماغ کو سکون کی ایک روشنی بھی مل گئی اور اس کے بعد سلطان ابراہیم لودھی نے جمالی اور میاں بہوہ کے خلاف ایک بات بھی نہ کی ۔ دونوں کی بڑے اطمینان اور مزے سے گزرنے لگی ۔ جمالی میاں بہوہ سے فخریہ کہا کرتے : "میاں بہوہ ! اب چونکہ میں نے اس چادر کو اوڑھ لیا ہے ، جو خواب میں حضرت شیخ عارف نے بھجوائی تھی ، چنانچہ میں اب یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ کسی فقیر کی بات اس طرح نشانے پر لگ سکتی ہے!"



شیخ فخرالدین عراقی شیخ عارف کے بھتیجے تھے اور شیخ عراقی صوفیائے کرام میں بڑی عزت رکھتے تھے ۔ عراقی کی تربیت میں حضرت ذکریا ملتانی کا بہت بڑا حصہ تھا ، شیخ عراقی کی کتاب "لمعات" کا ہر طرف بڑا چرچا ہوا ، صوفیائے کرام اس کتاب کی بڑی عزت کرتے تھے مشہور تھا کہ اس کتاب کی تیاری میں قونیہ کے مشہور صوفی شیخ صدرالدین قونوی نے شیخ عراقی کو فیض پہنچایا تھا!

ایک دن عبدالرحمٰن جامی کی محفل میں اس کتاب کا ذکر چھڑ گیا ۔ مولانا جامی نے فرطِ عقیدت سے کہا "شیخ عراقی اس وقت تک اتنی بلند پایہ کتاب لکھ ہی نہیں سکتے تھے ۔ اس کی تالیف اور تصنیف میں شیخ صدرالدین قونوی کا روحانی فیض رچا بسا ہوا ہے ، اگر ان کا فیض شیخ عراقی کے شاملِ حال نہ ہوتا تو وہ کبھی اتنی بلند پایہ کتاب نہ لکھ سکتے!"

جس محفل میں یہ ذکر چھڑا ہوا تھا ، اس میں جمالی بھی موجود تھے۔ انہیں مولانا جامی کی یہ بات اچھی نہیں لگی ۔ بولے "مولانا جامی ! آج یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے ؟ یہ آپ کیسی غیر مخلصانہ اور غیر عاقلانہ باتیں کر رہے ہیں؟"

مولانا جامی اپنی رائے پر قائم رہے ۔ بولے "شیخ جمالی ! میں جو رائے دیتا ہوں ، بہت سوچ سمجھ کر دیتا ہوں ، یہ میری اپنی ہی رائے نہیں ہے ، کئی دوسرے معتبر لوگ بھی اس معاملے میں میرے ہم خیال ہیں!"

شیخ جمالی نے عرض کیا ۔ "اگر یہ آپ کی خود اپنی رائے ہوتی تو میں آپ سے بحث کر گزرتا لیکن اب ایسا ممکن نہیں رہا!"

اس شب مولانا جامی نے ایک عجیب خواب دیکھا ۔ انہوں نے دیکھا ایک پُرنور چہرے والے بزرگ شیخ صدرالدین عارف بہت سے درویشوں کے ساتھ تشریف فرما ہیں اور مولانا عراقی شیخ عارف کے جوتے سنبھالے باادب کھڑے ہوئے ہیں ۔ اسی دوران مولانا جامی بھی وہاں پہنچ گئے ، اور شیخ عارف کو سلام کر کے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا ۔ مولانا جامی نے قریب ہی جمالی کو کھڑے ہوئے دیکھا ۔ جمالی نے مسکرا کر کہا : "مولانا جامی ! آپ کو شیخ عارف کے مرتبے کا علم ہوا یا نہیں؟"

مولانا جامی نے شرمسار ہو کر عرض کیا "شیخ جمالی ! حق تمہاری طرف ہے ، میں شرمندہ ہوں!"

دوسرے دن صبح صبح مولانا جامی شیخ جمالی کے پاس پہنچ گئے ۔ رات کا خواب بیان کیا اور عاجزی سے عرض کیا "شیخ جمالی ! جیسا کہ میں رات کو خواب میں بھی آپ سے کہہ چکا ہوں کہ حق آپ کی طرف ہے ، اس وقت وہی بات پھر دہرا رہا ہوں کہ حق آپ کی طرف ہے اور میں شرمندہ ہوں ، میری معذرت قبول فرمائیں!"

شیخ عارف کے سنِ وصال میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔ تاریخ فرشتہ میں ۶۷۷ھ ہے جب کہ دوسری کتابوں میں جیسے سفینۃ الاولیاء اور مرآۃ الاسرار میں ۶۸۳ھ لکھا ہے ، اور تذکرہ صدرالدین عارف از نور احمد خان فریدی میں سالِ وفات ۷۰۹ھ لکھا ہے ۔ سالِ وفات کوئی بھی ہو لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ اس آفتاب تصوف نے مدتوں دور دور تک اپنی ضیاء پاشیوں سے منور رکھا اور آج بھی اس کا فیضان جاری ہے!!





قبلۂ حاجات



ضیا تسنیم بلگرامی
جاسوسی نشست +92 3331784111

مشہور بزرگ شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی اپنی خانقاہ میں تشریف فرما تھے۔ ارادت مند اور مُرید ادب و احترام سے آپ کے ملفوظات سُن رہے تھے۔ لوگوں کی عقیدت اور احترام کا یہ حال تھا کہ ان کی خاموشی میں سانسوں کے سوا کوئی اور آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ آپ سامعین کو بتا رہے تھے کہ حقوق العباد کتنی ضروری شے ہیں، آپ نے فرمایا۔ "لوگو! اگر تم اس دنیا میں جنّت کا مزہ لُوٹنا چاہتے ہو تو حقوق العباد پر عمل کرو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر انسان، انسان کے ساتھ صحیح ہوجائے تو اسے ایک شاندار جنّت اسی دنیا میں حاصل ہوجائے۔ بیوی شوہر سے، شوہر بیوی سے، اولاد والدین سے، والدین اولاد سے، دکاندار گاہک سے، گاہک دوکاندار سے، اگر یہ سب اپنے اپنے فرائض اور حقوق پر دیانت داری سے عمل کریں، تو یہی دنیا جنّت بن جائے۔ انسان انسان کا احترام کرے۔"

آپ کا وعظ جاری ہی تھا کہ کسی نے مطلع کیا۔ "حضرت! آپ کی بہو قدمبوسی کے لئے حاضر ہوئی ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "ان سے کہو میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

آپ وعظ ختم کرکے گھر میں تشریف لے گئے۔ ان کی بہو راستی بی بی حسنِ کردار اور اعمال و اشغال میں اسم بامسمّیٰ تھیں۔ ان دنوں راستی بی بی سات ماہ سے امید سے تھیں۔ بہاؤ الدین زکریاؒ بہو سے نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔ وہ جتنا احترام کررہے تھے، راستی بی بی شرم و ندامت سے گڑی جارہی تھیں۔ انہوں نے اپنے خُسر سے کہا۔ "قبلہ بزرگوار! میں آپ کی بہو ہوں، بیٹی کی طرح۔ آپ کی عظمت اور بزرگی مسلّم ہے پھر آپ میری تعظیم بجالاکر مجھے کیوں شرمندہ کررہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "بی بی! تو غلط سمجھی، میں تیری تعظیم کہاں کررہا ہوں، میں تو اُس بچے کی تعظیم کررہا ہوں جو دو ماہ بعد تیرے بطن سے پیدا ہوگا۔ اس بچے کو سرتاجِ اولیاء، چراغِ اقلیمِ اصفیا اور شمعِ ایوانِ اتقیاء، جو کچھ بھی کہا جائے کم ہے، میں اس کے احترام اور تعظیم پر مجبور ہوں۔"

بی بی راستی کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہ ایک شاندار اور قابلِ فخر بشارت تھی۔ بے چینی سے اس یگانۂ روزگار بچے کی ولادت کا انتظار کرنے لگیں۔ بچہ پیدا ہوا اور بی بی راستی نے بچے میں وہ نشانیاں اور علامتیں تلاش کرنا شروع کردیں، جن سے اس نومولود کی عظمت اور بزرگی کا اندازہ کیا جاسکتا۔ بچے میں کئی غیر معمولی علامتیں موجود تھیں۔ بی بی راستی عموماً وضو سے رہتی تھیں، لیکن جب وہ وضو سے نہ ہوتیں تو بچے کو دودھ پینے میں تامّل ہوتا۔

بچے کا نام رُکن الدینؒ رکھا گیا۔ دادا کی آغوشِ جسمانی اور رُوحانی میں اس بچے کی پرورش ہونے لگی۔ کبھی کبھی بچے پر غیر معمولی محویت طاری ہوجاتی، بی بی راستی اگر اس محویت کو ختم کرنا چاہتیں تو ناکام رہتی۔ اس وقت بزرگ دادا مُسکرا کر ہدایت دیتا۔ "بی بی! کلام اللہ کی تلاوت شروع کرو، بچے کی توجہ کلام اللہ کی طرف منعطف ہوجائے گی۔"

ماں نے آپ کے قول پر عمل کیا اور فوراً ہی یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ بچہ پوری توجہ سے اللہ کا کلام سُن رہا ہے اور اس کے انگ انگ سے مسرّت و انبساط کا اظہار ہورہا ہے۔

پھر یہ بات بھی محسوس کی کہ بچہ اذان کے دوران بالکل خاموش اور منہمک رہتا ہے اور جب بچے نے بولنے کی ابتدا کی تو اس کی زبان سے ادا ہونے والا پہلا لفظ "اللہ" تھا۔ یہاں تک کہ یہ بچہ چار سال کا ہوگیا۔

اس دن رُکن الدینؒ کے دادا حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ خود کو تھکا تھکا محسوس کررہے تھے۔ وہ آرام کرنے کی غرض سے پلنگ پر لیٹ گئے۔ بہاؤ الدینؒ کے صاحبزادے اور چار سالہ رُکن الدینؒ کے والد شیخ صدر الدین عارفؒ پلنگ کے قریب فرش پر مؤدّب بیٹھ گئے۔ دادا نے اپنی دستار پلنگ کے سرہانے ایک پائے پر رکھ دی تھی۔ چار سالہ رُکن الدینؒ اپنے دادا کے پلنگ کے گرد چکر لگانے لگے۔ صدر الدین عارفؒ بیٹے کو سرزنش کرنے لگے۔ "رُکن الدینؒ! یہ کیا کررہے ہو، دادا جان کا ادب کرو اور میری طرح فرش پر ادب سے بیٹھ جاؤ۔"

دادا نے صدر الدینؒ کو منع کیا۔ "صدر الدینؒ! یہ جو کچھ کررہا ہے، کرنے دو۔ اسے منع نہ کرو۔ میں اس کے مرتبے سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

صدر الدینؒ نے ادب سے عرض کیا۔ "قبلہ و کعبہ! یہ آپ کی خود پروری ہے ورنہ میں رُکن الدینؒ کی یہ بے تکلفی بالکل پسند نہیں کرتا، اسے آپ کا ادب کرنا چاہیئے۔"

دادا نے مُسکرا کر کہا۔ "بیٹے صدر الدینؒ! اپنے بیٹے کا مرتبہ پہچانو۔"

ضیا تسنیم بلگرامی ہر ماہ آپ کے لیے ایک بصیرت افروز مضمون تحریر کرتی ہیں

چار سالہ پوتے نے اور زیادہ جسارت دکھائی، اور اپنے دادا کی دستار پلنگ کے پائے سے اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لی۔ صدر الدینؒ نے غصے میں اٹھ کر بیٹے کو پکڑ لیا۔ جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "رکن الدینؒ! تم نہیں مانو گے؟ اب تمہاری جرأت اور گستاخی حد سے بڑھتی جا رہی ہے، یہ دستار اتارو اپنے سر سے، تم ابھی اس دستار کی عظمت اور بڑائی سے واقف نہیں ہو، ورنہ یوں اپنے سر پر نہ رکھتے۔"

دادا نے صدر الدینؒ کو ڈانٹ دیا۔ "کیا کرتے ہو؟ اس سے دستار مت چھینو، پہنے رہنے دو، کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ اس نے میری دستار یوں ہی بچپنے کی نادانی یا شرارت میں پہن لی ہے؟ ہرگز نہیں، ایسا نہیں ہے، بلکہ اس نے میری دستار اپنا حق سمجھ کر پہنی ہے۔ میری یہ دستار رکن الدینؒ کا حق ہے اور بالآخر اسی کو پہننا ہے، اس نے میری نہیں اپنی دستار پہنی ہے۔"

ننھا رکن الدینؒ اپنے باپ اور دادا کی گفتگو بڑے غور سے سنتا رہا۔ اس کے بعد دستار اپنے سر سے اتار کر دادا کے حوالے کر دی۔ دادا نے اپنے بیٹے صدر الدینؒ کو حکم دیا۔ "تم میری یہ دستار امانتاً اپنے صندوق میں رکھ دو، جب رکن الدینؒ بڑا ہو جائے گا یہ دستار اس کے حوالے کر دینا۔"

صدر الدین عارفؒ نے وہ دستار لیکر صندوق میں محفوظ کر دی اور رشک و محبت سے اپنے ننھے رکن الدینؒ کو دیکھنے لگے لیکن بی بی راستی بہت خوش تھیں کیونکہ آج انہیں اپنے ننھے رکن الدینؒ کے علوئے مرتبہ کا بہت بڑا ثبوت مل گیا تھا۔ وہ بیٹا، جس کو اس کی پیدائش سے پہلے ہی سرتاجِ اولیاء، چراغِ اقلیمِ اصفیاء اور شمعِ ایوانِ اتقیاء جیسے خطابات سے نوازا جا چکا تھا۔

تین سال بعد، جبکہ رکن الدینؒ کی عمر سات سال ہو چکی تھی یہ باہر گلی میں کھیل رہے تھے۔ انہوں نے ایک عورت کو گود میں بچہ لئے روتے ہوئے دیکھا وہ عورت بچے کو گود میں لئے زار و قطار رو رہی تھی۔ رکن الدینؒ نے کھیلنا بند کر دیا اور عورت کے پاس جا کر دریافت کیا۔ "عورت! تم کیوں رو رہی ہو؟"

عورت نے گود کے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "رکن الدینؒ! میرا بچہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ میں تمہارے دادا کے پاس دعا کے لئے حاضر ہوئی ہوں، کیا وہ اندر موجود ہیں؟"

رکن الدینؒ نے جواب دیا۔ "دادا اندر موجود تو ضرور ہیں لیکن ان کے پاس خوشخبری کی امید لیکر مت جاؤ۔ میں جانتا ہوں وہ کیا جواب دیں گے۔"

غمگین عورت دیوانی ہو رہی تھی، بولی۔ "بچے! میں تمہاری باتوں میں وقت تو ضائع نہیں کر سکتی۔ میں ان سے اپنے بیٹے کی زندگی کے لئے دعا کرا لوں گی۔"

رکن الدینؒ نے جواب دیا۔ "میں نے تمہیں روکا ہی کب ہے جو تم یوں باتیں کئے جا رہی ہو، جاؤ دادا کے پاس اور کراؤ ان سے دعا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کیا دعا کریں گے۔"

عورت نے رکن الدین کی باتیں بے توجہی سے سنیں۔ اس کے خیال میں ایک سات سالہ بچے کی باتوں میں اسرار و رموز تلاش کرنا بے معنی کوشش تھی وہاں سے شیخ بہاؤالدین زکریاؒ [illegible] کہتے تھے تیز تیز قدم اٹھاتی ان کے حجرے میں داخل ہو گئی۔ شیخ زکریاؒ ذکرِ خفی میں مشغول تھے۔ عورت نے بے قراری سے اپنا بچہ ان کے آگے ڈال دیا اور گڑگڑاتی ہوئی بولی۔ "بابا! یہ بچہ میں آپ کے حوالے کئے جا رہی ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ اس کی قسمت میں کتنی زندگی لکھی ہے لیکن یہ نظر آ رہا ہے کہ یہ زندگی اور موت کی سخت کشمکش میں مبتلا ہے۔ بابا! یہ میری اکلوتی اولاد ہے، میں کچھ نہیں جانتی، میں آپ کی کچھ بھی نہ سنوں گی۔ میں اسے آپ کے سپرد کئے جا رہی ہوں اور ہفتہ بھر بعد اسے آپ کے پاس سے صحیح و سلامت لے جاؤں گی۔ میں اس کی زندگی چاہتی ہوں۔"

آپ نے بچے کو ایک نظر دیکھا، اس پر نزع کی تشنجی کیفیت طاری تھی، ایسا لگتا تھا گویا آخری ہچکی آنے ہی والی ہے۔ آپ نے اسے دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کشف سے اس کا مستقبل تلاش کیا۔ اس کے مستقبل میں موت کا اندھیرا تھا۔ ہست کا آخری سرا عدم سے ملا ہوا تھا۔ پید کا خاتمہ اور ناپید کا آغاز صاف نظر آ رہا تھا۔ زندگی فنا کے آگے سرنگوں تھی۔ 'ہے' مٹ رہا تھا 'نہیں' اس کی جگہ لے رہی تھی۔ آپ نے آنکھیں کھول دیں اور بڑے افسوس کے ساتھ کہا۔ "خاتون! میں تجھے کسی آسرے میں نہیں رکھنا چاہتا اور نہ ہی میں یہ چاہتا ہوں کہ تو مشیت ایزدی سے لاعلم رہے۔ میں نے کشف سے جو کچھ دیکھا ہے اسے بیان کر دینا ضروری ہے۔ میں نے عالمِ کشف میں تیرے بچے کی زندگی تلاش کی اور یہ دیکھ کر بہت مایوس ہوا کہ مشیت ایزدی یہی ہے کہ تیرا بچہ دارِ فانی سے دارِ عقبیٰ کی طرف سفر کر جائے، مشیتِ ایزدی کے آگے عاجز بندے کی کیا مجال کہ دم بھی مار سکے۔"

عورت نے بڑی دردناک چیخ ماری، روتی ہوئی بولی۔ "بابا! میں آپ کے پاس بڑی امیدیں لیکر آئی ہوں، آپ مجھے مایوس نہ کیجئے۔ آپ کے در کے بعد کس کا در ہے جہاں میں اپنا دکھ درد لے کر پہنچوں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "بی بی! در تو بس ایک ہی ہے جہاں ہر انسان کو جانا چاہئے اور وہ در ہے اللہ کا، خدا کا اور اس کار سازِ حقیقی کا جہاں سے کاموں کے بننے اور بگڑنے کے فیصلے صادر ہوتے ہیں۔ وہاں ہر کوئی عاجز اور بے بس ہے، میں بھی بے بس اور مجبور ہوں۔"

عورت زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ اس کے سینے میں ایک آگ سی جل رہی تھی، اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے آپ کی طرف دیکھا، پوچھا۔ "تب پھر میں جاؤں، آپ کچھ نہیں کر سکتے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "بی بی! میں مجبور ہوں۔"

عورت نے بچے کو سینے سے لگایا اور روتی ہوئی حجرے کے باہر آ گئی۔ اس وقت تک سات سالہ رکن الدینؒ کھیل بند کر چکے تھے اور عورت کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ آپ نے عورت کو روتے جو دیکھا تو پوچھا۔ "دادا نے کیا جواب دیا؟"

عورت نے کہا۔ "تمہارے دادا نے وہ جواب دیا ہے جس کی میں ان سے امید بھی نہ کر سکتی تھی۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میرے بچے کی زندگی ختم ہو چکی ہے اب اس کے حق میں دعا کرنا فضول ہے۔"

رکن الدینؒ نے کہا۔ "کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ دادا کے پاس

خوش خبری کی اُمید لیکر مت جاؤ لیکن تم نہیں مانیں اور وہاں سے وہ صدمہ لے کر واپس آئیں کہ جس سے بڑا کوئی اور صدمہ ہی نہیں۔"

عورت نے جواب دیا۔"رُکن الدینؒ! تم ابھی بچے ہو اور مامتا کے اُس باؤلے پن کا اندازہ نہیں لگا سکتے، جس میں مَیں پاگل ہو رہی ہوں۔"

رُکن الدینؒ نے کہا۔"ذرا بچے کو دکھانا تو۔"

عورت نے پوچھا۔"تم میرے بچے کو دیکھ کر کرو گے کیا؟"

انہوں نے جواب دیا۔"کروں گا کیا، یہ نہ پوچھو۔ وہ کروں گا جو دادا نے بھی نہیں کیا۔ تمہارے بچے کے حق میں دُعا کروں گا اور اس یقین کے ساتھ دُعا کروں گا کہ میرا اللہ مجھے مایوس نہیں کرے گا۔"

عورت نے اس مادر زاد ولی کو بڑے غور سے دیکھا، اس کے چہرے پر خوشی اور اُمید کی تابانی نمودار ہو گئی، بولی۔"رُکن الدینؒ! سچ، جو کچھ تم کہہ رہے ہو، سچ کہہ رہے ہو؟"

رُکن الدینؒ نے جواب دیا۔"میں جھوٹ کیوں اور کس کی خاطر بولوں گا، تم مجھے اپنے بچے کی صورت تو دکھاؤ۔"

عورت نے بچے کا مُنہ آپ کی طرف کر دیا۔ بچے کی گردن اس طرح جھول گئی، گویا اس کا منکا ڈھل چکا ہے۔ عورت نے ایک چیخ ماری، بولی۔"بابا رُکن الدین! اب تو یہ مرچکا۔ اب تم کس کے لئے دُعا کرو گے؟"

رُکن الدینؒ نے بچے کو بڑے غور سے دیکھا، بولے۔"بی بی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تمہارا بچہ مرا تھوڑی ہے، زندہ ہے، مستی مار کے پڑا ہے، تم دیکھ لینا یہ جلدی ہی اُٹھ کھڑا ہو گا۔"

عورت نے ان کی باتوں کو بڑی بے یقینی سے سُنا، بولی۔"رکن الدینؒ! تم مجھ دُکھیا سے مذاق مت کرو۔"

رکن الدینؒ نے جواب دیا۔"بی بی! میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، سچی بات کر رہا ہوں۔"

عورت نے پوچھا۔"اگر یہ لڑکا مر چکا ہے تو اس ہیر پھیر کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔"

رُکن الدینؒ نے جواب دیا۔"اچھا، اب تم گھر جاؤ اور اپنے لڑکے کی زندگی کا جشن مناؤ۔"

عورت نے عاجزی سے کہا۔"چھوٹے میاں! میں کس کا جشن مناؤں؟ معلوم نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں، کیوں کہہ رہے ہیں اور کس لئے کہہ رہے ہیں۔"

رکن الدینؒ نے جواب دیا۔"میں تمہارے بچے کی زندگی کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ تم اس پر بین مت کرو کیونکہ بین کرنا ناجائز اور ممنوع ہے۔"

عورت بچے سے اُلجھنا نہیں چاہتی تھی، چپ چاپ اپنے بچے کو لے کر رفوچکر ہو گئی اور اس دن شام تک یہ خبر پورے ملتان میں پھیل گئی کہ جس عورت کو بہاؤ الدین زکریاؒ نے مایوس کر دیا ہے، ان کے پوتے رُکن الدینؒ نے اسے بشارت دی اور لڑکا جِلا دیا۔

لوگ جوق در جوق اس عورت کے پاس پہنچنے لگے اور عورت بھاگی بھاگی رکن الدینؒ کے پاس آئی اور کہنے لگی۔"بیٹا! تو مادر زاد ولی ہے، میں تیرا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔"

رُکن الدینؒ نے جواب دیا۔"شکریے کی کوئی بات نہیں، مجھے تم پر رحم آگیا۔ میں نے اپنے خدا سے دُعا کی اور اُس نے میری سُن لی، مجھے مایوس نہیں کیا۔"

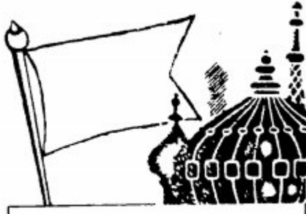
عورت نے کہا۔"رکن الدینؒ! اگر اسلام غیر اللہ کی پرستش کی اجازت دیتا تو میں تمہاری پرستش شروع کر دیتی۔ لیکن افسوس کہ میں یہ نہیں کر سکتی۔ مگر میرا دل جن جذبات اور احساسات سے مملو ہو رہا ہے، وہ مجھے بے اختیار اور بے خود کئے دے رہے ہیں۔"

رکن الدینؒ عورت کے سامنے سے ہٹ گئے کیونکہ انہیں ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں یہ عورت فرطِ جذبات میں انہیں سجدہ نہ کر بیٹھے۔

جب یہ خبر دادا کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے رکن الدینؒ کو اپنے پاس بلایا اور محبت سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دریافت کیا۔"بیٹے! یہ تم نے کیا کیا؟"

پوتے نے نظریں جُھکا لیں اور ادب سے جواب دیا۔"دادا! میں نے اسے روتے ہوئے دیکھا تو میرا دل پسیج گیا اور میں نے اللہ سے اس یقین کے ساتھ اس بچے کے حق میں دُعا کی کہ اس تغیر پذیر دنیا میں عاجزی اور انکساری سے نکلی ہوئی دعائیں اللہ کو اس پر ضرور آمادہ کر سکتی ہیں کہ وہ مایوس نہ کرے۔ جب وہ ہماری رگِ گلو سے بھی زیادہ قریب ہے تو اس قُربت کا ہمیں کوئی فائدہ تو ملنا چاہیئے، ہمیں اس کے کرم پر ناز ہے اور وہ ناز بردار ہے۔"

دادا نے پوتے کو سمجھایا۔"بیٹے رکن الدینؒ! میں تیرے مرتبے سے واقف ہوں۔ اور یہ جو کچھ ہوا، میں اس پر ذرا بھی حیران نہیں۔ لیکن کہنا تو صرف یہ ہے کہ



مرد عورت

چند آدمی جو حضرت رابعہ بصریؒ کی خداداد شہرت کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے، رابعہؒ کے پاس آئے اور اُن سے کہنے لگے۔۔۔

"بہترین اوصاف مردوں ہی میں پائے جاتے ہیں، عورتوں میں نہیں، اب تک مردوں ہی نے اپنے روحانی کمالات سے دُنیا کو حیرت میں ڈالا تھا آپ نے یہ روحانی عظمت کیسے پالی؟" حضرت رابعہؒ نے جواب دیا۔

ممکن ہے آپ جو کہہ رہے ہیں صحیح ہو، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آج تک دُنیا میں کسی عورت نے خدائی کا دعویٰ کیا ہو اور لوگوں سے کہا ہو کہ آ سے پوجیں نمرودیت اور فرعونیت مردوں ہی کی ایک خصوصیت ہے۔ عورتیں اس سے بری ہیں۔

اہلِ طریقت ایسی دلیری کو پسند نہیں کرتے۔ اس لئے آئندہ ایسی جسارت نہ کرنا۔"
فرماں بردار پوتے نے خود کو دادا کی آغوش میں گرا دیا اور شرمندگی اور ندامت سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

رکن الدینؒ انہی حالات اور واقعات سے گزرتے ہوئے جوان ہوگئے آپ کی ریاضت اور عبادت کا یہ حال تھا کہ اس کا دور دور شہرہ پھیل گیا۔ ہر شخص ان سے ملاقات کرنے کا متمنی نظر آنے لگا۔ ان کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوجاتا کہ اس مخلوق سے پیچھا کس طرح چھڑائیں۔ آپ کو چھتیس سال کی عمر میں خرقہ اور دستار عطا کردی گئی اور آپ اب خود کو براہِ راست اس لائق سمجھنے لگے تھے کہ اپنے دادا کی خالی مسند سنبھال لیں۔

ان دنوں دہلی میں کچھ ہنگامے ہورہے تھے۔ وہاں حضرت محبوبِ الٰہی نظام الدین اولیاؒ کی روحانی حکومت تھی۔ یہ قطب الدین خلجی کا دورِ حکومت تھا۔ اور اسے محبوبِ الٰہیؒ سے کد تھی۔ وہ آپ کی خانقاہ کے آس پاس جب بھی ہجوم دیکھتا حسد اور نفرت سے تلملا کر رہ جاتا۔ وہ ایک عرصے تک کسی ایسے طریقے کے بارے میں سوچتا رہا جس سے محبوبِ الٰہیؒ کو شرمسار کرسکتا۔ آخر یہ ترکیب سمجھ میں آئی کہ وہ ملتان سے شیخ رکن الدینؒ کو بلائے اور ان کا شاہانہ کروفر سے استقبال کرکے شاہی مہمان بنالے۔ پھر جب یہ خبریں محبوبِ الٰہیؒ کو پہنچیں گی تو وہ رشک و حسد کی آگ میں جلنے بھننے لگیں گے۔ چنانچہ بادشاہ نے آپ کو دہلی آنے کی دعوت دی۔ آپ دہلی روانہ ہوگئے۔ آپ سے پہلے دہلی میں آپ کی تشریف آوری کی خبر پہنچ چکی تھی۔ دہلی والوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ ان استقبال کرنے والوں میں بادشاہ بھی شامل تھا اور انہی میں حضرت محبوبِ الٰہیؒ بھی شامل تھے۔

بادشاہ نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور نہایت احترام اور ادب سے پیش آیا۔ آپ کو معلوم تھا کہ بادشاہ محبوبِ الٰہیؒ سے عناد رکھتا ہے، بادشاہ نے پوچھا "حضرت! دہلی میں آپ کا سب سے پہلے کس نے استقبال کیا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اس شخص نے، جو اس شہر کا سب سے اچھا آدمی ہے یعنی خواجہ نظام الدینؒ۔"

بادشاہ آپ کا جواب سن کر چپ ہوگیا۔

بادشاہ نے آپ کی خدمت کی پانچ لاکھ تنکے نذرانے میں پیش کئے۔ آپ نے لے لئے اور باہر آتے ہی انہیں ان لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کردیا جو آپ کے راستے میں استقبال اور زیارت کی خاطر گھنٹوں سے دھوپ میں کھڑے تھے۔

دوسرے دن جب آپ دوبارہ بادشاہ کے پاس جارہے تھے تو راستے میں لوگوں نے آپ کو روک لیا۔ آپ نے پوچھا "تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے؟"
لوگوں نے جواب دیا "شیخؒ! یہ تو آپ خود بھی جانتے ہیں کہ ہم غریبوں کی بادشاہ تک رسائی ناممکن ہے، ہمارے بہت سارے مسائل بادشاہ کی توجہ کے مستحق ہوتے ہیں لیکن بادشاہ کی توجہ حاصل کرنا ہم سب کے لئے بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اس لئے ہم سب نے مل جل کر یہ متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ جب تک آپ دہلی میں تشریف فرما ہیں اور بادشاہ سے ملاقاتیں جاری ہیں، ہم سب اپنی درخواستیں آپ کے حوالے کردیا کریں اور آپ انہیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کردیا کریں۔ اس طرح ہماری درخواستوں پر ہاتھ کے ہاتھ عمل درآمد ہوجایا کرے گا۔"

آپ نے کہا۔ "کوئی مضائقہ نہیں، لاؤ اپنی درخواستیں، کہاں ہیں؟ میں انہیں اسی وقت بادشاہ کے روبرو پیش کرکے ان پر اس کے احکام لکھوالوں گا۔"

پورے ہجوم نے اپنی اپنی درخواستیں آپ کی طرف بڑھادیں، یہ اچھا خاصا بوجھ ہوگیا۔ آپ ان درخواستوں سمیت شاہی محل میں داخل ہوگئے۔ شاہی محل کا پہلا دروازہ گزر گیا لیکن آپ سواری سے نہیں اترے۔ دوسرا دروازہ بھی گزر گیا لیکن آپ بدستور سوار رہے، یہاں تک کہ تیسرا دروازہ آگیا۔ وہاں بادشاہ اپنے امراء اور مصاحبین کے ساتھ آپ کے استقبال کے لئے مؤدب کھڑا تھا۔ آپ کی سواری جیسے ہی اس کے سامنے پہنچی، بادشاہ نے آپ کو سلام کیا۔ آپ اپنے چوڈولے میں سے باہر نکلے اور ساری درخواستیں اسی وقت بادشاہ کی خدمت میں پیش کردیں۔
بادشاہ نے پوچھا "حضرت! یہ کیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ان اہلِ غرض اور حاجتمندوں کی درخواستیں جو تیرے پاس تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔"

بادشاہ نے اپنے ایک خادم کو حکم دیا۔ "ان درخواستوں کو شیخؒ کی عدم موجودگی میں دوبارہ پیش کیا جائے۔"

آپ نے کہا "نہیں، میں اس وقت تک تجھ سے باتیں نہیں کروں گا جب تک تو ان درخواستوں پر اپنے احکام نہیں لکھتا۔"

بادشاہ نے قدرے تامل سے کہا۔ "کیا اسی وقت؟ فوراً؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں ابھی، اسی وقت، میرے سامنے ہی۔"

بادشاہ نے ساری درخواستیں اپنے سامنے پھیلا دیں اور انہیں پڑھ پڑھ کر احکام لکھنا شروع کردیئے۔ امراء اور مصاحبین بادشاہ کے روبرو مؤدب کھڑے رہے۔ جب ان درخواستوں پر کام مکمل ہوگیا تب آپ نے بادشاہ سے گفتگو شروع کی۔

واپسی میں آپ نے درخواست والوں کو شاہراہ کے کنارے، دونوں طرف کھڑے انتظار کرتے دیکھا۔ آپ کا چوڈولہ رک گیا اور آپ نے نام لے لے کر درخواست دہندوں کو ان کی درخواستیں واپس کرنا شروع کردیں۔ لوگوں کو یقین نہیں تھا کہ ان کی درخواستوں پر اتنی جلدی عمل درآمد ہوجائے گا۔ ان لوگوں نے فرطِ جوش اور انتہائے عقیدت میں آپ کو قبلۂ حاجات کہنا شروع کردیا۔

بادشاہ قطب الدین خلجی کا دل محبوبِ الٰہیؒ کی طرف سے اب بھی صاف نہیں تھا۔ اس کی شرارت آمیز باتیں آپ کے کانوں تک پہنچتیں تو بڑی اذیت محسوس کرتے لیکن خاموش رہتے۔ بادشاہ نے جب یہ دیکھا کہ رکن الدینؒ بھی محبوبِ الٰہیؒ کی بڑی عزت کرتے ہیں تو حسد اور بڑھا۔ رکن الدینؒ کو روک تو نہ سکتا تھا لیکن لوگوں سے شکایتاً کہتا کہ جب میں نے بابا رکن الدینؒ کو ملتان سے بلایا تھا اور وہ میرے مہمان تھے تو خواجہ نظام الدینؒ کو ان سے نہیں ملنا جلنا چاہیے تھا۔ جب رکن الدینؒ نے بادشاہ کی بات سنی تو صاف صاف کہہ دیا کہ بادشاہ نظام الدینؒ کے خلاف بغض و حسد رکھ کر اچھا نہیں کررہا ہے، اسے اس کی سزا ضرور ملے گی۔

ایک دن آپ نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ "بابا! فقیروں سے عناد رکھنا بادشاہوں کو زیب نہیں دیتا۔"

بادشاہ نے جواب دیا "فقیروں کو بھی یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ بادشاہوں سے عناد رکھیں۔ یہ خواجہ نظام الدینؒ اپنے تئیں بڑا سمجھ کر ہمیں کیوں چھوٹا اور کمتر سمجھتے ہیں۔"

رکن الدینؒ نے دلیری سے کہا۔ "ہم فقیر کسی کو بھی چھوٹا اور کمتر نہیں سمجھتے لیکن ہم چونکہ خود بھی دنیا کے مکروفریب سے بچتے اور دُور رہتے ہیں، اس لئے جو لوگ اس میں مبتلا ہوتے ہیں ان سے بچتے اور دُور رہتے ہیں اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ان کی بُرائیاں دُور کر دیں۔"

بادشاہ لاجواب ہو کر چُپ ہو گیا۔

بابا رکن الدینؒ نمازِ جمعہ پڑھنے مسجد تشریف لے گئے۔ وہاں نظام الدینؒ پہلے ہی سے موجود تھے۔ آپ خاموشی سے کنارے بیٹھ گئے۔ جب نماز ختم ہو گئی تو خواجہ نظام الدینؒ اپنی جگہ سے اُٹھے اور رکن الدینؒ کے پاس پہنچے۔ وہ نفلیں اور نفل پڑھ رہے تھے۔ حضرت محبوبِ الٰہیؒ ان کے پیچھے بیٹھ گئے۔ سلام کے بعد دونوں کی ایک دوسرے سے نظریں چار ہوئیں اور دونوں نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ کچھ دیر دونوں نے کام کی باتیں کیں، اس کے بعد دونوں بزرگ اپنے اپنے ڈولوں میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔

رکن الدینؒ تھے تو بادشاہ کے مہمان لیکن ان کا زیادہ وقت محبوبِ الٰہیؒ کے پاس گزرتا۔ ایک دن وہ خاص طور سے محبوبِ الٰہیؒ کی خانقاہ میں تشریف لے گئے۔ اُس دن رکن الدینؒ کے پاؤں میں بڑی تکلیف تھی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے کہا "حضرت! پاؤں میں تکلیف تھی تو ناحق تکلیف فرمائی، میں خود آ جاتا۔"

بابا رکن الدینؒ نے جواب دیا "بابا نظام الدینؒ! میں تمہاری زیارت کو حج سے کم نہیں سمجھتا۔"

اس کے بعد بابا رکن الدینؒ نے ڈولے سے اُترنے کی کوشش کی لیکن حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے انہیں روک دیا، فرمایا "آپ ڈولے سے نہ اُتریئے، ہم سب یوں ہی ڈولے کے پاس بیٹھ کر باتیں کر لیں گے۔"

حضرت محبوبِ الٰہیؒ اپنے مُریدوں کے ساتھ ڈولے کے پاس بیٹھ گئے۔ اور بابا رکن الدینؒ سے باتیں کرنے لگے۔

بابا رکن الدینؒ نے کہا "بابا نظام الدینؒ! میں تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔"

محبوبِ الٰہیؒ نے جواب دیا "فرمایئے، بلکہ حکم دیجئے۔"

بابا رکن الدینؒ نے کہا "تمہارے بارے میں میں نے بادشاہ سے بات کی تھی، اور اسے منع کر دیا ہے کہ وہ فقیروں سے عناد نہ رکھے۔ اگر ایسا کرے گا تو خود نقصان اُٹھائے گا۔"

محبوبِ الٰہیؒ نے جواب دیا "یہ بادشاہ لوگ عناد اور کینہ کے مجسمے ہوتے ہیں، حالانکہ انہیں مخلوق کی اور ہم فقیروں کی مخالفت نہیں مول لینی چاہیئے۔"

بابا رکن الدینؒ نے کہا "حکومت کا نشہ اور تعیشات انہیں خود سر اور عقل و خرد سے عاری کر دیتے ہیں لیکن ہمارا کام یہ ہے کہ ان کی اصلاح کا کوئی موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ چنانچہ ایک ایسا ہی وقت اس بادشاہ پر بھی پڑنے والا ہے اور اُس وقت بادشاہ تم سے مدد چاہے گا تو تم اُسے مایوس نہ کرنا۔"

محبوبِ الٰہیؒ نے جواب دیا "آپ خوب جانتے ہیں کہ درویشوں کا سینہ صاف ہوتا ہے اور یہ انتقام نہیں لیتے، پھر میں بادشاہ کو کیوں مایوس کروں گا۔"

اس وقت بابا رکن الدینؒ کے ساتھ ان کے بھائی شیخ عماد الدین اسماعیل بھی تشریف رکھتے تھے۔ انہوں نے حضرت محبوبِ الٰہیؒ کی موجودگی کو غنیمت جانا اور سوال کیا "اگر آپ دونوں بزرگ اجازت دیں تو یہ ناچیز آپ دونوں سے بعض علمی نکات معلوم کرنے کی جسارت کرے۔"

دونوں نے اجازت دے دی، عماد الدینؒ نے پوچھا "یہ ہجرتِ نبویؐ میں آپ دونوں کی نظر میں کیا مصلحت پنہاں تھی؟"

بابا رکن الدینؒ نے جواب دیا "رسولِ مقبولؐ کے بعض کمالات کی تکمیل مدینہ منورہ کی ہجرت ہی پر موقوف تھی، اس لئے آپ نے مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔"

حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے جواب دیا "لیکن اس ناچیز کے ذہن میں ایک اور بات آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبؐ کو مدینہ طیبہ اس لئے بھیجا تھا کہ وہ اصحابِ مدینہ، جو اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے مکّہ معظمہ حاضر ہونے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، وہ بھی رسولِ مقبولؐ کی ذاتِ بابرکات سے مستفیض و مستفید ہو کر ظاہری اور باطنی کمالات میں مکمل ہو جائیں۔"



نیکی وہ ہے جس سے نفس کو سکون اور اطمینان حاصل ہو، اور قلب کو طمانیت حاصل ہو۔ گناہ وہ ہے جس سے نہ نفس کو سکون ہو اور نہ قلب کو اطمینان ہو اگرچہ فتویٰ دینے والے کتنے ہی فتوے دیا کریں۔

جب تم کسی کام کو کرنا چاہو تو اس کے انجام پر غور کر لو۔ اگر وہ بہتر ہے تو کر گزرو، اگر وہ بُرا ہو تو باز رہو۔

جس نے میانہ روی اختیار کی وہ کبھی محتاج نہ ہوا۔

(شاہین ہما حسین آباد)

اس گفتگو کے بعد حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے ڈھولے ہی کے پاس کھانا منگوایا اور کھانے کے بعد اعلیٰ درجے کا کپڑا اور سو اشرفیاں بابا رکن الدینؒ کی خدمت میں بطورِ نذرانہ پیش کیں۔ آپ نے اشرفیاں دیکھ کر حضرت محبوبِ الٰہیؒ سے کہا۔

"اُستُر ذَھَبَکَ" (آپ اپنا سونا چھپائیے۔)

حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے برجستہ جواب دیا۔ "اُستُر ذَھَبَکَ وَذِھَابَکَ وَمَذھَبَکَ" (اپنے سونے کو، جانے کو اور جانے کی جگہ کو چھپائیے۔)

بابا رکن الدینؒ اس جواب پر مسکرا دیئے، مگر اشرفیاں قبول کرنے میں تامل ہی رہا۔ حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے یہ اشرفیاں ان کے بھائی شیخ عماد الدین کے حوالے کر دیں۔

اس کے بعد بابا رکن الدینؒ ملتان واپس تشریف لے گئے۔

کچھ ہی دنوں بعد بادشاہ کے پیٹ میں درد اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہی طبیبوں نے نہایت توجّہ اور انہماک سے علاج شروع کر دیا لیکن عالم یہ تھا کہ جیسے جیسے حلق سے دوائیں اُتر رہی تھیں، بادشاہ کی حالت غیر ہوتی چلی گئی۔ بادشاہ کے اُمرا اور مقرّبینِ بارگاہِ شاہی بادشاہ کے روبرو فکرمند اور آزردہ کھڑے تسلّی تشفّی دیتے رہتے۔ بادشاہ نے بعض علماء سے پوچھا۔ "میری بیماری کو شاہی اطبا سمجھنے سے قاصر ہیں، میں خود بھی حیران ہوں کہ آخر یہ کیسا مرض ہے کہ جیسے جیسے دوائیں اندر پہنچ رہی ہیں، مرض میں شدّت اور سختی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ کیا آپ لوگ بتا سکتے ہیں کہ یہ مرض ہی ہے یا کچھ اور؟"

کسی عالم نے ڈرتے ڈرتے اٹک اٹک کر جواب دیا۔ "اگر اس ناچیز کی صاف گوئی مزاجِ شاہی پر گراں نہ گزرے تو کچھ صاف صاف عرض کر دیا جائے، کیونکہ حضورِ والا نے ہم ناچیزوں سے جس باب میں استفسار چاہا ہے، ضروری ہے کہ اسے صاف صاف، بے لاگ عرض کر دیا جائے۔"

بادشاہ نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ "میری طرف سے اجازت ہے۔"

عالم نے عرض کیا۔ "حضورِ والا! ہماری ناچیز رائے میں حضور کی یہ پیچیدہ بیماری کوئی مرض نہیں ہے بلکہ اس گستاخی کا طمانچہ ہے جو بادشاہ کے دل میں حضرت نظام الدینؒ سے سوءِ ظنی کی صورت میں پیدا ہوئی ہے، اس لئے اس مرض کا اگر کوئی علاج ممکن ہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت نظام الدینؒ سے بادشاہ کی طرف سے معافی چاہی جائے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "تمہارے دل میں یہ خیال کس طرح آیا؟"

عالم نے جواب دیا۔ "میں نے کسی شخص سے یہ سُنا ہے کہ بابا رکن الدینؒ ملتان روانہ ہونے سے پہلے یہ فرما چکے ہیں کہ بادشاہ کا فقیروں کے خلاف عناد اچھا نہیں ہے اور اس کی مضرّت عنقریب ظاہر ہو کر رہے گی۔"

بادشاہ نے بے چینی سے پوچھا۔ "اور، اور کیا فرمایا تھا بابا رکن الدینؒ نے؟"

عالم نے جواب دیا۔ "اور یہ فرمایا تھا کہ جب بادشاہ پر اس نوع کی ناقابلِ فہم افتاد پڑے تو بادشاہ کے لئے یہ ضروری ہو گا کہ وہ حضرت نظام الدینؒ سے معافی چاہے، اگر وہ معاف کر دیں گے تو بادشاہ کو اس ناگہانی افتاد اور مضرّت سے نجات مل جائے گی۔"

بادشاہ خوفزدہ ہو گیا، کچھ دیر آنکھیں بند کئے سوچتا رہا اور روتا رہا۔ آنسوؤں نے داڑھی بھگو دی اور شبنمی قطرات اس کے دونوں رخساروں پر ندامت کے موتی بن کر چمکتے رہے۔ پھر بادشاہ نے آنکھیں کھول دیں اور سرد آہ بھر کر کہا۔ "مجھ میں تو اتنی ہمّت ہے نہیں کہ میں خواجہ نظام الدینؒ کا سامنا کر سکوں۔"

عالم اور اس کے ساتھ چند اُمرا نے متفقہ عرض کیا۔ "اگر حضورِ والا اجازت مرحمت فرمائیں تو ہم لوگ خواجہؒ کی خدمت میں جا کر الحاح و زاری سے شفاعت کی کوشش کریں۔ ممکن ہے خواجہ نظام الدینؒ کو رحم آ جائے اور چند الفاظ عفو و درگزر کے ادا ہو جائیں۔"

بادشاہ نے روتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں، آہستہ سے کہا۔ "ہاں، تم لوگ ان کی خدمت میں جاؤ اور جس طرح بھی مناسب اور ممکن سمجھو میری طرف سے معافی مانگ لو، اور ہر طرح یہ کوشش کرو کہ وہ مجھے معاف کر دیں اور اگر وہ معاف کرنے پر رضامند نہ ہوں تو ان سے میری طرف سے درخواست کرنا کہ وہ میرے لئے موت کی دُعا کر دیں تاکہ میں اس نزع سے زیادہ ناقابلِ برداشت اذیّت سے نجات حاصل کر لوں۔"

بادشاہ کا بہت بُرا حال تھا۔ وہ عالم اپنے ساتھ چند اُمرا کو لیکر اسی وقت حضرت محبوبِ الٰہیؒ کی خدمت میں روانہ ہو گیا۔ آپ کی خانقاہ کے باہر سائلوں اور حاجتمندوں کا میلہ سا لگا ہوا تھا۔ یہ لوگ چونکہ شاہی فرستادے تھے اس لئے کوشش کی کہ انہیں شاہی مناسبت سے کچھ رعایت عطا کی جائے اور انہیں فوراً ہی محبوبِ الٰہیؒ کی خدمت میں پہنچا دیا جائے۔ لیکن حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے خدمتگار نے عرض کیا۔ "بابا! یہ شاہی دربار نہیں ہے جہاں لوگ اپنے دنیاوی مراتب سے رعایتیں حاصل کر لیا کرتے ہیں۔ یہ درویشی دربار ہے، جو پہلے آیا ہے، پہلے جائے گا۔ جو بعد میں آیا ہے، بعد میں جائے گا۔"

عالم نے انتہائی خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "ہم رعایت نہیں چاہتے، بادشاہ کی حالت انتہائی خراب ہے، اس کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ تم اندر جا کر حضرت خواجہؒ صاحب سے یہ کہہ دو کہ چند صد درجہ غرض مند فوری باریابی کے طالب ہیں۔ وہ جیسا جواب دیں گے، ہم اُس پر راضی ہو جائیں گے۔"

خدمتگار مُنہ بناتا ہوا اندر چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس آ کے جواب دیا۔ "آپ لوگوں کو اندر طلب کیا جا رہا ہے۔"

عالم درباری اُمرا کے ساتھ حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے سامنے جا کھڑا ہوا، علیک سلیک کے بعد عالم نے بڑے فصیح و بلیغ لہجے میں بادشاہ کی تقصیر، سوءِ ظنی اور بیماری کے بارے میں عرض کیا اور بعد میں کہا۔ "حضور تو جانتے ہی ہیں کہ شاہوں میں ظرف اور استغنا کی کمی ہوتی ہے چنانچہ اس کی انہیں سزا بھگتنا پڑتی ہے ہمارے بادشاہ نے بھی ایسی ہی غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے لیکن یہ دربار، جہاں اس وقت ہم گنہگار کھڑے ہیں، ایسا ہے کہ گنہگاروں کو بخشش اور خطا کاروں کو عفو و ترحم کے مژدے سُنائے جاتے ہیں۔ بادشاہ نے حضورِ والا کے خلاف اپنے اندر عناد اور کینہ کا پھوڑا پال رکھا ہے، اب وہ پھوڑا بادشاہ کے چین اور سکون کو غارت کر کے اسے زندگی سے عاجز اور درماندہ کر دیا ہے۔ ہم خدامِ شاہی اور نمک خوارانِ عالم پناہی حضور کی خدمت میں عفوِ تقصیر کے لئے حاضر ہوئے ہیں اور بادشاہ کی طرف

سے معافی کی درخواست کرتے ہیں۔"

حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے دریافت کیا۔"خود بادشاہ کیوں نہیں آیا؟"

ایک امیر نے جواب دیا۔"خواجۂ خواجگاںؒ! ظلّ اللہ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ حاضری دے سکیں۔"

آپ نے کہا۔"شاہی رعونت اور کبرِ اقتدار و اختیار ابھی تک سر میں موجود ہے۔"

عالم نے بادشاہ کی وکالت کی۔"حضرت! یہ بات نہیں ہے، بادشاہ سلامت بھی حضور کی خدمت میں شکر لانے کے لئے حاضر ہوں گے اور شاید دو ایک دن میں ہی حاضر ہو جائیں۔"

آپ نے جواب دیا۔"اگر بیٹ کا یہ مہلک درد بھی بادشاہ کی رعونت دور نہیں کر سکا تو میری دعا اس درد کو کس طرح دور کرے گی۔ جاؤ، اپنے بادشاہ سے جا کر کہہ دو کہ صبر کرے اور انتظار کرے کہ مکافاتِ عمل کا ظہور کس طرح ہوتا ہے۔"

عالم نے بڑے افسوس سے کہا۔"تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ حضور مراحمِ درویشانہ سے کام نہیں لیں گے؟"

آپ نے جواب دیا۔"یہ بات بھی نہیں ہے بلکہ بادشاہ سے کہو کہ پیاسے کنویں کے پاس جاتے ہیں، کنواں پیاسوں کے پاس نہیں جاتا۔"

عالم نے پوچھا۔"تو گویا بادشاہ کو یہاں آنا ہی پڑے گا؟"

"ہاں، اگر اس کی انا یہاں آنے کی اجازت دے، میں اس کے حق میں دعا ضرور کروں گا۔"

ایک امیر نے کہا۔"حضرت! بیماری نے بادشاہ کو اتنا عاجز اور پریشان کر رکھا ہے کہ اس نے ہم سے یہ بھی کہا ہے کہ اگر آپ ان کی صحت کے بارے میں دعا نہ کر سکیں تو موت کے لئے دعا ضرور کریں تاکہ انہیں ایک ایسی اذیت سے نجات مل جائے جس نے ان کے سونے جاگنے اور کھانے پینے کو حرام کر رکھا ہے۔"

آپ نے ناراض ہو کر جواب دیا۔"اے شخص! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ہم درویش حسد اور انتقام کی دکان کھولے بیٹھے ہیں۔ یاد رکھ، ہم انسانوں کے روحانی اور معاشرتی امراض کا علاج کرتے ہیں، مرض نہیں دیتے۔ تو نے ہمیں غلط سمجھا ہے اور تو بھی کیا کرے، مجبور ہے۔ کیونکہ شاہوں کے مرض متعدی ہوتے ہیں۔ جو روحانی امراض شاہوں کو لگتے ہیں، ان ہی میں ان کے اُمرا اور مصاحبین بھی گرفتار ہو جاتے ہیں۔ جاؤ، پہلے درویشوں سے بات کرنے کا سلیقہ اور ادب سیکھ آؤ، اس کے بعد اپنے بادشاہ کی وکالت کرو۔ ورنہ تم نادان دوست اپنے آقا کو اور زیادہ دکھوں میں مبتلا کر دو گے۔"

وہ لوگ بے نیل و مرام، افسردہ اور اداس وہاں سے چلے آئے اور بادشاہ کو ساری تفصیل سنا دی۔

عالم نے کہا۔"خواجہ نظام الدینؒ بضد ہیں کہ حضور خود حاضری دیں اور اپنی زبان سے معذرت اور معافی چاہیں۔"

اس امیر نے، جسے حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے ڈانٹ دیا تھا، عرض کیا۔"اس ناچیز کی سمجھ میں تو آئے نہیں خواجہ نظام الدینؒ۔ میں تو ان سے بات کر کے بہت مایوس ہوا۔"

بادشاہ نے کراہتے ہوئے امیر کو ڈانٹ دیا۔"او نامراد! بند کر اپنی بکواس۔ میں تو بھگت ہی رہا ہوں، تو بھی کسی آزار میں گرفتار ہو جائے گا۔ میرے حق میں حضرت خواجہؒ کی تشخیص بالکل درست ہے۔ میں ان کی خدمت میں خود حاضری دیتا لیکن میری شاہی اَنا میرے پاؤں پکڑے ہوئے ہے۔"

عالم نے پوچھا۔"تو کیا حضور والا حضرت خواجہؒ کی خدمت میں تشریف لے جائیں گے؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔"میرے مرض اور انا میں جنگ جاری ہے، پتہ نہیں کون جیتے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ میری انا دب جائے، مر جائے۔ میرے مرض نے مجھے زندگی سے عاجز کر دیا ہے۔ شاید زندگی کی خواہش ہی میری شاہی انا کو شکست دے دے۔"

عالم اور اُمرا خاموش ہو گئے۔

بادشاہ پریشان اور سوگوار اپنی آنکھیں بند کر کے آہ آہ کرنے لگا۔

درد میں اور اضافہ ہو گیا، زندگی ہی میں موت کی لذت کا اندازہ ہونے لگا۔ بادشاہ کے چاروں طرف شاہی خواتین اور بیگمات جمع تھیں، انہی میں بادشاہ کی ماں بھی موجود تھی۔ ماں نے بیٹے پر جھک کر دریافت کیا۔"بیٹے! تکلیف کا کیا حال ہے؟"

بادشاہ نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔"ماں! اتنا برا حال ہے کہ میں اس

مِعراج کی پانچ منزلیں

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ ہادی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کون ہے جو مجھ سے یہ چند کلمات حاصل کرے پھر ان پر عمل کرے یا پھر کسی ایسے شخص کو سکھائے جو ان پر عمل کرے

میں نے عرض کیا۔"یا رسول اللہؐ میں۔"

پھر آپؐ نے میرا سیدھا ہاتھ پکڑا اور گن کر پانچ باتیں ارشاد فرمائیں۔

۱۔ ممنوعات سے بچو۔ سب سے بڑے عبادت گذار بن جاؤ گے۔

۲۔ اللہ نے جو کچھ تمہارے نصیب میں رکھ دیا ہے اس پر راضی رہو سب سے زیادہ خوشحال بن جاؤ گے۔

۳۔ اپنے پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کرو، مومن بن جاؤ گے۔

۴۔ لوگوں کے لئے وہ ہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرو، مسلم بن جاؤ گے۔

۵۔ زیادہ ہنسنے سے پرہیز کرو، کیونکہ زیادہ ہنسنے سے دل مُردہ ہو جاتا ہے۔

(ربیعہ مریم۔ کراچی)

تکلیف پر موت کو ترجیح دیتا ہوں اور جس اذیت سے دوچار ہوں اُسے لفظوں میں نہیں بیان کیا جاسکتا۔"

ماں نے آنسو بہاتے ہوئے دریافت کیا۔"خواجہ نظام الدینؒ کے پاس جو منگوارانِ شاہی گئے تھے، وہ کیا جواب لائے ؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔"میں نے اُن کا اتنا دل دُکھایا ہے کہ خواجہ نظام الدینؒ کا میرے لئے دُعا پر دل راغب ہی نہ ہوتا ہو گا۔ ہاں، اگر میں خود ان کے قدموں میں جا گروں تو وہ مجھ پر ضرور توجہ دیں گے۔"

ماں نے پوچھا۔"پھر وہاں جانے میں کیا امر مانع ہے ؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔"وہاں جانے میں کون سا امر مانع ہو سکتا ہے، جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔"

ماں نے کہا۔"وہاں تم نہیں جاؤ گے، میں جانتی ہوں، وہاں جانے میں شاہی انا مانع آ رہی ہے۔"

بادشاہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔"کیسی انا اور کہاں کا کبرِ شاہی؟ میں خواجہ نظام الدینؒ کی پابوسی کو ضرور جاؤں گا۔"

ماں نے کہا۔"نہیں، وہاں تم نہیں، میں جاؤں گی اور دیکھوں گی نظام الدینؒ تمہاری صحت یابی کے لئے کیوں دُعا نہیں کرتے۔"

بادشاہ کے چہرے پر تازگی سی دوڑ گئی، کہا۔"اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔"

ماں نے اُسی وقت جانے کی تیاری کر دی۔

خواجہ نظام الدینؒ کو جب یہ بتایا گیا کہ مادرِ بادشاہ باریابی کی اجازت چاہتی ہیں، تو حکم دیا۔"انہیں اسی وقت عزت اور احترام کے ساتھ حاضر کیا جائے۔"

چنانچہ، مادرِ سلطان آپ کی خدمت میں پہنچا دی گئیں۔ خواجہ نظام الدینؒ نے پوچھا۔"آپ نے کیسے زحمت فرمائی؟"

بادشاہ کی ماں نے جواب دیا۔"یا خواجہؒ! جس ماں کا بیٹا زندگی اور موت کی کشمکش میں بدترین اذیتیں جھیل رہا ہو اس کے دل سے پوچھو، میں اسی سلسلے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں، میں اپنے بیٹے کے لئے پاتال تک کا سفر کر سکتی ہوں۔"

آپ نے کہا۔"مائی! تم یہ بتاؤ کہ نظام الدینؒ کوئی طبیب ہے۔ تمہارا بیٹا بیمار ہے تو علاج کراؤ۔ وہ تو ظلِ اللہ ہے، عالم پناہ ہے، اس کے پاس کس چیز کی کمی ہے؟"

دُکھیاری ماں نے جواب دیا۔"یا خواجہؒ! آپ نے جو کچھ فرمایا بجا ہے۔ میرا بیٹا ظلِ اللہ کہلاتا ہے، عالم پناہ کہا جاتا ہے، لیکن یہ سارے خطابات اسے اس کے اُمرا اور منصب داروں نے دے رکھے ہیں، اس میں اس کی کیا خطا؟"

محبوب الٰہیؒ نے کہا۔"وہ کسی نے بھی دے رکھے ہوں لیکن یہ بتاؤ کہ خدائی کارخانے میں نظام الدینؒ کا کیا دخل ہے؟"

ماں نے کہا۔"خواجہؒ! اتنے بے تعلق نہ بنیئے، میں بڑی اُمیدیں لے کر آئی ہوں۔" آپ نے جواب دیا۔"اُمیدیں خدا سے رکھو، ایک عاجز بندے سے اُمیدیں وابستہ کرنا زیب نہیں دیتا۔"

ماں نے کہا۔"اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں یوں ہی بے نیل و مرام چلی جاؤں گی تو غلط ہے، میں دُعائے صحت یابی لینے آئی ہوں اور اسے لیکر ہی ٹلوں گی، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

آپ نے فرمایا۔"مائی! میں نے کہہ جو دیا کہ خدائی کارخانے میں نظامؒ کا کیا دخل؟ اور رہا یہ امر کہ تمہارے بیٹے کا علاج معالجے سے فائدہ نہیں ہو رہا تو یاد رکھو، دوا اور درد دونوں ہی تقدیری حرف ہیں، ان پر انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے۔"

بادشاہ کی ماں نے کوئی جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کی۔ آپ نے محسوس کر لیا کہ یہ بڑی بی اپنا مطلب حاصل کئے بغیر نہیں اُٹھیں گی تو آپ نے فرمایا۔"میں تمہارے بیٹے کے لئے ایک شرط پر دعا کر سکتا ہوں۔ جاؤ، اور اپنے بیٹے سے معلوم کرو کہ اسے میری یہ شرط منظور ہے یا نہیں؟"

ماں نے دریافت کیا۔"کون سی شرط؟"

آپ نے جواب دیا۔"اگر میری دُعا سے تیرا بیٹا صحت یاب ہو جائے تو اسے اپنی سلطنت میرے حوالے کر دینا ہو گی۔"

یہ بہت بڑی شرط تھی لیکن زندگی سے قیمتی نہیں تھی۔ آپ نے متامل جو دیکھا تو فرمایا۔"کیا سوچنے لگیں، جاؤ، اپنے بادشاہ بیٹے کو میری شرط بتا دو اگر وہ میری شرط مان لے تو میرے پاس اس کا قارورہ بھیج دینا تاکہ میں اس کا علاج شروع کروں۔"

ماں نے کہا۔"جب یہ سلطنت آپ کی ہو چکی ہو گی تو ہماری کیا حیثیت ہو گی؟"

آپ نے جواب دیا۔"کل کس کی کیا حیثیت ہو گی، اس کا صحیح علم اُس خدا کو ہے جو عالم الغیب کہلاتا ہے۔"

ماں جانے لگی تو آپ نے مزید فرمایا۔"اور ہاں، میری شرط کے مطابق بادشاہ اس کی منظوری اور پابندی کے لئے ہمیں ایک تحریری عہد نامہ بھیجے گا اس میں وہ صاف صاف اقرار کرے گا کہ اگر بادشاہ میری دُعا کے بعد اچھا ہو گیا تو وہ اپنی حکومت ہمارے حوالے کر دے گا، اور اپنے اس عہد نامے پر اپنے نامی گرامی اُمرا اور منصب داروں کے گواہی میں دستخط ضرور کرائے گا۔"

ماں یہ سوچتی ہوئی شاہی محل واپس ہوئیں کہ شاید اتنی بڑی قیمت ادا کرنے پر ان کا بیٹا آمادہ نہ ہو۔ لیکن جب بادشاہ کو اس شرط کا علم ہوا تو اس نے ماں سے کہا۔"ماں! میں تو اپنی زندگی سے عاجز آیا ہوا ہوں، یہ حکومت کیا چیز ہے؟ خواجہ نظام الدینؒ کو مطلع کر دیجئے کہ مجھے ان کی شرط منظور ہے، میں خود بھی اس حکومت سے عاجز آیا ہوا ہوں، وہ سنبھالیں میری سلطنت۔"

ماں نے جواب دیا۔"تب پھر اس کا ایک عہد نامہ تیار کرو اور اس پر اپنے نامی گرامی اُمرا اور منصب داروں کے دستخط کرا کے اپنے قارورے کے ساتھ خواجہ نظام الدینؒ کی خدمت میں روانہ کر دو۔ وہ فوراً ہی دوا یا دُعا کر کے تمہیں صحت یاب کر دیں گے۔"

بادشاہ نے اس پر فوراً عملدرآمد کیا اور دوسرے ہی دن عہدنامہ اور قارورہ ایک ساتھ آپ کی خدمت میں بھجوا دیئے۔

آپ نے ان دونوں چیزوں کو پاتے ہی بادشاہ کی صحت یابی کے لئے دُعا کی، جو قبول ہوئی اور بادشاہ کو پیٹ کے درد سے نجات ملی۔ جب وہ بالکل صحت یاب ہو گیا تو اس نے اپنے چند اُمرا آپ کی خدمت میں بھیجے اور معلوم کیا کہ ازروئے معاہدہ وہ حکومت اپنی تحویل میں لینے کے لئے کب تشریف لا رہے ہیں؟"

آپ نے بادشاہ کے عہدنامے کو گول گول لپیٹ کر قارورے میں ڈال دیا اور کہا۔ "جاؤ، اپنے بادشاہ سے جا کر کہہ دو کہ میں نے رکن الدّینؒ کی خواہش اور سفارش پر اس کے حق میں صحتیابی کی دُعا کر دی تھی۔ اور رہا دولت اور حکومت اپنی تحویل میں لینے کا معاملہ، تو بادشاہ کو واشگاف لفظوں میں بتا دینا کہ اس کی سلطنت، درویش کے نزدیک بیمار کے پیشاب کے برابر ہے۔ میں اس کی حکومت لیکر کیا کروں گا۔"

جب بادشاہ کو یہ پیغام ملا تو وہ زاروقطار رویا اور اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔

بابا رکن الدّینؒ ایک بار پھر دہلی تشریف لے گئے۔ آپ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی دُعا نے بادشاہ کو صحتیاب کر دیا تھا۔ قطب الدّین خلجی کا دور ختم ہوا، اس کی جگہ غیاث الدّین تغلق نے سنبھالی۔ یہ بھی خواجہ نظام الدّینؒ سے بُغض رکھتا تھا، لیکن رکن الدّینؒ کی عزت کرتا تھا۔ ایک دن بادشاہ غیاث الدّین تغلق نے اپنے ایک ایسے امیر سے، جو رکن الدّینؒ کے پاس آتا جاتا رہتا تھا، کہا۔ "ظہیر الدّین! تم ایک عرصے سے رکن الدّینؒ کے پاس آ جا رہے ہو، مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے ان کی کوئی کرامت بھی دیکھی؟"

ظہیر الدّین نے جواب دیا۔ "ظلِّ اللہ! میں آپ کی بات کا جواب دو دن بعد دوں گا۔"

اس کے بعد ظہیر الدّین، رکن الدّینؒ کی خدمت میں پہنچ گیا، لیکن کسی قسم کے سوال جواب کے بغیر ہی واپس آ گیا۔ رات کو بستر پر لیٹے لیٹے وہ سوچتا رہا کہ بادشاہ نے رکن الدّینؒ کی بابت جو کچھ پوچھا تھا، وہ غورطلب ضرور ہے۔ اس نے سوچا کہ میرا علم رکن الدّینؒ سے کچھ زیادہ ہی ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ رکن الدّینؒ کی تو بہت زیادہ عزت کرتے ہیں مگر میری نہیں کرتے۔ کیا اس کی یہ وجہ تو نہیں کہ رکن الدّینؒ کے پاس کوئی ایسا عمل ہو جس کے زیرِ اثر لوگ ان کی عزت کرنے پر مجبور ہوں۔

یہ سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔ اس نے خواب میں دیکھا، رکن الدّینؒ اسے حلوہ کھلا رہے ہیں۔ حلوہ کھا چکنے کے بعد اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے حلوے کی لذت اپنے مُنہ میں محسوس کی اور یہ لذت صبح تک باقی رہی۔ ظہیر الدّین نے سوچا، شاید یہی رکن الدّینؒ کی کرامت ہو۔ لیکن پھر فوراً ہی یہ خیال آیا کہ اگر یہ کرامت ہے تو اس کرامت پر یقین کیسے کیا جائے۔ شیطان بھی تو حلوہ کھلا سکتا ہے۔ یہ صبح ہی صبح رکن الدّینؒ کی خدمت میں چل دیئے اور راستے بھر یہ سوچتے رہے کہ آج میں ان سے پوچھوں گا کہ وضو کے دوران کُلّی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے کا کیا مطلب ہے اور اس میں کون سی حکمت پوشیدہ ہے؟

جب یہ رکن الدّینؒ کی خدمت میں پہنچے تو انہیں دیکھتے ہی آپ نے فرمایا۔ "بابا ظہیر الدّین! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا، آج میں تم پر چند باتیں واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ جنابت کی کتنی قسمیں ہیں؟"

ظہیر الدّین نے جواب دیا۔ "نہیں، شیخ! میں نہیں جانتا۔"

آپ نے فرمایا۔ "دو طرح کی، جنابتِ جسمانی، جنابتِ قلبی۔ جنابتِ جسمانی کا سبب تو ہر کوئی جانتا ہے لیکن یہ دوسری جنابت، جسے میں نے جنابتِ قلبی کہا ہے، یہ ناہموار لوگوں کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے۔ جنابتِ جسمانی کو تو پانی سے پاک کیا جا سکتا ہے، لیکن دل کی جنابت آنکھوں کے پانی سے دور ہوتی ہے۔ تم دل کی جنابت کی ناپاکی میں مبتلا ہو۔"

اس کے بعد آپ نے ذرا خاموشی اختیار کی، پھر فرمایا۔ "جانتے ہو، پانی میں کتنی صفتیں ہوتی ہیں؟"

ظہیر الدّین نے جواب دیا۔ "آپ ہی ارشاد فرمائیں۔"

آپ نے کہا۔ "پانی میں تین صفتیں پائی جاتی ہیں، رنگ، بُو اور مزہ۔ شریعت نے اس لئے وضو میں کُلّی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے کو مقدّم رکھا ہے۔ آنکھ سے پانی کا رنگ معلوم ہو جاتا ہے، کُلّی سے اس کے مزے کا علم ہو جاتا ہے اور ناک میں پانی ڈالنے سے اس کی بُو کا پتہ چل جاتا ہے۔" سب سے آخر میں فرمایا۔ "ظہیر الدّین! میرا یہ نکتہ بھی خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ جس طرح شیطان کسی نبی کی شکل اختیار نہیں کر سکتا اسی طرح وہ شیخِ حقیقی کی صورت بھی نہیں اختیار کر سکتا۔"

ایفائے عہد

ایران کا سردار ہرمزان حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے اُس کے قتل کا فرمان صادر کر دیا۔

ہرمزان نے آپ سے پانی طلب کیا۔ حضرت عمرؓ نے اُسے پانی پیش کیا۔

ہرمزان نے آپ سے درخواست کی "امیرالمومنین! اگر آپ مجھے قتل ہی کرنا چاہتے ہیں تو پانی پینے کے بعد قتل کیجئے گا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "منظور۔"

ہرمزان نے پانی پھینک دیا۔ بولا۔ "یہ لیجئے۔ میں پانی پیوں گا ہی نہیں، مجھے آزاد کر دیجئے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "گو کہ تو نے مجھ سے وعدہ لینے میں بڑی چالاکی سے کام لیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں اس کی پابندی کروں گا۔"



[redacted]

ظہیر الدّین کو اپنے تمام وسوسوں کا جواب مل چکا تھا۔ اس وقت ظہیر الدّین کا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔

جب غیاث الدّین تغلق کو اس واقعے کا علم ہوا تو وہ آپ کی بیحد عزّت کرنے لگا۔

ایک دن ایک عرب درویش آپ کی خانقاہ میں آکر ٹھہرا۔ آپ نے اپنے خادم خاص کے ذریعے اس کی خدمت میں کھانا بھجوایا۔ خادم نے عرب درویش سے پوچھا۔ "کیا تم نے شیخؒ سے ملاقات کی ہے؟"

عرب درویش نے جواب دیا۔ "نہیں تو۔"

خادم نے پوچھا۔ "کیا تم شیخ کو دیکھنا چاہتے ہو؟"

عرب درویش نے جواب دیا۔ "میری کیا مجال کہ ان سے ایسی کوئی بات کہوں یا وابستہ کروں۔"

خادم نے یہ باتیں آپ کو بتا دیں۔ آپ نے کہا۔ "عرب درویش سے کہہ دو، اس کے آنے کی ضرورت نہیں ہے، میں خود حاضر ہو جاتا ہوں۔"

آپ اس ٹوہ میں رہے کہ جب بھی آپ اس درویش کو فارغ بیٹھے دیکھیں گے، اس کے پاس پہنچ کر باتیں کرنے لگیں گے۔

ایک دن یہ موقع ہاتھ آ ہی گیا اور آپ اس عرب درویش کے پاس بیٹھ کر دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے لگے۔ عرب درویش آپ کی اس خوش اخلاقی سے بہت متاثر ہوا۔ آپ عرب درویش کے پاس سے اُٹھ کر اپنے خیمے کی طرف جا رہے تھے کہ ایک شخص سے راستے ہی میں مڈبھیڑ ہو گئی، اس نے آپ کا راستہ روک لیا، بولا۔ "رکن الدّینؒ! تم نے مجھے نہیں پہچانا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، اس وقت میرا حافظہ کام تو نہیں دے رہا ہے لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ میں اُن کے بیشتر لوگوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

اس شخص نے پوچھا۔ "آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں آپ سے اچھی طرح واقف ہوں گا اور یہ کہ میں ان کے بیشتر لوگوں سے اچھی طرح واقف ہوں، یہ 'اُن کے بیشتر لوگوں' کا کیا مطلب ہوا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "کیا تو مجھے ایک ایسے رشتے کا حوالہ نہیں دے گا جس میں تو میرے استاد کا بیٹا ثابت ہو جائے گا؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "بیشک میں آپ کا اُستاد زادہ ہوں۔"

آپ نے اس لڑکے کے باپ سے صرف سورۂ اخلاص پڑھی تھی اس کے بعد کسی اور سے پڑھنے لگے تھے۔ آپ نے اس پڑھائی کا بھی بہت زیادہ خیال کیا، بولے۔ "بیشک تو میرا استاد زادہ ہے۔ تو مجھے اس طرح حکم دے سکتا ہے جس طرح آقا اپنے غلاموں کو دیا کرتے ہیں۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "بابا رکن الدّینؒ! میں آپ پر حکم چلانے نہیں آیا، مجھے دنیا کا مال درکار ہے اور اسی کی طلب میں حاضر ہوا ہوں، میری مُراد جتنی جلدی پوری کر سکیں، کر دیں تاکہ میں جہاں سے چلا آ رہا ہوں، وہیں واپس چلا جاؤں۔"

آپ نے اُسی وقت اسے مالا مال کر کے رخصت کر دیا۔

اُن دنوں بادشاہ نے سماع پر پابندی لگا دی تھی۔ دورانِ قیامِ دہلی بابا گنج شکرؒ کے عرس کے دن آ گئے۔ چنانچہ پاک پٹن کی طرح دہلی میں بھی عرس کا اہتمام کیا گیا۔ اس عرس میں بابا رکن الدّینؒ اور خواجہ نظام الدین اولیاءؒ دونوں برابر برابر بیٹھے اور محفلِ سماع شروع ہو گئی۔ کچھ دیر بعد خواجہ صاحبؒ پر وجد کی کیفیّت طاری ہو گئی۔ وہ مضطرب ہو کر کھڑے ہونے لگے لیکن بابا رکن الدّینؒ نے دخل دیا اور زبردستی پکڑ کے بٹھا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد خواجہ صاحبؒ پر پھر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ کھڑے ہو گئے۔ اس مرتبہ رکن الدّینؒ نے انہیں نہیں بٹھایا اور دوسرے بزرگوں کی طرح خود بھی دست بستہ کھڑے ہو گئے۔"

محفلِ سماع کے خاتمے پر کسی شخص نے رکن الدّینؒ سے پوچھا۔ "یا شیخؒ! پہلی بار جب خواجہ نظام الدّینؒ کھڑے ہونے لگے تھے تو آپ نے انہیں بٹھا دیا تھا لیکن جب دوسری بار وہ کھڑے ہوئے تو آپ نے ایسا نہیں کیا۔ آخر کیوں؟ کوئی خاص وجہ؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، پہلی بار اُن کی رسائی عالمِ ملکوت (ملائکہ، ارواح اور نفوس کی دنیا) تک ہوئی تھی، وہاں تک میرا گزر بھی تھا، اس لئے میرا ہاتھ بھی وہاں تک پہنچ گیا اور میں نے انہیں بٹھا دیا تھا۔ لیکن دوسری بار خواجہ نظامؒ کی رسائی عالمِ جبروت (مقامِ وحدت) تک ہو گئی اور میں وہاں تک پہنچنے سے قاصر رہا۔"

کسی شخص نے خواجہ نظام الدّینؒ سے شکایت کی کہ میں آپ کے پاس جب بھی آتا ہوں، آپ مجھے کچھ نہ کچھ کھلاتے ضرور ہیں، لیکن اس کے برعکس میں بابا رکن الدّینؒ کے پاس کئی بار گیا مگر انہوں نے مجھے کچھ بھی نہیں کھلایا۔

خواجہ نظام الدّینؒ نے جواب دیا۔ "میں ہمیشہ اس حدیث پر عمل کرتا ہوں یعنی جو شخص زندہ کی زیارت کرے اور اس کے یہاں کچھ نہ چکھے تو گویا اس نے مُردہ کی زیارت کی۔"

اس شخص نے پوچھا۔ "کیا بابا رکن الدّینؒ نے یہ حدیث نہیں سُنی؟"

حضرت خواجہ نظام الدّینؒ نے جواب دیا۔ "سُنی کیوں نہیں، لیکن شیخ رکن الدّینؒ عملِ معنوی کرتے ہیں اور زیارت کرنے والوں کو ذوقِ روحانی چکھاتے ہیں۔"

یہی شخص شیخ رکن الدّینؒ کے پاس گیا اور کہا۔ "خواجہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ آپ اپنے زیارت کرنے والوں کو ذوقِ روحانی دیتے ہیں اور میں ذوقِ جسمانی دیتا ہوں، کیا یہ درست ہے؟"

شیخ رکن الدّین نے جواب دیا۔ "بھائی! نظام الدّینؒ میں دونوں وصف موجود ہیں، وہ ذوقِ روحانی بھی عطا کرتے ہیں اور ذوقِ جسمانی بھی۔"

عشرہ ذی الحجہ کا دن تھا، شیخ رکن الدّینؒ خواجہ نظام الدّینؒ سے



"جب تم کسی کے بارے میں کچھ سُنو تو فوراً اس پر یقین مت کرو بلکہ اُس کی چھان بین کرلو۔ یہاں تک کہ اس کی تحقیق ہوجائے، کیونکہ لوگوں کی عادت ہے کہ جب کسی کے بارے میں کوئی بُری بات سُنیں گے تو اس پر جلد یقین کرلیں گے اور پھر اُس کے پھیلانے کی فکر میں ہوجائیں گے"۔

(حدیثِ نبوی)

(رعنا سلیم - کراچی)

ملنے تشریف لے گئے۔ جب دونوں بزرگوں کا آمنا سامنا ہوا تو رکن الدینؒ نے محبوبِ الٰہیؒ سے کہا۔ "بابا نظام الدینؒ! یہ حج کا زمانہ ہے، میں حج کے لئے نہیں جاسکا لیکن یہ جانتا ہوں کہ حج کا ثواب میں تمہاری زیارت سے حاصل کرلوں گا"۔

خواجہ نظام الدینؒ آبدیدہ ہوگئے، فرمایا۔ "یہ تو آپ مجھ کو شرمندہ کررہے ہیں"۔

شیخ رکن الدینؒ کے ایک مُرید تھے شیخ وجیہہ الدین سیاح۔ یہ سنام کے رہنے والے تھے، اسی نسبت سے سیاح سنامی کہلاتے تھے۔ انہیں شیخ رکن الدینؒ نے حکم دیا کہ "خواجہ نظام الدینؒ کی خدمت میں رہو اور اس وقت تک رہو جب تک میں واپسی کی اجازت نہ دوں"۔

چنانچہ سیاح سنامی خواجہ نظام الدینؒ کی خدمت میں رہنے لگے۔

ایک دن یہ دونوں یکجا تھے۔ اتفاق سے ان کے سامنے سے اس عہد کا مشہور قوّال امیر حسن اپنے ساتھیوں سمیت گزرا۔ خواجہ نظام الدینؒ امیر حسن کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس نے ان دونوں بزرگوں کو یک جا جو دیکھا تو ان کے سامنے دست بستہ آکھڑا ہوا۔ عثمان سیاح، قوّال سے بہت اچھی طرح پیش آئے اور کچھ سُنانے کی فرمائش کی۔ امیر حسن نے جواب دیا۔ "حضرت! قوالی ممنوع ہے اور بادشاہ نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے"۔

شیخ عثمان نے کہا۔ "میں دروازہ اندر سے بند کرلوں گا، تم اپنے ساتھیوں کو لیکر اندر آجاؤ اور بادشاہ سے مت ڈرو"۔

خواجہ نظام الدینؒ نے بھی اصرار کیا۔ "امیر حسن! عثمان کو قوالی سُنادو"۔

امیر حسن اپنے ساتھیوں سمیت اندر داخل ہوگیا اور دروازہ اندر سے بند کرلیا گیا اور امیر حسن نے دھیمی آواز میں قوالی شروع کردی۔ جیسے جیسے وقت گزرا، عثمان پر جذب و بیخودی طاری ہوتی چلی گئی، عالمِ جذب و کیف میں قوال کو حکم دیا۔ "قوالی زور زور سے سُنائی جائے"۔

کسی مُرید نے کان میں کہا۔ "حضرت! اگر بادشاہ کو پتہ چل گیا تو سخت ناراض ہوگا اور معلوم نہیں کس مصیبت میں گرفتار کردے"۔

عثمان نے جواب دیا۔ "بادشاہ سے مت ڈرو، بادشاہ سے مت ڈرو"۔

امیر حسن نے زور زور سے قوالی شروع کردی، عثمان نے دوسرا حکم دیا۔ "دروازہ کھول دیا جائے"۔

لوگوں کو خوف ہوا کہ شاید اب قیامت آکے رہے گی، لیکن دروازہ کھول دیا گیا۔ جس وقت دروازہ کھُلا، اُس وقت امیر حسن یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

زاہد زدیں برآمد و صوفی زاعتقاد ترسا محمدی شد و عاشق ہما کہ نیست

(زاہد دین سے اور صوفی اعتقاد کے دائرے سے نکل گیا، عیسائی مسلمان ہوگیا مگر عاشق میں کوئی تبدیلی نہ آئی، عاشق، عاشق ہی ہے)

شیخ عثمان کی اس شعر پر حالت بے قابو ہوگئی اور وہ خود بھی وارفتگی میں اسے بار بار دُہرانے لگے۔ اس جذب و کیف و مستی میں وہ مکان سے باہر نکل گئے۔ قوال اور اس کے ساتھی بھی آپ کے ساتھ ہولئے اور اس شعر کو بار بار پڑھنے لگے۔ راستے میں تماشائی بھی ساتھ ہولئے اور ان پر بھی وجدانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ یہ جمِ غفیر تغلق آباد کی طرف روانہ ہوگیا، یہاں تک کہ یہ لوگ شاہی محل کے سامنے پہنچ گئے۔ بادشاہ اس ہجوم کو دیکھ کر گھبرا گیا اور حکم دیا کہ "معلوم کیا جائے یہ ہجوم کیسا ہے؟"

کچھ دیر بعد خدّام نے مطلع کیا کہ "شیخ عثمان نے محفلِ سماع قائم کررکھی ہے"۔

بادشاہ سخت برہم ہوا، اس نے حکم دیا۔ "شرکاء و حضار کی فہرست پیش کی جائے"۔

کچھ دیر بعد ان کی فہرست بادشاہ کی خدمت میں پیش کردی گئی۔ اس میں خواجہ نظام الدینؒ کا نام نہیں تھا۔ بادشاہ کا غصّہ کم ہوا، اس نے شیخ عثمان کو بلوایا اور جب یہ لوگ بادشاہ کے سامنے پہنچے تو وہ ان لوگوں سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے شیخ عثمان اور ان کے ساتھیوں کو شاہی محل میں ٹھہرایا، شاہی مطبخ سے ان کی ضیافت و مہمان نوازی کی گئی۔ شیخ عثمان اپنے ساتھیوں سمیت تین دن تک بادشاہ کے مہمان رہے۔ بوقتِ رخصت بادشاہ نے شیخ عثمان کی خدمت میں ایک خطیر رقم پیش کی، لیکن شیخ نے اسے قبول نہیں کیا اور وہاں سے غیاث پور کی طرف روانہ ہوگئے۔

شیخ رکن الدینؒ نے بادشاہ کو سمجھایا کہ وہ خواجہ نظام الدینؒ سے عناد نہ رکھے، لیکن بادشاہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بادشاہ بنگالے کی ایک مُہم پر روانہ ہوگیا۔ شیخ رکن الدینؒ نے کہا۔ "خدا خیر کرے، درویش سے بادشاہ کا عناد رنگ لائے گا۔ بادشاہ کی سمجھ میں فقیر کی یہ بات نہیں آرہی"۔

بادشاہ بنگالے کی مُہم سے فارغ ہوکر دہلی آرہا تھا، دہلی میں داخلے سے پہلے ہی اس نے خواجہ نظام الدینؒ کو حکمیہ پیغام بھیجا کہ "میں دہلی آرہا ہوں اور تمہیں حکم دیتا ہوں کہ میرے آنے سے پہلے ہی تم دہلی کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ"۔

بادشاہ کے حکم نے ہر کسی کو پریشان کردیا لیکن آپ نے پیغام لانے والوں سے کہا۔ "ہنوز دلّی دُور است۔ (ابھی دہلی دُور ہے)"۔

جب یہ بات شیخ رکن الدینؒ کو معلوم ہوئی تو آپ نے 'اِنّا للّٰہ' پڑھ دی اور فرمایا۔ "لو بھائی! یہ بادشاہ بھی گیا۔ کیا میں نے اسے سمجھایا نہیں تھا کہ درویش

سے بادشاہ کا عناد رنگ لائے گا۔ اب وہ وقت زیادہ دُور نہیں ہے۔"

جب بادشاہ دہلی کے قریب آ گیا تو شیخ رکن الدینؒ بھی اپنے مُریدوں کے ساتھ اس کے استقبال کو پہنچے، بادشاہ کے لئے ایک خاص کوشک تیار کی گئی تھی۔ بادشاہ نے اس کوشک میں قیام کیا۔ یہ کوشک افغان پور کے قریب تعمیر کی گئی تھی۔

بادشاہ نے کسی سے دریافت کیا۔ "کیا خواجہ نظام الدینؒ کو شاہی فرمان پہنچا دیا گیا ؟"

جواب دیا گیا۔ "پہنچا دیا گیا۔"

بادشاہ نے پوچھا "انہوں نے کیا جواب دیا ؟"

کسی نے جواب دیا۔ "خواجہ نظام الدینؒ نے جواب دیا ہے 'ہنوز دِلّی دُور است'۔"

بادشاہ نے حیران ہو کر سوال کیا۔ "اس کا مطلب ؟ اس طرح وہ کہنا کیا چاہتے ہیں ؟"

شیخ رکن الدینؒ نے جواب دیا۔ "بابا نظام الدینؒ کے بزرگوں میں یہ دستور نہیں رہا ہے کہ شاہوں کی محفلوں اور درباروں میں حاضریاں دی جائیں، نظام الدینؒ کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھانا چاہتے جو ان کے بزرگوں نے نہ اُٹھایا ہو۔"

بادشاہ نے کہا "حضرت! میں آپ کی باتوں کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکا۔"

شیخ رکن الدینؒ نے جواب دیا "میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بادشاہوں کو درویشوں سے نہیں اُلجھنا چاہیئے کیونکہ وہ خود بھی بادشاہوں کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔"

بادشاہ نے کہا "حضرت! آخر آپ بھی تو ہیں کہ یہاں تک تشریف لا کر عزت افزائی فرمائی، اگر خواجہ نظام الدینؒ بھی اس طرح تشریف لے آتے تو کیا فرق پڑ جاتا۔"

شیخ رکن الدینؒ نے جواب دیا "میں نے بتا تو دیا کہ بادشاہوں سے دُوری ان کے بزرگوں کا وتیرہ رہی ہے، بابا نظام الدینؒ نے اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر سفر کیا ہے، بادشاہ ان سے یہ اُمید نہ کرے کہ وہ شاہی رُعب اور ہیبت سے اپنا راستہ بدل دیں گے۔"

بادشاہ نے پوچھا "'ہنوز دِلّی دُور است'، سے خواجہؒ کا کیا مطلب ہے؟"

شیخ رکن الدینؒ نے جواب دیا۔ "اشارۃً اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اس میں بادشاہ کو متنبہ کیا گیا ہے کہ بادشاہ نے یہی حکم تو دیا ہے کہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی بابا نظام الدینؒ دہلی سے کہیں اور چلے جائیں، جس پر انہوں نے یہ کہلا دیا ہے کہ ابھی دِلّی دُور ہے یعنی بادشاہ کے لئے دِلّی دُور ہی رہے گی، نہ بادشاہ دِلّی میں داخل ہو گا نہ بابا نظام الدینؒ کو دِلّی چھوڑنی پڑے گی۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "اب میں دِلّی میں نہیں داخل ہوں گا تو پھر جاؤں گا کہاں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اس کا علم تو بس عالم الغیب ہی کو ہو گا۔"

شاہی دسترخوان بچھا تو اس پر بادشاہ کے اُمراء اور خاص مصاحبین کے ساتھ شیخ رکن الدینؒ اور ان کے مُریدِ خاص شیخ عثمان سیاح سنامی اور دوسرے مُرید بھی شریکِ طعام ہوئے۔ شیخ رکن الدینؒ نے اچانک کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور بادشاہ سے کہا۔ "اب اکل و شرب بند کیجئے اور یہاں سے اُٹھ چلیئے۔"

بادشاہ نے پوچھا "کیا کوئی خاص بات ہے ؟ میں تو اکل و شرب سے فارغ ہو کر ہی اس جگہ سے اُٹھوں گا۔"

شیخ رکن الدینؒ نے کچھ دیر بعد بادشاہ سے دوبارہ کہا۔ "بابا! اب زیادہ وقت نہ گنواؤ، یہاں مت ٹھہرو۔ اگر زندگی ہے تو ایسے ایسے ہزار موقع اکل و شرب کے ملیں گے۔"

بادشاہ نے ترنگ میں کہا۔ "اگر آپ کو جلدی ہے تو تشریف لے جائیے، میں بعد میں آ جاؤں گا۔"

شیخ رکن الدینؒ اُسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ ہی ان کے مُرید بھی اُٹھ گئے۔ بادشاہ اپنے مخصوص اُمراء اور مصاحبین کے ساتھ وہیں بیٹھا رہا۔

شیخ رکن الدینؒ نے کوشک سے نکلتے ہوئے فرمایا۔ "بابا نظام الدینؒ کا قول پورا ہو گیا، بادشاہ کے لئے دِلّی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دُور ہو گئی۔"

ابھی آپ کا یہ فقرہ پورا ہی ہوا تھا کہ کوشک سے شور و غل بلند ہوا، سب نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، کوشک اپنے در و دیوار اور چھت سمیت غائب ہو چکی تھی۔ یہ ساری چیزیں بادشاہ اور اس کے ساتھیوں پر گر چکی تھیں گویا شاہی کوشک شاہی قبرستان بن چکی تھی۔ بادشاہ اپنے ساتھیوں سمیت اس میں دفن ہو چکا تھا۔

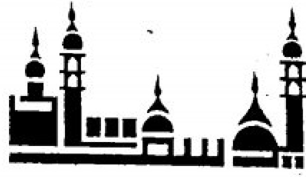
اس واقعے نے خواجہ نظام الدینؒ کا رُعب طاری کر دیا اور 'ہنوز دِلّی دُور است'، نے ایک ابدی اور تاریخی حیثیت حاصل کر لی۔

شیخ رکن الدینؒ ملتان واپس چلے گئے۔ آپ کا اصول تھا کہ وضو کے بعد دُعائے وضو ضرور پڑھتے، لیکن ایک دن آپ یہ دُعا پڑھنا بھول گئے صرف الحمد للہ ہی کہہ کر رہ گئے۔ خادمِ خاص نے یہ تبدیلی بڑی شدت سے محسوس کی اور شیخ رکن الدینؒ کے نانا جان کو اس سے مطلع کیا۔ وہ شیخ کے پاس پہنچے اور اس کی وجہ دریافت کی۔ آپ نے جواب دیا۔ "آج جب میں وضو کر رہا تھا تو دل میں دنیا اور آخرت کا کوئی خیال ہی نہ آیا۔ جس سے میں یہ سمجھا کہ آج میرا وصال ہو جائے گا۔ اس لئے میں الحمد للہ کہہ کر رہ گیا۔"

اس کے بعد آپ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ بس نماز فرض ادا کرنے کے لئے ہی حجرے سے باہر تشریف لاتے، اس کے بعد باہر نہیں نکلتے تھے۔ ۱۶ رجب ۷۳۵ھ بروز جمعرات آپ نے اپنے خادمِ خاص کو بلایا اور اپنی تجہیز و تکفین کی باتیں کرنے لگے، کچھ وصیتیں کیں، اس کے بعد اپنے ایک بھائی کو خرقۂ مسند و خلافت عطا کیا اور نمازِ مغرب ادا کرتے ہوئے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا علیہ راجعون۔

آپ کی آخری آرامگاہ آپ کے والد اور دادا کے قریب ہی ملتان میں ہے اور آج بھی مرجعِ خواص و عوام ہے۔





ضیاءالتسنیم بلگرامی



ایران کے علاقے "رے" میں جہاں امام فخرالدین رازی اور مشہور کیمیادان ابوبکر بن زکریا رازی جیسے باکمال لوگ پیدا ہوئے وہیں اہل اللہ اور صوفیائے کرام کے مقدس وجودوں سے یہ سرزمین چمکتی رہی۔ یہیں دوسری صدی ہجری میں حسین نامی ایک شخص کے گھر میں چاند جیسا بیٹا پیدا ہوا۔ اس کے حسن اور چہرے سے پھوٹنے والی نورانی کرنوں نے ہر دیکھنے والے کے دل و دماغ کو یکساں متاثر کیا۔ ایک ہفتہ تو اس کی پیدائش کی خوشیاں منائی جاتی رہیں۔ آٹھویں دن نام کا مسئلہ زیرِ غور آیا۔ اللہ کے کلام سے بچے کا نام نکالا جانے لگا۔ چنانچہ قرآنِ پاک کے کھلتے ہی "یُوسُفُ اَعرِض عن هٰذا اسکته واستغفرِی لذنبِکِ اِنکِ کنتِ مِنَ الخٰطِئینَ" (اے یوسف! اس بہتان کا خیال نہ کرو ۔۔۔ اے عورت! تو اپنے گناہوں کی بخشش مانگ، تو تو ان میں سے ہے جو جان بوجھ کر خطا کیا کرتے ہیں۔)

اس آیت نے نام رکھنے کا مسئلہ ہی حل کر دیا۔ چاند سا بیٹا اور اشارۂ غیبی سے "یوسف" نام رکھنے کا حکم۔ باپ نے فرطِ خوشی میں اعلان کر دیا۔ "خدا نے اس بچے کا نام یوسف رکھ دیا ہے۔"

خاندان والوں نے مبارک سلامت کے نعرے لگائے۔ بچے کا نام یوسف رکھ دیا گیا لیکن رات کو نومولود بچے کے باپ نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے ایک عجیب سی بات سوچنا شروع کر دی۔ قرآنِ پاک کی آیت میں یوسف کے ساتھ ہی اس عورت کا ذکر بھی تھا، جو زلیخا کے نام سے مشہور ہے۔ اس عورت کا ذکر جس نے خطا کی اور خدا سے گناہ کی بخشش کی دعا مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیا اس میں بھی نومولود کے لیے کوئی خاص اشارہ موجود ہے؟ کیا اس اشارے میں نومولود کے مستقبل کی کوئی جھلک پائی جاتی ہے؟ اور یہ سارے ہی سوالات ایسے تھے جن کا فوری جواب نہیں مل سکتا تھا۔ اس جواب کے لیے انھیں نومولود کی نوجوانی کا انتظار کرنا تھا۔

اس بات کو ایک عرصہ گزر گیا۔ بچپن لڑکپن میں اور لڑکپن نوجوانی میں بدل گیا۔ یوسف کا حسن نکھرتا چلا گیا۔ جو دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا۔ لوگ سبحان اللہ صل علیٰ کے نعرے بلند کرتے۔ خود یوسف کو بھی اپنی خوبصورتی کا بڑا احساس رہتا تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہوتے تو خود نمائی میں محو ہو جاتے۔ خود اپنی شکل صورت میں ایسے مستغرق ہو جاتے کہ کسی بات کا ہوش نہ رہتا۔ اس احساسِ حسن میں یوسف اچھے سے اچھا لباس پہنتے تاکہ خوبصورتی میں اور اضافہ ہو جائے لیکن اس کے ساتھ ہی یوسف کو عبادت و ریاضت کا بڑا شوق تھا۔ وہ اپنے صانع کے عاشق تھے اور ہر ہر لمحہ اپنے خدا کا شکر ادا کرتے رہتے تھے، جس نے انھیں بے مثال حسن عطا فرمایا تھا۔

یوسف کے باپ حسین جس عہد کا انتظار کر رہے تھے، وہ آچکا تھا۔ انھیں معلوم نہیں کیوں اس بات کا یقین تھا کہ ان کے بیٹے یوسف کے ساتھ ایک واقعہ ضرور پیش آئے گا جس میں یوسف اور زلیخا والی مشہور تاریخی مماثلت موجود ہوگی۔ وہ اپنے بیٹے کی حرکات سکنات پر گہری نظریں رکھتے۔ بیٹا کہاں جاتا ہے؟ کس سے ملتا ہے؟ اس کے عام مشاغل کیا ہیں؟ جنسِ مخالف کے لیے اس کے کیا احساسات ہیں؟ یہ اور اس نوع کے اور بہت سے سوالات حسین کو بہت پریشان رکھتے تھے۔ اس دوران حسین کو یہ محسوس ہونے لگا کہ شاید اب وہ زیادہ دن نہیں جییں گے اور انھیں جو کچھ کرنا ہے فوراً کر گزرنا چاہیے۔ دنیا کے بارے میں قنوطی اور غیر رجائی اندازِ فکر نے حسین کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ جو خاص کام اب تک نہیں کر سکے ہیں، اس کے بارے میں کم از کم یوسف کو نصیحت تو کر ہی دی جائے۔

شام کے وقت چڑیاں بسیرا لینے کے لیے اوپر فضا میں اِدھر اُدھر محوِ پرواز تھیں۔ کاشتکار اپنے مویشیوں کو ہنکاتے ہوئے اور آلاتِ زراعت اپنے اپنے کاندھوں پر اٹھائے اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔ دن کے شور و غل پر شام کے سناٹے نے قبضہ جمانا شروع کر دیا تھا۔

حسین اس عبرت انگیز ماحول میں اپنے بیٹے یوسف کا انتظار کر رہے تھے۔ یوسف دوپہر کے بعد سے غائب تھا۔ محلّے کی مسجد میں بھی وہ نظر نہیں آیا تھا۔ مغرب کے بعد عشاء کی نماز کا وقت آگیا لیکن یوسف کا کہیں پتہ نہ تھا۔ باپ کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ تقریباً نصف رات کو انھوں نے یوسف کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ باپ نے تجاہل و تغافل سے کام لیا اور منہ پر چادر ڈال کر یوں پڑے رہے گویا بڑی گہری نیند سو رہے ہیں۔ ماں نے دروازے پر دستک کی آواز ہی سے پہچان لیا کہ یہ یوسف کی دستک ہے۔ چپکے سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا اور دبی دبی آواز میں پوچھا "یوسف! تم اس وقت تک کہاں تھے؟"

یوسف نے جواب دیا "ماں! میں چند دنوں سے بہت پریشان ہوں اور سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس پریشانی کا انجام کیا ہوگا؟"

ماں نے بڑے افسوس سے کہا "یوسف! میں تجھ سے تیری پریشانی کے بارے میں کچھ بھی نہ پوچھوں گی لیکن تجھے اپنی اس پریشانی کی تفصیل اپنے باپ کو ضرور بتانا ہوگی۔"

یوسف نے جواب دیا "میں اپنی اس پریشانی کا ذکر آپ سے بھی کر سکتا ہوں اور باداجان سے بھی لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ میرا بوجھ جوں کا توں رہے گا اس لیے میری گزارش یہی ہے کہ مجھے چھیڑا نہ جائے۔ میں کہاں جاتا ہوں، اپنی زندگی کے قیمتی اور طویل لمحات کہاں اور کس کی صحبت میں گزارتا ہوں، وہاں سے مجھے کیا ملتا ہے اور مستقبل میں کیا ملے گا؟ یہ سارے ہی سوالات ایسے ہیں جن کا فی الحال کوئی جواب ممکن نہیں۔"

ماں نے بیٹے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے کہا "اندر چلو، وہاں اطمینان سے بات کروں گی۔"

دونوں ماں بیٹا اس کمرے میں چلے گئے جس کے برابر والے کمرے میں حسین چہرے پر چادر ڈالے سونے کی نقل کر رہے تھے۔

ماں نے یوسف کو بٹھا کر بڑی محبت سے کہا "اچھا، اب تو بیٹھ ذرا، میں تیرے لیے کھانا لاتی ہوں۔"

یوسف خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ماں کے جاتے ہی حسین نے اپنے چہرے کی چادر اتار پھینکی اور آہستہ آہستہ یوسف کے کمرے میں داخل ہوگئے۔ قدموں کی آہٹ نے یوسف کو چونکا دیا۔ اوپر نظریں جو اٹھائیں تو سامنے باپ کو کھڑے دیکھا۔ وہ باپ کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔ باپ نے بڑی نرمی سے کہا "بیٹھ جاؤ۔" پھر پوچھا "تمھاری ماں کہاں چلی گئیں ہے؟"

یوسف نے جواب دیا "وہ میرے لیے کھانا لینے گئی ہیں۔"

باپ نے آہستہ سے کہا "ہاں، جب تک تم گھر نہیں آجاتے تمھاری ماں جاگ کر تمھارا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ میں نے اس سے کئی بار کہا کہ یوسف کوئی بچہ تو ہے نہیں جو گم ہو جائے گا اس کے فضول قسم کے انتظار میں اپنا وقت کیوں ضائع کرتی ہو لیکن ماں کی ماتا مانتی ہی نہیں، وہ اپنی محبت سے مجبور ہے۔"

یوسف نے رنجیدہ لہجے میں کہا "باداجان! کل سے میں کوشش کروں گا کہ ماں کو میرے سلسلے میں کوئی تکلیف نہ اٹھانا پڑے اور یہ کوئی اتنا پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے جس کا کوئی حل ہی نہ ہو۔"

باپ نے آہستہ سے کہا "یوسف! شاید تو نہیں جانتا کہ میں خود تجھ سے کتنی محبت کرتا ہوں۔"

یوسف نے شرمندگی سے جواب دیا "خوب جانتا ہوں باداجان۔ یہ میری بڑی بدقسمتی ہوگی کہ میں آپ کی محبتوں اور شفقتوں کا کوئی اندازہ نہ لگا سکوں۔"

باپ بیٹے میں جس قسم کی بات چیت ہو رہی تھی، اس میں ایک طرف تکلف تھا، لحاظ تھا، اپنے مقدس رشتے کا شدید احساس تھا اور دوسری طرف یوسف کو بھی باپ کے ادب اور احترام کا بڑا خیال تھا۔ باپ کے سامنے زبان کھولنے میں بھی ادب اور احترام مانع آتے تھے۔ باپ بیٹے کے چہرے پر نظریں جمائے اس کش مکش اور الجھن کو پڑھنے سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے جن میں ان کا بیٹا مبتلا نظر آ رہا تھا۔ آخر حسین نے سکوت توڑ دیا اور پوچھا "بیٹے یوسف! کیا تو مجھے اجازت دے گا کہ میں اپنے دل کی خلش دور کر دوں؟"

یوسف نے جواب دیا "باداجان! آپ اجازت مانگ کر مجھے کیوں شرمندہ فرما رہے ہیں!"

باپ نے بڑی دور سے تمہید چھیڑی، بولے "بیٹے یوسف! آج میں تجھے ماضی میں لیجاؤں گا! اس ماضی میں، جس میں تو پیدا ہوا تھا اور وہ ماضی، جس میں تیرا نام یوسف رکھا گیا تھا۔"

بیٹے کے پاس باپ کی ان باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ بس وہ باپ کی صورت ہی دیکھنے میں محو تھے۔ اتنے میں ماں کھانا لیکر آگئیں۔ وہ شوہر کو بیٹے کے پاس دیکھ کر پریشان ہوگئیں، بولیں "آپ یوسف سے اس وقت تک کوئی بات نہیں کریں گے جب تک یہ کھانا نہ کھالے۔"

حسین نے مسکرا کر جواب دیا "کھانا تو رہا ایک طرف اگر تم کہو تو میں زندگی بھر اس سے کوئی بات ہی نہ کروں۔"

ماں نے شرما کر جواب دیا "نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ آپ کی تلخ ترش باتوں کے بعد اگر یہ کھانا کھائے گا تو وہ جسم میں نہیں لگے گا۔"

حسین نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے یوسف سے کہا "کھانا کھا چکنے کے بعد میرے کمرے میں آجانا، وہیں کچھ ضروری باتیں کر لوں گا۔"

یوسف نے جواب دیا "بہت بہتر ہے، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

حسین کے چلے جانے کے بعد ماں نے بیٹے کو سمجھایا "بیٹے یوسف! تم اپنے باپ کی باتوں کا بُرا نہ ماننا، اس لیے کہ میں خوب جانتی ہوں کہ وہ تجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں اور اسی محبت نے انھیں تیری طرف سے فکرمند اور پریشان کر رکھا ہے۔"

یوسف کوئی جواب دینے کے بجائے کھانا کھانے میں مشغول رہے۔

یوسف کو اپنے شوہر کے کمرے میں چھوڑ کر ماں چلی گئیں۔ حسین نے یوسف کو اپنے پاس ہی بٹھا لیا! انھوں نے کہا "بیٹے یوسف! جب تم پیدا

ہوئے تھے تو میں نے دستور کے مطابق تمہارا نام رکھنے کے لیے قرآن پاک کا سہارا لیا تھا! اس سے میں نے تمہارا نام یوسف رکھا۔ نام کے سلسلے میں جو آیت میرے سامنے آئی تھی اس کے ایک حصے نے مجھے آج تک ایک ایسی پریشانی اور الجھن میں مبتلا کر رکھا ہے کہ میں اس سے نجات نہیں حاصل کر پا رہا ہوں۔"

سعادت مند بیٹے نے جواب دیا۔ "آپ میری طرف سے اپنے آپ پر کوئی فکر نہ مسلط کیجیے اور مجھے بتایئے کہ آپ کیوں پریشان رہتے ہیں، شاید میں اس پریشانی کو دُور کر سکوں۔"

باپ نے قرآنِ پاک کی وہ آیت دہرا دی اور کہا۔ "یوسف! میں معلوم نہیں کیوں اس غلط فہمی یا شک و شبے کا شکار ہو گیا ہوں کہ تیرے ساتھ کوئی ایسا واقعہ ضرور پیش آ سکتا ہے جس میں حضرت یوسفؑ اور زلیخا والے واقعے کی مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہو گی۔"

یوسف نے آہستہ سے جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے کبھی ایسی بات رونما ہو لیکن فی الحال ایسی کوئی بات نہیں۔"

باپ نے ذرا تکلف سے پوچھا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تو آج کل کن ہنگاموں میں مشغول رہتا ہے؟"

یوسف نے جواب دیا۔ "آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

باپ نے کہا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آج کل تو کن مشغولیات میں پھنسا ہوا ہے جو آدھی آدھی رات تک غائب ہو جاتا ہے؟"

یوسف نے جواب دیا۔ "میں آپ کی اس تشویش کا ایک ہی جواب دے سکتا ہوں وہ یہ کہ میں جہاں کہیں بھی جاتا ہوں، وہ ایسی جگہ نہیں ہے کہ آپ فکر و تشویش میں مبتلا ہوں۔"

باپ نے کہا۔ "اگر وہ کوئی قابلِ اعتراض جگہ نہیں ہے تو اس کا نام لینے میں شرم اور تکلف کیوں ہے؟"

یوسف کسی تذبذب میں مبتلا ہو گئے، بولے۔ "میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ انسان برائیاں برملا اور علانیہ کرے تو ایسی بُری بات نہیں، کیونکہ اس طرح آدمی کا ظاہر باطن یکساں رہتا ہے اور لوگ اس سے دھوکا نہیں کھاتے لیکن اس کے برعکس انسان کو نیکیاں اور عبادت چھپ کر ہی کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح انسان اس بے جا فخر اور غرور سے بچ جاتا ہے جو زہد اور تقوے سے خواہ مخواہ سر اٹھانے لگتا ہے۔ آپ یہ سمجھ لیجیے کہ میں آج کل کچھ ایسی ہی مشکلات میں پھنسا ہوا ہوں۔"

باپ نے تشویشناک لہجے میں پوچھا۔ "میں تیرا مطلب نہیں سمجھا بیٹے۔ تو خدانخواستہ برائیوں میں پھنس گیا ہے یا خوش قسمتی سے زہد و تقوے کی طرف مائل ہے؟"

یوسف نے شرمندگی سے جواب دیا۔ "میں کوشش کر رہا ہوں کہ زہد و تقوے پر مائل ہو سکوں۔"

باپ نے کہا۔ "وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر تو کس طرح زہد و تقوے پر مائل ہو گیا ہے؟ اس کی صورت کیا ہے؟"

یوسف نے جواب دیا۔ "باوا جان! آج کل میں ابو تراب نخشبی کی صحبت میں اٹھ بیٹھ رہا ہوں اور وہاں مجھے بڑا مزہ آ رہا ہے۔ ایک ایسی لذت جس کا اظہار لفظوں میں ناممکن ہے، میری رگ رگ میں سرایت کر رہی ہے۔"

باپ نے اطمینان کی سانس لی اور بیٹے کو شاباش دے کر آرام کرنے کی اجازت دے دی۔

ابو تراب نخشبی کی صحبت میں رہنے کا ایک سردار بھی اٹھتا بیٹھتا تھا۔ وہ ابو تراب کی مجلس میں آنے والوں میں یوسف سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے سوچا کہ اس نوجوان کو خدا نے کتنا حُسن عطا فرمایا ہے۔ اگر یہ حُسن خود اس کو ملا ہوتا تو اس سے زبردست کام لیتا لیکن یوسف کو شاید اپنے حُسن کی خبر ہی نہیں! اس سردار کی ایک بیٹی تھی! اس نے سوچا اگر یوسف اس کی بیٹی سے شادی کر لے تو مزہ آ جائے۔ یہ سوچ کر اس نے یوسف سے تعلقات استوار کرنا شروع کر دیے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ ایک دن یوسف کو اپنے ساتھ لیکر گھر پہنچ گیا۔ یوسف کی شاندار دعوت کی اور کچھ اتنی خوش اخلاقی سے پیش آیا کہ یوسف کے دل میں اس سردار نے ایک خاص جگہ بنا لی اور پھر تو یہ دوستی اور بے تکلفی اتنی بڑھی کہ یوسف اکثر و بیشتر ملاقات کی خاطر اس سردار کے گھر آنے جانے لگے۔ سردار نے آہستہ آہستہ اپنی مستورات کا پردہ بھی ختم کر دیا اور بالواسطہ لڑکی کو یہ ہدایت کر دی کہ جس طرح بھی ممکن سمجھے، یوسف کو اپنے دام میں لے لے کیونکہ اس سے زیادہ شریف اور حسین کوئی اور نوجوان نہیں ملے گا۔ باپ کی ایما اور یوسف کے حُسن نے لڑکی کو از خود رفتہ اور پاگل کر دیا۔ وہ دل ہی دل میں یوسف کا نام لیتی رہتی اور ان کی اتنی زیادہ والہ و شیدا ہو گئی کہ اس کے اس جذبے کا دوسروں کو بھی علم ہو گیا لیکن خود یوسف کا یہ حال تھا کہ وہ سردار اور اس کی بیٹی کے ارادوں سے لاعلم اور بے خبر اس گھر میں آتے جاتے رہے۔

ایک دن تنہائی میں لڑکی نے یوسف کو روک لیا۔ گھر میں کوئی تھا نہیں۔ یوسف واپس آنے ہی والے تھے کہ لڑکی نے کہا۔ "جناب! آپ باوا اور ماں کا انتظار کیجیے کیونکہ وہ کہہ گئے ہیں کہ ہم ابھی واپس آتے ہیں۔"

یوسف رُک گئے اور بیٹھ کر ان دونوں کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ لڑکی بھی ان کے سامنے ہی آن بیٹھی۔ یوسف کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ لڑکی کو نظر بھر کے دیکھ ہی لیتے۔ لڑکی کو غصہ آ رہا تھا کہ یہ کیسا بے حس اور بد مذاق نوجوان ہے جو ایک نوجوان اور حسین لڑکی کی موجودگی اور تنہائی کا فائدہ نہیں اٹھا رہا ہے۔ وہ ہمت کر کے اپنی جگہ سے اٹھی اور یوسف کے سامنے آ کر مسکرا کر پاس ہی بیٹھ گئی۔ یوسف ذرا کھسک کر دُور ہو گئے۔ لڑکی نے مسکرا کر شوخی سے پوچھا۔

"کیا تمہیں مجھ سے ڈر لگتا ہے؟"

یوسف نے جواب دیا۔ "نہیں تو۔"

لڑکی ان سے بھڑ کر بیٹھ گئی، بولی۔ "پھر مجھ سے دُور کیوں بھاگ رہے ہو؟" یوسف نے ہٹنے کی کوشش کی مگر لڑکی نے انھیں پکڑ لیا، بولی۔ "میں

تمھیں بھاگنے نہیں دوں گی۔"

یوسف نے لڑکی کے حسین چہرے کو دیکھا اور پورے جسم میں ایک پُرکیف سنسناہٹ سی محسوس کی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کی رگ و پے میں آتش سیال پگھل رہی ہے۔

لڑکی نے بڑی سرمستی میں کہا۔"یوسف! میری خواہش تو یہی تھی کہ ہم دونوں شادی کر کے ایک ہو جاتے اور اس کے بعد لطف و لذت کی پُرمسرت زندگی گزارتے لیکن اب میں یہ سوچتی ہوں کہ معلوم نہیں ہم دونوں کی شادی ہماری قسمتوں میں لکھی بھی گئی ہے یا نہیں، اب میں صبر نہیں کر سکتی اور اس وقت اپنا مقصد حاصل کر کے رہوں گی۔"

یوسف نے جواب دیا۔"لڑکی! ایسا کیونکر ممکن ہے۔ میں اس گھر میں تیرے باپ کا دوست بن کر آیا ہوں اب میں اس دوستی میں یہ خیانت کیسے کر سکتا ہوں!"

لڑکی نے کہا۔"میرا باپ تم سے میری شادی کرنا چاہتا ہے لیکن تم نادان بنے ہوئے ہو۔ آخر میں کب تک صبر کروں؟"

یوسف نے جواب دیا۔"لیکن تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اس ناجائز اور گناہ کے معاملے میں، میں تمھارا ساتھ دوں گا؟"

لڑکی نے یوسف کو جھٹلانے کی کوشش کی، بولی۔"کیسا گناہ؟ کہاں کا گناہ؟ یہ تو شباب کا تقاضا ہے، جوانی کی بھوک ہے۔ اس تقاضے کو پورا کرنا اور جوانی کی بھوک مٹانا عین فطرت ہے۔ اس میں گناہ ثواب کو کیا دخل ہے؟"

یوسف کو نفس نے ورغلایا کہ لڑکی جو کچھ کہہ رہی ہے، غلط نہیں ہے لیکن اسی لمحے جیسے کسی نے کان میں کہا۔"یوسف! لڑکی جو کچھ کہہ رہی ہے غلط یا صحیح لیکن تیرے خدا نے انسان کے اس فعل کو حرام ضرور قرار دیا ہے۔" آپ نے نہایت جوش میں لڑکی کو دھکا دے کر دور کر دیا، بولے۔"اے لڑکی! تو مجھے خواہ مخواہ کیوں گمراہ کر رہی ہے۔ جس چیز کو خدا نے حرام قرار دیا ہے تیری خواہش اور تیرے کہنے سے وہ جائز کیونکر ہو سکتی ہے۔ چل ہٹ — دور ہو جا مجھ سے۔"

لڑکی بھی آسانی سے باز آنے والی نہیں تھی، اس نے غصے میں کہا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ اتنی آسانی سے پیچھا چھڑا لو گے مجھ سے؟ یہ تمھارا خیال خام ہے۔ میں نے تمھاری راہِ فرار بند کر دی ہے۔ اگر تم نے میرا کہنا نہ مانا تو میں شور کر کے اپنے نوکروں ملازموں کو بلالوں گی اور تم پر یہ الزام لگاؤں گی کہ تم مجھ پر بُری نیت سے حملہ کر رہے تھے۔ سوچو تو اس وقت تمھارا کیا حشر ہوگا؟ تم اتصال و وصال کی لذتوں سے محروم بھی رہو گے اور اس الزام میں ملوث بھی ہو جاؤ گے اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم میری رضامندی سے فائدہ اٹھاؤ اور جب تک چاہو مجھ سے لطف و لذت اٹھاتے رہو۔"

یوسف نے پیچھے دروازے کی طرف مڑ کر دیکھا، واقعی دروازہ مقفل تھا۔ یہ بہت گھبرائے کہ اب اس شیطان لڑکی سے بچنا مشکل ہے۔ یوسف کو لڑکی کے گھر والوں کا ذرا بھی خوف نہ تھا، انھیں اپنے رب کا خوف تھا، خدا کا ڈر تھا جس نے انسانوں کو اس کام سے روکا تھا۔ آپ نے لڑکی کو درشتی سے جواب دیا۔"اے لڑکی! میں اس بات سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں کہ تو شور غل کر کے آدمیوں کو جمع کر لے گی اور مجھ پر اس گناہ کا الزام لگائے گی جو میں نے نہیں کیا۔ یاد رکھ، جو گناہ میں نے کیا ہی نہیں، اس پر نہ تو میں شرمندہ ہوں گا نہ ہی خوفزدہ۔ میں تو اپنے اللہ سے خوفزدہ ہوں کہ کہیں مجھے اس کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑ جائے۔"

لڑکی نے طیش میں کہا۔"اچھا یہ بات ہے تو لو اور بچو گناہ کے اس الزام سے جو ذرا سی دیر میں تمھاری دنیا کو تباہ و برباد کر دے گا۔ یوسف! تم مجھے اب تک نہیں سمجھے میں بھی ایک ہی ضدی اور خطرناک لڑکی ہوں۔ تم نے میری دل شکنی اور بے عزتی کی ہے، میں اس کی سزا ضرور دوں گی۔"

یوسف دروازے کی طرف بڑھے۔ لڑکی ہنسی، بولی۔"ادھر کہاں جا رہے ہو، دروازہ مقفل ہے!"

یوسف نے جواب دیا۔"مجھے میرے خدا نے حکم دیا ہے کہ میں یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں۔"

یہ کہتے ہوئے آپ دروازے تک پہنچ گئے۔ لڑکی مطمئن تھی اور طنزاً ہنس رہی تھی کہ یوسف وہاں سے نکل نہیں سکیں گے لیکن اس وقت تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دروازے کو کھلتے اور یوسف کو باہر نکلتے دیکھا۔ لڑکی شور غل بھی نہ کر سکی اور یوسف وہاں سے چلے گئے۔ لڑکی نے اٹھ کر دروازے کا قفل دیکھا، زنجیر کھلی ہوئی تھی اور قفل خالی کنڈے میں پھنسا لٹک رہا تھا۔ یوسف چلے گئے اور لڑکی ہاتھ ملتی رہ گئی۔ ان پر خدا کا خوف اتنا غالب تھا کہ پاک و صاف نکل آنے کے باوجود وہ اپنے دل میں یہ خوف محسوس کر رہے تھے کہ کہیں خدا ان کے کسی فعل سے ناراض نہ ہو گیا ہو۔ رات کو جب وہ بستر پر گئے تو یہی فکر اور یہی تشویش انھیں پریشان کر رہی تھی۔ وہ پوری رات سو نہیں سکے۔ صبح فجر سے ذرا پہلے جو آنکھ لگی تو انھوں نے خواب میں دیکھا، ان کے ہم نام حضرت یوسف علیہ السلام ایک تخت پر جلوہ فرما ہیں۔ ان کے سامنے فرشتے صف بستہ کھڑے ہیں۔ حضرت یوسف نے آپ کو دیکھا تو استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے اور اپنے پہلو میں بٹھا کر فرمایا۔"اے میرے ہم نام! جس وقت سردار کی لڑکی نے تم سے وصل کی خواہش کی تھی اور یہ دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے اس کی خواہش پوری نہ کی تو وہ شور غل کر کے تمھیں ذلیل و خوار کر دے گی اور تم نے اس کے جواب میں بڑے مطمئن لہجے میں یہ کہا تھا کہ تم لوگوں سے نہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہو جس نے انسان کو اس کام سے روکا ہے۔ تم خدا کے سامنے شرمندہ ہونے سے ڈر رہے تھے۔ تمھاری یہ ادا خدا کو بہت پسند آئی اور اس نے مجھ سے کہا کہ اے ابن یعقوبؑ! ایک ایسے ہی موقعے پر تم نے مجھ سے زلیخا کے شر سے بچنے کی دعا مانگی تھی لیکن اس دوسرے یوسف نے سردار کی بیٹی کی سفلی خواہشات کو میرے خوف سے ٹھکرا دیا اس لیے میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ اپنے اس عظیم

ہم نام سے ملو۔" یوسف اتنا کہہ کر چپ ہو رہے اور محبت کی نظروں سے یوسف کو دیکھتے رہے۔ آخر فرمایا "یوسف! میں تمھیں بشارت دیتا ہوں کہ مستقبل میں تمھارا شمار عظیم بزرگوں میں ہوگا لہٰذا تم اسم اعظم کی تعلیم کے لیے خدمت کرتے رہو۔"

بیداری کے بعد آپ اپنے عہد کے مشہور ترین صوفی ذوالنون مصری کی خدمت میں پہنچے اور ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ آپ شب و روز ان کی خدمت میں حاضر رہتے۔ اس طرح رہتے رہتے جب کافی عرصہ گزر گیا تو ذوالنون مصری نے دریافت کیا "یوسف! اگر تم چاہو تو جا سکتے ہو۔"

یوسف نے جواب دیا "لیکن میں حضور کی خدمت میں مزید وقت گزارنا چاہتا ہوں۔"

ذوالنون مصری نے پوچھا "میرے پاس رہنے کا کوئی خاص مقصد؟"

انھوں نے جواب دیا "میں یہاں حصولِ نیاز اور خدمت گزاری کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

ذوالنون مصری نے سکوت اختیار کیا اور یوسف نے ان کی خدمت گزاری میں دو سال اور گزار دیے۔ ذوالنون مصری کو ان کے حال پر رحم آ رہا تھا! انھیں ایک بار پھر اپنے سامنے طلب کیا اور پوچھا "یوسف! کیا تمھیں یاد ہے کہ میں نے دو سال پہلے تم سے کیا کہا تھا؟"

انھوں نے جواب دیا "مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا تھا کہ میرے پاس رہنے کا مقصد؟"

ذوالنون نے پوچھا "پھر تم نے اس کا کیا جواب دیا تھا؟"

یوسف نے جواب دیا "میں نے کہا تھا کہ میں آپ کے پاس حصولِ نیاز اور خدمت گزاری کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

ذوالنون مصری نے فرمایا "حالانکہ تمھارا یہ جواب ادھورا تھا۔ جواب کا کچھ حصہ تم تکلفاً نہیں ادا کر سکے تھے۔"

یوسف نے گردن جھکالی اور عرض کیا "حضور نے بجا فرمایا۔ میں تکلف کی وجہ سے پورا جواب نہیں دے سکا تھا۔"

ذوالنون مصری نے نہایت نرمی سے کہا "یوسف! تم تکلف سے مت کام لو، جو مدعا ہے اسے صاف صاف بیان کر دو۔"

یوسف نے ہچکچاتے ہوئے عرض کیا "مجھے یہ اندیشہ پریشان کر دیتا ہے کہ کہیں آپ انکار نہ فرما دیں۔"

ذوالنون نے پوچھا "تم مجھ سے کچھ لینے آئے ہو؟"

"جی ہاں اور وہ چیز آپ کے سوا کسی اور سے مل بھی نہیں سکتی۔"

"بولو! کیا چاہتے ہو؟"

"پہلے وعدہ فرمایئے کہ مایوس نہیں کیجیے گا!"

ذوالنون نے جواب دیا "کیا بچوں کی سی بات کرتے ہو! اگر تم اس چیز کے اہل یا مستحق ہوئے تو ضرور دی جائے گی۔"

یوسف نے عرض کیا "حضور! میں اسم اعظم سیکھنے آیا ہوں۔"

ذوالنون مصری نے سکوت اختیار کیا اور معلوم نہیں کس سوچ میں پڑ گئے۔

یوسف جواب کا انتظار کرتے رہے اور جب دیر تک کوئی جواب نہیں ملا تو سامنے سے ہٹ گئے اور یہ سمجھ لیا کہ شاید ابھی ان کی منشا نہیں ہے، وہ ایک بار پھر ذوالنون مصری کی خدمت گزاری میں مصروف ہو گئے اور ایک سال اور گزر گیا۔ یوسف نے ایک بار پھر کوشش کی کہ اپنا مدعا بیان کریں لیکن ذوالنون مصری نے اشارے سے منع کر دیا کہ "صبر، کچھ صبر کرو! ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔"

آخر تین سال گزر گئے۔

تین سال بعد ذوالنون مصری نے یوسف کو طلب کیا اور کہا۔ "یوسف! تم سے ایک اہم کام آپڑا ہے، کیا اسے انجام دو گے؟"

یوسف نے جواب دیا "حضرت! میں تو موجود ہی اسی لیے ہوں کہ آپ کی خدمت انجام دوں۔ آپ حکم دیجیے اور دیکھیے میں اسے کس طرح بجا لاتا ہوں۔"

ذوالنون مصری نے سرپوش سے ڈھکا ہوا ایک پیالہ انھیں دیا اور حکم دیا "اسے تم دریائے نیل کے دوسرے کنارے لیجاؤ۔ وہاں تمھیں ایک شخص ملے گا اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ تمھیں دیکھتے ہی آگے بڑھے گا اور تم سے یہ پیالہ مانگے گا۔ تم یہ پیالہ اسے دے دینا اور میری طرف سے کہہ دینا کہ میں نے تمھیں اسم اعظم سیکھنے کے لیے اس کے پاس بھیجا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمھیں اسم اعظم ضرور سکھا دے گا۔"

یوسف پیالہ لیکر روانہ ہو گئے لیکن انھیں یہ یقین نہیں تھا کہ جس شخص کو یہ پیالہ دیا جائے گا وہ انھیں اسم اعظم سکھا بھی دے گا۔ یہ بے یقینی کے ساتھ دریائے نیل کی طرف چل پڑے۔ راستے میں یہ جستجو ہوئی کہ آخر اس پیالے میں کیا ہے؟ یا اپنی اس خواہش کو جتنا دباتے، اندر کا حال جاننے کی خواہش انھیں اور زیادہ پریشان کرتی۔ دریائے نیل کے کنارے تک پہنچتے پہنچتے ان کی اس خواہش نے انھیں اتنا پریشان کر دیا کہ انھوں نے پیالے کے منہ سے سرپوش ہٹا دیا اور اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ سرپوش کے دور ہوتے ہی اس میں سے ایک چوہا نکل کر بھاگ گیا! انھوں نے اندر پھر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اب پیالہ بالکل خالی تھا! انھوں نے پیالے پر سرپوش ڈال دیا اور شرمسار و نادم نیل کے دوسرے کنارے چل پڑے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس چوہے کو اتنے اہتمام سے بھیجنے کی غرض و غایت کیا تھی اور اگر کوئی غرض تھی تو وہ اس شخص کو کیا جواب دیں گے جب وہ یہ پوچھے گا کہ اس پیالے میں جو کچھ تھا، وہ کیا ہوا؟

اسی فکر و تشویش میں انھوں نے دریائے نیل کو عبور کیا اور دوسرے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ دوسرا کنارہ بالکل خالی اور ویران پڑا تھا۔ یہ پریشان اور متجسس اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ آخر دور سے ایک شخص آتا دکھائی دیا۔ اس کی الجھی ہوئی بے ترتیب داڑھی اور میلے کچیلے لباس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ شاید وہ شخص پاگل یا مجذوب ہے۔ وہ سیدھا انھی کی طرف بھاگا چلا آ رہا

تھا۔ یوسف کے ہوش و حواس رخصت ہو رہے تھے۔ اس شخص نے پاس آتے ہی کہا "یوسف! وہ پیالہ کہاں ہے؟ لاؤ نا تو ادھر!"

انھوں نے سرپوش سے ڈھکا خالی پیالہ اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے سرپوش ہٹاتے ہی حیرت سے پوچھا "اس میں سے چوہا کہاں چلا گیا؟"

آپ نے سچ سچ بتا دیا "حضرت! بات دراصل یہ ہے کہ میں راستے میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ آخر اس پیالے میں ہے کیا؟ چنانچہ میں نے جیسے ہی سرپوش ہٹایا، اس میں سے ایک چوہا نکل کر فرار ہو گیا۔ اب میں اپنی اس حرکت پر شرمسار ہوں۔"

اس شخص نے قہر کی نظروں سے انھیں گھورا، پوچھا "پھر تو میرے پاس کیوں آیا ہے؟"

انھوں نے جواب دیا "مجھ سے حضرت ذوالنون مصری نے یہ فرمایا تھا کہ آپ مجھے اسمِ اعظم سکھا دیں گے، میں اسی غرض سے آپ کے پاس حاضر ہوا تھا۔"

اس شخص نے طنزاً کہا "واہ یوسف واہ! سبحان اللہ تم مجھ سے اسمِ اعظم سیکھو گے! تم سے ایک ذرا سے چوہے کی تو حفاظت ہو نہیں سکی، معلوم نہیں اسمِ اعظم کی تم کس طرح حفاظت کرو گے!"

آپ اس شخص سے یہ جواب لیکر ذوالنون مصری کی خدمت میں واپس پہنچے اور انھیں واقعے کی پوری تفصیل سُنا دی اور روتے ہوئے بڑی مایوسی سے عرض کیا "تو حضرت! اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں اسمِ اعظم نہیں سیکھ سکوں گا۔"

ذوالنون مصری نے جواب دیا "مطلب یہ نہیں ہوا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میں نے خدا سے تمھارے بارے میں سات بار یہ اجازت طلب کی کہ کیا میں تمھیں اسمِ اعظم سکھا دوں؟ اور مجھے ہر بار یہی جواب ملا کہ ابھی اور آزماؤ۔ چنانچہ میں تمھیں بار بار آزماتا رہا اور ہر بار تم ناکام رہے۔ میں نے تمھیں آخری بار اس چوہے کے ذریعے آزمایا تو معلوم ہوا کہ تم اسمِ اعظم کے فی الحال ابھی اہل نہیں ہو۔"

یوسف کو رونا آ گیا، پوچھا "پھر میرے لیے کوئی حکم ہے؟"

ذوالنون مصری نے جواب دیا "ہاں، چونکہ تم اسمِ اعظم کے مستحق نہیں ہو، اس لیے اپنے وطن واپس جاؤ اور اس وقت کا انتظار کرو جب تمھیں اسمِ اعظم سیکھنے کا اہل قرار دیا جائے۔"

یوسف رونے لگے۔ روتے جاتے اور واپسی کی تیاری کرتے جاتے۔ روانگی سے ذرا پہلے وہ ذوالنون مصری کی خدمت میں الوداعی ملاقات کے لیے گئے اور رقت زدہ آواز میں کہا "حضرت! میں اپنے وطن واپس جا رہا ہوں اور آپ سے اسمِ اعظم کے بجائے کسی نصیحت کا طالب ہوں۔"

ذوالنون مصری نے جواب دیا "یوسف! تم نے جو کچھ لکھا پڑھا ہے کوشش کرو کہ وہ سب تمھارے حافظے سے محو ہو جائے۔"

آپ نے پوچھا "لیکن اس کا فائدہ؟"

ذوالنون مصری نے جواب دیا "اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ درمیان سے حجاب اٹھ جائے گا۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی جھوٹ بولتا ہے تو اس کی بدبو سے فرشتے اس سے میل بھر دور چلے جاتے ہیں۔

رسول اللہ نے فرمایا۔ سچائی کو اپنے اوپر لازم کر لو کیونکہ سچ بولنا نیکی کو پہچانتا ہے اور نیکی بہشت میں پہنچاتی ہے اور آدمی ہمیشہ سچ بولتا اور سچ بولنے کی کوشش کرتا ہے یہاں تک کہ خدا کے نزدیک (وہ سچا لکھا جاتا ہے صدیق کا درجہ پاتا ہے)۔ اور جھوٹ سے بچو کہ جھوٹ نافرمانی (فسق و فجور) کا راستہ دکھاتا ہے اور نافرمانی دوزخ میں پہنچاتی ہے، اور آدمی ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے اور جھوٹ بولنے کی کوشش کرتا ہے، یہاں تک کہ خدا کے نزدیک بڑا جھوٹا (کذاب) کہلاتا ہے۔

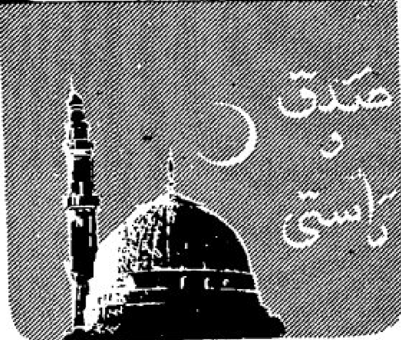
حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ مومن بزدل بھی ہو سکتا ہے۔ فرمایا۔ ہاں ہو سکتا ہے، پھر آپ سے پوچھا گیا کہ مومن بخیل بھی ہو سکتا ہے، فرمایا ہاں ہو سکتا ہے، پھر پوچھا گیا کہ مومن کبھی جھوٹا ہو سکتا ہے، فرمایا۔ نہیں۔

نبی کریم نے فرمایا کہ سب سے بڑی خیانت یہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے جھوٹی بات اس طریقے سے بیان کرو کہ وہ اسکو سچ سمجھے۔

حضور رسول اکرم نے فرمایا۔ جھوٹ بولنے سے رزق گھٹ جاتا ہے۔

حضور نے فرمایا کہ آدمی کو جھوٹا بنانے کیلئے یہ کافی ہے کہ جو کچھ کسی سے سُنے اسے بے تحقیق دوسروں کے آگے بیان کر دے۔

حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں اگرچہ وہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ میں مسلمان ہوں کہ جب وہ بات کرے تو اس میں جھوٹ بولے اور جب وہ وعدہ کرے تو اُسے ایفا نہ کرے اور جب کوئی امانت اسکے سپرد کیجائے تو اس میں بددیانتی کرے۔



آپ نے پوچھا "اور کچھ؟"

ذوالنون مصری نے جواب دیا "تم مجھے بھی اپنے حافظے سے نکال دو اور کبھی کسی سے یہ نہ کہنا کہ ذوالنون میرے مرشد ہیں۔"

یوسف نے عرض کیا "حضرت! میں آپ کی یہ بات مان لوں گا کہ وطن واپس جا کے اس وقت کا انتظار کروں جب مجھے اسمِ اعظم سیکھنے کا اہل

قرار دے دیا جائے اور آپ کی یہ دوسری بات بھی مان لوں گا کہ میں نے جو کچھ لکھا پڑھا ہے اسے اپنے حافظے سے محو کردوں لیکن تیسری یہ شرط کہ میں آپ کو بھی اپنے حافظے اور ذہن سے نکال دوں، مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ میں آپ کو اپنے حافظے اور ذہن سے نہیں نکال سکتا۔ میں آپ کو نہ صرف یہ کہ یاد رکھوں گا اور اپنا پیر و مرشد کہتا رہوں گا بلکہ گاہے بگاہے آپ کی خدمت میں حاضری بھی دیتا رہوں گا۔"

ذوالنون مصری نے کہا "اچھا ایک اور ضروری بات ہے جو تم سے کہنا ہے اور جس پر تم ہمیشہ عمل پیرا رہو گے۔"

انھوں نے پوچھا "ارشاد۔ حکم۔"

ذوالنون مصری نے جواب دیا "اللہ کی مخلوق کو اس کی طرف راغب کرنے کی کوشش ہر حال میں ہمیشہ جاری رکھنا۔"

انھوں نے کہا "اس کا میں وعدہ کرتا ہوں اور اللہ نے چاہا تو اس پر زندگی بھر کاربند رہوں گا۔"

اس کے بعد آپ اپنے وطن چلے گئے اور لوگوں میں وعظ گوئی شروع کردی۔ علما نے آپ کی مخالفت کی لیکن آپ ان کی پرواہ کیے بغیر وعظ گوئی میں مشغول رہے۔ علما کی مخالفت زور پکڑنے لگی اور انھوں نے عوام میں آپ کے خلاف ایک مہم شروع کردی۔ آپ کے چند ارادتمندوں نے بے دلی سے کہا "حضرت! علمائے کرام آپ کی مخالفت پر کمربستہ ہیں اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ کچھ دنوں کے لیے سکوت اختیار فرمالیں ورنہ اب یہ ڈر پیدا ہوگیا ہے کہ شاید لوگ آپ کی وعظ گوئی کے خلاف کوئی ہنگامہ کھڑا کردیں۔"

آپ نے جواب دیا "میرے دوستو! مجھے اس کی کوئی پروا نہیں، میں اپنی وعظ گوئی جاری رکھوں گا خواہ کچھ بھی ہو۔"

ایک مرید نے کہا "یہاں کے سارے علما آپ کے مخالف ہیں اور انھوں نے عوام کو آپ کے خلاف کردیا ہے۔"

آپ نے جواب دیا "مجھے اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں۔"

اور آپ نے اپنی وعظ گوئی جاری رکھی۔ ہر روز آپ کی مجلس وعظ میں لوگوں کی تعداد کم ہونے لگی، یہاں تک کہ ایک دن ایک آدمی بھی آپ کا وعظ سننے نہیں آیا۔ یہ دل شکن منظر دیکھ کر آپ لرز گئے۔ آپ کے مریدوں کو بھی یہ حال دیکھ کر دکھ پہنچا، بولے "جناب! کیا ہم جاں نثاروں نے آپ کو منع نہیں کیا تھا؟"

آپ نے جواب دیا "منع کیا تھا۔"

انھوں نے کہا "آپ نے ہماری بات نہ ماننے کا انجام دیکھ لیا؟"

"دیکھ لیا، خوب دیکھ لیا!"

"پھر اب کیا ارادے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "اب یہ ارادے ہیں کہ میں اپنی وعظ گوئی بند کرتا ہوں، کیونکہ جب سامعین ہی نہ ہوں گے تو میرا وعظ سننے گا کون؟ جب سننے والے کان ہی نہ ہوں گے تو زبان کس کے لیے کھولوں گا!"

آپ کے مریدوں کو اس فیصلے سے خوشی ہوئی۔ اسی دن سہ پہر کو ایک بڑی بی لاٹھی ٹیکتی ہوئی آپ کے پاس آئیں اور کہا "یوسف! کیا بات ہے، آج تو وعظ گوئی نہیں کررہا؟ خاموش کیوں ہے؟"

آپ نے جواب دیا "میں وعظ کس کے لیے کہوں؟ اسے سُنے گا کون؟ لوگ جب میرے وعظ سُننا ہی نہیں چاہتے تو معلوم نہیں کیوں، میں خود بھی اپنے سامعین سے بیزار ہوتا چلا جارہا ہوں۔"

بڑی بی نے بڑے افسوس سے کہا "یوسف! شاباش ہے تجھ پر۔ تُو نے وہ عہد بھی بھلا دیا جو تُو نے ذوالنون مصری سے کیا تھا۔ تُو نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ مخلوق کو پند و نصائح کرتے رہنے کا سلسلہ جاری رکھے گا، پھر یہ عہد شکنی کیسی؟"

یوسف شرمندہ ہوگئے، بولے "بےشک میں نے ان سے یہ عہد کیا تھا اور اللہ نے چاہا تو اس پر کاربند بھی رہوں گا۔ میں اپنی اس بھول پر نادم ہوں۔"

بڑی بی یہ عہد یاد دلا کر کہیں غائب ہوگئیں اور آپ نے وعظ گوئی کا سلسلہ دوبارہ جاری کردیا۔



آپ کے مریدوں میں ابراہیم خواص نے بڑی عزت حاصل کی اور یوسف ان کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ایک دن ابراہیم خواص نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے "اے ابراہیم! یوسف بن حسین سے کہہ دو کہ تم راندۂ درگاہ ہوچکے ہو۔"

ابراہیم چونک کر بیدار ہوگئے اور اس کشمکش و پیچ میں مبتلا ہوگئے کہ اپنا یہ خواب ان پر ظاہر کریں یا خاموش رہیں۔ دوسری شب انھیں یہی خواب پھر دکھائی دیا۔ ابراہیم خواص نے پھر سکوت اختیار کیا اور ان سے کوئی بات نہیں کی۔ انھیں تیسری شب پھر یہی خواب دکھائی دیا۔ ابراہیم نے کہا "میں یہ بات اپنے پیر و مرشد سے کس طرح کہہ سکتا ہوں، مجھے شرم آتی ہے۔"

انھیں جواب ملا "تمھیں جو حکم دیا گیا ہے اسے پورا کرو ورنہ یاد رکھو تمھیں ایک ایسی سزا دی جائے گی کہ تم زندگی بھر یاد رکھو گے۔"

ابراہیم خواص خوفزدہ اور بدحواس اٹھے اور اپنا خواب بیان کرنے آپ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ ابھی آپ نے خواب بیان بھی نہ کیا تھا کہ یوسف نے کہا "ابراہیم! کوئی اچھا سا شعر سُناؤ۔"

ابراہیم نے انھیں ایک اچھا سا شعر سُنا دیا۔ آپ یہ شعر سُن کر تڑپ گئے اور رونے لگے۔ آپ اتنا روئے کہ آنکھوں سے خون جاری ہوگیا۔ جوش میں فرمایا "ابراہیم! تم دیکھ رہے ہو تمھارے ایک شعر نے مجھے از خود رفتہ کردیا ہے کہ میں اپنا ہوش تک گنوا بیٹھا ہوں، شاید لوگ اسی لیے مجھے زندیق کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا بار بار یہ فرمانا کہ میں مردود بارگاہ ہوگیا ہوں بالکل بجا ہے۔"

ابراہیم خواص سناٹے میں آگئے۔ وہ اتنے پریشان ہوئے کہ جنگل کی راہ لی۔ وہاں انھوں نے ایک آواز سُنی "خواص! یوسف بن حسین عشق الٰہی

کی شمشیر کا گھائل ہے اور اس کا مقام اعلیٰ علیین میں ہے۔"

ابراہیم خواص نے رو رو کر عرض کیا "یا اللہ! مجھے اس آزمائش سے بچا جس سے میں اپنے پیرومرشد کے خلاف کسی بدگمانی کا شکار ہو جاؤں۔"

انہی دنوں کی بات ہے، عبدالواحد بن زید، جن کا شمار صوفیائے کبار میں ہوتا ہے، یہ اپنے عہدِ شباب میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کے مزاج میں شوخی اور جرأت اتنی تھی کہ اکثر اپنے والدین سے جھگڑ پڑتے تھے اور جب یہ جھگڑا زیادہ طول پکڑتا تھا تو گھر سے راہِ فرار اختیار کرتے تھے اور آپ کی مجلسِ وعظ میں آجاتے تھے۔ ایک دن آپ کا وعظ ہو رہا تھا کہ واحد بن زید گھر سے لڑ کر آپ کی مجلس میں آگئے۔ آپ اس وقت اپنے وعظ میں فرما رہے تھے کہ اللہ جس کسی پر مہربان ہوتا ہے وہ اسے اپنی طرف اس طرح متوجہ کر لیتا ہے جس طرح کوئی محتاج ہو کر کسی کے سامنے جائے اور پکڑا جائے۔"

اس فقرے نے واحد بن زید کی حالت ہی غیر کر دی، آپ کے پاس پہنچے اور پوچھا "آپ نے جو کچھ فرمایا کیا یہ درست ہے؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں یہ درست ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ درست ہے!"

واحد بن زید نے پوچھا "کیا وہ میری طرف بھی متوجہ ہو سکتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "اگر وہ تمھاری طرف متوجہ ہو جائے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہوگی؟"

واحد بن زید نے سکوت اختیار کیا اور ذرا دیر بعد ایک چیخ ماری اور کپڑے پھاڑ کر قبرستان کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں تین دن تک بے خودی کی حالت میں پڑے رہے۔

واحد بن زید نے جس دن چیخ ماری تھی، اسی دن رات کو یوسف نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص انھیں ہدایت کر رہا ہے کہ یوسف! اپنے وعظ کے ایک فقرے سے جس نوجوان کی تم نے حالت بدل دی ہے، اسے تلاش کرو۔ آپ ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور تین دن بعد جب واحد بن زید انھیں مل گئے تو دیکھتے ہی یوسف کو مخاطب کیا "واہ جناب! آپ کو تو تین دن پہلے میری تلاش کا حکم ملا تھا اور آپ تین دن بعد میرے پاس پہنچے۔"

آپ نے بڑے رشک سے کہا "واحد! تم بڑے خوش قسمت انسان ہو کہ تین دن کے قلیل عرصے میں تم نے وہ سارے مدارج طے کر ڈالے جنھیں لوگ سالوں میں بھی نہیں طے کر پاتے۔"

نیشاپور کے ایک تاجر نے کسی شخص کو کچھ رقم قرض دی۔ قرض دار تاجر کو بتائے بغیر کہیں چلا گیا۔ تاجر کو اپنی رقم کی فکر ستانے لگی۔ ابھی وہ قرض کی وصولیابی کی فکر میں تھا کہ کہیں سے ایک خوبصورت کنیز اس کے ہاتھ لگ گئی۔ یہ کنیز اسے اتنی پسند آئی کہ ایک بڑی رقم کے عوض اسے خرید لیا۔ خریداری کے بعد اسے اپنے قرض کی وصولیابی کی خاطر سفر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اب اسے یہ تشویش لاحق ہوئی کہ اپنی خوبصورت کنیز کو کس کے حوالے کر جائے۔ ان دنوں نیشاپور میں عثمان حیری نامی صوفی کا بڑا شہرہ تھا! اس نے اپنی کنیز عثمان حیری

◉ کسی انسان میں معمولی خوبیاں، عوام کو قابلِ تحسین نظر آتی ہیں۔ اوسط درجے کی خوبیوں پر وہ متحیر ہوتے ہیں اور اعلیٰ درجے کے فضائل ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتے۔

◉ بدگمانی، انسان کے افکار و خیالات کے درمیان اس طرح ہے جیسے چمگادڑ پرندوں کے درمیان، کہ صرف صبح کے جھٹپٹے میں یا غروب کے وقت، جبکہ اندھیرا اور اُجالا باہم مل جاتے ہیں، نمودار ہوتی ہے۔

کے پاس پہنچا دی اور درخواست کی "قبلہ! آپ میری کنیز اپنی بیوی کے پاس رہنے دیں تو بڑی مہربانی ہوگی کیونکہ مجھے اپنے ایک قرض کی وصولیابی کے سلسلے میں سفر کرنا ہے اور کنیز کے سلسلے میں آپ کے گھر سے زیادہ اعتماد کوئی اور جگہ نہیں ہے۔"

عثمان حیری نے جواب دیا "چھوڑ جاؤ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

تاجر نے اپنی کنیز آپ کے گھر چھوڑی اور خود سفر پر روانہ ہو گیا۔

کئی دن بعد عثمان حیری کی اتفاقاً اس کنیز پر نظر پڑ گئی۔ یہ ترکی کنیز اتنی حسین تھی کہ عثمان حیری کی حالت ہی غیر ہو گئی۔ یہ فوراً باہر نکل گئے اور سیدھے اپنے مرشد ابوحفص حداد کے پاس پہنچے! انھوں نے مسکرا کر دریافت کیا "کہو عثمان کیسے آئے؟"

عثمان نے جواب دیا "حضرت! خدا نے مجھے ایک ایسی آزمائش میں ڈال دیا ہے کہ اس سلسلے میں زبان کھولتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔"

مرشد نے کہا "شرماؤ مت، شرمانے سے کام نہیں چلے گا۔"

عثمان حیری نے پورا واقعہ سُنا دیا، آخر میں عرض کیا "اب عالم یہ ہے کہ اس ترکی کنیز نے میری حالت خراب کر دی ہے اور میں اس کے خوف سے اپنے گھر نہیں جا رہا ہوں۔"

ابوحفص حداد نے جواب دیا "اب تم رَے چلے جاؤ اور وہاں یوسف بن حسین سے ملو، وہ جیسا کہیں، کرو۔"

عثمان نے حیرت سے پوچھا "آپ کچھ نہیں کر سکتے؟"

مرشد نے جواب دیا "اس مرض کا معالج وہی شخص ہے، تمھیں رَے کا سفر کرنا ہی پڑے گا!"

عثمان حیری بے چوں و چرا رَے روانہ ہو گئے۔ رَے پہنچ کر انھوں نے لوگوں سے یوسف بن حسین کا پتہ دریافت کیا "صاحبان! میں نیشاپور سے آیا ہوں اور یہاں کے مشہور بزرگ یوسف بن حسین سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں، براہِ کرم ان کا پتہ بتا دیں۔"

لوگ ہنسنے لگے۔ ایک شخص نے جواب دیا "یوسف بن حسین اور بزرگ!- یہ کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے تو تم خود بزرگ نظر آتے ہو۔ رہا یوسف کی بزرگی کا مسئلہ

تمھیں کسی نے غلط فہمی میں مبتلا کردیا ہے۔ وہ تو ایک ہی زندیق ہے خیریت اسی میں ہے کہ تم اسی وقت نیشاپور واپس چلے جاؤ اور یوسف سے ملنے کا خیال ہی اپنے دل سے نکال دو۔"

عثمان حیری شک و شبہے میں پڑ گئے۔ آپ نے عرض کیا "بھائی! مجھے ان کے پاس جس شخص نے بھیجا ہے وہ بذاتِ خود صاحبِ کمال بزرگ ہیں اور وہ میری غلط رہنمائی نہیں کرسکتے۔"

لوگوں نے طنزاً ہنسنا شروع کردیا اور بڑے دباؤ سے کہا "میاں جی! ہم آپ کو سمجھاتے ہیں کہ اس زندیق سے ملنے کا خیال اپنے دل سے نکال دیجیے ورنہ جو کچھ آپ کے پاس ہے وہ بھی چھن جائے گا۔"

عثمان حیری بہت ہی بددل ہوئے اور ان سے ملے بغیر ہی نیشاپور واپس چلے گئے۔ ابوحفص نے انھیں دیکھتے ہی پوچھا "کیا ہوا؟ یوسف نے کیا علاج بتایا؟"

عثمان حیری نے جواب دیا "حضرت! کیا عرض کروں؟ میں تو رے جاکر ایک مصیبت میں مبتلا ہوگیا۔"

ابوحفص نے پوچھا "کیا ہوا؟ مجھے صاف صاف بتاؤ۔"

عثمان حیری نے جواب دیا "میں جس شخص سے ملنے گیا تھا، اس کے ہم وطن تو اسے مسلمان تک نہیں سمجھتے، وہ اسے زندیق کہتے ہیں۔ میں اس زندیق سے مل کر اپنے دین و ایمان کو خطرے میں کیوں ڈالتا۔ میں اس سے ملے بغیر ہی واپس چلا آیا۔"

ابوحفص نے بہت افسوس کیا، بولے "یوسف کو میں پہچانتا ہوں یا رے والے؟ تم نے واپس آکر سخت غلطی کی۔ پھر جاؤ اور یوسف سے ملاقات کرو۔ رے کے لوگوں کو بکنے دو۔"

عثمان حیری نے شرمندگی سے سر جھکالیا۔ ابوحفص نے سختی سے کہا "کیا سوچنے لگے۔ جاؤ اور یوسف سے اپنی سوءِ ظنی کی معافی بھی چاہو۔ تم اس کے مرتبے کو ابھی نہیں سمجھتے۔"

عثمان حیری اسی وقت رے روانہ ہوگئے لیکن ایک خلش ایک تشویش، ایک الجھن اور ایک پریشان کن خیال انھیں برابر ستا رہا تھا۔ رے والے یوسف بن حسین کو زندیق کیوں کہتے ہیں؟ اگر یہ شخص دیندار ہے تو اس کی دینداری کا اس کے وطن والوں کو علم کیوں نہیں؟ آخر یہ کیسا شخص ہے جس نے اہالیانِ وطن میں بھی اپنا بھرم نہیں قائم کیا۔ آخر یہ شخص ہے کیسا؟ اور لوگ اسے زندیق کیوں کہتے ہیں؟

عثمان حیری ایک بار پھر رے میں داخل ہوگئے اور لوگوں سے پھر آپ کا پتہ دریافت کیا۔ لوگوں نے ایک بار پھر آپ کو دیکھ کر ہنسنا مسکرانا شروع کردیا۔ بولے "تمھیں تمھاری شامت ایک بار پھر اس زندیق کی طلب میں رے کھینچ لائی ہے!"

عثمان حیری نے جواب دیا "مجھے تم اس زندیق کا پتہ بتادو۔ میں اپنے دین اور ایمان کی پروا کیے بغیر یوسف سے ملنا چاہتا ہوں۔"

لوگوں میں سے ایک نے کہا "اگر یہ بات ہے تو آؤ میرے ساتھ میں تمھیں اس زندیق کے در پر چھوڑ کر واپس آجاؤں گا۔"

وہ شخص آپ کو اپنے ساتھ لیکر یوسف بن حسین کے گھر لیے چلا گیا اس وقت یوسف گھر کے باہر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے جام و صراحی رکھی تھی اور ان کی بغل میں ایک کمسن لڑکا بیٹھا تھا جو شخص انھیں لیکر گیا تھا، اس نے ادھر اشارہ کرتے ہوئے کہا "لو، دیکھ لو اس زندیق کا عالم۔ دیکھو کتنا بے حیا اور بُرا ہے یہ شخص۔ اسے تو دنیا کی ذرا سی بھی شرم نہیں۔"

عثمان حیری اپنے دل میں ایک بار پھر فکرمند ہوگئے کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے اور ابوحفص حداد اس بُرے آدمی کو کیوں پسند کرتے ہیں؟ وہ آدمی آپ کو یوسف کا دُور سے پتہ بتا کر چلا گیا۔ آپ آہستہ آہستہ دل شکستہ اور دل برداشتہ ان کے پاس پہنچے اور سلام کیا۔ یوسف نے سر اٹھا کر سوال کیا "بابا! تم کیسے آگئے ہم زندیقوں سے ملاقات کرنے؟"

عثمان حیری کبھی لڑکے کو دیکھتے اور کبھی جام و صراحی پر نظر ڈالتے۔

آپ نے ذرا ترشی سے پوچھا "تم اس بچے اور جام و صراحی کو کیا دیکھتے ہو میری طرف دیکھو، مجھ سے بات کرو۔"

عثمان حیری نے جواب دیا "میں خود نہیں آیا، کسی کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔"

یوسف نے کہا "بھیجے ہوئے تو پہلے بھی آئے تھے لیکن ملے بغیر ہی واپس چلے گئے تھے۔ وہی تو میں پوچھتا ہوں کہ اب کیوں ملنے آئے ہو مجھ جیسے انسان سے، میں تو زندیق ہوں۔"

عثمان حیری نے جواب دیا "میں تو آپ سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ زبانِ خلق تو کوئی چیز ہے آخر۔ آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ خود کو لوگوں کی نظروں میں ایسا بنالیں کہ وہ بے ہودہ گوئی ترک کرکے آپ کو نیک سمجھنا شروع کردیں۔"

آپ نے پوچھا "عثمان! تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

عثمان حیری نے جواب دیا "میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ آپ اگر کچھ ہیں تو کشف سے خود ہی معلوم کرسکتے ہیں، میں کیا بتاؤں؟"

آپ نے کہا "اچھا باتیں تو ہوں گی بعد میں، پہلے تو تم ہمیں اپنے ہاتھوں سے کچھ پلادو، پھر باتیں ہوں گی۔"

عثمان حیری نے پوچھا "کیا پلادوں؟"

انھوں نے جواب دیا "جو کچھ صراحی میں موجود ہے۔"

عثمان حیری کو تعمیل میں تامل ہوا لیکن یوسف نے سختی سے کہا "عثمان! اگر تم ابوحفص کے بھیجے ہوئے آئے ہو تو تمھیں میرے حکم کی تعمیل میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔ میں جو کہہ رہا ہوں، اس کی آنکھ بند کرکے تعمیل کرو۔"

عثمان حیری نے صراحی کی طرف جاتے ہوئے کہا "بہتر ہے، اگر آپ کی یہی منشا ہے تو میں شراب بھی آپ کو پلادوں گا۔"

انھوں نے جام سنبھالا اور صراحی سے اس میں کچھ انڈیلا اب تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ تو پانی تھا، صاف شفاف پانی۔ انھوں نے حیرت سے کہا "ارے یہ تو پانی ہے!"

یوسف نے جواب دیا "اور تم کیا واقعی شراب سمجھ رہے تھے؟"

عثمان حیری نے کہا "ایک میں ہی کیا، رے کا ہر شخص اسے شراب ہی سمجھتا ہے۔"

آپ نے کہا "عثمان! ایسے والوں کی بات مت کرو۔ انھیں آنکھیں ملی ہیں لیکن یہ اس سے حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے۔ انھیں کان ملے ہیں لیکن یہ لوگ اپنے کانوں میں پڑنے والی باتوں میں سے جھوٹ اور سچ کی تمیز نہیں کر سکتے لیکن ایک وہ شخص جو نیشاپور میں بیٹھا ہوا ہے وہ مجھے پہچانتا ہے اور اس نے تمھیں میرے پاس بھیجا ہے۔"

عثمان حیری نے لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "حضرت! اگر اس کی وضاحت بھی ہو جائے تو خوب ہو۔"

آپ نے اس لڑکے کا ہاتھ پکڑ کے کھڑا کر دیا اور اسے حکم دیا "صاحبزادے! ذرا اپنا تعارف تو کرا دو۔"

لڑکے نے جواب دیا "جناب! یہ میرے والد ہیں، میں ان کا بیٹا ہوں۔"

عثمان حیری کا شرم و ندامت سے برا حال ہو گیا۔

یوسف نے تقریر شروع کر دی، بولے "عثمان! یہ دنیا بڑی عجیب جگہ ہے۔ یہاں کسی حال میں بھی انسان کو چین نہیں ملتا۔ اگر دین دار بن کے رہو تو دنیا گھیر لیتی ہے اور چین نہیں لینے دیتی اور اگر زندیق بن کے بیٹھو تو لعنت ملامت کرتی ہے اور گالیاں دیتی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ انسان کس طرح زندہ رہے اور کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ تم خود ہی بتاؤ کہ خود کو دین دار جتا کے تم نے کون سا سکھ حاصل کر لیا ہے۔ تمھیں کون سا اطمینان مل گیا ہے۔ عالم یہ ہے کہ تمھارے پیروں تلے ایک آگ ہے جو تمھیں نیشاپور اور رے میں گھما پھرا رہی ہے۔ تم کسی جگہ پیر رکھ کر بیٹھ ہی نہیں سکتے کیونکہ جہاں بیٹھو گے پیروں تلے کی آگ تمھیں اٹھا کے کھڑا کر دے گی۔ تم اپنے معالج کی تلاش میں کبھی ابوحفص کے پاس جاتے ہو اور کبھی میرے پاس رے چلے آتے ہو۔ آخر اس دینداری کا فائدہ؟"

عثمان حیری آپ کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے اور پوچھا "اچھا اب مجھے یہ بتا دیجیے کہ جب خدا نے آپ کو اتنا شاندار مرتبہ عطا فرمایا ہے تو پھر یہ کیا ہے کہ صراحی اور جام سامنے رکھ کر اور لڑکے کو اپنے پہلو میں بٹھا کر لوگوں کو بدگمان کیوں کرتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "تاکہ لوگ مجھے خالص اور پکا دیندار سمجھیں اور اپنی ترکی کنیز میرے حوالے کر کے آزمائش میں نہ ڈالیں۔"

عثمان حیری کا دل دہل گیا اور وہ لرز گئے۔ آنکھیں بھر آئیں اور دل پگھلنے لگا۔ روتے ہوئے بولے "آپ نے بالکل بجا فرمایا لیکن میں جس غرض سے آپ کے پاس آیا ہوں اب اس کا علاج بھی بتا دیجیے۔"

آپ نے جواب دیا "اس کا علاج تو یہ ہے کہ تم اپنے [illegible] اور تقویٰ کا ترکی کنیز سے معاملہ نہ کرو۔ اگر تم اس کے مقابلے میں [illegible] ہو تو پھر دینداری اور تقوے کو چھوڑ کر دنیادار بن جاؤ اور [illegible] مرد میداں بننا چاہتے ہو تو اسے مردانہ وار قبول کرو اور تحمل اور [illegible] اس آزمائش پر پورے اترو۔"

عثمان حیری کے دل پر یوسف کی باتیں تازیانے کی طرح [illegible] تھیں۔ انھوں نے کہا "میں نے آپ کی باتیں گرہ میں باندھ لیں۔ مجھے اور نصیحتیں فرمایئے تاکہ کام آئیں۔"

آپ نے جواب دیا "عثمان! میں سیدھی سادی باتیں جانتا ہوں۔ تم انھیں ذہن نشین کر لو۔ یاد رکھو، دنیا سے سب سے زیادہ رغبت رکھنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس کی برائیاں دنیاداروں کے سامنے بیان کرتے ہیں۔ عثمان! میں نے صوفیوں کی آفتوں کو سمجھنا چاہا تو معلوم ہوا، یہ حضرات اضداد کے میل جول سے تباہ ہوتے ہیں اور یہی کسر عورتوں کی طرف ان کا حد سے زیادہ میلان پوری کر دیتا ہے۔ عثمان! کیا تمھیں معلوم ہے کہ طغیان کسے کہتے ہیں؟"

عثمان حیری نے پوچھا "آپ ہی ارشاد فرمائیں!"

آپ نے جواب دیا "ایک طغیان تو یہ ہے کہ دنیا حد سے گزر جائے۔ دوسرا طغیان علم کا ہوتا ہے۔ جو شخص یہ چاہے کہ علم کے طغیان سے رہائی حاصل کرے، اس کو عبادت کی پابندی کرنا چاہیے اور جو مال کے طغیان سے مخلصی چاہے، اس کو زہد اختیار کرنا چاہیے۔ ادب سے تم علم کو سمجھو گے۔ علم سے تمھارا عمل درست ہو گا۔ عمل سے تمھیں حکمت ملے گی، حکمت سے زہد پاؤ گے، زہد سے دنیا چھوڑ دو گے۔ دنیا چھوڑ دو گے تو تم کو آخرت کی رغبت ہو گی اور آخرت کی رغبت سے اللہ کی خوشنودی ہاتھ آئے گی۔"

عثمان حیری جب نیشاپور واپس پہنچے تو ان کے مرشد ابوحفص حداد نے دریافت کیا "یوسف سے مل آئے؟"

عثمان نے جواب دیا "مل آیا۔"

ابوحفص نے پوچھا "وہ زندیق کیسا نکلا؟"

عثمان نے شرمندگی سے جواب دیا "میں اپنی سوءِ ظنی پر نادم ہوں۔ وہ تو بے مثل اور یگانہ انسان ہیں۔"

ابوحفص نے پوچھا "ترکی کنیز کی بابت کیا فرمایا؟"

جواب دیا "کہتے تھے اس شیطانی جذبے کا مردوں کی طرح مقابلہ کرو۔"

ابوحفص نے کہا "یوسف نے درست ہی کہا۔ اگر یہی بات میں اپنے سیدھے سادے انداز میں کہتا تو اس کا تم پر وہ اثر نہ ہوتا جو اب ہو گا۔"

انتقال کے وقت آپ نے خدا سے دعا کی۔

"اے اللہ میں قول سے مخلوق کو اور فعل سے نفس کو نصیحت کیا کرتا تھا لیکن اب میں تجھ سے یہ التجا کرتا ہوں کہ مخلوق کی نصیحت کے معاوضے میں تو میرے نفس کی خیانت کو معاف کر دے۔"

آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے دنیا میں برائی کو بھلائی کے ساتھ کبھی بھی مخلوط نہیں ہونے دیا۔

❋❋❋❋



ضیا تسنیم بلگرامی







بلخ کے مشہور صوفی حضرت شفیقؒ بلخی کے آس پاس مریدوں کا ہجوم رہتا تھا۔ آپؒ ان سب کی تعلیم و تربیت فرماتے رہتے تھے۔ آپؒ ان میں سے کسی نہ کسی کو طلب فرماتے اور پوچھتے کہ "تم میری صحبت میں کتنے عرصے سے رہ رہے ہو؟"

کوئی کہتا۔ "پچیس سال سے" کسی کا جواب ہوتا "تیس سال سے۔"

پھر آپؒ اس سے یہ معلوم کرتے کہ اس عرصے میں تم نے مجھ سے کیا حاصل کیا؟ کیا سیکھا؟

ادھر سے جو جواب ملتا، اگر آپؒ اس سے مطمئن ہو جاتے تو آپؒ اسے اپنے پاس سے رخصت فرماتے اور اگر مطمئن نہ ہوتے تو کچھ عرصے کے لیے اور روک لیتے اور مرید کی اصلاح و تربیت کی کمی دور فرمانے لگتے۔

ایک دن شفیقؒ بلخی اپنے مریدوں سے اسی قسم کے سوالات کر رہے تھے کہ ایک مرید کے جوابات نے آپؒ کو چونکا دیا۔ اس مرید کا نام حاتمؒ اور کنیت ابوعبدالرحمٰن بلخی۔ ان کے باپ کا نام جلوان تھا اور یہ اپنے پیر و مرشد کی طرح بلخ ہی کے باشندے تھے۔ شفیقؒ بلخی اپنے مریدوں سے سوالات کرتے جاتے تھے اور ان کے جوابات کے مطابق اپنے فیصلوں کا اعلان فرما دیتے تھے۔ کئی مریدوں کے بعد حاتمؒ کا نام پکارا گیا۔

"حاتمؒ بن جلوان! تم میرے سامنے آؤ۔"

حاتمؒ اپنے پیر و مرشد کے روبرو ادب سے جا کھڑے ہوئے۔ ان کی نگاہیں پیروں کے انگوٹھوں پر جمی ہوئی تھیں۔

مرشد نے پوچھا۔ "ابن جلوان! تمھیں میرے پاس رہتے ہوئے کتنا عرصہ گزر گیا؟"

ابن جلوان نے جواب دیا۔ "تینتیس ۳۳ سال!"

مرشد نے ایک دم چونک کر ابن جلوان کا جواب دہرایا۔ "تینتیس سال۔ یعنی تم میرے سوال کا جواب پورے ہوش و حواس سے دے رہے ہو؟"

ابن جلوان نے کہا۔ "پیر و مرشد! میں جھوٹ سے طبعاً نفرت کرتا ہوں۔ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے پورے ہوش و حواس کی درستگی کے ساتھ عرض کیا ہے۔"

پیر و مرشد نے حیرت سے پوچھا۔ "اور تم نے اس طویل عرصے میں حاصل کیا کیا؟ یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے۔"

انھوں نے سر جھکا کر عاجزی سے جواب دیا۔ "صرف آٹھ مسئلے۔"

شفیقؒ بلخی نے اپنا سر پکڑ لیا، بولے۔ "اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ تم نے تو کمال کر دیا حاتمؒ ابن جلوان! تینتیس سال میں صرف آٹھ مسئلے! میں سمجھتا ہوں تمھاری عمر ضائع ہو گئی۔"

حاتمؒ نے جواب دیا۔ "پیر و مرشد! جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا، فی الواقع میں نے کل آٹھ مسئلے ہی حاصل کیے ہیں بقیہ کا علم اسی وقت حاصل کروں گا جب میں ان پر پوری طرح عمل کر سکوں گا۔"

شفیق بلخی نے دریافت کیا۔ "اچھا تو وہ کون سے آٹھ مسائل ہیں ذرا میں بھی تو سنوں۔"

حاتمؒ نے جواب دیا۔ "پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ ان میں ہر شخص کسی خاص شے کو محبوب بنا لیتا ہے۔ یہ محبوب شے مرتے وقت تک اس کے ساتھ رہتی ہے لیکن جب رشتۂ حیات منقطع ہو جاتا ہے تو وہ اپنی محبوب شے سے جدا ہو جاتا ہے لیکن میں نے اچھے اعمال کو اپنا محبوب بنا لیا ہے جو مرنے کے بعد بھی میرے ساتھ رہیں گے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے جب یہ آیت پڑھی 'وَاَمّا مَن خافَ مقامَ ربّہٖ ونَهی النّفس عن الھویٰ فاِنّ الجنّۃ ھی الماویٰ' تو میں نے اس آیت پر غور کیا اور اپنے نفس کی خواہشات پر قابو پانے کی عادت ڈال لی اور یہاں تک کہ میرا نفس اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں راسخ ہو گیا۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے لوگوں کو آپس میں حسد کرتے دیکھا، میں نے اس معاملے میں اللہ سے رہنمائی چاہی تو میں نے قرآن پاک میں دیکھا، 'نحنُ قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیٰوۃ الدّنیا' ہم نے لوگوں میں ان کی معاشی ضروریات کو تقسیم کیا۔ میں نے اللہ کے اس حکم کو بڑی مضبوطی سے

دل میں بٹھالیا اور حسد سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ میں نے سوچا کہ جب قسمت، اللہ کے ہاتھ میں ہے تو اس کی مخلوق سے حسد کیوں کیا جائے۔

چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے ہر شخص کو کسی نہ کسی پر بھروسا کرتے ضرور دیکھا۔ کوئی مال پر بھروسا کرتا ہے کوئی تجارت پر، کسی نے زمین پر اور کسی نے اپنے ہنر پر بھروسا کر رکھا ہے، یہاں تک کہ ایسے لوگ بھی مل جائیں گے جو اپنی صحت بدنی پر بھروسا کرتے نظر آئیں گے۔ جب میں نے اس بارے میں خدا کے کلام سے رہبری چاہی تو مجھے حکم ملا "ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ" (جو اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے کافی ہے) اب میں نے اپنے اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسا کر رکھا ہے۔

پانچواں مسئلہ یہ ہے کہ میں نے لوگوں کو اپنے حسب نسب، مال و زر اور جاہ و منصب پر ناز کرتے دیکھا۔ میں نے قرآن پاک میں پڑھا، اس میں موجود ہے "اِنَّ اکرمکم عنداللہ اتقاکم" (اللہ کے نزدیک سب سے بہتر وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے) چنانچہ میں نے تقویٰ اختیار کر لیا تاکہ حق تعالیٰ کے نزدیک میں بہتر قرار پاؤں۔

چھٹا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے لوگوں کو دیکھا، ان میں ہر شخص روٹی کے چند ٹکڑوں کے لیے اپنے نفس کو ذلیل کرتا ہے اور ایسے ایسے کام کر گزرتا ہے جو ناجائز ہوتے ہیں حالانکہ اللہ کا ارشاد ہے "ومامن دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا" (کوئی بھی جاندار نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو) میں نے سوچا کہ میں بھی تو اس کی مخلوق ہی میں شامل ہوں اور جب اللہ تعالیٰ کے ذمے ہی میرا رزق ہے تو میں کیوں پریشان ہوں۔ میں نے ادھر ادھر کی بھاگ دوڑ ترک کر دی۔

ساتواں مسئلہ یہ ہے کہ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنی قیمتی چیزوں کی خوب اچھی طرح دیکھ بھال اور حفاظت کرتے ہیں، اسی کے ساتھ میں نے قرآن پاک میں دیکھا "ماعندکم ینفد وما عنداللہ باق" (تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ سب ختم ہو جائے گا اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہے گا) چنانچہ میں نے اپنی دانست میں جس چیز کو قیمتی پایا اسے اللہ کی طرف پھیر دیا تاکہ اس کے پاس محفوظ رہے۔

آٹھواں مسئلہ یہ ہے کہ میں نے لوگوں کو دیکھا زمین پر فساد پھیلاتے پھرتے ہیں اور ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں، میں نے پھر کلامِ الٰہی کی طرف رجوع کیا تو اس میں پایا "اِنَّ الشیطان لکم عدو فاتخذوہ عدواً انما یدعوا حزبہ لیکونوا من اصحاب السعیر" (شیطان تمہارا دشمن ہے اس کو دشمن سمجھو وہ اپنے گروہ کو اس کی طرف بلاتا ہے تاکہ دوزخی ہو جائے) چنانچہ میں نے شیطان کو اپنا دشمن سمجھ لیا اور باقی مخلوق کی عداوت ترک کر دی۔"

شفیق بلخیؒ نے حاتمؒ کو سر سے پیر تک دیکھا اور کہا "حاتمؒ! اللہ تم پر فضل کرے، میں نے تمام کتب سماوی پر غور کیا تو ان سب کی اصل یہی آٹھ مسئلے پائے ہیں، دوسرے تمام مسائل انہی آٹھ مسئلوں کی شاخیں ہیں۔ اب تم جا سکتے ہو تمہیں مزید تعلیم و تربیت کی ضرورت نہیں باقی رہی۔"

حاتمؒ نے اپنے پیر و مرشد سے علیحدگی اختیار کی اور یادِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ آپؒ کے پاس لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ لوگ آتے اور مختلف مسائل پر باتیں کر کے تسلی و تشفی حاصل کرتے۔ آپؒ وعظ بھی فرمایا کرتے تھے۔ آپؒ کے وعظ میں بڑا ہجوم رہنے لگا۔ ایسا لگتا گویا پورا بلخ سمٹ آیا ہے۔ اسی طرح آپؒ وعظ فرما رہے تھے اور مجلس میں ہر قسم کے لوگ موجود تھے۔ ان میں امراء بھی تھے اور غرباء بھی۔ تجارت پیشہ بھی تھے اور اہل حرفہ بھی۔ دستکار بھی تھے کاشتکار بھی۔ چور بھی تھے اچکے بھی، رہزن بھی تھے اور جعلساز بھی۔ نیک بھی تھے اور برے بھی۔ آپؒ کے وعظ سے ہر کوئی متاثر تھا اور انہماک کا یہ عالم تھا کہ دلوں کی دھڑکنیں سنی جا سکتی تھیں۔ آپؒ نے دوران وعظ آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا "خدایا! میں اپنے لیے تجھ سے کچھ بھی نہیں چاہتا لیکن یہ لوگ جو میری مجلس میں میری باتیں سننے آئے ہیں، تیرے عفو و کرم کے مستحق ہیں، ان پر رحم فرما، اور ان میں جو سب سے زیادہ گناہگار ہو اس کے گناہ معاف فرما دے۔"

مجلس کا ہر شخص خود کو سب سے بڑا گناہگار سمجھ رہا تھا اور اپنی بخشش کی توقع میں خوش ہو رہا تھا! انہی میں ایک کفن چور بھی تھا، اس نے آپؒ کی تقریر اور دعا کا یہ اثر لیا کہ مجلس سے نکل کر ہنسنے لگا، بولا۔ "اُن کی ساری باتیں تو سمجھ میں آ گئیں لیکن ان کی دعا کا مطلب میں بالکل نہیں سمجھا، یہ کس قسم کی دعا تھی اور اس کی قبولیابی سے کسی گناہگار کے گناہ کس طرح معاف ہو سکتے ہیں!"

ایک دوسرے شخص نے جواب دیا "ان کا مذاق نہ اڑاؤ، یہ مستجاب الدعوات ہیں اور ان کی دعائیں بے اثر نہیں ہوتیں۔" پھر پرخیال انداز میں کہنے لگا "معلوم نہیں وہ کون خوش قسمت ہوگا، جس کے حق میں یہ دعا کارگر رہی ہوگی۔"

کفن چور مذاق اڑاتا ہوا چلا گیا۔ وہ سیدھا قبرستان پہنچا اور جائزہ لینے لگا کہ کتنی نئی قبریں تیار ہو رہی ہیں اور آج کی شب کتنے کفن ہاتھ لگیں گے۔ اس نے دیکھا کئی قبریں کھد رہی ہیں اور یہ ساری قبریں بڑی تھیں۔ اسے یاد آیا کہ ایک دن میں اتنی قبریں کبھی بھی نہیں کھدی تھیں، یہ سوچ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ ایک ہی رات میں کئی کفن ہاتھ لگیں گے بڑا مزہ رہے گا۔

اس رات شاید تاریکی اور دنوں سے زیادہ تھی۔ ابر آلود آسمان پر ستارے غائب تھے، وہ اٹکل سے اس قبر کی طرف بڑھا جو اس کی راہ میں پہلے پڑ رہی تھی۔ قبر کی تازہ بھربھری مٹی اس کے پیر کی ٹھوکر سے ادھر ادھر بکھرنے لگی۔ وہ قبر کے پاس کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر کھڑا

سوچتا رہا، آخر قبر کے سرہانے سے اس نے مٹی کھسکانا شروع کردی۔

ابھی وہ سرہانے کی مٹی ہٹا ہی رہا تھا کہ اسے قبر کے اندر سے ایک سایہ سا نکلتا دکھائی دیا۔ کفن چور ڈر گیا! اس نے آنکھیں مل کر اس سائے کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کے سامنے سفید چادر میں لپٹا ہوا ایک شخص کھڑا تھا۔ کفن چور نے بھاگنا چاہا لیکن اس شخص نے چور کا ہاتھ پکڑ لیا، پوچھا "تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

کفن چور کی گھگی بندھ گئی، اٹک اٹک کر بولا "خدا کے لیے مجھے معاف کردو، اب میں نہیں آؤں گا۔ اب میں یہ کام نہیں کروں گا۔"

اس شخص نے افسوس سے کہا "بدبخت! میں تجھے کیا معاف کروں گا، تجھے تو خدا معاف کرچکا ہے۔ میں تو تجھے یہ بتانے آیا تھا کہ تو کتنا بدقسمت انسان ہے کہ خدا نے تجھے حاتمؒ کی دعا پر آج ہی معاف کیا تھا اور تیرے گناہ بخش دیے تھے اور تو ہے کہ پھر گناہ کرنے آگیا۔ کیا تجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ حاتمؒ کی مجلس کا گناہگار ترین انسان تو ہی تھا۔"

کفن چور کا پورا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ اسے کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا! اس وقت وہ اپنے خیالوں میں حاتمؒ کی مجلس سجائے بیٹھا تھا۔ اس کے کانوں میں حاتمؒ کی آواز گونج رہی تھی "خدایا! میں اپنے لیے تجھ سے کچھ نہیں مانگتا لیکن یہ لوگ جو میری مجلس میں میری باتیں سننے آئے ہیں، تیرے عفو و کرم کے مستحق ہیں، ان پر رحم فرما اور ان میں جو سب سے زیادہ گناہگار ہو اس کے گناہ معاف فرمادے۔"

کفن چور کے منہ سے چیخ نکل گئی "حاتمؒ! میرے بزرگ میرے سردار! اب میں یہ کام نہیں کروں گا، مجھے ایک بار اور معاف کرادو، میں بہت شرمندہ اور نادم ہوں۔"

اس کے بعد جو اس نے اس شخص کو مخاطب کرنا چاہا جس نے اس کفن چور کا ہاتھ پکڑ لیا تھا لیکن اب وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ وہ ایک نئی قبر کے سرہانے سے ذرا سی کھلی قبر پر تنہا بیٹھا تھا۔ اندر ایک طوفان برپا تھا جس نے اس کے پورے وجود کو ہلا رکھا تھا۔ ذرا سی دیر میں اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور ہوگیا۔ وہ ٹھوکروں کی پروا کیے بغیر ہی اندھیرے میں اس سمت دوڑنے لگا، جدھر حاتمؒ کی قیامگاہ تھی۔ وہ راستے میں کئی جگہ گرا اور جسم کئی جگہ سے زخمی بھی ہوگیا، لیکن زخموں کی پرواہ کیے بغیر وہ مسلسل بھاگتا رہا یہاں تک کہ وہ حاتمؒ کے حجرے کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے بند حجرے کے در کو زور زور سے تھپتھپایا، اندر سے آواز آئی ——

"کون ہے؟"

کفن چور نے رقت زدہ آواز میں جواب دیا "آپ کی آج کی مجلس کا گناہگار ترین انسان!"

حجرے کا دروازہ کھل گیا، اندر موم کی شمع روشن تھی اور اس کی مدھم روشنی میں اسے حاتمؒ اپنے پاس کھڑے دکھائی دیے۔ آپؒ نے پوچھا "تو کون ہے اور یہاں کیا لینے آیا ہے؟"

کفن چور نے پورا واقعہ سنایا اس کے بعد کہا "اب میں تائب ہوچکا ہوں اور آپؒ کے قدموں میں اپنی پوری زندگی گزار دینا چاہتا ہوں، خدا کے لیے مجھے مایوس نہ کیجیے گا۔"

آپؒ نے اسے ایک طرف بیٹھ جانے کا اشارہ کیا، جب وہ بیٹھ گیا تو آپؒ نے دریافت کیا "کیا تو نے واقعی اپنے پیشے سے توبہ کرلی ہے؟"

کفن چور نے عاجزی سے جواب دیا "ہاں اور جس طرح فرمایئے میں یقین دلانے کو تیار ہوں۔"

آپؒ فوراً ہی سجدے میں گر گئے اور عاجزانہ خدا سے عرض کیا "میرے مولا، میرے ستار العیوب اور غفار المعاص! میں تیرا کس زبان سے شکریہ ادا کروں کہ تو نے اس گناہگار کے نہ صرف گناہ معاف کردیے بلکہ آیندہ کے لیے اسے تائب بھی کردیا۔"

آپؒ روتے گڑگڑاتے رہے اور اپنا سر سجدے میں رگڑتے رہے۔

آخر کفن چور آپؒ کے مریدوں میں شامل ہوگیا اور شب و روز عبادت و ریاضت میں مشغول ہوگیا۔

کسی مرید نے آپؒ کو مطلع کیا "حضرت! ایک عورت آپؒ سے کوئی مسئلہ پوچھنے آئی ہے اگر اجازت دیں تو اسے آپؒ کی خدمت میں حاضر کردیا جائے۔"

"حاضر کردو!"

مرید واپس گیا اور کچھ ہی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ پھر آگیا۔ آپؒ نے اس عورت سے نظر تک نہ ملائی، پوچھا "ہاں تو بی بی اب بتایئے آپ کا کیا کام ہے مجھ سے؟"

عورت نے جواب دیا "حضرت! میں ایک مسئلہ لیکر حاضر ہوئی ہوں کہ اگر میں کسی . . . . ."

عورت کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی لیکن آواز نکلنے سے پہلے ہی بادِ مخالف (ریح) خارج ہوگئی! اپنی اس حرکت پر عورت بے حد نادم ہوگئی۔ حاتمؒ نے اس کی شرمندگی محسوس کرلی، ذرا زور سے بولے "ہاں تو خاتون آپ کیا کہہ رہی تھیں۔ میں آپ کی بات نہیں سن سکا، کیونکہ میں بہرا ہوں اور دھیمی آوازیں نہیں سن سکتا۔"

عورت کی جان میں جان آئی، ٹٹول کر مزید اطمینان حاصل کرنا چاہا "تو جناب آپ نے بتایا نہیں کہ میں کیا کروں؟"

آپؒ عورت کی صورت اس طرح دیکھنے لگے، گویا عورت کی بات سنی ہی نہ ہو، ذرا زور سے بولے "تو کیا کہہ رہی ہے اے عورت، ذرا زور سے بول۔"

"کیا آپ واقعی میری بات نہیں سن سکے؟"

آپؒ نے جواب دیا "عورت! مجھے پریشان نہ کر، ذرا زور سے اپنا مدعا بیان کر۔"

عورت کو یقین ہوگیا کہ حاتمؒ اس کی ریح کی آواز نہیں سن سکے ہیں، وہ مزے میں آپؒ سے گفتگو کرنے لگی۔ اس کے بعد آپؒ نے خود کو مستقلاً بہرا بنالیا۔ آپؒ کے پاس جو بھی آتا آپؒ اس سے بہرا بن کے گفتگو فرماتے۔ آخر لوگوں نے آپؒ کو حاتمؒ اصم کہنا شروع کردیا یعنی حاتمؒ بہرا۔ اصم کا مطلب ہی بہرا ہے۔

آپؒ کسی کی دعوت قبول نہیں کرتے تھے، جو بھی دعوت کرتا آپؒ نہایت ہوشیاری سے ٹال جاتے لیکن ایک شخص آپ کے پیچھے ہی پڑگیا، بولا "حضرت! میں اس وقت تک آپؒ کا پیچھا کیے رہوں گا جب تک آپؒ میری دعوت قبول نہ کرلیں گے۔"

آپؒ نے پوچھا "لیکن تو میری دعوت کیوں کرنا چاہتا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا "میرا دل اس میں بڑی خوشی محسوس کرتا ہے کہ آپؒ اس ناچیز کی دعوت قبول فرمالیں۔"

آپؒ نے کہا "اچھا، اگر تو اس میں خوشی ہی محسوس کرتا ہے تو میں تین شرطوں پر تیری دعوت قبول کرلوں گا!"

اس شخص نے دریافت کیا "آپؒ کی تین شرطیں کیا ہونگی؟"

آپؒ نے جواب دیا "پہلی شرط تو یہ ہوگی کہ میں جہاں چاہوں بیٹھوں، تو میرے لیے کسی خاص جگہ کی قید نہیں لگائے گا۔"

اس شخص نے کہا "مجھے آپؒ کی یہ پہلی شرط منظور ہے، اب اپنی دوسری شرط بتائیے۔"

آپؒ نے جواب دیا "میری دوسری شرط یہ ہے کہ میں جو چاہوں گا کھاؤں گا، کسی خاص چیز کے کھانے پر اصرار نہیں کرے گا۔"

ارادت مند نے کہا "مجھے آپ کی یہ دوسری شرط بھی منظور ہے، تیسری شرط بتائیے۔"

آپؒ نے جواب دیا "میری تیسری شرط یہ ہے کہ تجھے میرے کہنے پر عمل کرنا ہوگا۔"

مرید نے کہا "مجھے آپؒ کی یہ تیسری شرط بھی منظور ہے۔"

اس کے بعد آپؒ اس شخص کے گھر تشریف لے گئے تو پتہ چلا اس نے آپؒ کے اعزاز میں دوسروں کو بھی مدعو کرلیا ہے، جب آپؒ اس کے گھر پہنچے تو سارے لوگ احتراماً کھڑے ہوگئے اور آپؒ کو سب سے اچھی جگہ کی پیشکش کی لیکن آپؒ ان سب کے جوتوں کے پاس بیٹھ گئے۔

آپؒ کے ارادت مند نے کہا "حضرت! آپ یہ کیا غضب کررہے ہیں۔ یہ کہاں بیٹھ گئے ہے؟"

آپؒ نے جواب دیا "میری پہلی شرط ہی یہ تھی، اب تو خاموش رہے گا۔"

وہ شخص چپ ہورہا۔

آپؒ نے اپنے پاس سے دو روٹیاں نکالیں اور کھانے لگے۔ صاحبِ خانہ برداشت نہیں کرسکا، نہایت دکھ سے بولا "حضرت! یہ آپ کیا کررہے ہیں، میں نے تو آپ کے اعزاز میں نہایت لذیذ اور اعلیٰ قسم کے کھانے پکوائے ہیں۔ آپ ان کے بجائے اپنی روکھی پھیکی روٹیاں کھارہے ہیں، آخر یہ کیوں؟"

آپؒ نے جواب دیا "میری یہ دوسری شرط بھی تو مان چکا ہے اس لیے اب خاموش رہ۔"

روٹیاں کھاچکنے کے بعد آپؒ نے حاضرینِ محفل کی طرف دیکھا، وہ مرغن اور لذیذ کھانوں پر دشمنوں کی طرح ٹوٹ پڑے تھے اور جلدی جلدی اس کا صفایا کرنے میں مشغول تھے۔ آپؒ ان کی جلد بازی اور بے صبرے پن کو غور سے دیکھتے رہے۔ جب یہ لوگ کھاچکے تو آپؒ نے میزبان سے کہا "اے میاں! ذرا گرم گرم توا تو لانا۔"

میزبان آپؒ کی عجیب و غریب خواہش پر آپؒ کی شکل دیکھنے لگا، پوچھا "حضرت! یہ گرم گرم توا کیا کیجیے گا؟"

آپؒ نے جواب دیا "تو مجھے سوال جواب نہیں کرے گا۔ میں جو کہوں گا تو اس کی تعمیل کرے گا کیونکہ میری تیسری شرط ہی یہ تھی۔"

میزبان نے بے بسی سے پوچھا "توا کتنا گرم ہونا چاہیے؟"

جواب دیا "بالکل سرخ، لال لال۔"

میزبان نے آگ پر توے کو سرخ کیا اور آپ کے روبرو لے آیا۔ آپؒ اس توے پر کھڑے ہوگئے اور حاضرین سے کہا "لوگو! میں نے صرف دو روٹیاں کھائی ہیں۔"

کچھ لوگوں نے جواب دیا "بیشک، مگر آپ کا اس سے مطلب؟"

آپؒ نے کہا "اور تم سب نے بڑے بڑے مزے کے کھانے کھائے ہیں!"

لوگوں نے جواب دیا "یہ بھی درست ہے مگر ان باتوں کا مطلب؟"

آپؒ نے کہا "کیا تم لوگ اس عقیدے پر ایمان رکھتے ہو کہ قیامت میں ہر شے کا محاسبہ ہوگا؟"

لوگوں نے جواب دیا "بحمداللہ۔ ہمارا اس پر ایمان ہے۔"

آپؒ نے کہا "اگر تم سب کا اس پر ایمان ہے کہ قیامت میں ہر شے کا محاسبہ ہوگا تو تمھیں اس جلتے تپتے توے پر کھڑا ہوجانا چاہیے، بالکل اسی طرح، جس طرح میں کھڑا ہوں۔"

لوگوں نے عرض کیا "حضرت! یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔"

آپؒ نے قدرے طیش میں فرمایا "تب پھر جو چیز تمھارے بس کی نہیں اس کا خطرہ کیوں مول لیتے ہو۔ تم نے خوب اچھی اچھی لذیذ مرغن

غذائیں کھائیں اور عالم یہ ہے کہ تمھاری یہ غذائیں تم میں اتنی قوت اور برداشت پیدا کر سکیں کہ تم میری طرح اس جلتے تپتے توے پر کھڑے ہو جاؤ، تو ذرا سوچو تو کہ جب تم اس عمل سے اس وقت کا حساب نہیں دے سکتے تو آگ سے بنی ہوئی محشر کی زمین پر کھڑے ہو کر تمام عمر کا حساب کس طرح دو گے؟" پھر آپؒ نے قرآنی آیت سنائی "ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم (قیامت کے دن تم سے تمام نعمتوں کی باز پرس ہوگی)"

آپؒ کا انداز بیان اتنا سحر انگیز اور مصورانہ تھا کہ میدان حشر نظروں کے سامنے آگیا۔ اہل مجلس مضطرب ہو کر زار و قطار رونے لگے۔

آپؒ کے پاس مجلس میں ایک دولت مند بھی آتا رہتا تھا۔ اس نے محسوس کیا، آپؒ کی معاشی حالت بڑی سقیم ہے، وہ آپؒ سے بات کرنے کا موقع تلاش کرتا رہتا تھا لیکن ہر وقت مریدوں اور ارادتمندوں کا ہجوم دیکھ کر زبان بند رکھتا تھا۔ آخر ایک دن وہ آپؒ کے حجرے میں گھس گیا اور آپؒ کو تنہا دیکھ کر کہنے لگا "حضرت! میں آپؒ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

اسی وقت ایک ارادتمند بھی حجرے میں آگیا۔ دولت مند نے اسے دیکھ کر اپنی زبان بند کر لی۔ آپؒ نے کہا "ہاں ہاں کہو کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

دولت مند نے آپؒ کے ارادت مند کی طرف دیکھ کر نظریں جھکالیں، بولا "ذرا دیر بعد عرض کروں گا، تخلیے میں۔"

آپؒ نے جواب دیا "شرماؤ مت، یہاں کسی سے کوئی پردہ نہیں، جو کچھ کہنا ہے برملا، صاف صاف کہہ دو۔"

اس شخص نے سرگوشی میں کہا "حضرت! میں آپ کی سقیم معاشی حالت دیکھ کر آپؒ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں، آپؒ مجھے اس کا موقع دیجیے۔"

آپؒ نے قدرے سکوت اختیار کیا، پھر بولے "میں تیری مدد شکریے کے ساتھ قبول کر لیتا لیکن اس میں چند قباحتیں ہیں اگر کسی طرح وہ دور ہو جائیں تو میں تیری اعانت بے چوں و چرا قبول کر لوں گا۔"

دولت مند نے خوش ہو کر جواب دیا "آپؒ ان قباحتوں کی وضاحت فرمائیے میں کوشش کروں گا کہ انھیں دور کر دوں۔"

آپؒ نے کہا "پہلی قباحت تو یہ ہے کہ تو کئی دنوں سے تخلیے کا متلاشی تھا کہ چھپ کر میری مدد کرے اس طرح میں لوگوں کی نظروں میں خواری سے بچ جاؤں گا، میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ میں تیری مدد عزت آبرو کے ساتھ قبول کر سکوں، یعنی تو میری مدد سب کے سامنے بھی کرے اور میری بے عزتی بھی نہ ہو۔"

دولت مند نے جواب دیا "یہ بہت مشکل ہے، شاید ناممکن بھی۔"

آپؒ نے کہا "لیکن میرا خدا تو سب کے سامنے میری مدد فرماتا رہتا ہے اور میں لوگوں میں ذلیل و خوار نہیں ہوتا۔"

دولت مند نے پوچھا "اور دوسری قباحت کیا ہے؟"

آپؒ نے جواب دیا "دوسری قباحت یہ ہے کہ جب تک تو زندہ ہے میری مدد کرتا رہے گا لیکن جب تو مر جائے گا تو میری مدد کس طرح کرے گا؟"

دولت مند نے کہا "پھر اللہ کوئی اور صورت پیدا کر دے گا۔"

آپؒ نے فوراً کہا "لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ تیرے بعد میں خدا سے یہ کہوں کہ خدایا میرا زمین کا رزاق تو مر گیا اب تو میری معاشی ضروریات پوری کر۔"

دولت مند شرمندہ ہو کر چلا گیا۔

ایک آتش پرست آپؒ کو دور سے دیکھا کرتا تھا اور آپؒ سے سخت نفرت کرتا تھا۔ وہ کسی ایسے موقعے کی تلاش میں تھا جب وہ اپنی باتوں سے حاتم اصم کو قائل اور خاموش کر سکتا لیکن اس کا موقع نہیں مل رہا تھا، لیکن ایک دن وہ آپؒ سے الجھ ہی گیا، پوچھا "جناب! میں حیران ہوں کہ آپؒ کو رزق کہاں سے ملتا ہے؟"

آپؒ نے جواب دیا "خدا کے خزانے سے۔"

آتش پرست نے منہ بنا کر کہا "افسوس کہ آپؒ لوگوں کو فریب دے دے کر رزق حاصل کرتے ہیں۔"

آپؒ نے اس سے سوال کیا "سچ بتا کیا میں نے تجھ سے بھی کبھی کوئی رقم لی ہے؟"

آتش پرست نے جواب دیا "نہیں۔ آپؒ نے مجھ سے کوئی رقم نہیں لی۔"

آپؒ نے نہایت دل سوزی سے کہا "اے کاش تو مسلمان ہو جاتا۔"

آتش پرست نے مذاق اڑایا "آپؒ تو ہمیشہ کج بحثی پر اتر آتے ہیں۔"

آپؒ نے جواب دیا "میں تو اس لیے حجت پیش کر رہا ہوں کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں سے حجت طلب کرے گا۔"

آتش پرست نے کہا "جناب یہ ساری کہنے کی باتیں ہیں میں نہیں مانتا۔"

آپؒ نے غصے میں کہا "تو ان احکامات کو باتوں سے تعبیر کر رہا ہے جن احکام کی رو سے تیری ماں تیرے باپ پر حلال ہوئی۔"

آتش پرست نے شرمندہ ہو کر سوال کیا "کیا آپؒ کو رزق آسمان سے ملتا ہے؟"

آپؒ نے جواب دیا "ایک مجھے ہی کیا، پوری دنیا کے لیے آسمان ہی سے رزق نازل ہوتا ہے۔"

آتش پرست نے کہا "اگر یہ بات ہے تو آپؒ مشرق کی ان

پہاڑیوں میں چلے جائیں، جہاں دُور دُور تک کوئی آبادی نہیں۔ آپؒ ان پہاڑیوں کے کسی غار میں روپوش ہوجائیں اور پھر دو سال تک وہیں رہیں، پھر میں دیکھوں گا کہ آسمان سے کس طرح رزق نازل ہوتا ہے۔"

آپؒ نے جواب دیا "میرے لیے یہ نہایت آسان ہے کیونکہ میں خدا پر توکّل کرتا ہوں لیکن اگر میں دو سال بعد اسی طرح واپس آگیا جس طرح اس وقت میں تیرے سامنے موجود ہوں تو یہ تیرے لیے میری آخری صحبت ہوگی اور تو اسلام قبول کرے گا۔"

آتش پرست نے کہا "مجھے منظور ہے لیکن اس دوران میں بھی آپؒ کی نگرانی کرتا رہوں گا۔"

آپؒ نے جواب دیا "مجھے منظور ہے۔ تجھے میری نگرانی کا اختیار حاصل ہوگا۔"

اس کے بعد آپؒ نے مشرقی پہاڑیوں کے کسی غار میں دو سال کے لیے جانے کی معمولی سی تیاری کی۔ چند جوڑے کپڑے، وضو کے لیے لوٹا، نماز کے لیے جائے نماز، ذکرِ الٰہی اور اوراد کے لیے تسبیح لی اور آتش پرست کے ساتھ مشرقی پہاڑیوں کی طرف روانہ ہوئے۔ آپؒ کے ارادتمند اور مرید آپؒ کی دو سالہ جدائی سے خوفزدہ اور رنجیدہ تھے۔ وہ آپؒ کے ساتھ ساتھ چلے لیکن آتش پرست کو اس پر اعتراض ہوگیا، بولا "جناب! آپؒ اپنے مریدوں اور ارادتمندوں کو واپس چلے جانے کا حکم دے دیجیے۔ یہ آپؒ کا ٹھکانا نہیں دیکھیں گے۔"

آپؒ نے اپنے مریدوں اور ارادتمندوں کو واپس چلے جانے کا حکم دے دیا۔ وہ سب بہ چشمِ گریاں واپس چلے گئے۔ آتش پرست بھی آپؒ کو پہاڑی سلسلوں میں چھوڑ کر واپس آگیا۔ آپؒ کچھ دُور تک جاتے نظر آتے رہے لیکن پھر نظروں سے اوجھل ہوگئے تو آتش پرست واپس آگیا۔

آتش پرست خوش تھا، اس نے خود سے کہا "اس شخص نے کتنے ہی آتش پرستوں کو مسلمان کرلیا لیکن یزداں کا شکر ہے کہ بڑی مشکل سے اس سے نجات حاصل ہوئی۔"

آپؒ پورے دو سال تک کسی غار میں روپوش رہے لیکن آتش پرست برابر آپؒ کی نگرانی کرتا رہا اور دو سال کے پورے عرصے میں اسے کوئی ایسی علامت نہیں ملی جس سے یہ شبہ کیا جاسکتا کہ حاتم اصمؒ کو کہیں باہر سے کوئی معاشی مدد پہنچ رہی ہے۔ جب دو سال کی مدّت پوری ہوگئی تو آتش پرست اس کھوج میں نکلا کہ کسی غار سے ان کی لاش برآمد کرلائے لیکن اس تلاش اور جستجو کے دوران اس نے یہ منظر دیکھا کہ ایک طرف سے حاتم اصمؒ چلے آرہے ہیں اور ان کی صحت اور توانائی میں سرمو فرق نہیں آیا۔ وہ ہکّا بکّا آپؒ کو دیکھتا رہ گیا۔ آپؒ نے اسے فکرمند دیکھ کر سوال کیا "کیا بات ہے؟ تو اب کیا سوچ رہا ہے؟"

اس نے جواب دیا "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ آپ واقعی ہیں یا آپؒ کی روح ہے، مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔"

آپؒ نے کہا "اب فضول مباحث مت چھیڑ اور کام کی بات کر۔ میں آخری صحبت پوری کرچکا اب تو اسلام قبول کرلے۔"

اس نے مذبذب لہجے میں سوال کیا "میں حیران ہوں کہ آج تک میں نے کہیں یہ نہیں دیکھا کہ بوئے بغیر فصل کاٹی جائے۔"

آپؒ نے جواب دیا "کیا تو نے کبھی اپنے سر کے بالوں پر بھی غور کیا، جنھیں تو بوئے بغیر کاٹتا رہتا ہے، خدا کو کسی بات کا محتاج کیوں سمجھتا ہے۔"

یہ آخری صحبت اپنا کام کرگئی اور آتش پرست مسلمان ہوگیا، اس نے کہا "حضرت! آپ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے۔"

آپؒ نے جواب دیا "مخلوق سے قطع تعلق کرکے اس طرح مشغول عبادت ہوجا کہ خدا کے سوا اس کا کسی اور کو علم نہ ہو لیکن اس کے ساتھ ہی مخلوق کو فراموش بھی نہ کر، اس کی خدمت کرتا رہ۔"

نومسلم آتش پرست آپؒ کی ہدایت پر صدق دل سے عمل پیرا ہوگیا۔

آپؒ کے کسی مُرید نے کسی دکاندار سے قرض لیا تھا اور بڑی کوشش کی کہ اس کی ادائی کردے لیکن ناکام رہا۔ دکاندار کا تقاضا بڑھتا اور شدید ہوتا رہا۔ ایک دن آپؒ بازار سے گزرے تو دیکھا دکاندار مرید کی بڑی بے عزتی کررہا ہے۔ اس نے مرید کو پکڑ رکھا تھا اور بازار والوں کے سامنے گالیاں دے رہا تھا۔ آپؒ نے یہ صورت دیکھی تو پوچھا "یہ تو کیا کررہا ہے؟"

دکاندار نے جواب دیا "میں اپنا قرض مانگ رہا ہوں۔"

آپؒ نے کہا "لیکن قرض مانگنے کا یہ کیا انداز ہے؟"

دکاندار نے جواب دیا "میں نے نرمی سے مانگ کر دیکھ لیا۔ اس شخص پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔"

آپؒ نے حکم دیا "اسے چھوڑ دے اور یہ بتا کہ جب تو نے قرض دیا تھا تو کیا اس وقت بھی اتنے ہی آدمی جمع کرلیے تھے؟"

"نہیں، میں نے چپ چاپ قرض دیا تھا!"

"تب پھر چپ چاپ وصول کر اور اس وقت اسے چھوڑ دے۔"

"واہ کیوں چھوڑ دوں، میں تو آج قرض وصول کیے بغیر ہرگز نہ چھوڑوں گا، چاہے کچھ بھی ہوجائے۔"

آپؒ نے پوچھا "کیا قرض کی رقم بہت زیادہ ہے؟"

دکاندار نے جواب دیا "قرض کی رقم ایک دینار ہو یا ایک درہم، قرض قرض ہی ہے۔ میں تو وصول کر کے ہی رہوں گا اس وقت۔"

آپؒ کو غصہ آگیا، بولے "تو اپنا قرض وصول کر سکتا ہے لیکن ذلیل اور رسوا نہیں کر سکتا۔"

آپؒ نے اپنی چادر زمین پر پھینک دی، چادر میں سے سونا بکھرنے لگا اور چاروں طرف سونا ہی سونا نظر آنے لگا۔ آپؒ نے دکاندار کو حکم دیا "تو اپنے قرض بھر کا سونا اٹھائے، خبردار جو لالچ میں زیادہ سونا اٹھایا۔"

دکاندار نے مرید کو چھوڑ دیا اور سونے پر جھپٹا، لالچ میں آکر کچھ زیادہ سونا اٹھا لیا لیکن وہ جیسے ہی اپنی دکان پر واپس آکر بیٹھا، آپؒ نے پوچھا "سچ سچ بتا، کیا تو نے اپنے قرض ہی بھر کا سونا اٹھایا ہے؟"

دکاندار نے جواب دیا "ہاں!"

آپؒ نے افسوس سے کہا "افسوس کہ تو بددیانت ہونے کے ساتھ ہی جھوٹا بھی ہے۔"

دکاندار نے اپنا ہاتھ سن ہوتے محسوس کیا۔ اس نے گھبرا کر ہاتھوں کو حرکت دینے کی کوشش کی لیکن وہ بے حس و حرکت ہی رہے، اس نے گھبرا کر التجا کی "ہائے میرے ہاتھ، یہ انھیں کیا ہو گیا؟ خدا کے لیے انھیں ٹھیک کر دیجیے۔"

آپؒ نے جواب دیا "تو بازار والوں کو جمع کر اور ان سے اس کا علاج کرا۔"

آپؒ وہاں سے چلے آئے اور دکاندار واویلا ہی کرتا رہ گیا۔

آپؒ کے ہمعصر ایک دوسرے بزرگ عصامؒ آپؒ سے ملنے آئے۔ کئی دن بعد انھوں نے حاتم اصمؒ سے دریافت کیا "حضرت! آپ نماز کس طرح پڑھتے ہیں؟"

آپؒ نے جواب دیا "جب نماز کا وقت آتا ہے تو پہلے نہایت اطمینان سے وضو کرتا ہوں، پھر مسجد چلا جاتا ہوں اور اس طرح کھڑا ہو جاتا ہوں گویا بیت اللہ میرے سامنے موجود ہے اور مقامِ ابراہیمؑ میرے دونوں ابروؤں کے درمیان ہے۔ میرا پاؤں پل صراط پر ہے۔ بہشت میری دائیں جانب ہے اور دوزخ بائیں جانب۔ موت میرے پیچھے کھڑی ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ میری آخری نماز ہے پھر شاید کوئی نماز میسر نہ آئے۔ دل کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں، اس کے بعد نہایت عاجزی سے تکبیر کہتا ہوں پھر پوری ہیبت کے ساتھ قرآن پاک پڑھتا ہوں، نہایت عاجزی سے رکوع میں جاتا ہوں، نہایت تضرع کے ساتھ سجدہ کرتا ہوں، نہایت حلم کے ساتھ تعوذ کرتا ہوں اور شکر کے ساتھ سلام پھیرتا ہوں اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اپنی نماز کے قبول ہونے کی امید رکھتا ہوں اور اپنے اعمال کے مردود ہو جانے کا خوف کرتا ہوں۔"

عصامؒ حیرت سے جواب سنتے رہے، پھر پوچھا "آپ کتنی مدت سے اس طرح نماز پڑھ رہے ہیں؟"

آپؒ نے جواب دیا "تیس سال سے۔"

عصامؒ رونے لگے، بولے "افسوس کہ مجھے آج تک ایک بھی ایسی نماز نصیب نہیں ہوئی۔"

آپؒ کا قزوین جانا ہوا تو وہاں کے قاضی نے آپؒ کو مہمان بنایا اور میزبانی کا شرف حاصل کیا۔ قاضی طنافسی کا مکان اور طرز بود و باش ایسا تھا کہ آپؒ حیران رہ گئے۔ لباس بڑا امیرانہ پہن رکھا تھا اور پورا مکان قیمتی سامان سے بھرا ہوا تھا۔

حاتم اصمؒ نے ان سے کہا "قاضی صاحب! آپ عالم دین ہیں، مجھے وضو کا صحیح طریقہ بتا دیجیے۔"

قاضی نے آپؒ کو غور سے دیکھا اور جواب دیا "میں آپ کو وضو کا طریقہ بتا دوں؟ آپؒ مجھے کیوں شرمندہ کر رہے ہیں؟"

آپؒ نے کہا "ہاں ہاں اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ آپ ٹھہرے عالم دین۔ میں آپ کے سامنے وضو کر کے دکھاتا ہوں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو ٹوک کر اس کی اصلاح فرما دیجیے گا۔"

قاضی نے کہا "بہتر ہے آپ کیجیے وضو۔"

آپؒ نے وضو کرنا شروع کر دیا۔ آپؒ نے ابتدا میں تو تین تین بار ہر عضو کو دھویا لیکن پاؤں کو چار بار دھویا۔ قاضی نے فوراً ٹوکا "حضرت! آپ غلطی کر رہے ہیں۔"

آپؒ نے پوچھا "کیسی غلطی؟"

قاضی نے کہا "آپ تین بار کے بجائے، پاؤں کو چار بار دھو رہے ہیں۔"

آپؒ نے کہا "تو اس میں کیا ہرج ہے؟"

قاضی نے جواب دیا "اس میں ہرج تو کوئی نہیں لیکن ہر عضو کو تین بار سے زائد دھونا پانی کو بیکار ضائع کرنا ہے اور یہ اسراف کی تعریف میں آتا ہے۔"

آپؒ نے سر اٹھا کر فرمایا "سبحان اللہ! قاضی صاحب میں غریب آدمی تو ایک چلو پانی بہا کر اسراف کا مجرم بن گیا اور جناب کا یہ ٹھاٹھ باٹھ اور ساز و سامان آخر کس زمرے میں آتا ہے!"

قاضی نے شرمندہ ہو کر گردن جھکالی۔

* * *

ایک مرید نے کہا "حضرت! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔"

آپ نے جواب دیا "اگر تجھے کسی دوست کی خواہش ہے تو تیرے لیے خدا کافی ہے۔ اگر ساتھیوں کی تمنا ہے تو تکبیر بس کافی ہیں۔ اگر عبرت حاصل کرنا ہو تو اس کے لیے دنیا کافی ہے۔ اگر مونس کی تلاش ہے تو قرآن کافی ہے۔ اگر مشغلہ چاہتا ہے تو عبادت بہت بڑا مشغلہ ہے اور اگر میرے اقوال ناگوار ہوں تو جہنم کافی ہے۔"

ایک مرید نے کسی شخص کا نام لیا اور کہا "اس نے بڑی دولت جمع کر رکھی ہے۔"

آپ نے پوچھا "کیا اس نے زندگی کا ذخیرہ بھی کر لیا ہے؟ کیونکہ مُردوں کا دولت جمع کرنا قطعاً بے سود بھی ہے اور احمقانہ بھی۔"

کسی دولت مند نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ اگر آپ کو کسی شے کی ضرورت ہو تو فرمادیں۔"

آپ نے جواب دیا "میری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ میں تجھے آئندہ نہ دیکھوں اور نہ تو مجھے دیکھے۔"

آپ مکہ معظمہ تشریف لے جا رہے تھے۔ بغداد میں امام احمد بن حنبل سے ملاقات ہوگئی۔ حاتم اصم نے ان سے سوال کیا "آپ رزق کی جستجو کرتے ہیں یا نہیں؟"

امام صاحب نے جواب دیا "یقیناً متلاشی رہتا ہوں۔"

آپ نے دریافت کیا "قبل از وقت یا بر وقت تلاش کرتے ہیں؟"

اس سوال نے امام صاحب کو سکتے میں ڈال دیا کیونکہ وہ اس سوال کے مختلف جوابوں کی نزاکت سے واقف ہو چکے تھے اگر وہ جواب میں یہ کہتے کہ قبل از وقت تو حاتم اصم کہتے تم تضیع اوقات کرتے ہو اگر وہ بعد از وقت کہتے تو جواب ملتا اگزشتہ شے کی جستجو لاحاصل ہے اور اگر امام جواب میں یہ کہتے کہ بروقت تلاش کرتا ہوں تو حاتم اصم کی طرف سے کہا جاتا کہ موجود شے کی تلاش سے فائدہ؟

امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا "حاتم اصم! تمہارے سوال کا جو جواب ہو تم خود تلاش کر لو لیکن میں مختصر یہی کہوں گا کہ تمہارا سوال لاجواب ہے۔"

بغداد میں آپ کی آمد اور موجودگی کا شہرہ جو ہوا تو خلیفہ نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ آپ اس کے پاس خود ہی تشریف لے گئے اور جاتے ہی فرمایا "السلام علیک یا زاہد!"

خلیفہ نے کہا "حضرت! زاہد میں کہاں، زاہد تو آپ ہیں۔"

آپ نے جواب دیا "کیا تو اللہ کے اس قول سے واقف نہیں قل متاع الدنیا قلیل (دنیا کا ساز و سامان نہایت حقیر ہے) تو زاہد وہی ہوتا ہے جو قلیل پر قناعت کرے چونکہ تم دنیا کو سنبھال کر مطمئن بیٹھے ہو اور آخرت سے بے فکر ہو اس لیے تم ہی زاہد ہو میں نہیں۔"

خلیفہ شرمندہ ہوگیا۔ اس نے آپ کی خدمت میں اشرفیوں کی تھیلیاں پیش کیں لیکن آپ نے انہیں قبول نہیں کیا اور جواب میں کہا "مجھے اس کی ذرا بھی حاجت نہیں، میرے لیے میرا اللہ کافی ہے۔"

آپ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ آپ نے وہاں عالیشان محل کھڑے دیکھے۔ آپ کو بڑا دکھ پہنچا۔ آپ نے طنزاً کسی سے پوچھا "یہ کس کا شہر ہے؟"

جواب ملا "حضرت! یہ مدینۃ النبی (یعنی نبی کا شہر) ہے۔"

آپ نے کہا "میں اس محل میں دو رکعت نماز پڑھنا چاہتا ہوں جس میں رسول اللہ ﷺ رہتے تھے۔"

کئی آدمیوں نے ایک ہی جواب دیا "رسول اللہ ﷺ محل میں کہاں رہتے تھے، آپ تو ایک کچے مکان میں رہتے تھے جس کی دیواریں کھجور کی شاخوں پر مٹی تھوپ کر بنائی گئی تھیں۔"

حاتم اصم نے پوچھا "رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کے محل کہاں ہیں میں وہیں نماز ادا کرلوں گا۔"

لوگوں نے جواب دیا "حضور ﷺ کے صحابہ میں سے کسی نے بھی محل نہیں بنوایا۔"

آپ نے بگڑ کر کہا "تب پھر تم نے رسول اللہ ﷺ کے شہر میں نمرود اور فرعون کی طرح یہ عالیشان محل کیوں کھڑے کر رکھے ہیں؟"

لوگوں نے شرمندہ ہو کر اپنے سر جھکا لیے کیونکہ ان میں سے ایک کے پاس بھی آپ کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

ایک مرتبہ آپ نے فیصلہ کر لیا کہ آپ جہاد میں شرکت فرمائیں گے۔ ان دنوں آپ کی شادی ہو چکی تھی اور آپ نہایت پُرسکون زندگی گزار رہے تھے آپ نے سوچا کہ یہ سفر معلوم نہیں کتنے عرصے کے لیے ہو۔ بیوی سے کہا "میں جہاد کے لیے جا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں چار ماہ کے لیے اخراجات کی رقم دے جاؤں یا پھر یہ بتاؤ کہ تمہیں کتنی رقم کافی ہوگی؟"

بیوی نے جواب دیا "آپ مجھے اتنی رقم دیتے جائیں جتنی میری زندگی ہے۔"

آپ نے فرمایا "زندگی تو میرے قبضۂ قدرت میں نہیں ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ تمہاری کتنی زندگی ہے؟"

بیوی نے جواب دیا "پھر آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میرا رزق آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔"

آپ بیوی کے جواب سے شرمندہ ہوگئے۔

آپ جہاد میں مشغول تھے کہ ایک کافر تلوار سونت کر آپ کے سر پر آگیا۔ ابھی اس نے آپ کو مارنے کے لیے تلوار بلند ہی کی تھی کہ کسی طرف سے سنسناتا ہوا ایک تیر آیا اور کافر کو ہلاک کر گیا۔ آپ نے طنزاً کہا "بول تو نے مجھے ہلاک کیا یا میں نے تجھے ہلاک کر دیا۔"

آپ کسی سے کچھ لیتے نہیں تھے لیکن ایک دن لوگوں نے یہ منظر

بھی دیکھا کہ ایک دوسرے بزرگ عصام بن یوسف نے آپ کو کوئی چیز بھیجی اور آپ نے اسے قبول کر لیا۔ کسی معترض نے پوچھا "حضرت! یہ بات تو آپ کے اصول کے خلاف ہے کہ آج آپ نے عصام کی بھیجی ہوئی چیز قبول کر لی۔"

آپ نے جواب دیا "میں نے جب بھی کسی کی دی ہوئی چیز کو لینے سے انکار کیا ہے، میرے نفس نے ایک خوشی سی محسوس کی ہے اور میں اپنے نفس کو خوش نہیں دیکھ سکتا، آج جب میں نے عصام کی بھیجی ہوئی چیز قبول کر لی تو میرے نفس کو بڑی تکلیف پہنچی، میرے لیے یہ بہت کافی ہے۔"

کسی وجہ سے آپ ظہر کی نماز باجماعت نہیں ادا کر سکے۔ اس کا آپ کو بے حد ملال ہوا اور سوگوار بیٹھ گئے۔ لوگ آتے رہے اور آپ کو اداس بیٹھا دیکھ کر واپس جاتے رہے۔ لوگ معلوم نہیں کیوں آپ سے اداسی کا سبب نہیں معلوم کر رہے تھے لیکن انہیں میں دو آدمی ایسے بھی تھے جنہوں نے یکے بعد دیگر ایک ہی بات کی۔

ایک نے آپ سے کہا "حضرت! کیا بات ہے۔ آج آپ ظہر کی جماعت میں نظر نہیں آئے!"

آپ کی آنکھیں بھیگ گئیں، بولے "ظہر کی جماعت چھوٹ جانے کا مجھے جتنا ملال ہے زبان بیان نہیں کر سکتی۔"

اس نے کہا "مجھے خود بھی اس کا بڑا افسوس ہے لیکن میں افسوس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔"

یہی بات ایک دوسرے شخص نے بھی کی۔ آپ نے ان دونوں سے کہا "میرے ہمدردو! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اگر میرا بیٹا مر جاتا تو آدھا بلخ تعزیت کے لیے حاضر ہو جاتا لیکن آج میری ظہر کی جماعت چھوٹ گئی تو تم دونوں کے علاوہ کسی نے تعزیت ہی نہ کی جانتے ہو ایسا کیوں ہوا؟"

ان دونوں نے جواب دیا "نہیں آپ بتائیں گے تو معلوم ہوگا۔"

آپ نے جواب دیا "صرف اس لیے کہ لوگوں کی نظر میں دنیا کی مصیبت کے مقابلے میں دین کی مصیبت ہلکی اور معمولی ہے۔"

آپ نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "لوگو! تین چیزوں کے بغیر تین چیزوں کا دعویٰ کرنا کذب میں داخل ہے۔"

کسی مرید نے پوچھا "کون کون سی تین چیزیں تین چیزوں کے بغیر؟"

آپ نے جواب دیا "اللہ تعالیٰ کی محرمات سے پرہیز کیے بغیر اس سے ڈرنے کا دعویٰ کرنا کذب ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مال خرچ کیے بغیر جنت کی محبت کا دعویٰ کرنا کذب ہے اور تیسرے یہ کہ جو شخص فقر سے محبت کیے بغیر رسول اللہ سے محبت کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے۔"

آپ نے ایک جگہ علما کو کسی بحث میں الجھا ہوا دیکھا۔ آپ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "اے دین کے ستونو! ایک میری نصیحت بھی سن لو اور اگر میری بات تمہارے دلوں میں اتر جائے تو اس پر کاربند ہو جانا ورنہ جو سمجھ میں آئے کرتے رہنا۔ میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو جاؤں گا۔"

علما آپ کی شکل دیکھنے لگے۔ آپ نے فرمایا "حضرات! اگر روز گزشتہ پر تاسف اور موجودہ دن کو غنیمت تصور کرتے ہوئے آئندہ دن سے خوفزدہ ہو تب تو بہتر ہے ورنہ تمہارے لیے جہنم تیار ہے۔"

علما نے زیرِ لب تبسم کیا، آپس میں کہنے لگے "یہ شخص تو آداب مجلس تک سے واقف نہیں۔ یہ کیسی باتیں کرتا ہے۔"

آپ نے ان سب سے فرمایا "لوگو! خدا نے تین چیزوں کا باہمی ربط قائم فرمایا ہے۔ فراغت کا عبادت سے۔ اخلاص کا مخلوق سے اور مایوسی نجات میں پابجائی احکامات سے۔"

آپ اپنے مریدوں سے فرمایا کرتے تھے "اگر اہل دنیا تم سے پوچھیں کہ تم نے حاتم اصم سے کیا سیکھا یا کیا حاصل کیا تو تم یہ کبھی نہ کہنا کہ ہم نے اس سے علم و حکمت حاصل کیا ہے بلکہ تم یہ کہنا کہ ہم نے اس سے دو باتیں حاصل کی ہیں۔ اوّل یہ کہ جو شے اپنے قبضے میں ہے۔ اس پر خوش رہا جائے اور دوم یہ کہ اس چیز کی توقع مت کرو جو اپنے قبضے ہی میں نہ ہو۔"

بصرے کے قاضی القضاۃ محمد بن مقاتل بیمار پڑ گئے۔ ان دنوں حاتم اصم رے میں موجود تھے۔ انہیں علالت کی خبر ملی تو سنتِ نبویؐ کی پیروی میں قاضی صاحب کی عیادت کو پہنچ گئے۔ ان کی قیام گاہ کی شان و شوکت دیکھ کر آپ سکتے میں آ گئے۔ وہ ایک عالیشان محل تھا۔ اس کا دروازہ بہت بلند و بالا تھا



…س کے پیچھے ایک شاندار ڈیوڑھی تھی۔ آپ کے منہ سے بے ساختہ نکلا "اللہ اکبر! ایک عالم کے مکان کا یہ حال"۔

قاضی نے آپ کی آمد کی خبر سنتے ہی اندر بلا لیا۔ آپ نے اندر داخل ہو کر دیکھا۔ ایک خوبصورت باغ میں جا بجا فوارے چل رہے ہیں۔ نوکر چاکر ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے ہیں۔ محل کے ہر کمرے کے سامنے قیمتی پردے لٹک رہے ہیں۔ حاتم کی حیرت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ جب وہ قاضی کے کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا قاضی صاحب مکلف گدے پر آرام فرما ہیں۔ قاضی صاحب حاتم کو دیکھتے ہی مسند پر بیٹھ گئے۔ حاتم سے کہا "تشریف رکھئے"۔

لیکن حاتم نے سنی ان سنی کر دی اور کھڑے رہے۔ قاضی صاحب نے بیٹھنے پر اصرار کیا لیکن وہ انکار ہی کرتے رہے۔ آخر قاضی صاحب نے پوچھا "کیا آپ یہاں کسی ضرورت سے تشریف لائے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں"۔

قاضی صاحب نے کہا "فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"۔

آپ نے جواب دیا "میں ایک مسئلہ پوچھنے آیا ہوں"۔

قاضی صاحب نے کہا "پوچھیئے"۔

آپ نے پوچھا "آپ نے علم کن لوگوں سے حاصل کیا؟"

قاضی صاحب نے جواب دیا "بڑے بڑے معتبر اور فاضل اساتذہ سے"۔

آپ نے پوچھا "انھوں نے کس سے حاصل کیا تھا؟"

جواب دیا "رسول اللہؐ کے صحابہ کرامؓ سے"۔

آپ نے پوچھا "رسول اللہ کے پاس علم کہاں سے اور کیسے آیا تھا؟"

جواب دیا "اللہ تعالیٰ نے جبریلؑ کے ذریعے آپ کو دیا تھا"۔

آپ نے کہا "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس جو ذخیرہ علم ہے یہ وہی ہے نا جسے آپ کے اساتذہ نے صحابہ کرامؓ سے حاصل کیا تھا اور صحابہ کرامؓ نے رسول اللہؐ سے حاصل کیا تھا اور حضورؐ نے جبریل کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے حاصل کیا تھا۔ اس میں کہیں یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ اللہ کے نزدیک اس کا درجہ بلند ہوگا جس کا عالیشان مکان ہو اور اس میں ہر قسم کا سامان تعیش موجود ہو"۔

قاضی صاحب نے جواب دیا "نہیں تو میں نے نہ تو ایسی بات کہیں پڑھی ہے اور نہ کہیں سنی ہے"۔

آپ نے کہا "تب پھر آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ جو لوگ لذات دنیا اور آسائش حیات سے رخ پھیر کر آخرت کے لیے زاد راہ اکٹھا کرنے میں مشغول رہیں گے اور غربا اور مساکین سے زیادہ محبت کریں گے اور ہر وقت آئندہ زندگی کو پیش نظر رکھیں گے، خدا کے نزدیک انہی کا مرتبہ بلند ہوگا"۔ یہ کہتے کہتے آپ کو جلال آ گیا۔ پرجوش لہجے میں کہا "آپ نے اپنے آپ کو کن لوگوں کی زندگی سے مطمئن کر رکھا ہے؟

رسول اللہؐ کی حیات مبارک سے، حضورؐ کے صحابہ کرامؓ کی زندگی سے یا صلحائے امت کی زندگی سے؟ یا پھر یہ کہ فرعون اور ہامان کے انداز زندگی سے آپ کے قلب نے اطمینان حاصل کر لیا ہے؟"۔

قاضی صاحب ایک تو بیمار تھے۔ آپ کی تقریر نے ان کی حالت اور زیادہ خراب کر دی۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ فرط ندامت سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

آپ نے جوش میں فرمایا "اے علماء سو! تم جیسے لوگوں کو جب ایک جاہل دنیادار دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ جب علماء اس حال میں ہیں تو میرا حال ان سے برا نہیں ہے"۔

اس کے بعد آپ نے قاضی صاحب سے کوئی بات نہ کی۔ روتا ہوا چھوڑ کر محل سے باہر نکل گئے۔

قاضی صاحب مسند پر اوندھے منہ گر گئے اور رو رو کر مسند تر کر دی۔ نوکر چاکر قاضی صاحب کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ انھوں نے اندر خبر دی "ایک دیوانہ قاضی صاحب کو رلا کر چلا گیا"۔

گھر میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ بیوی بچے قاضی صاحب کے گرد جمع ہو گئے۔ بیوی نے پوچھا "آپ کے پاس کون آیا تھا؟"

قاضی صاحب نے بمشکل جواب دیا "اس عہد کا صدیق!"

بیوی نے دریافت کیا "اس عہد کا صدیق کون ہے؟"

جواب دیا "حاتم اصم!"

بیوی نے بیزاری سے کہا "بلخ کا وہ بہرہ جس کے لیے مشہور ہے کہ جب تک چیخ کر بات نہ کی جائے، وہ سنتا ہی نہیں!"

قاضی صاحب نے جواب دیا "لیکن میں جانتا ہوں کہ حاتم بہرے نہیں ہیں"۔

بیوی نے نفرت سے کہا "پھر وہ کیا ہے؟ لوگ تو اسے بہرہ ہی کہتے ہیں!"

قاضی صاحب نے کہا "حاتم سے بات کرنے میں مجھے ایک بار بھی چیخنا نہیں پڑا"۔

بیوی نے پوچھا "وہ یہاں آپ کے پاس آیا کیوں تھا؟"

جواب دیا "میرے مرض گمراہی کا علاج کرنے"۔

بیوی کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی، بولی "آپ کے مرض گمراہی کا علاج کرنے!! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ آپ تو لوگوں کو راہ دکھاتے ہیں۔ دین کے مسئلے مسائل سلجھاتے ہیں۔ آپ تو اپنے عہد کے صاحب سند ہیں"۔

قاضی صاحب نے ٹھنڈی سانس بھری، بولے "حاتم کی آمد سے پہلے میں خود کو ایسا ہی سمجھتا تھا لیکن انہوں نے میرے دل کی تاریکی میں اصلاح اور ہدایت کی ایک شمع روشن کر دی تو پتہ چلا کہ وہاں تو گھور اندھیرا ہے۔ میں اپنی ضلالت کو ہدایت سمجھتا تھا"۔

بیوی نے جھنجلا کر پوچھا "آخر وہ بہرہ آپ کو سکھلا کر گیا کیا جو ایسی اکھڑی اکھڑی بے زاری کی باتیں کر رہے ہیں"

قاضی صاحب نے سختی سے کہا "میں حاتم کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا۔ اپنی زبان بند رکھو نادان عورت"

بیوی نے تلخ لہجے میں کہا "بس ایک ایسی ہی بات ہے جو زبان سے نہیں نکل رہی ورنہ میں اس بہرے کو ایسا مزہ چکھاتی کہ یہ زندگی بھر یاد کرتا"

قاضی صاحب پھر چیخے "نادان عورت تنبیہ کر رہا ہوں کہ ان کا نام بدتمیزی سے مت لے"

بیوی نے جواب دیا "عزت تو میں ان کی کرنے سے رہی۔ مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ وہ یہاں آپ کے پاس آئیں گے اور پریشان کر کے چلے جائینگے"

قاضی صاحب نے کہا "تم لوگ آ گئے ہو تو میں چاہتا ہوں کہ کچھ اہم باتیں بھی کر لوں"

قاضی صاحب کے بڑے بیٹے نے کہا "بابا جان! میں آپ کو بہت زیادہ پریشان دیکھ رہا ہوں، آخر بات کیا ہو گئی ہے؟"

قاضی صاحب نے جواب دیا "بیٹے! بات دراصل یہ ہے کہ میری بیماری میرے حق میں تازیانۂ ہدایت ثابت ہوئی۔ میں بیمار پڑتا۔ نہ حاتم عیادت کو آتے اور نہ میری اصلاح ہوتی۔"

اس کے بعد قاضی صاحب نے حاتم کی ساری باتیں بیوی بچوں کو بتادیں۔ آخر میں کہا "خوف نے میرا بُرا حال کر رکھا ہے"

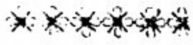
بیوی نے پوچھا "کس قسم کا خوف؟"

قاضی صاحب نے جواب دیا "اپنے اعمال کا خوف"

بیوی نے آس پاس موجود لوگوں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اور کہا "لوگو! کچھ تم ہی فیصلہ کرو، کیا تم لوگ یہ نہیں محسوس کر رہے ہو کہ یہ اس وقت ہذیانی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ یہ انہیں ہو کیا گیا ہے۔ ہائے اللہ میں کیا کروں؟"

قاضی صاحب نے بیوی کو ڈانٹ دیا "اپنی زبان بند کر، ہذیان مجھے نہیں تم سب کو ہو گیا ہے۔ میں آج تم سب کو یہ اہم بات بتا رہا ہوں کہ میں ایک عرصے سے جس مہلک بیماری میں مبتلا تھا۔ آج حاتم اصم کے علاج سے صحت یاب ہو چکا ہوں۔ غلطی سے میں نے اس دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ لیا تھا لیکن آج معلوم ہوا کہ بہت بڑا علم رکھنے کے باوجود میں جاہل تھا۔ آج حاتم اصم نے مجھے یاد دلا دیا کہ میں کیا ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اب میں شان و شوکت اور نام و نمود کی زندگی کو خیرباد کہتا ہوں اور اپنی بقیہ زندگی مکہ معظمہ میں گزار دینا چاہتا ہوں"

قاضی صاحب نے جو کچھ کہا تھا۔ اس پر حرف بہ حرف عمل کر کے دکھا دیا۔ انہوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں نہایت سادگی سے زندگی گزار کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔



آپ فرمایا کرتے کہ ہر روز صبح صبح ابلیس مجھے وسوسے میں ڈالتا ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتا ہے "کیا کھاؤ گے؟" میں کہتا ہوں "موت!"

وہ پوچھتا ہے "کیا پہنو گے؟" میں جواب دیتا ہوں "کفن"

وہ پوچھتا ہے "کہاں رہو گے؟" میں جواب دیتا ہوں "قبر میں"

عاجز آ کر وہ کہتا ہے "تم بہت بُرے آدمی ہو!" اور مجھے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

آپ اپنے مریدوں کو نصیحتیں کیا کرتے تھے کہتے تھے کہ تین وقت نفس کی حفاظت کرو۔

۱۔ کام کے وقت اس بات کی کہ خدا تم کو دیکھتا ہے۔

۲۔ بات کرتے وقت اس بات کی کہ خدا سنتا ہے۔

۳۔ خاموش رہو تو یاد رکھو کہ خدا جانتا ہے۔

آپ فرماتے "خواہشِ نفس کی تین قسمیں ہیں۔ کھانے کی خواہش بات کرنے کی خواہش اور دیکھنے کی خواہش۔ خدا پر بھروسا اور یقین کر کے کسبِ حلال سے کھانے کی حفاظت کر۔ سچ بول کر زبان کی نگہداشت کر۔ اور نظارۂ عالم سے عبرت حاصل کر کے نظر کو محفوظ رکھ۔ جو شخص کھانے میں خدا پر توکل کرے۔ وہ کھانے کی خواہش سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ جو شخص سچ بولے۔ وہ بات کرنے کی خواہش سے نجات حاصل کر لیتا ہے اور جو شخص آنکھ سے امرِ حق دیکھے۔ وہ دیکھنے کی خواہش سے بچ جاتا ہے۔

فرمایا: ہر شے کے لیے ایک زیبائش ہوا کرتی ہے اور عبادت کی زیبائش خوف ہے اور خوف کی علامت آرزوؤں کی قلت ہے۔ پھر یہ تلاوت فرمائی! ولا تخافوا ولا تحزنوا (نہ خوفزدہ ہو اور نہ غمگین) پھر فرمایا کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود مہمان کے سامنے کھانا رکھنے، مُردے کو کفنانے دفنانے، بالغ لڑکی کا نکاح کرنے اور توبہ کرنے میں عجلت سے کام لینا افضل ہے۔

آپ نے واش گرد پہاڑ کے پاس سر دند نامی جگہ پر ۲۳۷ھ میں رحلت فرمائی اور وہاں کے مسافر خانے کے پاس دفن ہوئے۔

جنید بغدادی فرمایا کرتے تھے کہ حاتم اصم ہمارے عہد کے صدیق ہیں۔



محمود واحد گیلانی

ضیاء تسنیم بلگرامی

عباس صفوی کے عہد کی ایک فتنہ ساز شخصیت جس نے مذہب کو عجیب و غریب عقائد دیے۔ اس کی باتوں میں سحر تھا اور دلائل میں ایسی کشش کہ اس کا مخالف بھی ایک بار اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس نے دوسرے مذاہب کا مطالعہ کیا اور اپنے مطلب کی باتیں اخذ کیں اور انسانی نفسیات کو ذہن میں رکھ کر اپنے کام کا آغاز کیا۔ اگر اسلام کی جگہ کوئی اور مذہب ہوتا تو وہ اس کو غیر معمولی نقصان پہنچا دیتا مگر ایسا ہی پر کیا موقوف آپ انسانیت فتنوں پر غور کریں جو ان صفحات میں مسلسل پیش کئے گئے ان کا سلسلہ جاری ہے۔ اسلام نے ان سب کا مقابلہ کیا اور کر رہا ہے اور اپنی جگہ پر کھڑا ہوا ہے۔ آج یہ دوسرے مذاہب کو مغلوب کرتا جا رہا ہے لیکن جس نے بھی اس کو مغلوب کرنے کی کوشش کی تباہ و برباد ہو گیا۔ محمود واحد کے ایجاد کردہ مذہب کا بھی وہی حشر ہوا۔ اس کو ایران کے بادشاہ عباس صفوی نے ختم کر دیا۔

اپنے موضوع اور گوناگوں واقعات کے اعتبار سے ایک نہایت دلچسپ مضمون

ایران کے شہر گیلان کا ایک گاؤں مسجوان کوئی ایسا موضع نہیں تھا جسے یاد رکھا جاتا لیکن اسے بھی دنیا کے دوسرے بہت سے مشہور مقامات کی طرح اس لیے غیر معمولی شہرت حاصل ہو گئی کہ یہاں بھی ایک مشہور شخص پیدا ہوا تھا۔ گو کہ آج اس شخص کو ایران کے سوا لوگ نہیں جانتے اور ایران کے بھی وہی لوگ اس سے واقف ہیں جو در پردہ اس شخص کے پیرو ہیں۔

شہر گیلان کو اس لیے شہرتِ دوام حاصل ہو گئی کہ حضرت شیخ عبدالقادرؒ یہاں پیدا ہوئے تھے جو تاریخ میں پیرانِ پیر حضرت غوث پاک، شیخ عبدالقادر جیلانی کی حیثیت سے شہرتِ دوام کے حامل ہیں۔ چونکہ عربی زبان میں حرف "گ" نہیں ہوتا اس لیے گ کو ج سے بدل کر گیلانی کو جیلانی کر دیا گیا لیکن ایرانیوں کو اپنی ایرانیت پر فخر ہے اور اپنی کسی شے میں کسی دوسرے کی پیوند کاری کو معیوب سمجھتے ہیں اس لیے وہ گیلان کو جیلان کہنے یا لکھنے پر راضی نہیں ہوتے۔ مسجوان میں پیدا ہونے والا محمود واحد بھی ایسا ہی ایرانی تھا جو گیلان کو جیلان کہنے یا لکھنے کو عیب سمجھتا تھا۔ یہ ساتویں صدی ہجری کا ایک غیر معمولی شخص تھا۔ پتا نہیں کہ نام محمود کے ساتھ لگا ہوا "واحد" سابق تھا یا جدتِ طبع کی وجہ سے اس نے اسے بعد میں مستقلاً اپنے نام کا ایک جزو بنا لیا تھا۔

محمود واحد نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے چاروں طرف اسلام اور عربوں کا غلبہ دیکھا۔ ایران کو اپنے شاندار ماضی کی وجہ سے عربوں کی برتری گراں گزرتی تھی، یہ احساسِ برتری فارسی شاعری میں جگہ جگہ نظر آئے گا۔ یہاں تک کہ فردوسی طوسی کے شاہنامے میں جگہ جگہ عربوں کی مذمت اور ایران کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ شاید یہی وہ ماحول تھا جس میں محمود واحد پیدا ہوا تھا۔ وہ بچپن میں بے چین و مضطرب رہا کہ ایرانیوں نے عربوں کا دین اختیار کر رکھا ہے لیکن کم سنی میں وہ اگر کوئی الناسید حادعویٰ کر دیتا تو وہ دینِ اسلام کے پروانوں کو اپنی طرف کس طرح راغب کرتا۔ اس کے لیے جس قابلیت اور ذہانت کی ضرورت تھی وہ کم سنی میں اس سے محروم تھا۔

اس نے ایرانی اساتذہ سے علوم حاصل کئے۔ ذہین تھا اس لیے جو کچھ پڑھتا تھا اسے یاد ہو جاتا تھا۔ اساتذہ اس پر فخر کرتے تھے اور اسے فخرِ ایران کہتے تھے۔ موضع مسجوان اگر محمود واحد کی جائے پیدائش تھا تو اس کا صدر مقام گیلان تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے نام کے ساتھ گیلانی لگا لیا تھا اور اسی حیثیت سے وہ تاریخ کا ایک حصہ بن گیا۔ محمود واحد نے ہر طرف اپنے نام کے ساتھ گیلان کا چرچا کر دیا۔

سب سے زیادہ اسے عربوں کی جو چیز کھٹکتی تھی وہ دینِ اسلام تھا اور وہ دینِ اسلام سے براہِ راست ٹکر لینا چاہتا تھا۔ وہ مدتوں اسی مقصد کی تیاری میں مشغول رہا۔ یعنی وہ نبی بننے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا لیکن ابھی تک اسے وہ علم اور کمال حاصل نہیں ہوا تھا۔

اس نے اپنے چند استادوں کو یہ بتایا کہ وہ ایک ایسا منصوبہ تیار کر رہا ہے جس پر عمل کر کے وہ عربوں کی برتری کو خاک میں ملا دے گا۔ اس کے ایرانی بھائی اس کی اتنی بڑی بڑی باتوں کو سنتے تو مسکرا دیتے۔ انہیں انتظار تھا کہ دیکھیں ان کا یہ ہونہار ہم وطن کس طرح عربوں کو نیچا دکھاتا ہے۔ آخر وہ دن آ گیا اور محمود واحد نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ وہ لوگوں کو دھڑلے سے یہ بتاتا پھر رہا تھا کہ میرے آجانے کے بعد آسمانوں اور زمینوں میں صرف ایک ہی دین موجود ہے اور وہ ہے واحدی دین۔ جس طرح اللہ ایک ہے اسی طرح محمود کا دین بھی واحد ہے اور اب دینِ اسلام کو منسوخ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی اسلامیت سے دستبردار ہو جائیں۔

ہر طرف سے اس نئی آواز کی مخالفت شروع ہو گئی اور لوگ محمود کے خلاف ہونے لگے۔

محمود کو اپنے ہم وطنوں پر غصہ آتا تھا کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو غیر ملکی دین کی خاطر اپنے وطنی دین کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ وہ انتہائی

کوششوں کے بعد چند پڑھے لکھے لوگوں کو اپنے دین میں داخل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ لوگ کسی لالچ سے اس نئے دین میں داخل ہوئے تھے یا کوئی اور سبب تھا اس کا پتا نہیں چلتا کیونکہ بظاہر محمود کے پاس کوئی سرمایہ بھی نہیں تھا اور ایسا کوئی عہدہ یا منصب بھی حاصل نہیں تھا جس کے دباؤ اور اثر سے وہ لوگوں کو اپنی طرف مائل کر لیتا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں صرف عصبیت کام کر رہی تھی اور عرب میں جو ایک عرصے سے عصبیت کی جنگ جاری تھی' محمود نے اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے ہم وطنوں سے کہا "بھائیو! تم عربوں کے ماضی سے واقف ہو ان کے مقابلے میں اپنے ماضی پر نظر ڈالو تو تمہیں دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ یہ عرب جو آج ہمارے حاکم ہیں کل ہماری سائیسی کیا کرتے تھے۔ یہ توہم پرست اور بُت پرست تھے۔ ان کا کعبہ بے شمار بُتوں سے بھرا ہوا تھا جب کہ ایران نے دنیا کو یزداں اور اہرمن کا عقیدہ دیا تھا۔ ایران نے دنیا کو اس حقیقت سے روشناس کیا تھا کہ دنیا کو دو بڑی قوتیں چلا رہی ہیں۔ خیر کی قوت کا نام یزداں ہے اور شر کی قوت کا نام اہرمن۔ ایران نے ان دونوں قوتوں کو ایک ہی قوت کے دو رخ قرار دیے تھے۔ اسلام نے انہیں الگ الگ کر دیا۔ ایک قوت کا نام اللہ رکھ دیا اور دوسری کا شیطان۔ ایک قوت قادر مطلق قرار پائی اور بقیہ قوتیں اس کی تابع فرمان۔"

وہ لوگوں سے پوچھتا تھا "بھائیو! جب اللہ قادر مطلق ہے تو شیطان میں تابِ انکار کہاں سے آئی۔ قادر مطلق اپنی مخلوق کو کوئی حکم دے اور مخلوق اس کا حکم نہ مانے یہ کیا بات ہوئی۔ تم لوگوں نے کبھی اس طرح سوچا جب کہ میں یہ سب سوچ رہا ہوں اور بہت جلد وہ دن بھی آجائے گا جب تم لوگ بھی میری طرح سوچنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔"

وہ اس قسم کے شوشے چھوڑتا رہتا اور اپنے ہم وطنوں کو حیران کرتا رہتا۔ اس نے بہت سے ایرانی بھائیوں کو اپنی طرح اور اپنے ہی انداز میں سوچنے اور غور و فکر کرنے پر مجبور کر دیا۔ لوگوں کے دلوں سے یقین اور ایمان کی قوت کم ہونے لگی اور اس کی جگہ شک و شبے نے لے لی۔ آخر کار ان میں اتنے جری اور بے باک لوگ پیدا ہو گئے جو برملا اسلام کا مذاق اڑانے لگے۔

محمود واحد گیلانی نے جس کام کا آغاز کیا تھا وہ بظاہر آسان نظر آتا تھا مگر جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' مشکلات اور دشواریاں سامنے آتی جارہی تھیں۔ لوگوں کے دلوں میں صدیوں سے جو دین جگہ بنا چکا تھا اسے یوں آسانی سے اکھاڑ پھینکنا بہت مشکل کام تھا۔ سیادت اور حکومت بڑی زبردست چیزیں ہوتی ہیں اور غلامی اور محکومی بھی ایسی خطرناک حالتیں ہیں جن میں قوموں کے طبائع اور عادات بدل جاتی ہیں۔ حکومت اور سرداری میں بڑائی اور برتری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کہ غلامی اور محکومی میں ذہنی پستی اور احساسِ کمتری کا مرض پرورش پانے لگتا ہے۔ وہ ایرانی جو صدیوں سے دین اسلام کے زیر سایہ رہ رہے تھے اور جن کے دلوں میں اسلام راسخ ہو چکا تھا' وہ محمود واحد گیلانی کی باتیں غور سے سنتے مگر اپنے آبائی دین سے سرمو انحراف کو گناہِ عظیم سمجھتے۔ جو داعی اور مبلغ محمود واحد کے لیے کام کر رہے تھے وہ اپنے روز مرہ کے تجربات اپنے آقا و مولا محمود واحد گیلانی کے سامنے بیان کرتے کہ لوگ ان کی باتیں سن تو لیتے ہیں مگر سن کر ٹال جاتے ہیں۔ ان کے دلوں پر محمد عربیؐ اور ان کے چچا زاد بھائی اور داماد علی اور ان کے خاندان کا ایسا اثر اور قبضہ پایا جاتا ہے کہ وہ اس سے علیحدگی یا دوری کا خیال تک دل میں نہیں لاتے۔ وہ بحث کرتے ہیں' ہماری مذمت کرتے ہیں اور کہیں کہیں ہمارا مذاق بھی اڑایا جاتا ہے۔

محمود واحد کئی دن تک اس مسئلے پر غور کرتا رہا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ سب کی نفی کر کے کوئی مقام نہیں حاصل کر سکتا۔ اگر اسے کوئی مقام حاصل کرنا ہے اور ان کے درمیان اپنی جگہ بنانی ہے تو اسے ان سب کو ساتھ لے کر چلنا ہو گا۔ ان سب کے مقام و مرتبے کو تسلیم کرنا ہو گا تب کہیں لوگ اس کی بات سنیں گے اور مانیں گے۔ اس کے مبلغوں اور داعیوں نے بھی اس کو یہی مشورہ دیا۔

اب اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ جو سلسلہ ابوالبشر آدمؑ سے شروع ہوا تھا' وہ سلسلہ جاری ہے یہاں تک کہ میں بھی اسی سلسلے کا ایک نبی ہوں۔ اب اس نے یہ بھی کہنا شروع کیا کہ سرورِ عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا تھا (میں اور علی ایک ہی نور سے پیدا ہوئے ہیں) اور اپنے مبلغوں سے یہ بھی کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے یہ بھی فرمایا تھا (اے علی تمہارا اور میرا گوشت اور تمہارا اور میرا جسم ایک ہی ہیں)۔

کچھ عرصہ یہ تبلیغ جاری رہی اور لوگوں کی سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ اس سے محمود واحد کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہتا ہے۔ اس سے تو حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کے مقام اور مرتبے ہی کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان میں کہیں بھی محمود واحد کا کوئی ذکر نہ تھا پھر یہ لوگ کس طرح محمود واحد پر ایمان لائیں گے۔ اس کے ارادتمندوں نے شکایتاً کہا "جناب! بات وہیں کی وہیں ہے لوگ پہلے بھی ان دونوں کی عظمت کے قائل تھے۔ اب آپ کے دو حوالوں نے ان دونوں کی حیثیتوں کو مزید مستحکم کر دیا۔ آپ اپنی بات کریں' اپنی حیثیت مستحکم کریں۔ اپنے مقام کا ذکر کریں تب بات بنے گی۔"

آخر ایک دن صبح اس نے اپنے ارادتمندوں کو جمع کیا اور کہا "اس دن میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کے حوالے سے جو باتیں کی تھیں شاید تم لوگوں نے ان کے معانی اور مطالب پر غور نہیں کیا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ میں ہر بات کھل کر صاف صاف کروں۔ کچھ باتیں کی جانے والی باتوں میں چھپی ہوئی ہوتی ہیں' ان چھپی ہوئی باتوں تک پہنچنا ہی انسانی بصیرت کا نقطۂ کمال ہوتا ہے۔ جب میں نے رسول مقبولؐ اور حضرت علیؓ کے حوالے سے دو باتیں تمہیں بتائی تھیں تو اس وقت اس کا صریح مطلب یہ تھا کہ بقیہ باتیں میرے بتائے بغیر تم خود ہی سمجھ لو گے لیکن تم لوگوں نے تو جیسے نہ سمجھنے کی قسم کھا رکھی ہے۔"

لوگوں نے عرض کیا "حضرت! ابھی تک تو ہم لوگ محض طالب علم ہیں جب استادی مقام حاصل ہوگا تو شاید ہمیں کسی سے کچھ پوچھنا نہ پڑے۔"

محمود واحد کو ان پر رحم آگیا اور کہا "ٹھیک ہے اگر تم لوگوں نے میرے مذکورہ حوالوں سے کچھ نہیں سمجھا تو اب سمجھ لو۔ جب میں نے تم لوگوں کو یہ بتایا تھا کہ محمدؐ اور علیؓ ایک ہی نور سے پیدا ہوئے ہیں اور یہ کہ محمدؐ کے جسم میں علیؓ کا جسم شامل ہے اور محمدؐ کے گوشت میں علیؓ کا گوشت۔ تو اس سے میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ جب انبیا و اولیا کے اجزائے اجساد کی صفوت و قوت مل گئی تو اس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کا جسم تیار ہوا اور پھر جب ان دونوں بزرگوں کے اجزائے جسم جمع ہوئے تو ان سے محمود کا جسم بنا اور جس محمود کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ میں خود ہوں۔ ماضی میں جو نور، جسم اور گوشت دو حصوں میں تقسیم ہوگئے تھے اب وہ درجۂ کمال کو پہنچ کر جسم واحد کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ میں محمود واحد ہوں مذکورہ نور کا کمال اور مذکورہ اجسام اور گوشت کی واحد شکل۔"

اس دعوے نے کسی قدر تہلکہ مچادیا اور محمود کے ارادتمند پھولے نہ سمائے۔ ان کے پاس ایک ایسی دلیل آگئی تھی کہ وہ اس دلیل پر اترانے لگے اور لوگوں سے فخریہ کہنا شروع کیا "وہ نور جو ماضی میں دو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا تھا آج اس نے ایک شکل اختیار کرلی ہے۔ دو جسموں نے ایک قالب میں ظہور کیا ہے اور دو گوشت و پوست ایک فردِ واحد میں جمع ہوگئے کیوں کہ خدا واحد ہے اور احدیت اس کا کمال ہے۔ اسے خود بھی دوئی پسند نہیں۔ اب اس نے نبوت کو بھی احدیت کی شکل دے دی ہے۔ اس طرح محمود واحد عظمت و مقام کی اس بلندی پر پہنچ چکا ہے جہاں کوئی اور نہیں پہنچ سکا۔"

یہ دلیلیں اور اندازِ تکلم ایسے پُراثر تھے کہ ان کا لوگوں پر حیرت انگیز اثر ہوا۔ لوگ اس پر ایمان لانے لگے گویا عارضی اور وقتی طور پر ایران عرب پر غالب ہوتا نظر آرہا تھا اور ایرانی اس برتری پر بہت خوش تھے۔

جب محمود واحد نے یہ دیکھا کہ لوگ اس کی باتیں غور سے سنتے اور برداشت کرتے ہیں تو اس نے اپنے دعوے میں مزید اضافہ کیا اور اعلان کردیا "اب دینِ اسلام منسوخ ہوچکا ہے اور یہ دینِ محمودی کا دور ہے' زمینوں اور آسمانوں میں اب اسی دین کا چلن ہے۔" اس نے یہاں تک جسارت کی کہ سب کے سامنے علی الاعلان کہہ دیا "عربوں کے لیے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی باعثِ صد فخر و مباہات تھی اور اسی فضیلت کی وجہ سے اہلِ عرب کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن میری بعثت پر عرب کا وہ فخر ایک قصۂ پارینہ ہوگیا۔"

اب یہ لوگ نہایت زور و شور سے دینِ محمودی کی اشاعت اور ترویج میں مصروف ہوگئے۔ اس کے ارادتمند گلی گلی کوچے کوچے اور بازاروں میں یہ اعلان کرتے پھر رہے تھے کہ دینِ اسلام منسوخ ہوا اور دینِ محمودی رائج ہوا' عربوں کی برتری ختم ہوئی اور ایران اپنے شاندار ماضی کی طرح شاندار مستقبل کی طرف رواں دواں ہے اب ایران ہی دنیا کی رہنمائی کرے گا۔

محمود قرآنی آیات میں اپنے لیے پیش گوئیاں اور بشارتیں تلاش کرتا رہتا تھا کیوں کہ اس کو اندازہ ہوچکا تھا کہ لوگ اسلام اور قرآن کے حوالے سے جو بات سنتے ہیں اس پر غور کرتے ہیں اور اس پر توجہ بھی دیتے ہیں اور بات میں اثر پذیری پیدا ہوجاتی ہے۔

اس جستجو اور کوشش کے دوران اسے ایک مفید مطلب آیت مل گئی۔ اس نے اعلان کیا "جسدِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کمال کو پہنچ گیا تو میں پیدا ہوا جیسا کہ قرآن پاک کی اس آیت میں کہا گیا ہے (اے محمدؐ آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود میں جگہ دے رہا ہے) اس میں میری ہی بعثت کا ذکر ہے۔"

اس آیت سے گرم بازاری پیدا ہوگئی۔ اب اس کے حامی اور ارادتمند نہایت زور و شور سے محمود کے لیے کام کرنے میں مشغول ہوگئے۔ محمود کو کہیں سے یہ نکتہ ہاتھ آگیا تھا کہ نفی کسی بھی رہنما' مصلح اور مدعی کے لیے موت ثابت ہوتی ہے' اقرار اور تائید سے مدعی کو اپنی کوششوں میں بڑی مدد ملتی ہے۔ چنانچہ اس نے کسی کے وجود اور اس کے برتر مقام کو ختم نہیں کیا اس نے کسی نبی کو بھی ہدفِ تنقید نہیں بنایا لیکن ماضی کے نبیوں' رسولوں اور اماموں کی حد بندی کردی۔ ان کے زمانے کو محدود کردیا۔ چنانچہ وہ جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتا تو یہی کہتا کہ ماضی کے دوسرے دینوں کی طرح اسلام کو بھی ایک خاص مدت کے لیے بھیجا گیا تھا اور اب میرے آنے کے بعد اسلام کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ جو لوگ اب بھی میرا انکار کرتے ہیں اور اسلام پر قائم رہتے ہیں وہ گمراہ ہیں' گناہ گار ہیں ان کی روزِ حشر بخشش نہیں ہوگی اور ان کا سخت مواخذہ ہوگا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود محمود کا ذہن صاف نہیں تھا۔ اس نے ایشیا کے دوسرے ادیان کا بھی مطالعہ جاری رکھا تھا اور جہاں سے بھی اس کو کوئی مفید مطلب بات ملتی کسی حوالے کے بغیر اپنے طور پر اس کا پرچار شروع کردیتا۔

معلوم نہیں اس نے یہ عقیدہ کہاں سے لیا کہ کہنا شروع کردیا "جب عناصر میں قوت پیدا ہوتی ہے تو اسے معدنی صورت حاصل ہوجاتی ہے پھر اس کی استعداد مزید ترقی کرتی ہے تو اس وقت وہ نباتی صورت میں فائض ہوجاتی ہے پھر قوت کو اور زیادہ ترقی و نمو حاصل ہوتی ہے تو اسے حیوانی صورت مل جاتی ہے پھر ان عناصر کی قوت اس سے بھی آگے اور ترقی کرتی ہے تو اسے انسانی صورت بخشی جاتی ہے۔ پھر ان عناصر نے جن کو انسانی صورت حاصل ہوچکی تھی' ایسی ترقی کی کہ اس سے انسان کامل ظہور میں آیا۔ یعنی جسدِ انسانی کے اجزا حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام کے زمانے سے ترقی میں تھے۔ یہاں تک کہ ان کو درجۂ محمدیؐ عطا ہوا۔ اس کے بعد جب یہ اجزا اصاف و

شفاف ہو کر انتہائی کمال کو پہنچ گئے تو محمود کی شکل میں ظاہر ہوئے۔" محمود خاک کو نقطہ کہتا تھا۔ اس کے نزدیک تمام عناصر خاک سے پیدا ہوئے اور نقطۂ خاک ہی واجب اور مبدء اول ہے۔ اس کا یہ قول بھی تھا کہ سورج آگ ہے' چاند پانی اور آسمان ہوا ہے۔

ان تعلیمات نے محمود واحد کے ماننے والوں میں احساسِ برتری پیدا کر دیا تھا چنانچہ یہ لوگ جب بھی کسی مسلمان ایرانی یا عربی سے ملتے تھے تو خود کو ان سے برتر سمجھتے تھے۔ ان کا ان کے ساتھ رویّہ اور سلوک جانب دارانہ ہو جاتا تھا۔ یہ صورتِ حال جھگڑے کی شکل اختیار کر جاتی تھی اور دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جاتے تھے۔ مسلمان تو ان گمراہ اور فاسدانہ عقائد کے حاملین کو..... گردن زدنی سمجھتے تھے اور ہر وقت ان کے قتل پر آمادہ رہتے تھے۔ حالانکہ سرزمینِ ایران نے اس نئے دین کو بڑی سہولتیں اور چھوٹ دے رکھی تھی اور ان ہی سہولتوں اور چھوٹ کی وجہ سے یہ دین خوب پھل پھول رہا تھا۔

عناصر کے قوت پکڑنے اور نت نئی صورت اختیار کرنے کے عقیدے نے محمود کے ارادتمندوں میں ایک ہلچل مچا رکھی تھی اور ہر کوئی خود کو دوسروں سے بڑا سمجھنے لگا تھا۔ یہ لوگ ماضی کے بڑے لوگوں کے حالاتِ زندگی پڑھتے' انکے کارناموں پر نظر ڈالتے اور فوراً اس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ وہ خود ان کی ترقی یافتہ شکل ہیں۔ کوئی دانیال نبی سے بڑھ جاتا کوئی حضرت لوط علیہ السلام و شیث علیہ السلام سے آگے نکل جاتا۔ کسی نے حضرت ادریس علیہ السلام کو پیچھے چھوڑ دیا اور کوئی خود کو حضرت یونس علیہ السلام کا ترقی یافتہ مجسم قرار دیتا۔ اگر کسی کو غیر معمولی حسن عطا ہو گیا تھا تو وہ حضرت یوسف علیہ السلام سے آگے نکل گیا' گویا یہ زمانہ انبیا سلف کی نشاۃ ثانیہ کا تھا۔

جس چیز نے محمود اور اس کے ماننے والوں کو بے بس کر رکھا تھا وہ اقتدار تھا۔ اقتدار اسلام اور مسلمانوں کو حاصل تھا۔ وہ اس گراہی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان پر سختیاں کی جانے لگیں۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ انہوں نے اپنے نئے دین کو چھپالیا۔ یہ اندر سے محمودی دین کے پیرو ہوتے اور بظاہر مسلمان نظر آتے لیکن جب آپس میں ملتے تو خوشیاں مناتے اور رنگ رلیوں میں وقت گزار دیتے۔ ان کے جھوٹے نبی نے اسلام پر خطِ تنسیخ تو پھیر ہی دیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں شعائرِ اسلامی سے نجات حاصل ہو گئی اور اب نہ تو وہ نماز پڑھتے تھے اور نہ روزے رکھتے تھے' اب انہیں حج کی بھی زحمت گوارا نہیں کرنا پڑتی تھی۔

عربوں نے جب اس نئی مصیبت کا ذکر سنا تو انہوں نے ان کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ بغداد کے عباسی خلیفہ نے محمود کو مناظرے کے لیے بغداد طلب کیا مگر محمود نے روپوشی اختیار کی اور ہمیشہ مناظروں سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔

محمود کا کہنا تھا کہ مناظرے میں مسلمان جبر و زبردستی سے کام لیں گے اور اس کا بھی امکان ہے کہ اسے گرفتار کر کے قید کر دیا جائے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو اس سے پورے ایران میں بدامنی کی فضا پیدا ہو جاتی اور اس کے ایرانی بھائی دونوں طرف سے مارے جاتے۔

اب محمود نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو اب ایران کے مفاد ہی میں کام ہو گا۔ وہ جب بھی سنتا کہ ایران میں دونوں مذاہب آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں تو وہ اپنے ارادتمندوں کو بیچ بچاؤ کے لیے بھیج دیتا اور اس جھگڑے کو ختم کروا دیتا۔ محمود کہتا رہتا کہ ایرانی آپس میں ہرگز نہ لڑیں اور کوشش کریں کہ ایران عربوں کے مقابلے میں اس طرح آئے کہ عربوں کا اثر و نفوذ ختم ہو جائے۔ جس دن ایرانی اس میں کامیاب ہو گئے ان کی گردن سے عربوں کی غلامی کا جوا اتر جائے گا اور ایران شاندار مستقبل کی راہوں پر گامزن ہو جائے گا۔

ان باتوں کا یہ اثر ہوا کہ ایرانی اور عرب ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ یہ دوری پہلے بھی موجود تھی لیکن اب اس میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا۔ عربوں نے ایران میں شاہراہِ عام پر نکلنا چھوڑ دیا کیوں کہ اب عرب ایران میں کہیں بھی محفوظ نہیں تھے۔ اس انتشار کا فائدہ ایران نے اٹھایا اور جو بھی عرب ایران چھوڑتا اس کی جگہ کوئی ایرانی لے لیتا۔

اس رنگ میں پورا ایران رنگ گیا اور وہ ایران پر اپنی حکمرانی کا خواب دیکھنے لگے۔

محمود اور اس کے ارادتمندوں کو سب سے زیادہ یہی بات پریشان کرتی تھی کہ ایران کے بڑے بڑے شہروں میں غیر ایرانی موجود تھے۔ مدرسے ان کے تھے۔ مکتب ان کے تھے۔ فلاحی ادارے ان کے تھے۔ بڑے بڑے شہروں میں خاص ایرانی بھی عربوں ہی کے عقیدے پر قائم تھے جس کی وجہ سے ایران اسلام اور مسلمانوں کا مددگار بن کر رہ گیا تھا۔

○☆○

گیلان کے حاکم کو حکم پہنچا کہ محمود واحد کو گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا جائے۔

اب محمود کی تلاش شروع ہو گئی۔ جگہ جگہ چھاپے مارے گئے لیکن کہیں سے بھی محمود ہاتھ نہ آیا۔ محمود کی ذات ایک روایتی آدمی جیسی ہو گئی تھی جس کا ذکر تو ہر زبان پر تھا اور بچہ بچہ اس کے نام سے واقف تھا لیکن اس کے وجود کا کوئی پتا نہ تھا۔ روایتی پرندے' ہما کی طرح' آگ کے کیڑے ققنس کی طرح کہ جو روایات میں تو موجود ہیں مگر کہیں نظر نہیں آتے۔ آبِ حیات اور دیوارِ قہقہہ کی طرح کہ ان کا ذکر تو ہر زبان پر ہے' کتابوں میں ہے' شاعری میں ہے مگر یہ دنیا میں کہاں پائے جاتے ہیں کوئی نہیں جانتا۔

محمود واحد کو بہت تلاش کیا گیا مگر اس کا کہیں پتا نہ چلا اور حکام یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ محمود واحد نامی کوئی شخص موجود بھی ہے یا یہ بھی کوئی روایتی اور فرضی نام ہے۔ کئی آدمی اس نام کے گرفتار کیے گئے اور انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ وہ محمود واحد ہیں مگر بعد میں وہ کوئی اور ہی نکلے۔ ان لوگوں سے گفتگو کی گئی اور ان کی علمی سطح کو جانچا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ معمولی لوگ ہیں۔

آخر محمود واحد کے پیروؤں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ یہ پیرو تناسخ کے بھی قائل تھے کیونکہ محمود واحد نے یہ مسئلہ یقین کے ساتھ اپنے ارادت مندوں کے دل و دماغ میں بٹھا دیا تھا کہ انسان بار بار اس دنیا میں آتا رہتا ہے چنانچہ اس کی کئی پہچانیں بھی بتائی گئیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جب کوئی انسان کسی شے کی طرف ضرورت سے زیادہ راغب ہوتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس کے پچھلے جنم سے اس کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ کسی نے غیر ارادی طور پر مچھلی کا ذکر کر دیا تو وہ اس کے دو مطلب لیتے تھے ایک تو یہ کہ مچھلی کا ذکر کرنے والا اپنے سابقہ جنم میں مچھلی رہا ہو گا یا پھر وہ اپنے پچھلے جنم میں یونس پیغمبر رہا ہو گا۔

یہ لوگ جب بھی پکڑے جاتے اور ان کو علما کے سامنے پیش کیا جاتا تو یہ عالموں کی شکلیں دیکھ دیکھ کر خوب ہنستے اور آپس میں تجزیہ کرتے کہ جس عالم سے واسطہ پڑا ہے وہ اپنے سابقہ جنم میں کیا رہا ہو گا۔ اگر عالم کی ناک طوطے جیسی ہے تو یہ طے شدہ امر تھا کہ یہ عالم اپنے پچھلے جنم میں طوطا رہا ہو گا۔ کسی کی آنکھیں ہرن جیسی ہوتیں تو اس کے بارے میں یہ کہہ دیا جاتا کہ وہ پچھلے جنم میں ہرن رہا ہو گا۔

یہ لوگ آپس میں ملتے تو اسی حوالے سے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور دوسروں کو بھی اسی حوالے سے پہچاننے کی کوشش کرتے گویا اب وہ دین جو ایرانیوں کو شاندار مستقبل کی طرف لے جانا چاہتا تھا' اب وہ آہستہ آہستہ توہمات اور فضولیات کا شکار ہو گیا تھا۔ ان سے کسی اعلیٰ بات کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔

جب محمود واحد کی تلاش میں ایک شخص کو گرفتار کیا گیا اور اسے گیلان کے حاکم کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ حاکم کو دیکھ کر بہت ہنسا کیوں کہ حاکم ایک پستہ قامت شخص تھا اور گرفتار ہونے والا شخص بھی پستہ قامت تھا۔ دونوں باتیں بہت کرتے تھے اور دونوں ہی اپنے آقا کے بے حد وفادار تھے۔ اسی وفاداری کے پیش نظر اس شخص نے خود کو محمود واحد ظاہر کر کے گرفتار کروا دیا تھا اور گیلان کے حاکم کی وفاداری کا علم اس طرح حاصل ہوا کہ اس نے گرفتار ہونے والے فرضی محمود واحد سے اپنی پہلی ملاقات ہی میں یہ کہہ دیا کہ وہ بغداد کے خلیفہ کا ایک ادنیٰ کارکن ہے۔ یہاں تک کہ اگر خلیفہ اسے حکم دے کہ وہ اس کے احکام کی بجا آوری میں اپنی جان قربان کر دے تو وہ اپنی جان قربان کر دے گا۔ حاکم نے اس کو یہ بھی بتایا "میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں محمود واحد کو ہر حال میں گرفتار کر کے رہوں گا اور بالآخر میں نے اسے گرفتار کر لیا۔ میں خلیفہ کے اس حکم کی بجا آوری میں اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔"

فرضی محمود واحد حاکم کی باتیں سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔ حاکم کو اس کی مسکراہٹ پر غصہ آ رہا تھا' پوچھا "تو اپنی گرفتاری سے خوش ہے؟"

اس نے جواب دیا "میں بہت خوش ہوں۔"

حاکم نے حیرت سے پوچھا "تو اپنے انجام سے واقف ہے؟"

اس نے جواب دیا "خوب اچھی طرح۔"

حاکم نے پوچھا "بتا تیرا کیا انجام ہو گا؟"

اس نے جواب دیا "زیادہ سے زیادہ یہ کہ مجھے قتل کر دیا جائے گا۔"

حاکم کو اس کے اطمینان پر حیرت ہو رہی تھی۔ "کمال ہے کہ تجھے موت سے ڈر نہیں لگتا۔"

اس نے جواب دیا "جان دار کی موت ایک عارضی تعطل ہوتا ہے کیوں کہ مرنے والا کسی نہ کسی شکل میں دوبارہ واپس آ جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں موت سے نہیں ڈرنا چاہیے۔"

حاکم عرب تھا اس لیے وہ اس مسئلہ تناسخ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا' پوچھا "میری سمجھ میں اب بھی یہ بات نہیں آئی کہ تو مرنے کے بعد کس طرح دوبارہ پیدا ہو جائے گا؟"

اس نے جواب دیا "یہ ہمارے آقا و مولا محمود واحد کا عقیدہ ہے کہ جان دار بار بار آتا اور جاتا رہتا ہے۔"

حاکم نے حیرت سے پوچھا "یعنی تو کئی بار پیدا ہو چکا ہے؟"

اس نے جواب دیا "ہاں۔ میں موجودہ انسانی شکل میں آنے سے پہلے کُتّے کی شکل میں موجود تھا۔"

حاکم کو اس کی باتوں میں مزہ آ رہا تھا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کے سامنے کھڑا ہوا آدمی کُتّے کی شکل میں بھی آ چکا ہے تو اسے بڑی ہنسی آئی اور کسی قدر کراہت بھی ہوئی کہ وہ خود کو کتا کہہ رہا ہے اور کتا نجس العین ہوتا ہے اور اس شخص کو اپنے نجس العین ہونے پر فخر ہے۔ یہ کیسا ایرانی ہے؟ فرضی محمود واحد نے اس کو سمجھایا "دیکھ! کوئی شے بھی فنا نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ جو نباتات و جمادات ہیں وہ بھی اپنے اپنے وجود کو بدلتے رہتے ہیں اور فنا نہیں ہوتے۔"

حاکم نے پوچھا "تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں تو مجھے صرف یہ بتا کہ تو محمود واحد ہے یا نہیں۔"

اس نے جواب دیا "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں خود کو محمود واحد ظاہر کروں اور میں نے یہ اعلان کر دیا کہ میں محمود واحد ہوں اور حکومت کی ہر آزمائش اور کسوٹی پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

حاکم شش و پنج میں پڑ گیا کہ وہ اس پاگل کو بغداد روانہ کرے یا چھوڑ دے کیوں کہ یہ بات سمجھ میں آ چکی تھی کہ گرفتار ہونے والا شخص

محمود واحد نہیں ہے۔ کئی دن گرفتار رکھنے کے بعد اس کو چھوڑ دیا گیا۔

اب بھی حاکم شہر کو یہ بات کھٹک رہی تھی کہ گرفتار ہونے والے شخص نے اپنے ساتھ حاکم شہر کو بھی کتا قرار دے دیا تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ فرضی محمود واحد کو اس کی فضول گوئی اور بکواس پر سزا دی جائے پھر بھی اس معاملے کو اتنی عجلت میں نہیں ختم کرنا چاہیے تھا لیکن اس کو حیرت اس بات پر تھی کہ ایسے بے ہودہ خیالات اور عقائد کے نبی پر لوگ کس طرح ایمان لے آئے اور پامردی سے اس پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ اب تو حاکم گیلان کا یہ طریقہ ہو گیا تھا کہ وہ ہر روز اس کو بلواتا اور کسی نہ کسی سے ملواتا "ان کتے صاحب سے ملیے۔ یہ آدمی بننے سے پہلے کتا تھا اور اب دوبارہ کتا بننے کی فکر میں ہے۔" حاکم کے ملاقاتی اور دوست مسکراتے اور اس بے دین سے باتیں کرکے لطف اندوز ہوتے۔ وہ ہر ایک کے بارے میں یہ جانتا تھا کہ وہ پچھلے جنم میں کیا تھا۔ کسی کو بلی بتاتا' کسی کو گدھا' کسی کو سؤر' کسی کو ریچھ' کسی کو زیبرا تو کسی کو لومڑی اور اپنی اس رائے پر اسے یقین کامل ہوتا۔ اسی فرضی محمود واحد کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جس کے کاندھوں پر ایک دھاری دار بڑا رومال پڑا ہوا تھا۔ یہ شخص مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کرکے گیلان آیا تھا اور بغداد سے ایک فرمان بھی لایا تھا کہ جو بھی محمود واحد ہونے کا دعویٰ کرے اسے گرفتار کرکے بغداد بھیج دیا جائے۔ اس زائر کو بھی فرضی محمود واحد سے ملوایا گیا۔ اس وقت زائر کے شانے پر ایک دھاری دھار رومال پڑا ہوا تھا۔

فرضی محمود واحد کی نظر اس رومال پر پڑی تو وہ مسکرایا اور رومال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "تو نے یہ رومال کیوں خریدا؟"

زائر نے جواب دیا "مجھے یہ پسند تھا' اس لیے خرید لیا۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

فرضی محمود واحد نے جواب دیا "میں اس رومال کو دیکھ کر یہ بتا سکتا ہوں کہ تو آدمی کے جسم میں آنے سے پہلے کیا تھا؟"

زائر کو فکر ہوئی کہ وہ معلوم کرے کہ وہ آدمی بننے سے پہلے کیا تھا' پوچھا "اگر میں آدمی بننے سے پہلے کچھ تھا تو بتا میں کیا تھا؟"

فرضی محمود واحد نے اس سے پوچھا "تو نے کبھی گورخر دیکھا ہے؟"

زائر نے جواب دیا "میں نے گورخر کبھی نہیں دیکھا' نام سنا ہے۔"

فرضی محمود ہنسنے لگا "بس یہی تو کمال ہے کہ تو نے جس چیز کو دیکھا ہی نہیں' تجھے وہ چیز بہت پسند ہے۔"

زائر نے کہا "یہ تجھ کو کس طرح معلوم ہوا کہ مجھے گورخر پسند ہے؟"

فرضی محمود نے رومال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اگر تجھ کو یہ دھاری دار رومال پسند آگیا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تجھ کو گورخر بہت پسند ہے کیوں کہ گورخر کے جسم پر بھی اسی قسم کی دھاریاں ہوتی ہیں۔"

زائر کو بڑا غصہ آیا اور اس نے اپنا دھاری دار رومال کھینچ کر ایک طرف پھینک دیا اور کہا "اگر اس رومال سے میں گورخر بن گیا ہوں تو اس رومال پر لعنت۔ آئندہ میں اس کو اپنے شانے پر نہیں ڈالوں گا۔"

فرضی محمود اب بھی ہنس رہا تھا' کہنے لگا۔ "اب تو اس رومال کو پھینکے' کسی کو دے دے یا رکھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نادانستگی' لاعلمی اور غیرارادی طور پر تو نے اپنی جس پسند کا اظہار کیا ہے اسی کا تیرے پچھلے جنم سے تعلق تھا۔"

زائر نے باہر نکل کر حاکم شہر سے پوچھا "یہ شخص کون تھا؟"

حاکم نے جواب دیا "یہ خود کو محمود واحد کہتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ جھوٹا ہے۔"

زائر نے پوچھا "کیا اسے بغداد بھیجا جائے گا؟"

حاکم نے کہا "ضرور بھیجا جائے گا کیوں کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اس نام کے جتنے دعوے دار ہوں سب کو بغداد بھیج دیا جائے۔"

زائر نے کہا "لیکن یہ تو پاگل ہے۔ خلیفہ اور وزیر اس سے بات کرکے پاگل ہو جائیں گے۔"

حاکم نے اپنی مجبوری ظاہر کی "میں تو خلیفہ اور وزیر کے حکم کا پابند ہوں۔ جیسا حکم ملے گا اس کی تعمیل کی جائے گی۔"

○☆○

ان لوگوں کا مراق اتنا بڑھا اور ان کی موشگافیوں میں اتنا اضافہ ہوا کہ ان کی ساری قابلیت اگلے پچھلے جنم کے ذکر میں ضائع ہونے لگی اور شہروں میں پچھلے جنم کے جاننے کا خبط اتنا بڑھا کہ لوگ جوق در جوق محمود واحد کے مبلغوں' داعیوں اور عالموں سے اس لیے ملاقاتیں کرنے لگے کہ انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ آدمی بننے سے پہلے کیا تھے؟

لوگ محمود واحد کی تلاش میں آوارہ و سرگرداں رہتے اور جب ان کو ایسا شخص مل جاتا جس کا تعلق محمود واحد کے دین' عقیدے' فلسفے اور شعبدے سے ہوتا تو اس سے ہر شخص یہی پہلا سوال کرتا کہ بتاؤ میں پچھلے جنم میں کیا تھا؟

اس بھیڑ بھاڑ کو محمود واحد اپنے دین کی کامیابی سمجھتا تھا۔ چالاک اور ذہین گروہ بھی لوگوں نے خود ہی یہ بتانا اور اندازہ لگانا شروع کر دیا تھا کہ ان کے سامنے موجود انسان پچھلے جنم میں کیا تھا۔

ایک بھدے موٹے موٹے ہونٹوں' سیاہ رنگت' گھنے' موٹے اور سخت بالوں والا شخص فرضی محمود واحد سے ملا اور کہا "آپ بتائیں کہ میں پچھلے جنم میں کیا تھا؟"

یہ زنگی جب بات کرتا تھا تو اس کے موتیوں جیسے دانت نمودار ہو جاتے تھے اور اس نے جو سفید لباس پہن رکھا تھا اس کی رنگت دانتوں سے مل جاتی تو یہ زنگی کوئی اور ہی مخلوق معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنے کاندھے پر ایک سیاہ رومال بھی ڈال رکھا تھا۔

فرضی محمود اسے دیکھ کر کچھ دیر مسکراتا رہا اور کہا "تجھے کون سا رنگ سب سے زیادہ پسند ہے؟"

زنگی نے جواب دیا "مجھے جو رنگ پسند ہے اس پر مجھے اختیار نہیں ہے۔ مجھ کو میری سیاہ رنگت نے بہت پریشان کیا ہے اگر میرا بس چلتا تو میں سفید رنگت اختیار کرتا۔"

فرضی محمود نے کہا "لیکن تیرے کاندھے پر تو سیاہ رنگ کا رومال پڑا ہوا ہے؟ جو ظاہر ہے تیری مرضی اور تیری پسند ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ انسان بننے سے پہلے تو سنگِ مرمر کے سلسلوں کے درمیان سنگِ اسود کی شکل میں رہتا تھا اور جب قدرت نے سنگِ اسود کو انسانی شکل دی تو تو زنگی انسان بن گیا۔ کیوں کہ تو انسان بننے سے پہلے سنگِ مرمر کے درمیان رہتا تھا اس لیے تجھے سفید رنگ بھی بہت پسند ہے اور تو ہمیشہ سفید لباس اور سفید بستر کو دوسرے رنگوں پر ترجیح دے گا۔"

اس زنگی کو یہ جان کر دکھ پہنچا کہ وہ پچھلے جنم میں سنگِ اسود تھا۔ وہ فرضی محمود کے پاس سے اٹھ کر خاموشی سے ایسی جگہیں تلاش کرتا رہا جہاں سنگِ مرمر کے کوہستانی سلسلے ہوں اور ان سلسلوں کے درمیان سنگِ اسود بھی پائے جاتے ہوں۔ اب یہ زنگی کسی قدر مخبوط الحواس ہو گیا تھا۔

حالاں کہ فرضی محمود نے زنگی کو بتایا تھا "دیکھ! جب تک تو ہمارے آقا و مولا پر ایمان نہیں لائے گا تجھ کو اپنی منزل نہیں ملے گی۔" زنگی کو جو بات معلوم کرنا تھی، وہ تو معلوم ہو چکی تھی۔ اس لیے اب محمود واحد کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔

جن ماننے والوں اور ارادت مندوں کی رسائی محمود واحد تک تھی، وہ اپنے فرضی نبی کے پاس سے نئی نئی خبریں اور معلومات لایا کرتے تھے اور یہ معلومات کسی تخصیص کے بغیر مذہب و ملت کے پیرو تک پہنچا دی جاتی تھیں۔ چنانچہ اس کا ایک داعی یہ عجیب و غریب خبر لے کر آیا کہ ہمارا جس آدم سے تعلق ہے وہ چونسٹھ ہزار سال قبل دنیا میں آیا تھا۔ یہ اپنی دانست میں عجیب و غریب خبریں لانے والے کسی مکان میں جمع ہو جاتے۔ وہاں بے ضرر دوسرے لوگوں کو بھی جمع ہونے کی دعوت دیتے۔ جب خاصی تعداد میں لوگ جمع ہو جاتے تو کوئی واحدیہ کھڑا ہو جاتا اور اپنی تقریر شروع کر دیتا۔ ایک ایسے ہی موقعے پر ایک کم رو واحدیہ کھڑا ہوا اور اعلان کیا "لوگو! آج میں تمہیں وہ بات بتاؤں گا جو آج تک کسی نے کسی کو نہ بتائی ہو گی۔"

لوگوں کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ واحدیہ نے کہا "ہمارے آدم کو گزرے ہوئے چونسٹھ ہزار سال ہو گئے۔ آج میں نے سیدنا محمود واحد سے پوچھا کہ اپنے آدم سے پہلے یہ دنیا کن لوگوں سے آباد تھی تو مجھے بتایا گیا کہ آدموں کی آمد تواتر سے جاری ہے۔ آدم سے پہلے بھی آدم تھے اور اس آدم سے پہلے بھی آدم تھے گویا ہر آدم کا زمانہ چونسٹھ ہزار سال ہوتا ہے اور یہ سلسلہ مدتوں سے جاری ہے۔"

اس عجیب و غریب انکشاف نے لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا اور وہ اس عقیدے پر اس طرح ایمان لے آئے گویا اس سے سچی کوئی اور بات ہو ہی نہیں سکتی۔ اور کچھ عرصے بعد وہی واحدیہ لوگوں میں واپس آیا تو اس نے لوگوں کو ایک مکان میں جمع کیا اور کہا "لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ جب کوئی ذی روح مر کر مٹی میں مل جاتا ہے تو وہ کہاں جاتا ہے؟"

لوگوں نے لاعلمی ظاہر کی "ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ بظاہر تو وہ فنا ہو جاتا ہے۔"

واحدیہ نے کہا "نہیں، یہاں کوئی چیز فنا نہیں ہوتی بلکہ اپنی شکلیں بدلتی رہتی ہے۔"

لوگوں کی سمجھ میں واحدیہ کا یہ فلسفہ بالکل نہیں آیا۔ ہر شخص واحدیہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

واحدیہ نے کہا "قدرت کا عمل کسی توقف کے بغیر جاری ہے، یہ ایک نہ رکنے والا سلسلہ ہے۔ آج جس کو ہم جس صورت میں دیکھ رہے ہیں کل جب اس کی موت واقع ہو جائے گی تو اس کی شکل بھی بدل جائے گی اور ہم اسے ہرگز پہچان نہیں سکیں گے۔"

بات ابھی تشنہ تھی، لوگ اس نئے اور انوکھے عقیدے کو تفصیل سے جاننا چاہتے تھے اور ہر شخص کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی تھی کہ آخر وہ مر کر کہاں جائے گا؟ یا وہ کون سی شکل اختیار کرے گا؟

واحدیہ نے جو کچھ محمود واحد سے سنا تھا ان سب کے سامنے بیان کر دیا "لوگو! جب کوئی ذی روح مر کر مٹی میں مل جاتا ہے تو اس کے بدن کے اجزا نباتات و جمادات کی صورت میں ظہور کرتے ہیں اور وہ نباتات انسان یا جانور کی غذا بن کر پھر انسان یا حیوان کی شکل میں نمودار ہو جاتا ہے اور جب کوئی جسم انسانی سے حیوانی میں اور حیوانی سے نباتی میں اور نباتی سے جمادی میں یا اس کے برعکس تناسخ کرتا ہے تو اس کے اگلے جنم کی باتیں دوسرے جنم میں پہچان لی جاتی ہیں اور اس شناخت کا قاعدہ یہ ہے کہ اس کے پچھلے جنم میں جو عادات ہوتی ہیں ان سے اگلے جنم کی عادات معلوم ہو جاتی ہیں اور جو شخص ایسی شناخت رکھتا ہو اسے ممی کہتے ہیں۔ یہ ممی دوسروں کو بھی بتا سکتا ہے کہ وہ پچھلے جنم میں کیا تھا؟"

لوگوں کو جستجو ہوئی کہ ممی کا پتا چلایا جائے تاکہ اس سے اپنے پچھلے جنم کے بارے میں معلوم کیا جائے۔

کچھ عرصہ تو یہ پریشانی رہی کہ لوگوں کو ممی نہیں ملتا تھا لیکن پھر یہ ممی نظر آنے لگے اور انہوں نے یہ طریقہ وضع کیا کہ یہ مہینے میں

ایک بار کسی عظیم الشان عمارت میں جمع ہو جاتے۔ یہ جس کمرے یا ہال میں بٹھائے جاتے تھے اسی سے متصل ایک دوسرا ہال بھی ہوتا تھا۔ ممی دونوں ہالوں کو ملانے والے دروازے پر کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا اور پھر لوگوں کو حکم دیتا کہ ایک ایک آدمی ممی کے پاس جائے اور موالید ثلاثہ میں سے ایک کا نام لیتا جائے۔ اگر کسی نے پوچھا "یہ موالید ثلاثہ کیا ہوتی ہے؟" تو ممی جواب دیتا "موالید ثلاثہ کا مطلب ہے تین وہ شکلیں جن میں ذی روح ظہور کرتا ہے۔ ان میں سے ایک تو جمادات ہیں' دوسری نباتات اور تیسری جاندار۔"

لوگ موالید ثلاثہ کا مفہوم لکھ لیتے پھر ہر کوئی اس جستجو میں مبتلا ہو گیا کہ اپنے بارے میں معلوم کرے کہ وہ پچھلے جنم میں کیا تھا۔

شہر کی ایک عظیم الشان عمارت میں بہت سے شہری اکٹھا ہوئے اور ممی سے درخواست کی کہ انہیں ان کے پچھلے جنم سے آگاہ کیا جائے کہ پچھلے جنم سے پہلے وہ کیا تھے۔ ممی نے ہال میں موجود لوگوں سے درخواست کی کہ وہ صبر و سکون سے بیٹھیں اور جسے طلب کیا جائے وہ حاضر ہو جائے اور اسے جو کچھ بتایا جائے تو اگر وہ پڑھا لکھا ہے تو اسے لکھ لے اور اگر کوئی ان پڑھ یہ سمجھتا ہے کہ اسے جو کچھ بتایا جائے گا یاد نہیں رہے گا تو وہ کسی پڑھے لکھے سے لکھوا لے۔

ہال کی صفوں میں سب سے اگلی صف میں سب سے پہلا شخص وہ تھا جو فرضی محمود واحد سے ملاقات کر چکا تھا۔ اس کے کاندھے پر دھاری دار رومال پڑا ہوا تھا۔ ممی نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا "کیا بات ہے تو کچھ پریشان نظر آ رہا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا "جناب! میں جب تک یہ نہیں معلوم کر لوں گا کہ میں پچھلے جنم میں واقعی کیا تھا' مجھے چین نہیں آئے گا۔"

ممی نے کہا "تو موالید ثلاثہ میں سے کسی ایک کا نام لے لے۔"

اس شخص نے فوراً کہا "جاندار۔"

ممی نے دھاری دار رومال کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "یہ تجھ کو بہت پسند ہے؟"

اس نے جواب دیا "یہاں تو جو بھی حج کر کے آتا ہے یا کربلائے معلی کی زیارت سے فارغ ہوتا ہے اس کے کاندھے پر یہ رومال ضرور ہوتا ہے۔"

ممی نے جواب دیا "تو اپنے پچھلے جنم میں گلہری تھا۔"

یہ شخص چونک پڑا اور کہا "لیکن کچھ عرصہ پہلے تک تو مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ میں پچھلے جنم میں گورخر تھا اور آج آپ مجھے یہ بتاتے ہیں کہ میں گلہری تھا' ان دونوں جوابوں میں سے کسے درست سمجھوں؟"

ممی نے جواب دیا "میرا جواب درست ہے۔ کیوں کہ تیری چستی اور تیزی یہ بتاتی ہے کہ تو اپنے سابقہ جنم میں گلہری تھا۔"

اس کے بعد ممی نے اس شخص کو حکم دیا "تو ہال میں تیز تیز قدموں سے چل اور اچانک رک جانے کی کوشش کر۔"

اس شخص نے کئی بار تیز تیز قدموں سے چل کر دکھایا اور وہ جہاں چاہتا تھا اچانک رک جاتا تھا۔

کئی بار کے مشاہدے کے بعد ممی نے اعلان کر دیا "تو پچھلے جنم میں گلہری تھا کیوں کہ خرگوش کی طرح گلہری میں بھی یہ صفت پائی جاتی ہے کہ بھاگتے بھاگتے جہاں چاہے اچانک رک جائے اور گلہری میں یہ خوبی بھی پائی جاتی ہے کہ وہ پچھلے دو پیروں پر بیٹھ کر کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی ہے اور اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتی رہتی ہے۔ میں نے تجھ کو بیٹھے ہوئے کچھ کھاتے دیکھا ہے اور اس دوران تیری نظریں مسلسل اِدھر اُدھر کا جائزہ لے رہی تھیں جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ تو اپنے پچھلے جنم میں گورخر نہیں گلہری تھا۔"

ہال میں سے ایک دوسرا شخص اپنے کاندھے پر دھاری دار رومال ڈالے نمودار ہوا اور ممی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور کہا "اگر یہ سابقہ جنم میں گلہری تھا تو بتائیں کہ میں کیا تھا؟"

ممی نے کہا "موالید ثلاثہ میں سے کسی ایک کا نام لے؟"

اس شخص نے کہا "نباتات۔"

ممی نے فوراً جواب دیا "تب پھر تو اپنے پچھلے جنم میں دھاری دار خربوزہ تھا۔"

یہ خربوزہ مطمئن ہو کر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا... کہ خربوزے کی عمر کیا ہوتی ہے!

ممی کے پاس ایک گوری رنگت کا آدمی پہنچا اور اس سے اپنے پچھلے جنم کے بارے میں پوچھا "جناب! مجھے میرے بارے میں کچھ بتلائیں؟"

ممی اس کے رنگ برنگے لباس پر غور کرتا رہا "کیا تجھ کو اپنا یہ لباس بہت پسند ہے؟"

اس نے جواب دیا "مجھے ہمیشہ رنگ برنگے کپڑے پسند آتے ہیں اور خاص کر وہ رنگین کپڑے جن پر مختلف رنگوں کی گول گول چتیاں پڑی ہوں۔"

ممی نے پوچھا "تیرے غصے کا کیا عالم ہے؟"

اس نے جواب دیا "مجھ کو جب کسی پر غصہ آتا ہے تو میں اس کا دور تک پیچھا کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اس کا کام تمام کر دیتا ہوں۔"

ممی نے پوچھا "تیری اپنی دوڑ کا کیا عالم ہے؟"
اس نے جواب دیا "میں اپنے تمام ساتھیوں میں سب سے تیز دوڑتا ہوں۔ اگر کوئی پیدل دوڑنے والا مجھے پکڑنا چاہے تو نہیں پکڑ سکتا۔"
ممی نے کہا "تو مواليد ثلاثہ میں سے کسی ایک کا نام لے۔"
اس نے فوراً جواب دیا "جاندار۔"
ممی نے فی الفور جواب دیا "تو اپنے سابقہ جنم میں چیتا تھا۔"
یہ شخص اپنے سابقہ جنم کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا تھا مگر یہ جان کر کہ وہ پچھلے جنم میں چیتا تھا، بہت خوش ہوا۔ اس نے اقرار کیا کہ وہ اپنے دشمن کا تعاقب بالکل چیتے کی طرح کرتا ہے۔ اس کا دشمن کتنا ہی تیز بھاگے وہ اس کو پکڑ لیتا ہے اور جب پکڑ لیتا ہے تو اس کے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔
ممی نے کہا "ہمیں تیرے ہی جیسے لوگ درکار ہیں۔"
اس شخص نے اپنا خالی ہاتھ ہوا میں لہرایا اور کہا "جناب! آپ فکر نہ کریں، میں دو دن میں اپنی جیسی طبیعت رکھنے والے پچاس ساتھ جاں نثار مہیا کروں گا۔ اس کے بعد آپ لوگ اپنا یہ کام علی الاعلان کر سکیں گے۔ آپ کو اب بھی کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے کیوں کہ آپ لوگ تو آدمیوں کو ان کے پچھلے جنم سے پہچان لیتے ہیں۔"
اس دن ہال میں نوّے بانوے آدمی موجود تھے۔ ممی نے ان سب کو ان کے پچھلے جنموں کے بارے میں بتایا اور یہ امید کی کہ یہ سب دین محمودی کے لیے اپنی جانیں وقف کر دیں گے اور اس کو اس مقام تک پہنچا دیں گے جہاں کوئی دوسرا دین اس سے آنکھ ملا کر بات بھی نہیں کر سکے گا۔
اسی ہال میں یہ بھی طے پایا کہ دین محمودی کے پیرو اپنے ان حیرت انگیز کمالات کا مظاہرہ دوسروں کے سامنے کریں گے اور خصوصاً عربوں کے سامنے، کیوں کہ پوری دنیا کی باگ ڈور عربوں کے ہاتھ میں ہے اور اگر یہ عرب قابو میں آجائیں گے تو پوری دنیا قابو میں آجائے گی۔

○☆○

دین محمودی کے ممی مختلف شہروں میں پھیل گئے اور لوگوں کو شکار کرنے لگے۔ ان کا طریقۂ واردات کچھ عجیب تھا۔ وہ کسی کو بھی اچانک روک لیتے تھے۔ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اپنے مطلب پر آجاتے تھے۔ کسی کو خوش کرنے کے لیے بتا دیتے کہ وہ پچھلے جنم میں شیر تھا اور کسی کو ریچھ بتا دیتے۔ کسی کو ماضی کا کوئی بڑا آدمی قرار دے دیتے اور پھر اس کی حرکات و سکنات کو ذہن میں رکھ کر اس کا کسی بڑے انسان سے موازنہ کرتے۔ بتاتے کہ تو ماضی میں فلاں فلسفی تھا۔ کسی سے کہتے کہ تو فلاں سپہ سالار تھا۔ لوگ ان کی ان خبروں سے بہت خوش ہوتے تھے۔ اس طرح دین محمودی کو ان کے ممیوں نے بہت فائدہ پہنچایا۔
یہ جب عربوں سے ملتے تو کسی کو امراء القیس بنا دیتے اور کسی کو امیہ بن صلت، کسی کو ایک کوہان والا اونٹ اور کسی کو دو کوہان والا اونٹ، کسی کو گھوڑا بنا دیا تو کسی کو گدھا۔ عربوں میں نخلستان بہت مقبول تھے۔ اس کی نسبت سے انہیں کھجور کا درخت بہت پسند تھا۔ جب یہ کسی کو نباتات کے زمرے میں داخل کرتے تھے تو اسے اس کے سابقہ جنم میں کھجور کا کوئی درخت قرار دیتے۔
یہ سلسلہ ایک عرصے تک چلتا رہا اور یہ دین اسی طرح پھیلتا رہا۔
محمود واحد کا کہیں کوئی پتا نہ تھا مگر اس کا کام حیرت انگیز طور پر آگے بڑھتا جا رہا تھا، وہ خود کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔
آخر ان کاریگر لوگوں نے ایرانیوں کو حضرت حسینؓ، حضرت موسیٰؑ اور یزید و فرعون کے بارے میں ایک نیا تصور دیا۔ بہت سے ایرانی ان ممیوں سے یہ معلوم کرتے پھر رہے تھے کہ اگر تم زندہ لوگوں کے بارے میں یہ بتا سکتے ہو کہ وہ پچھلے جنم میں کیا تھے تو یہ بھی بتاؤ کہ ماضی کے لوگ بڑا بننے سے پہلے کیا تھے؟ ممی ان سوالات کرنے والوں سے ازراہِ مذاق کہتے "تم لوگ جو کچھ جاننا چاہتے ہو لکھ کر ہمیں دے دو۔ ہم ان پر خوب اچھی طرح غور کر کے تمہیں بتا دیں گے کہ کون بڑا شخص اپنے پچھلے جنم میں کیا تھا۔" زیادہ تر لوگوں نے ان سے یہی سوال کیا "حضرت حسینؓ، حضرت موسیٰؑ، فرعون اور یزید پچھلے جنموں میں کیا تھے؟"
جس کا جواب یہ دیا گیا "سوال ہی میں اس کا جواب موجود ہے۔ حضرت حسینؓ اپنے پچھلے جنم میں موسیٰؑ پیغمبر تھے اور یزید اپنے پچھلے جنم میں فرعون تھا۔ جب فرعون اور حضرت موسیٰؑ میں مقابلہ ہوا تو حضرت موسیٰؑ بحیرۂ احمر کو عبور کر گئے اور فرعون اس میں غرق ہو کر ہلاک ہوا، اسی طرح صدیوں کے بعد حضرت حسینؓ پیدا ہوئے اور ساتھ ہی یزید بھی پیدا ہو گیا۔ پھر دونوں میں حسبِ سابق مقابلہ ہوا۔ یہاں بھی دونوں کے درمیان دریائے فرات آگیا اور حضرت حسینؓ پر فرات کا پانی بند کر دیا گیا اور جو انجام ہوا اس سے ہم سب واقف ہیں۔"
اس کا تذکرہ عام ہوا اور لوگ دوسروں کو بتاتے پھرتے یہاں تک کہ یہ ذکر ایران سے نکل کر عراق میں داخل ہو گیا۔ سنجیدہ اور پختہ ایمانوں والے مسلمان ان کا مذاق اڑاتے۔ انہیں مسئلۂ تناسخ پر بالکل یقین نہیں تھا کیوں کہ یہ بیگانہ موضوع معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ لوگ

دوسروں سے الگ تھلگ اپنے دین کی تبلیغ واشاعت میں مشغول ہوتے تو کوئی پختہ ایمان رکھنے والا مسلمان ان کو ٹوک دیتا اور کہتا "اپنی یہ خرافات اسلامی حدود سے باہر لے جاؤ۔ مملکتِ اسلامیہ میں ان کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

ان کے فقہی ایسے لوگوں کو ہامان قرار دیتے۔ آخر اس بحث و مباحثہ نے فسادات کی شکل اختیار کر لی اور گلی کوچوں میں لوگ قتل کیے جانے لگے۔ ہر طرف خوف و ہراس پھیلنے لگا۔ محمود واحد کے پیروکار اتنے زیادہ نہیں تھے کہ وہ کھلم کھلا مسلمانوں کا مقابلہ کرتے۔ یہ اپنی جان کے خوف سے کرمان شاہ کی پہاڑیوں میں چلے گئے۔ اسی طرح کچھ لوگوں نے البیال کی پہاڑیوں میں پناہ لی۔ محمود کا اب بھی کہیں کوئی پتا نہ تھا لیکن اس کے احکامات، عقائد اور نظریات کا پرچار جاری تھا اور پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ ان لوگوں نے مسلمانوں کی شکل و صورت اور لباس میں مسلمانوں کے خلاف اپنا کام جاری رکھا۔ ان میں جو صاحبِ ثروت تھے وہ مسلم مفلسوں کو مالی مدد دیتے اور اس طرح ترغیب و تحریص دے کر اپنے دین میں داخل کر لیتے۔ ان کا یہ طریقۂ کار زیادہ خطرناک تھا کہ جس کسی کو بھی اپنے دین میں داخل کرتے اسے یہی ہدایت دیتے کہ وہ اپنے اس نئے دین کا کسی سے کوئی ذکر نہ کرے۔ اور ہر واحدیہ کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے نئے دین میں داخل ہونے کے بعد کم از کم تین نئے آدمی اپنے دین میں داخل کرے۔ جب اس طرح انہوں نے حالات پر قابو پالیا تو اپنی کوششیں تیز کر دیں اور نہایت ہوشیاری سے مسلمانوں کو دینِ محمودی میں داخل کرنے لگے۔ ان نئے لوگوں کو بتایا جاتا تھا کہ وہ اپنے اپنے حلقوں میں بھی نہایت باوقار اور کارآمد لوگ تھے۔ اگر کسی کو کوئی سرکاری منصب مل جاتا تھا تو وہ اپنے اس منصب سے فائدے اٹھاتا اور نہایت ہوشیاری سے اپنے اس نئے دین کی ترویج واشاعت کے لیے کام کرتا رہتا۔

کچھ عرصہ مسلمانوں کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ دینِ محمودی کے پیرو سرکاری عہدوں تک پہنچ چکے ہیں اور وہاں لوگوں کو ورغلا کے اپنے دین میں داخل کرتے جا رہے ہیں۔

اس مسئلے نے مسلمانوں کو سخت تشویش میں مبتلا کر دیا اور اس کی سخت ذمے داری اور جواب دہی حاکم گیلان کی ذات سے متعلق تھی اور جب بھی دینِ محمودی کے سلسلے میں شور و غل ہوا تو بات حاکم گیلان تک پہنچی۔ اس غریب کو جواب دیتے دیتے ایک زمانہ گزر گیا تھا اور آخر بغداد نے یہ طے کیا کہ اسے گیلان کی حکومت سے الگ کر دیا جائے اور اس کی جگہ کسی تیز طرار اور ظالم انسان کو بٹھایا جائے۔ وہ حالات درست کر دے گا اور جو کام سالوں سے التوا میں پڑا ہوا ہے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا یعنی محمود واحد کی گرفتاری۔

دینِ محمودی کے پرستاروں نے اپنی شناخت الگ کروانے کے لیے کئی ایسی چیزیں اختیار کر لیں جس سے ان کا تشخص الگ ہو گیا۔ یہ جب آپس میں سلام کرتے تو ایک کہتا اللہ اللہ دوسرا بھی جواب میں اللہ اللہ کہہ دیتا۔ پہلے یہ لوگ واحدی کہلاتے تھے لیکن بعد میں مستقلاً امین بن گئے یعنی ہر واحدی امین کہلایا جانے لگا۔ یہ لوگ اتنے وہمی اور مراقی تھے کہ جس شے کو بھی دیکھتے اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ نکال لیتے اور قطعیت سے کوئی فیصلہ سنا دیتے اور یہ اپنی انہی باتوں سے پہچانے جاتے تھے۔

O☆O

حاکم گیلان کی طرف سے معززینِ شہر کو ایک دعوت دی گئی۔ اس دعوت کا مقصد یہ تھا کہ محمودی دین کے پیروؤں کو پہچان کر الگ کیا جائے اور پھر ان سب کے خلاف قدم اٹھایا جائے۔

اس دعوت میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے شمولیت کی۔ ان میں عالم بھی تھے، تاجر بھی، ملازمت پیشہ بھی تھے اور فوجی عہدے دار بھی۔ ان سب میں حاکم گیلان کے آدمی بھی شامل تھے اور ان کا کام تھا ہر ایک سے ملنا، باتیں کرنا اور باتوں سے یہ اندازہ لگانا کہ وہ مسلمان ہے یا دینِ محمودی کا پرستار۔

جس سبزہ زار پر دعوت کا اہتمام ہوا تھا وہاں چاروں طرف مختلف اقسام کے درخت اور پودے لگے ہوئے تھے۔ ان میں بڑے بڑے درخت بھی تھے اور چھوٹے چھوٹے بھی اور پودوں میں مختلف اقسام کے رنگ برنگے پھولوں والے پودے زیادہ تھے۔

حاکم گیلان کے آدمیوں نے بالکل عام آدمیوں کی طرح مہمانوں سے باتیں شروع کر دیں۔ یہ لوگ دینِ محمودی کا خیال رکھ کے اپنے مخاطب سے بات کرتے تھے مثلاً ان کے سامنے آبنوسی لکڑی کی تپائیاں اور میزیں پڑی تھیں تو ان کی طرف اشارہ کر کے سرکاری آدمی ایک عام آدمی کی طرح اپنے کسی مہمان سے باتیں شروع کر دیتا۔ وہ آہستہ سے کہتا "یہ سیاہ فام لکڑی بھی کسی خاص ماضی کی نشاندہی کرتی ہے۔ آج یہ بے جان اور بے اختیار شے ہے لیکن یہ ماضی میں یقیناً جاندار رہی ہوگی۔ اپنے ارادے اور اپنے اختیار کی مالک رہی ہوگی۔"

اتفاق کی بات کہ جس سے یہ بات کی جا رہی تھی وہ دینِ محمودی کا امین تھا اور اس کو پہچانا اس طرح گیا کہ اس نے آتے ہی کسی کے کان میں آہستہ سے اللہ اللہ کہا تھا اور اس کو دوسری طرف سے بھی یہی جواب ملا تھا۔

چنانچہ جب اس سے آبنوسی لکڑی کے بارے میں اس قسم کی باتیں کی گئیں تو وہ بھی اپنے عقائد کے مطابق باتیں کرنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ معلوم نہیں کیا کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس قدر محتاط تھا کہ زبان کسی بے بس محکوم کی طرح حرکت میں نہیں آئی اور ساکت رہی۔ سرکاری آدمی نے اندازہ لگا لیا کہ یہ شخص یقیناً محمودی دین سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے مزید چھیڑ چھاڑ کی "میں نے سفیدے کے ایک درخت کو

دیکھا جو آنسو بہا رہا تھا۔ حالانکہ کہا یہ جاتا ہے کہ درخت روتے نہیں ہیں اور جنہیں غلطی سے درختوں کے آنسو کہا جاتا ہے وہ درحقیقت درخت کا گوند ہوتے ہیں۔ یہ گوند نیم اور ببول کے درختوں سے بکثرت نکلتا ہے۔"

مخاطب دینِ محمودی کا پیرو تھا۔ اس کا نام خالد تھا مگر خالد امین کہلاتا تھا۔ بظاہر تو ایسا لگتا تھا کہ اس کا پورا نام خالد امین ہے مگر لفظ امین اس کے نام کا جزو نہیں تھا بلکہ یہ اس کے دین کی پہچان تھا۔ جیسے کوئی مسلمان اپنی دینی پہچان کے لیے اپنے نام کے ساتھ لفظ مسلم کا اضافہ کردے۔ خالد امین نے کہا "نہیں' جسے لوگ درخت کا گوند سمجھتے ہیں وہ دراصل درخت کے آنسو ہوتے ہیں۔"

سرکاری آدمی کا نام یوسف تھا اور وہ اس وقت ایک پیشہ ور تاجر کی حیثیت سے اس دعوت میں شریک تھا۔ اسے کچھ کچھ یقین ہو چلا تھا کہ یہ شخص جس سے وہ مخاطب ہے' دینِ محمودی کا امین ہے۔ اس نے خالد امین کو اندر سے باہر لانے کے لیے زیرِ بحث مسئلے کو طول دیا اور کہا "میں کسی قیمت پر بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ درخت روتے ہیں اور آپ یہ کس طرح ثابت کریں گے کہ درخت روتے ہیں؟"

خالد امین نے جواب دیا "جناب! آپ نہیں جانتے' نباتات کے ایک ماہر نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ درخت گو کہ بول نہیں سکتے لیکن بے حد حساس ہوتے ہیں اور انہیں اپنے ماضی کا علم بھی حاصل ہوتا ہے۔ انہیں اپنی سابقہ پیدائشوں کا علم ہوتا ہے۔ یہ رونے والے درخت اپنی سابقہ زندگیوں کے بارے میں سوچ سوچ کر آنسو بہاتے ہیں۔ جب وہ جان دار تھے' آدمی تھے یا جانور تھے اور انہیں چلنے پھرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ جہاں چاہتے' چلے جاتے۔ جہاں چاہتے بیٹھ جاتے' اگر اپنی سابقہ زندگی میں وہ پرند تھے تو اڑ کر اپنی مرضی کے مطابق اپنی پسندیدہ جگہوں پر پہنچ جاتے لیکن آج انہیں درختوں کی شکل میں پیدا کردیا گیا ہے۔ وہ اپنی بے بسی اور بے اختیاری پر رات دن آنسو بہاتے رہتے ہیں کہ آج انہیں خود کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں رہا۔ ان کی جڑیں زمین میں پیوست ہوتی ہیں۔ گویا زمین نے ان کے پاؤں مضبوطی سے پکڑ رکھے ہیں اور اب وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے۔"

یوسف نے خالد امین کی یہ باتیں بہت غور سے سنیں اور پوچھا "یہ ماہرِ نباتات کون ہیں' میری تو کبھی کسی ایسے آدمی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اگر آپ کسی ایسے آدمی سے ملوادیں تو میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔"

خالد امین نے کہا "میں ایسے کئی آدمیوں سے واقف ہوں۔ آپ جب چاہیں ان سے مل سکتے ہیں۔"

یوسف نے زیادہ اشتیاق ظاہر کیا "کیا گیلان میں ایسے لوگ موجود ہیں؟"

خالد امین نے جواب دیا "بے شک۔ گیلان میں ایسے لوگ موجود ہیں۔ دعوت کے بعد آپ مجھے کچھ وقت دیں گے تو میں آپ کو ان ماہرینِ نباتات سے ملواؤں گا۔"

یہ دونوں باتوں میں مشغول تھے اور اسی طرح کئی دوسرے بھی دینِ محمودی کے پرستاروں کی جستجو میں اِدھر اُدھر باتیں کرتے پھر رہے تھے۔ امینی چونکہ اپنے دین کی تبلیغ کرنا چاہتے تھے اس لیے وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھتے تھے۔ وہ اپنے نئے اور جدت آمیز خیالات کے اظہار کے لیے بے چین رہتے تھے۔

خالد امین کو بھی یہی مرض لاحق ہو گیا تھا' جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کا مخاطب اس کی باتوں میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہا ہے تو اس کا دینی جذبہ بیدار ہو گیا اور اپنے دین کے بارے میں وہ جو کچھ جانتا تھا' سب کچھ ایک ہی نشست میں بتانے کے لیے بے قرار نظر آنے لگا۔

یوسف نے کہا "آپ جو کچھ مجھے بتا رہے ہیں' وہ بہت دلچسپ ہے۔ میں حیران ہوں کہ انسان نے اتنا زبردست علم کس طرح حاصل کرلیا کہ یہ اپنی سابقہ پیدائشوں سے بھی واقف ہو گیا۔"

خالد امین نے کہا "علوم دو قسم کے ہوتے ہیں کچھ تو اکتسابی ہوتے ہیں اور کچھ وہبی یا لدنی۔ اکتسابی علوم کوئی بھی حاصل کرسکتا ہے اور یہ کسی حد تک محدود ہوتے ہیں لیکن وہبی اور لدنی کا کوئی سرا نہیں ہوتا اور انہیں حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ وہبی اور لدنی علوم کے حاملین ایسی ایسی چیزوں کے راز فاش کردیتے ہیں کہ اکتسابی علوم کے حاملین بھی ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہبی یا لدنی علوم انسان ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔"

یوسف نے کہا "اس وقت تو ہم سب دعوت میں شریک ہیں اور کچھ دیر بعد ہم سب کھانے پینے میں مشغول ہو جائیں گے اور اس وقت ہم جن موضوعات پر گفتگو کررہے ہیں وہ تشنہ رہ جائیں گے اس لیے ہمیں کہیں دوبارہ ملنا چاہیے اور وہاں صرف اسی قسم کی باتیں ہوں گی۔"

دونوں نے اس پر اتفاق کرلیا اور یہ طے پایا کہ وہ دونوں کسی جگہ یکجا ہوں گے اور پھر نہایت بے تکلفی سے کھل کر باتیں ہوں گی۔ اب کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ پھلوں کی اتنی افراط تھی کہ ایسا لگتا تھا جیسے یہ پھلوں کی دعوت کی گئی ہے مگر جب کھانے کی دیگوں پر نظر جاتی تو معلوم ہوتا کہ یہ گوشت خوروں کی محفل ہے۔ لوگ کھانے پر ٹوٹ پڑے' کھانے کے دوران ان کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ بعض زوردار ڈکاریں لے رہے تھے' کوئی بوٹیاں چباب رہا تھا اور کوئی نلیاں چوس رہا تھا۔ کسی نے شوربے کی قاب ہونٹوں سے ایسی لگائی کہ پوری قاب اکیلا پی گیا۔

یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ حاکم کے آدمیوں نے باتوں کے دوران محمودی دین کے پرستاروں کو پہچان لیا۔ انہوں نے ان کے گھروں

کے پتے معلوم کر لیے اور سب نے اپنی باتوں سے یہ تاثر دیا کہ وہ محمودی دین میں داخل ہونا چاہتے ہیں مگر ایسا کوئی ذریعہ ہاتھ نہیں آرہا کہ وہ دین محمودی میں داخل ہو جائیں۔ ان سب کو یقین دلایا گیا تھا کہ بظاہر کسی ایسے آدمی کا انہیں علم نہیں جو محمودی دین کا پرستار ہو یا اس کا علم رکھتا ہو لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔

حاکم گیلان کو اپنی اس دعوت سے بہت کچھ حاصل ہو گیا تھا' وہ ان امینوں کے ذریعے محمود واحد تک پہنچنا چاہتا تھا۔

یوسف اس کا خاص آدمی تھا اور جب یوسف نے حاکم گیلان کو یہ بتایا کہ وہ ایک بلند پایہ عالم خالد امین تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے تو یوسف کی طرح حاکم گیلان بھی بہت خوش ہوا اور یوسف سے کہا "دیکھ! خالد امین کے ذریعے محمود واحد تک پہنچنے کی کوشش کر کیوں کہ اگر ہمیں یہ شخص مل جائے تو ہم اس مذہب کا پوری طرح قلع قمع کر سکتے ہیں۔"

یوسف نے وعدہ کیا "اللہ نے چاہا تو میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اب دین محمودی کے پرستاروں تک پہنچنا کوئی دشوار کام نہیں ہے۔"

حاکم گیلان کو یہ خوشی تھی کہ سابقہ حاکم گیلان یہاں تک پہنچنے میں ناکام رہا تھا مگر یہ حاکم تقریباً اس کے آس پاس پہنچ چکا تھا۔

حالانکہ دعوت عام کے ذریعے گیلان کا حاکم اپنے معاون و مددگار کے ذریعے دین محمودی کے پرستاروں تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن اب بھی احتیاط کی ضرورت تھی کیوں کہ احتیاط نہ کرنے کی صورت میں وہ کسی ایسی ناکامی سے دوچار ہو سکتا تھا جس سے وہ امینوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بہت دور ہو جاتا۔

یوسف نے تیسرے دن اپنے نئے دوست خالد امین کا پتا لگا لیا۔ یہ بہت بڑی حویلی میں رہتا تھا۔ اس حویلی میں دوسرے لوگ بھی رہتے تھے اور یہ سب امینی تھے۔ یوسف اپنے دوست کو تلاش کرتا ہوا اس حویلی تک پہنچ گیا۔ اس وقت خالد امین اپنے ایک داعی کو کچھ ہدایتیں دے رہا تھا۔ وہ یوسف کو اچانک دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کہا "میں تو یہ سمجھا تھا کہ آپ مجھ کو بھول گئے مگر اب اس وقت سامنے دیکھ کر میں بے حد خوش ہوں۔ شاید اللہ نے آپ کی قسمت میں پہلے سے یہ لکھ رکھا ہے کہ آپ ایک ایسے دین میں داخل ہو جائیں گے جو سچا' نیا اور زندہ رہنے والا دین ہو گا۔"

یوسف نے حیرت سے پوچھا "کیا اسلام سے زیادہ سچا دین کوئی اور ہو سکتا ہے؟ میں مسلمان ہوں اور اسلام کو ایک سچا' آخری اور دائمی دین سمجھتا ہوں۔"

خالد امین نے کہا "دوست! اگر آپ جذباتی نہ ہو جائیں اور خود کو اپنے آبائی عقائد سے الگ کر کے کچھ سوچنے اور باتیں کرنے کا موقع دیں تو میں یہ ثابت کروں گا کہ ہماری اس دنیا میں کوئی چیز بھی دائمی اور پائیدار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ نہ تو کوئی دین دائمی ہے اور نہ جانور دائمی ہیں' نہ جمادات و نباتات' یہ سب تغیر پذیر ہیں۔"

یوسف نے پوچھا "کیا آپ مسلمان نہیں ہیں؟"

خالد امین نے جواب دیا "جناب! کیا کوئی بوڑھا یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کیا کوئی درخت زمین پر ہمیشہ کے لیے کھڑا رہ سکتا ہے' کیا پہاڑ ہمیشہ ایک ہی شکل میں رہیں گے' کیا دریا خشک نہیں ہو سکتے؟"

یوسف نے جواب دیا "یہ سب کچھ ممکن ہے' ایسا ہو سکتا ہے مگر ان باتوں سے انسان کا کیا تعلق۔ ان سے اسلام کا کیا تعلق؟"

خالد امین نے آپ جناب کی تکلفات ختم کرتے ہوئے جواب دیا "دوست! ایک بات بتا۔ جب تو ایک ماہ کا بھی نہیں تھا تو تیرے جسم پر کس پیمائش کے کپڑے آتے تھے پھر جب تو بڑا ہوا اور لڑکپن میں داخل ہو گیا تو تیرا پچھلا لباس بے کار ہو گیا تھا اور تجھ کو نئی پیمائش اور ناپ کا لباس درکار ہوا۔ پچھلا لباس بیکار ہو چکا تھا۔ اس کے بعد جب تو نے جوانی اور بڑھاپے میں قدم رکھا تو ایک بار پھر تیرے لباس کی پیمائش اور ناپ میں فرق آ چکا تھا۔"

یوسف خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا "جب یہ بات طے پا گئی کہ انسانی لباس تک میں استقلال اور دوام نہیں پایا جاتا تو کسی دین میں یہ دوام کس طرح ممکن ہے۔ دین میں بھی زوال پذیری پائی جاتی ہے اور اگر تو فراخ دلی سے میری یہ بات مان لے تو آگے بات کی جائے۔"

یوسف نے جواب دیا "اگر تو کہتا ہے تو تیرے کہنے پر وقتی طور سے تیری بات مان لوں گا ورنہ دین اسلام ایک مستقل ابدی سچائی ہے اور اس کے بعد کسی اور دین کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔"

خالد امین کو یہ احساس تھا کہ انسان کے لیے سب سے زیادہ دکھ کا وہ مقام ہوتا ہے جب اس کے آبائی دینی اور مذہبی بت ٹوٹتے ہیں اور اس کو کسی نئی سمت میں دیکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

یوسف نے پوچھا "تو کس نئے دین کی بات کرتا ہے؟"

خالد امین نے جواب دیا "ابھی دنیا کی اکثریت کو یہ نہیں معلوم کہ زمانے کے دستور کے مطابق اسلام اپنی طبعی عمر پوری کر چکا ہے۔ اللہ نے اس دین کو منسوخ کر دیا ہے۔ گویا اسلام کی طبعی موت واقع ہو چکی ہے اور اس کی جگہ محمودی دین نے لے لی ہے۔"

یوسف کو جس چیز کی تلاش تھی وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا' کہنے لگا "میں نے اس دین کا ذکر تو سنا تھا مگر اس دین کے کسی پیرو یا عالم سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔"

خالد امین نے کہا "اگر تو چاہے تو میں اس دین کے بارے میں تجھے بہت کچھ بتا سکتا ہوں اور اگر تجھے اس میں کوئی دلچسپی نہ ہو تو میں خاموش ہو جاؤں گا۔"

یوسف نے آہستہ سے کہا "مجھے ہمیشہ حق کی تلاش رہتی ہے۔ اگر واقعی کوئی ایسا حق ہم میں موجود ہے جس کا جاننا اور ماننا ہمارے لیے ضروری ہے تو.... مجھے بتاؤ' میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

خالد امین نے کہا "جس حق کی بات میں کر رہا ہوں وہ آہستہ آہستہ لوگوں میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ پہلے تو اس کے بنیادی نکات سے واقف ہو جا۔ اس کے بعد دوسری باتیں ہوں گی۔"

یوسف خاموشی سے سنتا رہا اور خالد امین بولتا رہا۔ "جب بھی آدم آتا ہے تو اس آدم کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ دورانیہ چونسٹھ ہزار سال کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارا جس آدم کے دور سے تعلق ہے اسے تقریباً دس ہزار سال گزر چکے' ان دس ہزار سالوں میں کتنے ہی دین آئے اور ختم ہو گئے۔ جب کوئی دین اپنی طبعی عمر پوری کر لیتا ہے تو اسے منسوخ کر دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ نیا دین لے لیتا ہے۔ گویا پچھلے دین کی طبعی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اب تک جو دین آ چکے ہیں' ان میں اسلام سب سے نیا اور آخری دین ہے۔ قانونِ قدرت کے مطابق اسے بھی اپنی مدت پوری کرنی تھی چنانچہ خدا کا فرمان آیا کہ اسلام کی جگہ دینِ محمودی رائج ہو گا... اور اب ہم اس نئے دین کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اسے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ فنا ہونے کے بعد دوسری شکل و صورت میں دوبارہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور اپنے چونسٹھ ہزار سال پورے کرے گا پھر اللہ ایک نئے آدم کو بھیجے گا اور دنیا میں نئے دین آنا شروع ہو جائیں گے۔ نئی نسل ہو گی' نئی مخلوق ہو گی' نئے جمادات ہوں گے' نئے نباتات ہوں گے۔ نئے لباس ہوں گے' نئی زبانیں ہوں گی۔"

یوسف اس کی باتیں نہایت دلچسپی سے سنتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ان باتوں میں کوئی صداقت ہو یا نہ ہو لیکن یہ باتیں دلچسپ ضرور تھیں۔ یوسف نے پوچھا "بھائی! یہ پیدائش' دوبارہ پیدائش' جون بدلنے کا چکر اور شکل و صورت کے تبدیل ہو جانے کی باتیں میرے خیال میں نہایت عجیب و غریب اور معلومات افزا ہیں۔ آخر اس تسلسل اور تواتر کے پیچھے قدرت کا کون سا عمل کارفرما ہے؟"

خالد امین نے کہا "خدا نے اس دنیا میں جو کچھ پیدا کیا ہے' وہ ہمیشہ باقی اور موجود رہے گا۔ بس اس کی شکل اور ہیئت بدلتی رہتی ہے۔ انسان کو اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ پہلے وہ کیا تھا تو اس کے جاننے کے کئی طریقے ہیں۔ اس کا رنگ و روپ ہماری رہنمائی کرے گا' اس کی عادتیں اور خصلتیں ہمیں اس کے پچھلے جنم تک پہنچا دیں گی اور یہ عمل کسی جاندار یا انسان تک محدود نہیں' جمادات و نباتات بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔"

یہ کہتے کہتے اس نے کسی کو آواز دی۔ اس نے کیا نام لیا تھا کچھ سمجھ نہیں آیا لیکن اس کے نام کے ساتھ خر لگا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد بھدے جسم کا ایک جوان خالد امین کے پاس آیا۔ اس کی رنگت بھوری تھی اور کسا ہوا جسم یہ بتاتا تھا کہ یہ شخص بہت محنتی ہے۔ یہ جوان دونوں کے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔ خالد امین نے کہا "یہ ہمارا انتہائی محنتی خدمت گار ہے' اس کو کسی کام میں کوئی عار نہیں۔ اگر چاہیں تو اس کو چوبیس گھنٹے کام میں مشغول رکھیں' یہ کسی عذر کے بغیر کام کرتا رہے گا۔ کسی سے کوئی شکوہ نہیں کرے گا۔ کھانے کے لیے جو دیا جائے گا صبر و شکر سے کھا لے گا۔ کسی معاملے میں بحث نہیں کرے گا' اپنی عقل کو اپنی دانست میں غیر ضروری استعمال نہیں کرے گا۔"

یوسف کو غور کرنا پڑ رہا تھا کہ یہ ساری تمہید کس سلسلے میں بروئے کار لائی جا رہی ہے' پوچھا "یہ یہاں کیا کرتا ہے؟"

خالد امین نے جواب دیا "یہ جس حویلی میں تو بیٹھا ہے' یہ دراصل دینِ محمودی کے پرستاروں کی حویلی ہے۔ یہ شخص ہم سب کی خدمت کرتا ہے اور ہمارے دین کا نہایت مخلص پیرو ہے۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ تکلیف پہنچنے پر یا کسی کے بے جا ستانے پر نہایت شور کرتا ہے اور اس شور کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اس کے شور میں کسی قسم کا کرب شامل نہیں ہوتا۔"

خدمت گار نے پوچھا "مجھ سے کوئی کام ہو تو بتائیں ورنہ میں جاؤں؟"

خالد امین نے کہا "اب تو جا سکتا ہے۔"

جب وہ شخص چلا گیا تو خالد امین نے یوسف کو بتایا "ہم نے اس پر مہینوں غور کیا اور اس کی رنگت دیکھی' اس کی عادات پر غور کرتے رہے اور اس کی غیر معمولی قوتِ برداشت پر غور کیا تو ہم پر یہ بات القا کی گئی کہ یہ شخص اپنے پچھلے جنم میں گدھا رہا ہو گا۔"

پچھلے جنم کے جاننے اور سمجھنے کا یہ عجیب و غریب طریقہ تھا۔ یوسف نے پوچھا "اگر میں جاننا چاہوں کہ میں اپنی سابقہ زندگی میں کیا تھا تو تم لوگ یہ کس طرح معلوم کرو گے؟"

خالد امین نے کہا "تجھے ہمیں کچھ وقت دینا ہو گا کہ تو کچھ دن ہمارے ساتھ رہے۔ ہم ساتھ اٹھیں بیٹھیں' ساتھ کھائیں پئیں۔ ہمارا کوئی ماہر تجھ کو بتلا دے گا کہ تو پچھلے جنم میں کیا تھا؟"

یوسف ان کے بارے میں جو معلومات جمع کر رہا تھا اس سے اس کا یہ مقصد بھی تھا کہ وہ کسی طرح محمود واحد تک پہنچ جائے چنانچہ

یوسف نے خالد امین سے وعدہ کیا کہ وہ چند ہفتے خالد امین کے ساتھ رہ سکتا ہے لیکن اس سے پہلے اپنے عزیزوں سے اجازت لینا ہوگی یا انھیں ان سے چند ہفتے دور رہنے کی خبر کرنا ہوگی۔ خالد امین کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا' اس نے اجازت دے دی۔

یوسف نے ایک دوسرے شخص کے ذریعے حاکم گیلان کو مطلع کردیا کہ وہ چند ہفتے غائب رہے گا اور امید ہے کہ وہ اس دوران محمود واحد کا پتا چلا لے گا۔ یوسف' خالد امین کے پاس گیا اور اسے بتایا "اب میں کئی ہفتے تم لوگوں کے ساتھ رہ سکتا ہوں۔"

خالد امین اس کو شہر سے ایک گاؤں لے گیا۔ پہلے دن تو وہ خاموش رہا لیکن دوسرے دن اس نے گاؤں کی سیر کرائی۔ اس گاؤں میں بمشکل چالیس گھر رہے ہوں گے اور یہ بھی کاشت کار تھے۔

خالد امین نے گاؤں کے لوگوں سے یوسف کو ملوایا اور گاؤں والوں کو خوش خبری سنائی کہ یہ نیا پیرو ہے جس نے دین محمودی میں داخل ہونے کا وعدہ تو کرلیا ہے مگر ابھی اس کا زبان سے اظہار نہیں کیا۔

کئی دن تک یوسف کو ان لوگوں کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی۔ یوسف ان لوگوں کے بارے میں جو کچھ جاننا چاہتا تھا اس کا ابتدائی اور آخری سرا محمود واحد تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے بارے میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ اپنی سابقہ زندگی میں کیا تھا؟

یوسف کو گاؤں میں اچانک درزی کی ضرورت پیش آگئی۔ وہ اپنے ساتھ چند لباس لایا تھا۔ نئے کپڑے خالد امین نے فراہم کردیے اور کہا "انھیں سلواؤ۔"

لیکن گاؤں میں جو درزی ملا وہ اس لائق نہیں تھا کہ یوسف کے کپڑے سیتا۔ مجبوراً یوسف کو خالد امین کے ساتھ شہر جانا پڑا۔ وہاں ایک دن رک کر دونوں پھر گاؤں واپس چلے گئے۔ گاؤں میں خالد امین محمود واحد کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ وہ مسلسل اور مدلل یہی باور کراتا رہا کہ ہر انسان پہلے کسی نہ کسی شکل میں کہیں نہ کہیں موجود ضرور تھا۔ اس نے کہا "ہر انسان اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن نہیں ہے۔ یہ کام کچھ کرتا ہے اور پسند کچھ رکھتا ہے اور ہمیشہ اپنی پسند کی طرف کھنچتا رہتا ہے۔ اگر اس کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا جائے تو صاف پتا چل جاتا ہے کہ وہ اپنی سابقہ زندگی میں کیا تھا؟"

اب خالد امین نے یوسف سے اچانک سوال کیا "تمہارا پیشہ کیا ہے اور تم کرتے کیا ہو؟"

یوسف نے جواب دیا "اہواز میں میری جاگیر ہے اور گیلان میں میرے چند عزیز رہتے ہیں۔ میں یہاں اپنے عزیزوں سے ملنے آیا تھا اور حاکم گیلان نے مجھے اپنی دعوت میں مدعو کیا۔ یہ پہلے اہواز کے قریب اصفہان کا حاکم تھا۔"

خالد امین نے اس کے مشاغل پوچھے اور اس کی دلچسپیوں کے بارے میں بہت سے سوالات کیے۔ آخر میں خالد امین نے یوسف کو بتایا "تم چالاکی سے کام لے رہے ہو اور تم میرے سوالات کے صحیح جوابات نہیں دے رہے ہو۔ جب تم میرے سوالات کے صحیح جوابات نہیں دو گے تو میں یہ کس طرح بتاؤں گا کہ تم اپنی سابقہ زندگی میں کیا تھے؟"

یوسف نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس پر قائم رہا اور کہا "تم لوگ چاہو تو اس کی تصدیق کرسکتے ہو کہ میرا تعلق اہواز سے ہے لیکن میں کپڑوں کا بے حد شوقین ہوں۔ اپنے پاس کتنے ہی لباس کیوں نہ موجود ہوں میں بلا ضرورت لباس سلواتا رہتا ہوں۔"

جس مکان میں خالد امین اور یوسف رہتے تھے اس سے ملحق ایک صحن تھا اور اس صحن میں ریت بچھی ہوئی تھی۔ یوسف کی سمجھ سے یہ بات بالاتر تھی کہ اس صحن کو بے کار اور غیر آباد کیوں چھوڑ دیا گیا۔ کمروں کی کھڑکی سے یہ صحن نظر تو آتا تھا لیکن یہاں کوئی انسان کبھی نظر نہ آیا اور نہ یہ بات سمجھ میں آئی کہ پورے صحن میں ریت کیوں بچھی ہوئی ہے۔

یوسف نے راتوں کو کئی کئی بار خالد امین کو کھڑکی سے صحن کی طرف دیکھتے ہوئے پایا پھر جیسے ہی خالد امین کو احساس ہوتا تھا کہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے تو وہ چپ چاپ بستر پر چلا جاتا۔ آخر ایک دن یوسف نے خالد امین کو کھڑکی کے پاس صحن کی طرف گھورتے ہوئے پکڑلیا اور کہا "آج تجھ کو یہ بتانا ہوگا کہ تو اس ویران صحن میں کس کو دیکھتا رہتا ہے؟"

خالد امین نے جواب دیا "میں جس کو اس صحن میں تلاش کرتا ہوں۔ جب وہ مجھے مل جائے گا تو میں اس کی تجھ سے ملاقات کروادوں گا۔"

یہ سلسلہ تقریباً آٹھ دن جاری رہا اور نویں دن خالد امین یوسف کو صبح صبح اٹھا کر ریت والے صحن میں لے گیا اور کہا "رات میں نے ایک سایہ متحرک دیکھا۔ وہ اس صحن کی ریت پر حرکت کررہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ریت پر کچھ شکلیں موجود ہوں گی اور میں ان شکلوں کی مدد سے یہ بتادوں گا کہ تو اپنی سابقہ زندگی میں کیا تھا؟"

ابھی سورج کی روشنی زمین تک نہیں پہنچی تھی اور ہر طرف کسی قدر اندھیرا موجود تھا۔

خالد امین جس دروازے کو کھول کر صحن میں داخل ہوا تھا اسے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مدتوں سے بند ہے۔

خالد امین نے صحن میں داخل ہوتے ہوئے کہا "جب ہم لوگ اپنے مقصد میں ناکام ہونے لگتے ہیں تو ہمیں یکسوئی سے اپنے آقا' اپنے پیغمبر اور اپنے رہنما محمود کو یاد کرنا پڑتا ہے اور ان سے استعانت کی درخواست کی جاتی ہے اور ہمیں مدد حاصل ہو جاتی ہے۔"

یوسف نے پوچھا "اب تجھ کو کون سی مدد درکار تھی؟"

خالد امین نے جواب دیا "صحن کی ریت پر غور سے دیکھ، تجھ کو جو کچھ دکھائی دے بتا۔"

دونوں ہی ریت پر پُراسرار نشانات دیکھنے میں مشغول ہوگئے۔ کافی دیر بعد دونوں کا ایک بات پر اتفاق ہوگیا کہ ریت پر انسانی اور حیوانی پاؤں کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ حیوانی پاؤں کا نشان کسی اونٹ کا تھا اور یہ نشان وہی خالد امین نے کی تھی۔ اس نے یوسف کو صاف صاف بتا دیا "یہ پاؤں کا نشان کسی اونٹ کا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ یہ پاؤں کے نشانات کسی مویشی چور کے ہیں یا پھر کسی کھوجی کے جو مویشی چور کی تلاش میں نکلا ہوگا۔ اب چونکہ میں نے تیرے سلسلے میں اپنے پیغمبر محمود واحد سے مدد چاہی تھی اس لیے جہاں تک میرا خیال ہے کہ مویشی چور کوئی اور ہے اور کھوجی کوئی اور۔۔۔ کھوجی تو ہے اور تیرا تعلق کسی عرب کھوجی قبیلے سے ہے لیکن اس بار تو اہواز میں پیدا ہوگیا اور مجھے رات کے پچھلے پہر یہ خاص طور پر بتایا گیا تھا کہ تو اب بھی اپنے سابقہ جنم کے مطابق کام کر رہا ہے یعنی تو اس وقت بھی ایک کھوجی ہے اور گیلان کے حاکم کی طرف سے کھوجی کا کردار ادا کر رہا ہے۔"

یوسف کو یوں لگا جیسے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک رہی ہے۔ اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔

وہ اس سے انکار ہی کرتا رہا مگر خالد امین اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

رات کو یوسف کو لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور اس پر دباؤ ڈالا کہ وہ بتائے کہ آج کل وہ کیا کر رہا ہے؟

یوسف نے کہا "اگر تمہارے نبی میں کچھ ہے اور وہ یہ بتانے پر قادر ہے کہ میں کون تھا، کون ہوں اور کیا ہو جاؤں گا تو میں ابھی اسی وقت اپنے گھر واپس چلا جاؤں گا اور تیرے دین کے لیے خود بھی تبلیغ کرنے لگوں گا۔"

خالد امین کو یوسف کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے چند دنوں کے بعد خالد امین نے یوسف کے بارے میں محمود واحد کو مطلع کیا کہ ایک ایسا پیچیدہ شخص ملا ہے، جو ہم سب کے لیے دردِ سر بن گیا ہے۔ اگر اجازت ہو تو اس کو آپ کے حوالے کر دیا جائے اور پھر آپ اس کے بارے میں جو کچھ فرمائیں گے، اس پر عمل ہوگا۔ اور پھر چپ چاپ یوسف کو ایک دوسرے گاؤں میں روانہ کر دیا گیا۔ یہیں اس کی ملاقات محمود واحد سے ہوئی لیکن محمود واحد کا نام کسی نے بھی نہیں لیا تھا۔ یہاں بھی بہت سے کارکن موجود تھے اور یہ سب کسی نہ کسی پیشے سے وابستہ تھے لیکن اپنے کام سے وقت بچا کر اس نئے دین کے لیے کام کرتے رہتے تھے۔

ابتدا میں محمود واحد نے یوسف پر کوئی خاص توجہ نہیں دی مگر یوسف نے کسی حد تک محمود واحد کو پہچان لیا تھا۔ گویا اس نے ایک ایسی کامیابی حاصل کر لی تھی جس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی تھی۔

یہاں بھی یوسف کو دو ہفتے لگ گئے اور کہیں بعد میں جا کر اس کو احساس ہوا کہ وہ ان لوگوں میں ایک قیدی کی حیثیت سے رہ رہا ہے اور وہ یہاں سے نہیں نکل سکے گا کیونکہ اس نے چند دنوں کے لیے گیلان جانے کی اجازت چاہی تو اسے اجازت نہیں ملی۔ اس کے آس پاس موجود نگراں آدمیوں نے بتایا کہ جب تک اوپر سے جانے کی اجازت نہیں ملے گی وہ یہاں سے نہیں جا سکتا۔

یوسف نے درخواست کی "مجھے اس سے ملوا دیا جائے جو میرے جانے کی اجازت دے گا۔"

دو دن کے انتظار کے بعد اسے محمود واحد کی خدمت میں پہنچا دیا گیا۔

محمود واحد نے اس کو دیکھتے ہی کہا "خوب! کیا تُو نے اللہ کے کلام میں یہ نہیں پڑھا (ترجمہ) ہر شے اپنی اصل کی طرف واپس جاتی ہے۔ تُو بے چین تھا کہ تجھے تیرے پچھلے جنم کے بارے میں بتایا جائے جب کہ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں تیرے کئی جنموں سے واقف ہوں۔ کبھی تُو یہود میں پیدا ہوا تھا۔ اس وقت تیرا تعلق ایک علمی گھرانے سے تھا اور تیرے دو شوق تھے۔ ایک بہترین لباس پہننے کا، دوسرا حق کی تلاش کا اور تُو نے آبائی دین یہود چھوڑ دیا تھا اور عیسائی ہوگیا تھا پھر تجھے یہودیوں نے ہلاک کر دیا اور تُو شام کے ایک ویرانے میں خانہ بدوشوں کے گھر میں پیدا ہوگیا۔ تیرا یہ گھرانا بھی عیسائی تھا اور تُو عیسائیت کی تعلیمات کے زیرِ اثر بھولے بھٹکے مسافروں کی رہنمائی کر دیا کرتا تھا۔ اس کے بعد تُو عربوں کے دورِ جاہلیت میں پیدا ہوا۔ یہاں تیرا خاندان کھوجی کی حیثیت سے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ تُو بھی اپنے خاندان کا نامور کھوجی تھا اور جب ایک بار تُو نے ایک فسادی مویشی چور بدو کو پکڑوا دیا تو اس نے تجھے قتل کروا دیا تھا۔ اس کے بعد تُو عربوں کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوا۔ حسبِ سابق تلاش و جستجو تیری فطرت رہی ہے۔ ان دنوں عرب میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا چکے تھے اور اسلام ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ تیری تو اصل ہی تلاش و جستجو تھی۔ تُو نے دینِ اسلام کے بارے میں جستجو شروع کر دی اور مسلمان ہوگیا اور مسلمانوں کی طرف سے ایک جنگ میں شہید ہوگیا پھر تُو مسلمانوں کے دورِ بنوامیہ میں پیدا ہوا اور اپنی طبیعت کے مطابق ایک ایسے محکمے میں ملازمت کی جو دشمنوں کی مخبری کیا کرتا تھا۔ ان دنوں آلِ عباس اور نفسِ ذکیہ مل جل کر بنوامیہ کے خلاف تحریک چلا رہے تھے اور تُو بنوامیہ کے جاسوس کی حیثیت سے آلِ عباس اور نفسِ ذکیہ کے خلاف کام کرتا رہا اور اسی دوران تجھ کو احساس ہوا کہ تُو جن کے خلاف کام کر رہا ہے وہ حق پر ہیں اور جن کے لیے کام کر رہا ہے وہ حق پر نہیں ہیں اور تُو بنوامیہ کا دشمن ہوگیا۔ جب کسی طرح بنوامیہ اس سے واقف ہوگئے تو انہوں نے نہایت چالاکی اور ہوشیاری سے تجھ کو قتل کروا دیا اور تُو ایک بار پھر پردۂ غیب میں چلا گیا۔ اس بار پھر تُو مسلمانوں میں پیدا ہوا۔ تیری قسمت اور فطرت کا تعلق تجسس سے ہے۔ چنانچہ اس بار پھر تجھے حکومت کی طرف سے جاسوسی اور مخبری کا فرض سونپا گیا ہے اور تُو محمود واحد کی تلاش میں یہاں تک آ گیا۔ تُو یہ مت سمجھ کہ ہم لوگ تجھ سے غافل ہیں اور تجھے پہچان نہیں سکے۔ تُو

پہچانا جاچکا ہے اور ہم تجھے دعوت دیتے ہیں کہ تو مصری دین حق کو اختیار کرلے اور امین ہو جا۔"

یوسف کو ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ اس کا مخاطب کون ہے' وہ اسے محمود واحد سمجھ رہا تھا لیکن باتوں سے اندازہ ہوا کہ یہ محمود واحد نہیں ہے۔ یوسف نے اس کی تردید کی "یہ بات غلط ہے کہ میں حکومت کا مخبر یا جاسوس ہوں۔ تلاش اور جستجو میری فطرت میں ہے اور یہی فطرت مجھے یہاں تک لے آئی ہے۔"

محمود واحد نے کہا "اگر تو واقعی حق کی تلاش میں نکلا ہے تو دین محمودی کا امین ہو جا لیکن اس کے بعد تو کہیں اور نہیں جا سکے گا۔ ہم لوگوں میں رہے گا اور ہمارے لیے کام کرے گا۔"

یوسف نے شرط پیش کی "ٹھیک ہے میں اس عہد کے اس نئے دین میں داخل ہو جاؤں گا مگر میری یہ شرط ہے کہ مجھے جناب محمود واحد کی زیارت کروائی جائے۔ میں انہی کے دست حق پرست پر ایمان لاؤں گا۔"

محمود واحد نے جواب دیا "ٹھیک ہے اس کے لیے تجھے تین دن انتظار کرنا ہوگا۔ اس دوران تو بھی خوب غور کرلے کہ تو جس نئے دین میں داخل ہوگا وہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوگی اور میں بھی اپنی چشم باطن سے تیرے باطن کو دیکھ لوں گا کہ تو اندر سے مخلص ہے یا نہیں؟"

یوسف کو تین دن اس کرب واذیت میں گزارنے پڑے کہ ابھی تک اس کی ملاقات محمود واحد سے نہیں ہو سکی اور یہ کہ جب وہ دین محمودی میں داخل ہو جائے گا تو اس کا یہاں سے نکلنا ناممکن ہو جائے گا۔

اس دوران خالد امین اس کے ساتھ ساتھ رہا اور یہی باور کراتا رہا کہ محمود واحد سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ وہ ہر انسان کے سابقہ جنموں سے اسی طرح واقف ہے جس طرح وہ لوگ اپنی اس زندگی سے واقف ہیں۔

یوسف نے پوچھا "تو نے مجھے جس شخص سے ملوایا تھا اور جس نے میرے سابقہ جنموں کا ایک نقشہ میرے سامنے پیش کر دیا تھا' یہ شخص کون ہے؟"

خالد امین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "جو شخص تیرے سابقہ جنموں کے بارے میں اتنا واقف ہے۔ وہ اپنے قبلہ محمود واحد کے سوا کون ہو سکتا ہے؟"

یوسف نے گھبرا کر پوچھا "اگر یہی شخص محمود واحد ہے تو کیا وہ دوبارہ مجھ سے ملے گا؟"

خالد امین نے کہا "ہاں' وہ حسب وعدہ کم از کم دوبارہ آخری بار تجھ سے ضرور ملے گا۔"

یوسف اس دوسری ملاقات کا بے چینی سے منتظر رہا۔ آخر اسے دوبارہ محمود واحد کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ دونوں تپاک سے ملے۔ محمود واحد نے کہا "ہمارے دین میں داخل ہونے سے پہلے تو ایک بار پھر سوچ لے کہ یہاں سے واپسی ممکن نہیں ہے۔"

یوسف نے جواب دیا "آپ نے اپنی پہلی ملاقات میں خود کو مجھ سے چھپائے رکھا۔ ایک نبی کو اپنے امتی سے ایسا مغالطہ آمیز رویّہ نہیں رکھنا چاہیے تھا۔"

محمود واحد نے کہا "اس قسم کی فضول باتیں مناسب نہیں ہیں۔ اگر تو ایمان لے آئے گا تو تو ایک بار پھر حق کو پانے میں کامیاب ہو جائے گا ورنہ خواہ مخواہ مارا جائے گا۔"

یوسف نے یہ تو سمجھ لیا تھا کہ محمود واحد باتیں بہت اچھی کرتا ہے۔ اس کی گفتگو میں ساحرانہ کشش پائی جاتی تھی۔ اسے محمود واحد کی کسی بات پر اعتبار ہو یا نہ ہو لیکن وہ اس شخص سے مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یوسف نے کہا "کیا آپ یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ ایران کی مشرقی شمالی سرحدوں پر آباد قزلباش اپنی سابقہ پیدائش میں کیا تھے؟"

محمود واحد نے اس کی اصلاح کی "قزلباش افغانستان میں رہتے ہیں جو افغانستان کی جنوبی اور مغربی سرحد ہے۔ یہ لوگ اپنے سابقہ جنم میں گکّے تھے۔ ان کی ٹیڑھی دُم یہ بتاتی ہے کہ یہ تلوار چلانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔"

اب محمود واحد نے اپنی علمی اور دینی تقریر شروع کر دی اور یوسف سے پوچھا "کیا تو جانتا ہے کہ لوہے کا کمال کو پہنچ جانا کیا ہوتا ہے؟"

یوسف نے کہا "جناب! میں ان اسرار و رموز سے بالکل واقف نہیں ہوں۔"

محمود واحد ہنسنے لگا اور کہا "تجھ کو ان اسرار و رموز سے واقف ہونا بھی نہیں چاہیے کیوں کہ ان باتوں کا علم مجھے حاصل ہے۔ جب لوہے سے کوئی نبی یا ولی شہید کیا جاتا ہے تو وہ لوہا درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔"

اس کے بعد اس نے ان حاجیوں کا ذکر کیا جو عبائی کربلائی (ایک قسم کا دھاری دار کپڑا) پہنے پھرتے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا "یہ لوگ فریب پیشہ ہوتے ہیں اور مکرو تزویر ان کا خاصّہ ہے۔ جب یہ مریں گے تو آئندہ جنم میں اگر جسم حیوانی میں منتقل ہوں گے تو گلہری بن جائیں گے۔ اگر جسم نباتی میں انتقال ہوا تو دھاری دار خربوزہ بنیں گے اور اگر پتھر کے جسم میں منتقل ہوئے تو سنگِ سلیمان بنائے جائیں گے۔" اس کے بعد اس نے دعوے سے کہا "حیوانات' نباتات اور جمادات میں سے جس کا رنگ کالا ہے وہ پہلے سیاہ فام انسان تھے اور جو اب سفید ہیں وہ سپید رو آدمی تھے۔"

یوسف نے محمود واحد کے بارے میں بہت کچھ جان لیا تھا اور اسے دیکھ بھی لیا تھا' اب وہ یہاں سے بھاگ نکلنا چاہتا تھا مگر محسوس کیا

کہ فی الحال اس کی زبردست نگرانی کی جارہی ہے۔ اس نے ابھی تک دینِ محمودی کو اختیار نہیں کیا تھا گو کہ اس پر مسلسل دباؤ ڈالا جارہا تھا مگر اس نے غور و فکر کے لیے کچھ وقت مانگ لیا تھا۔ خالد امین نے اشاروں میں اس کو دھمکی دی "دیکھو! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمیں دھوکا دے کر یہاں سے نکل جاؤ گے تو اس خیال کو دل سے نکال دو۔"

یوسف نے کہا "میرے بارے میں جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ میں اپنے سابقہ جنموں میں بھی جستجو پسند تھا' یہ میری فطرت ہے کہ میں جب تک کسی چیز سے بالکل مطمئن نہیں ہوجاتا اسے قبول نہیں کرتا۔ دینِ محمودی کے سلسلے میں' میں ابھی تک پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ اس لیے اسے اختیار بھی نہیں کیا۔ مجھے غور و فکر کے لیے کچھ دن اور درکار ہیں۔ اس لیے دینِ محمودی کے اختیار کرنے میں تامل ہے۔ میرا کلی اطمینان مجھے اپنے دین میں راسخ رکھتا ہے۔"

خالد امین نے کہا "ٹھیک ہے۔ خوب اچھی طرح غور و فکر کرلو لیکن اس التوا سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ خواہ مخواہ کسی نئے جنم میں پہنچا دیے جاؤ گے۔"

بہت جلد یوسف کو اندازہ ہوگیا کہ وہ یہاں سے بمشکل نکل سکتا ہے۔ بظاہر فرار کے سارے منصوبے ناکام ہوتے نظر آرہے تھے۔

اسی دوران اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوگئی جو حاکمِ گیلان کا مخلاتی خدمت گار تھا۔ وہ یہاں کس طرح پہنچ گیا؟ حیرت کی بات تھی' اس نے تخلیے میں یوسف کو سمجھایا۔ "دیکھیں! آپ کا یہاں سے بچ نکلنا نہایت دشوار کام ہے کیوں کہ آپ نے ابھی تک دینِ محمودی بھی اختیار نہیں کیا۔ میں آپ کے ساتھ ہی یہاں آیا تھا اور دینِ محمودی میں داخل ہوکر ان سب کا اعتبار حاصل کرلیا لیکن حقیقتاً میں یہاں آپ کی مدد کو آیا ہوں۔ آپ حاکمِ گیلان کے نام جو پیغام دینا چاہیں دے دیں۔ میں اس بہ آسانی پہنچا دوں گا اور آپ کی مجبوریوں کا ذکر کردوں گا۔"

یوسف اس شخص پر بھی اعتبار نہیں کرسکتا تھا لیکن اسے موت اور زندگی کا یہ کھیل کھیلنا پڑا۔ اس نے سوچا کہ اگر یہ شخص واقعی اس کی مدد کرنا چاہتا ہے تو اس کی ساری باتیں حاکمِ گیلان تک پہنچا دے گا اور پھر اس فتنے کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوجائے گا لیکن اگر یہ شخص خالد امین اور محمود واحد کا آدمی ہے تو پھر خود اس کا کام تمام کردیا جائے گا اور اس تکلیف دہ اور اذیت ناک زندگی سے نجات مل جائے گی۔ آخر یوسف نے اس شخص کو ساری تفاصیل سمجھا دیں اور کہا "جب یہاں چھاپا پڑے گا اور یہ سب گرفتار کرلیے جائیں گے تو ان میں محمود واحد بھی ہوگا۔"

وہ شخص غائب ہوگیا اور چند دنوں بعد جب حاکمِ گیلان نے مختلف مقامات پر چھاپے مارے۔ وہ وہاں بھی پہنچ گیا جہاں محمود واحد' خالد امین اور دوسرے امین رہتے تھے اور جس جگہ سے یوسف نے حاکمِ گیلان کو اپنا پیغام بھیجا تھا لیکن حاکمِ گیلان کو یہاں سے کچھ بھی نہیں ملا۔ بس یہاں سے یوسف کی لاش ملی اور یوسف کے سامان میں سے اس کی یادداشتیں۔ ان یادداشتوں میں وہ ساری باتیں موجود تھیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ بس ان میں چند سطریں نئی تھیں۔ یوسف نے یہ لکھ کر یادداشت لکھنے کا سلسلہ موقوف کردیا تھا۔

"اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ میں یہاں سے کبھی بھی نہیں نکل سکوں گا اور شاید یہ لوگ مجھے قتل کردیں۔ محمود واحد کے بقول میں اب کسی انسان کے روپ میں آنے سے پہلے کئی مکروہ جانوروں کی جون میں پیدا ہوتا رہوں گا۔"

حاکمِ گیلان کو بے حد دکھ ہوا کہ ایک شخص جو بمشکل محمود واحد تک پہنچ گیا تھا اور اسے پہچان بھی لیا تھا وہ حاکمِ گیلان تک نہیں پہنچ سکا اور مارا گیا۔ محمود واحد کو پہچاننے والا کوئی اور نہ مل سکا۔ یہ شخص تاریخ کا ایک حصہ بن گیا۔ اپنا کام کرکے کسی کے ہاتھ آئے بغیر اس دنیا سے رخصت ہوگیا کیوں کہ کتابوں سے ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ محمود واحد پر اس دور کی حکومت نے قابو پالیا تھا۔ وہ پیش منظر سے پس منظر میں چلا گیا اور کچھ عرصے کے لیے یہ دین بھی زمین دوز رہا مگر پھر آہستہ آہستہ یہ لوگ دنیا کے سامنے آگئے اور ان کے ممتاز اور مشہور پیروؤں میں درویش صفا' درویش بقائے واحد' درویش اسماعیل' میرزا تقی' شیخ لطف اللہ' شیخ شہاب' شیخ تراب اور کمال امین مشہور لوگ ہیں۔ یہ لوگ نہایت زور و شور سے اپنے دین کی تبلیغ میں مشغول ہوگئے اور معلوم نہیں کیوں حکومتِ وقت نے بھی سکوت اختیار کرلیا' ان کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں اور ان کے کاموں میں مداخلت نہیں کی۔ حوصلہ افزا حکومتی روش نے ان کے حوصلے بڑھادیے تھے اور کمال امین نے تراب سے مل کر حکومت کے آدمیوں میں تلقین و تبلیغ شروع کردی۔ جن مسلمانوں کے سینوں میں دردمند دل تھا اور جن کے دلوں میں ابھی تک دینی حمیت اور مذہبی غیرت باقی تھی وہ اپنے طور پر ان کا مقابلہ کرتے رہے۔ وہ خود مرکھپ گئے مگر محمودی دین کے امینوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ایران میں شاہ عباس صفوی کا دورِ حکومت آگیا۔

○☆○

مذہبی علما نے شاہ عباس صفوی کی توجہ واحدی فرقے کی طرف مبذول کرائی اور کہا "اگر آپ کے دورِ اقتدار میں ان کے خلاف کچھ نہ کیا گیا تو تاریخ میں آپ کو بدنام کیا جائے گا اور اس سے آپ کی نیک نامی اور نیک شہرت متاثر ہوگی۔"

شاہ عباس صفوی نے کہا "میں نے تو ان کا زور کہیں بھی نہیں دیکھا۔ میں کس طرح یقین کرلوں کہ یہ لوگ بھی اس لائق ہیں کہ ان پر

شاہی توجہ مبذول ہو۔"

علما نے درخواست کی "آپ نامی گرامی واحدیوں سے ملیں' ان سے باتیں کریں یا آپ ہمیں ان سے باتیں کرنے کا موقع دیں پھر معلوم ہو جائے گا کہ یہ فرقہ کتنا گمراہ ہے۔"

شاہ عباس صفوی نے حکم دیا کہ واحدیوں کے مشہور عالموں کو اس کے سامنے پیش کیا جائے۔

تراب اور کمال اپنے دین کے مفتی تھے۔ ان دونوں کو شاہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ شاہ نے ان دونوں سے باتیں کیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دونوں کٹر امین ہیں۔

اس کے باوجود شاہ عباس صفوی نے دونوں سے پوچھا "جب ایک ابدی اور عالمی سچائی موجود تھی تو تیرے آقا و مولا محمود واحد کو کیا ضرورت پیش آئی تھی کہ اس نے اسلام کے خلاف آواز بلند کی اور اپنی طرف سے ایک نیا دین پیش کر دیا جس کے تم دونوں بھی پیرو ہو؟"

تراب امین نے جواب دیا "ہمارے آقا و مولا نے دین اسلام کو کبھی بھی جھوٹا نہیں کہا' وہ بھی اس کی سچائی کے قائل تھے لیکن وہ کہتے تھے کہ اس سچائی کی عمر تمام ہوئی اور اس رائج سچائی کو عصر حاضر کا لباس پہنا دیا گیا ہے۔ گویا دین اسلام منسوخ ہوا اور اس کی جگہ دین محمودی نے لے لی۔ ہم اس کی حقیقت کو پا گئے ہیں اور اپنے آقا و مولا محمود واحد کے بعد انسانوں کی رہنمائی کرنے لگے۔"

تراب امین جیسے ہی خاموش ہوا کمال امین نے بات شروع کر دی "معلوم نہیں شاہ کو ہماری باتوں کا یقین آئے گا یا نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ ہم دونوں کچھ عرصے سے شاہ تک رسائی حاصل کرنے کے خواہش مند تھے کہ شاہ نے ہم دونوں کو خود ہی طلب کر لیا۔"

شاہ عباس صفوی نے دونوں کو حکم دیا "تم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ اپنے نئے دین کو چھوڑ کر اسلام کی طرف واپس آجاؤ اور اپنی پراگندہ خیالی سے نجات حاصل کر لو۔"

تراب امین نے عرض کیا "یہ عجیب بات ہے کہ شاہ ہمارے ساتھ اسی طرح پیش آ رہا ہے' جس طرح فرعون حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ کے ساتھ پیش آیا تھا اور اے صفوی خاندان کے نیک نام شاہ! ہمارے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کر۔ خود کو سوچنے کا موقع دے۔ ہو سکتا ہے کہ اس دوران حقیقت آشکار ہو جائے اور شاہ کو شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔"

شاہ عباس صفوی نے یہ سب نہایت صبر و تحمل سے سنا اور محسوس کیا کہ دونوں اپنے دین میں راسخ العقیدہ ہیں اور آسانی سے اسلام کی طرف واپس نہیں آئیں گے۔ اتمام حجت کے لیے شاہ نے دونوں کو سوچنے کا موقع دیا اور کہا "میں تم دونوں کی فضول دلیلیں سننے کو تیار نہیں۔ اس لیے اس وقت جاؤ اور جب میں تم دونوں کو دوبارہ طلب کروں تو تم میرے دربار میں اس طرح باتیں نہیں کرو گے۔"

تراب امین نے کہا "اگر شاہ کا یہ خیال ہے کہ ہم شاہ کی حکومت اور اس کے دبدبے سے خوف زدہ ہو کر اپنا دین ترک کر دیں گے تو ابھی سے جان لو کہ اب ہماری دوسری ملاقات بھی اسی طرح اور انہی عقائد پر ہو گی۔ اس لیے شاہ کو اپنی کسی امید موہوم پر ہمیں نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

شاہ عباس صفوی کو دونوں کی ڈھٹائی پر غصہ آ رہا تھا۔ "میں دیکھ رہا ہوں کہ میری نرمی نے تم دونوں کو دلیر کر دیا ہے۔ اب تم دونوں دفع ہو جاؤ اور یاد رکھو کہ جب تمہیں دوبارہ طلب کیا جائے گا تو دربار میں تمہیں بات کرنے کی یہ آزادی حاصل نہیں ہو گی۔"

دونوں دربار سے نکلے تو شاہ کے سخت لب و لہجے سے ذرا بھی پریشان نہ ہوئے۔ وہ اب بھی پُرامید تھے کہ شاہ کو ورغلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اب دوسرے غیر معروف امین اپنی کوششوں میں مشغول ہو گئے۔ یہ لوگ دربار سے بھی وابستہ تھے اور ان کے امین ہونے کا علم شاہ کو نہیں تھا۔ انہیں جب بھی موقع ملتا شاہ کو دین محمودی کے واقعات سناتے رہتے۔ یہ لوگ اپنے ارادوں میں اس حد تک کامیاب ہو گئے کہ شاہ ان کی باتیں گوارا کرنے لگا۔ حالانکہ اپنے نرم رویے کے جواز میں شاہ یہی کہہ سکتا تھا کہ اس کو اس نئے دین کے عقائد جاننے میں دلچسپی ہے اور وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ یہ لوگ آخر کہتے کیا ہیں اور چاہتے کیا ہیں؟

جب شاہ کو یہ معلوم ہوا کہ اس دین کے پیرو انسانوں' حیوانوں اور موجودات کے دوبارہ جنم لینے کے قائل ہیں تو اس کی دلچسپیوں میں اضافہ ہو گیا اور اس نے امینوں کے بارے میں نرم رویہ اختیار کیا۔ بادشاہ کو بھی یہ جستجو ہوئی کہ وہ سابقہ جنم میں کیا تھا؟ اس کے اس سوال کا جواب معمولی امین نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے شاہ کو مشورہ دیا گیا کہ اسے تراب اور کمال سے رابطہ رکھنا چاہیے اور اگر شاہ نے ان سے سختی کی تو یہ بھی ذہنی طور پر خود کو شاہ سے دور کر لیں گے اور شاہ ان سے جو کچھ معلوم کرنا چاہتا ہے' کبھی معلوم نہیں کر سکے گا۔

چنانچہ شاہ نے ان دونوں کو دوبارہ دربار میں طلب کیا اور کسی قدر خوش اخلاقی سے پیش آیا جس سے یہ دونوں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ شاہ پر ان کے دین کا جادو چل گیا ہے اور شاہ ذہنی طور پر دین محمودی کی صداقتوں پر ایمان لے آئے گا۔ گویا اب یہ لوگ نہایت توجہ اور تن دہی سے سرگرم عمل ہو گئے تھے اور انہیں ایسا لگتا تھا کہ شاہ عنقریب ان کے دین میں داخل ہو جائے گا۔

شاہ نے ان سے سوال کیا "سنا ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون انسان اپنے سابقہ جنم میں کیا تھا؟"

کمال نے جواب دیا "بے شک! ہم لوگ انسانوں' حیوانوں' نباتات اور جمادات کے ماضی سے واقف ہوتے ہیں اور یہ علم ہی ہمیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے اور ہم یہ دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ سابقہ ادیان کو اس علم سے محروم رکھا گیا تھا۔"

شاہ نے پوچھا "کیا تم دونوں یہ بتا سکتے ہو کہ میں سابقہ جنم میں کیا تھا؟"

کمال نے جواب دیا "اگر شاہ کے نازک مزاج پر گراں نہ گزرے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ شاہ اپنے سابقہ جنم میں بھیڑیا تھا اور کمزوروں کو چیرپھاڑ کے رکھ دیتا تھا۔ اب انسانی روپ میں آنے کے بعد بھی اس کی فطرت و عادت کے مطابق چیرپھاڑ کا عمل جاری ہے اور شاہ کسی کمزور کو معاف کرنے کا قائل نہیں۔"

شاہ کو ان باتوں پر غصہ تو بہت آیا لیکن ان کو جھٹلانے کے خیال سے نرم رویّہ اختیار کیا اور کہا "یہ بات نہیں ہے۔ کیا تم لوگ مجھے بھیڑیا کہہ کر میرے ساتھ زیادتی نہیں کر رہے ہو۔ اگر میری فطرت میں درندگی ہوتی تو میں تم دونوں کی یہ باتیں سن کر تمھیں معاف نہ کرتا۔"

کمال نے زیادہ حوصلہ مندی دکھائی اور کہا "اے شاہ! جب ہم حق بیان کرتے ہیں تو موت اور زندگی کا خیال تک دل میں نہیں لاتے۔ شاید خدا کو یہ منظور ہو کہ شاہ آئندہ صالح اور نیک انسان کی صورت میں جنم لے اور اسی لیے فطرت میں یہ تبدیلی لائی جا رہی ہے کہ شاہ ہم سے اپنی فطرت کے خلاف پیش آ رہا ہے۔"

شاہ نے انھیں منع کیا "تم لوگ اپنے ان فضول عقائد سے تائب ہو جاؤ ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں مجھ سے تمھیں نقصان نہ پہنچ جائے۔"

تراب نے کہا "شاہ ہمیں تلقین کر رہا ہے، اب ہمیں اجازت دی جائے کہ ہم شاہ کو تلقین کریں۔"

شاہ نے کہا "تلقین کوئی بھی کر سکتا ہے، میں بھی، تم بھی، کوئی بھی۔"

کمال نے کہا "ہم نے اپنے دین کے بارے میں جو کچھ شاہ کو بتایا ہے یا شاہ نے ہمارے دین کے بارے میں دوسروں سے جو کچھ جانا یا سمجھا ہے میں شاہ کو مشورہ دے رہا ہوں کہ پہلے وہ ہمارے دین کے حسن و قبح پر غور کرے۔ اس کے بعد کوئی قدم اٹھائے۔"

شاہ نے کہا "میں نے اپنی طبیعت کے خلاف تمھیں گوارا کر رکھا ہے لیکن کب تک یہ کوئی نہیں جانتا۔ نہ میں، نہ تم، نہ کوئی اور۔ تم لوگ میری اس روش سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنے جدی دین کی طرف لوٹ آؤ۔"

بہرحال یہ ملاقات بھی بدمزگی سے ختم ہوئی۔ جانبین کے دل صاف نہیں تھے لیکن شاہ کی نرمی نے اتنا اثر ضرور دکھایا کہ امینی شاہ کے بارے میں یہ باتیں مشہور کرنے لگے کہ شاہ نے بھی دینِ محمودی اختیار کر لیا ہے اور اب وہ خود بھی ایک امین ہیں۔

لیکن شاہ کے حامی اور دینِ محمودی کے مخالف یہ پوچھتے تھے "اگر شاہ نے تمہارا دین اختیار کر لیا ہے تو اس نے تم دونوں کو اپنے دربار سے نکال کیوں دیا؟ پھر شہریوں کے دیکھنے میں یہ بھی آ رہا ہے کہ تمہارے دین کے پیروؤں پر ایران کی زمین تنگ ہوتی جا رہی ہے۔"

اسی دوران دینِ محمودی پر سختیاں شروع ہو گئیں اور شاہی فرامین کے ذریعے ان کو سزائیں دی جانے لگیں۔ ایک دن ایک امین اپنے رختِ سفر کے ساتھ مسلمانوں میں پہنچا اور زادِ راہ دکھاتے ہوئے کہا "کچھ جانتے ہو کہ مجھے یہ قیمتی زادِ راہ کس نے مہیا کیا ہے؟"

لوگوں نے اس قیمتی زادِ راہ کو دیکھا تو حیرت ہوئی اور پوچھا "تو کہاں جا رہا ہے اور تجھ کو یہ زادِ راہ کس نے مہیا کیا ہے؟"

مسافر امین نے جواب دیا "یہ زادِ راہ شاہ نے مہیا کیا ہے اور کہا ہے کہ میں ایران میں اسلام کی موجودگی میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا اس لیے تو اپنی جان بچا کر ہندوستان چلا جا اور وہاں اپنے دین کو پھیلانے کی کوشش کر۔ اگر میں کچھ کر سکا تو ایران میں بھی یہ دین پھیلے گا اور خوب پھیلے گا۔"

مسلمانوں نے کسی تصدیق کے بغیر شاہ کو بھی برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

جب یہ خبریں شاہ تک پہنچیں تو اس کو غصہ آیا "یہ کتنے برے لوگ ہیں کہ بلاوجہ مجھے بدنام کر رہے ہیں، میں اس دین پر ایسی کاری ضرب لگاؤں گا کہ یہ پھر کبھی سر اٹھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔"

شاہ نے تیسری بار دونوں کو طلب کیا اور پوچھا "تم لوگ یہ کس قسم کی جھوٹی جھوٹی باتیں مشہور کرتے پھر رہے ہو؟"

تراب نے کہا "ہم نے کوئی بھی جھوٹی بات ابھی تک نہیں کی ہے۔ بے شک ہمارے مخالف، ہمارے دشمن شاہ کو ورغلاتے رہتے ہیں۔"

شاہ نے پوچھا "سچ بتاؤ، کیا تم لوگوں نے یہ مشہور نہیں کر رکھا ہے کہ میں بھی تمہارے دین میں داخل ہو گیا ہوں؟"

تراب نے جواب دیا "یہ بات ہم دونوں میں سے کسی نے بھی نہیں کی ہے۔ لوگ بذاتِ خود چالاک اور ہوشیار ہیں اور شاہ کے عمل، نرمی اور بے ضرر رویّے سے یہ اندازہ لگا بیٹھے ہیں کہ شاہ نے بھی دینِ محمودی اختیار کر لیا ہے حالانکہ یہ محض قیاس آرائی ہے۔"

شاہ نے کہا "میری نرمی تو تم لوگوں نے دیکھ لی، اب کسی دن سختی بھی دیکھ لو گے۔"

ابھی یہ دونوں دربار سے اٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ شاہ نے ان دونوں سے کہا "آج میں آخری بار تم دونوں سے چند سوال کروں گا۔ اس کے بعد ہماری ملاقاتیں نہیں ہوں گی۔"

تراب نے کہا "پوچھیں۔"

شاہ نے پوچھا "یہ جو کچھ شہروں اور بازاروں میں میری بابت مشہور کیا جا رہا ہے اس میں تم دونوں کس حد تک شامل ہو؟"

تراب نے جواب دیا "آپ کے اس سوال کا جواب میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔ شہروں اور بازاروں میں جو کچھ مشہور ہو رہا ہے اس میں ہم دونوں کا کوئی ہاتھ نہیں ہے لیکن زبان خلق کو نقارۂ خداوندی کہا جاتا ہے۔ اب تو ہمیں بھی یہ شبہ پیدا ہو گیا ہے کہ شاہ نے بھی اپنے جدی اور آبائی دین کو ترک کر کے دین محمودی اختیار کر لیا ہے۔"

شاہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا "گویا اب میں اپنے اس بدنما داغ کو تمہارے خون ہی سے دھو سکتا ہوں۔"

کمال جو ابھی تک خاموش تھا اور دونوں کی باتیں محض سن رہا تھا' شاہ کی دھمکی سے کسی قدر خوف زدہ ہوا اور عرض کیا "جناب والا! یہ بات تو قرین صداقت اور انصاف نہیں کہ آپ ایک ایسے جرم میں ہم دونوں کو قتل کروا دیں جو ہم سے سرزد نہیں ہوا۔"

شاہ نے دونوں کو ڈانٹا "تم دونوں مقتدائے دین ہو اور تمہیں اپنے پیروؤں پر اتنا بھی اقتدار حاصل نہیں کہ وہ بازاروں اور گلی کوچوں میں تمہارے دین کی نسبت سے میرا نام لے کر جو کچھ مشہور کر رہے ہیں انہیں روکو' اگر تم یہ بھی نہیں کر سکتے تو تمہارا وجود اپنوں کے لیے' میرے لیے اور غیروں کے لیے بالکل بے کار ہے اور اب تم دونوں کے لیے زمین کے اوپر کے بجائے زمین کے اندر مناسب جگہ ہے۔"

دونوں کو شاہ کی نیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔

تراب نے وعدہ کیا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کوئی ایسی ویسی بات آپ کے حوالے سے نہیں مشہور ہو گی۔"

وقتی طور پر یہ مسئلہ دب گیا گویا شاہ نے ان دونوں کو موقع دیا تھا کہ وہ جو وعدہ کر رہے ہیں اس پر عمل کر کے دکھائیں۔

لیکن یہ کتنی عجیب بات تھی کہ شاہ کے عقائد کے بارے میں جو مشہور کیا جا رہا تھا وہ سلسلہ جاری رہا۔ شاہ کی صحبت میں ہر وقت کوئی نہ کوئی امین موجود ہوتا تھا اور وہ نہایت ہوشیاری اور عقل مندی سے اپنے عقائد شاہ کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ یہ لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ شاہ ایرانیوں کو خوش رکھنے کے لیے بظاہر اپنے دین پر قائم ہے ورنہ اندر سے وہ امین بن چکا ہے۔

اسی دوران شاہ از راہ عقیدت پاپیادہ مشہد گیا۔ مشہد میں تراب اور کمال پہلے سے موجود تھے۔

شاہ عباس نے امام رضا کے مزار پر حاضری دی۔ اس وقت پاپیادہ چلنے کی وجہ سے اس کے دونوں پاؤں درد کر رہے تھے۔ شاہ نے تراب اور کمال سے کہا "اس وقت پیدل چلنے کی وجہ سے مجھے بہت تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔"

تراب نے جواب دیا "یہ تمہاری دناوت طبع ہے کیوں کہ یہ امام جس کے لیے تم نے پاپیادہ سفر کیا اور اس کے مزار پر حاضری دی اگر یہ پیوستہ بحق ہے تو اسے اس کے مزار میں ناحق تلاش کرتے ہو اور اگر یہ حق سے پیوستہ نہیں تو تم اس سے کیا توقع کر سکتے ہو۔ اس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ تم زندہ امام کی خدمت میں پہنچو۔"

شاہ نے پوچھا "وہ زندہ امام کہاں ہے؟"

کمال نے کہا "وہ زندہ امام میں ہوں۔"

شاہ عباس کو بے حد غصہ آیا لیکن ضبط و برداشت سے کام لیا اور سنجیدگی سے کہا "تم زندہ امام ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو میں اس سچ کی تصدیق چاہوں گا۔"

کمال نے کہا "بے شک آپ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔"

شاہ عباس نے کہا "میں تم دونوں کو بندوق کی گولی کا نشانہ بناتا ہوں۔ اگر گولی نے کوئی اثر نہ کیا تو میں تمہاری طرف رجوع کر لوں گا۔"

تراب نے کہا "سبحان اللہ! تمہارے امام رضا تو ایک دانۂ انگور سے جاں بحق ہو گئے تھے پھر ہم دونوں بندوق کی گولی کھا کر کیوں کر زندہ رہ سکتے ہیں۔"

شاہ عباس نے دونوں کو اپنے سامنے کھڑا کر کے باری باری گولی کا نشانہ بنایا اور انہیں کسی اگلے جنم کی طرف روانہ کر دیا اور تاریخ سے ہمیں کچھ پتا نہیں چلتا کہ اس کے بعد محمود واحد' تراب امین اور کمال امین نے دنیا کے کن کن خطوں میں کن کن شکلوں میں جنم لیے۔ اگر وہ سنگ مرمر کی شکل اختیار کر گئے تو یہ مرمری چٹانوں اور سلوں کی شکل میں کہاں موجود ہیں۔ اگر انہوں نے رجعت سے تفریق اختیار کی ہے تو کن حیوانوں کی شکلوں میں کہاں کہاں آئے اور کون کون سی شکلیں اختیار کیں۔ اگر انہوں نے نباتات کی شکل اختیار کی ہے تو آج کل وہ کن درختوں کی شکلوں میں استادہ ہیں اور بد قسمت لوگ انہیں ابھی تک پہچاننے سے کیوں قاصر ہیں؟

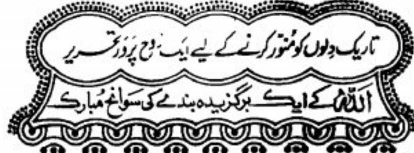
مضمون کے مآخذ

دبستان مذاہب	ائمہ تلبیس	تاریخ ایران	تاریخ مذاہب عالم
نامعلوم	ابوالقاسم رفیق دلاوری	مرزا مقبول بیگ بدخشانی	رشید احمد



ضیا تسنیم بلگرامی







تاتاریوں کا سیل بلا آبادیوں کو ویرانوں میں بدلتا ہوا ایران میں داخل ہوا۔ تاتاریوں کے جتھے چاروں طرف قہرِ خداوندی کا کردار ادا کرتے پھر رہے تھے۔ اسی طرح تاتاریوں کا ایک جتھا کرمان میں گھس گیا۔ کرمان میں تاتاریوں کو جس قبیلے سے نبرد آزما ہونا پڑا، اس کا تعلق امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے خاندان سے تھا۔ اس قبیلے نے بڑی بے جگری سے تاتاریوں کا مقابلہ کیا اور ان کا منہ پھیر دیا۔ تاتاریوں کو شکست ہوگئی اور وہ شمال کی طرف فرار ہو گئے۔ کرمانی قبیلے کا یہ ایک غیر معمولی کارنامہ تھا جس نے بڑی شہرت حاصل کی اور دوسرے قبائل کے رشک اور توجہ کا مرکز بن گیا اور اس قبیلے کو سالار کا لقب بخشا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد اس قبیلے کے ہر نوجوان کے نام کے ساتھ سالار لگنے لگا۔

ایک عرصہ بعد اس قبیلے میں ایک نوجوان سالار فخرالدین کو تصوف سے عشق ہوگیا اور یہ نوجوان اپنے دل کی آگ میں جلتا ہوا مشہور بزرگ شاہ محمد کرمانی کی خدمت میں پہنچا۔ شاہ محمد کرمانی نے اس نوجوان میں نہ جانے کیا دیکھا کہ اس کو باقاعدہ بیعت سے سرفراز فرما کر اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ اور چودہ سال تک مجاہدے اور ریاضت میں مشغول رکھا۔ ان چودہ سالوں میں سالار فخرالدین نے اس قدر بلند مراتب حاصل کر لئے کہ ان کے مرشد شاہ محمد کرمانی نے اپنی بہن بی بی حافظ جمال کو سالار فخرالدین سے وابستہ کر دیا۔

شادی کے بعد پہلی اولاد نرینہ پیدا ہوئی۔ اس کا نام نظام الدین رکھا گیا۔ شاہ محمد کرمانی نے نظام الدین کو اپنی فرزندی میں لے لیا اور پرورش و تربیت میں خاص توجہ برتی۔

ان دنوں برِصغیر کو اس اعتبار سے خاص شہرت حاصل تھی کہ برِصغیر کے مسلم حکمران اپنے مسلمان بھائیوں کا خاص خیال رکھتے ہیں اور ان کو اعلیٰ عہدے اور مراتب دے کر فکرِ معاش سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ چنانچہ نظام الدین نے جب ہوش سنبھالا اور پھر اس سنِ شعور کو پہنچے جہاں آدمی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا ہے تو انہوں نے اپنے آس پاس نظر دوڑائی اور اس ملک کی جستجو کی جہاں وہ اپنا معاشی مسئلہ حل کر سکتے تھے۔ چنانچہ ان کی نظرِ انتخاب برِصغیر پر پڑی اور وہ ہجرت کر کے سندھ میں آ گئے۔ نظام الدین نے کچھ وقت سندھ میں گزارا۔ اس کے بعد شمالی ہند کا رخ کیا اور پانی پت میں جا بسے۔ یہاں انھیں شاہی رسالے میں ملازمت مل گئی۔

سالار فخرالدین اپنی بیوی کے ساتھ بیٹے کی واپسی کا انتظار کرتے رہے لیکن اب نظام الدین کا واپس جانا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ باپ نے بیٹے کو اشتیاق آمیز خطوط لکھے اور واپسی کی تلقین کی لیکن بیٹے نے جواب میں لکھ دیا کہ میں واپس آ تو سکتا ہوں لیکن مجھے ملازمت خاص شاہی رسالے میں ملی ہے اور ترکِ ملازمت کوئی آسان مسئلہ نہیں اس لئے واپسی کا سرِدست کوئی امکان نہیں۔ واپسی جب بھی ممکن ہوئی، میں سر کے بل بھاگ کر آپ کے قدموں میں حاضری دوں گا۔"

باپ نے اس انتظار میں کئی سال اور گزار دیئے مگر بیٹا واپس نہیں آیا — باپ کی جو کیفیت تھی اس کا اظہار کسی نہ کسی شکل میں ہو جا رہا تھا لیکن بیٹے کی جدائی کے غم میں ماں کا برا حال تھا۔ ماں کی بھوک پیاس، سونا جاگنا سب کچھ حرام تھا۔ باپ کو بیٹے کے خط یا کسی پیغام کا انتظار تھا اور سالار فخرالدین خود کو مجبور اور بے بس محسوس کر رہے تھے۔ بیٹے نظام الدین کی واپسی اُس کی مرضی اور ارادے پر منحصر تھی۔ اتنی دور سے وہ بیٹے کو کسی بات پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔

آخر ایک دن ماں کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ انھوں نے اپنے شوہر سے پوچھا۔ "نظام الدین کا کیا ہوا؟ آخر وہ کب تک واپس آئے گا؟"

سالار فخرالدین نے جواب دیا۔ "اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ میں کیا، اس سوال کا کسی کے پاس بھی کوئی جواب نہ ہوگا۔"

بیوی نے ذرا بے مروتی اور سختی سے کہا "لیکن میں آج آپ سے حتمی جواب لے کر رہوں گی۔"

شوہر نے عاجزی سے کہا۔ "نیک بخت! جہاں تو وہاں ہیں۔

تیرے سوال کا میں کوئی حتمی جواب کس طرح دے سکتا ہوں۔"

بیوی نے کہا۔"نظام الدین کی جدائی کے غم میں میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ اب میں زیادہ صبر نہیں کر سکتی۔ میں تو ہر قیمت پر اپنے نظام الدین سے ملنا چاہتی ہوں۔"

فخر الدین نے جواب دیا۔"پھر میں نظام الدین کو خط بھیجنے کی کوئی سبیل کرتا ہوں اور اس خط میں تمہاری بے چینی کو نہایت موثر طریقے سے سمونے کی کوشش کروں گا۔ ممکن ہے اس کو پڑھ کر نظام الدین مضطرب ہو کر وہاں سے چل پڑے۔"

لیکن بیوی کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی، کہا۔"اس کے علاوہ کوئی اور صورت؟"

شوہر نے جواب دیا۔"میری سمجھ میں تو کوئی اور صورت آتی نہیں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں نظام الدین کو زبردستی بلوا لیتا۔"

لیکن بے چین ماں کے پاس اس کا حل تھا، بولی۔"میں ماں ہوں۔ اور اب میں اس کے انتظار کے نام پر صبر نہیں کر سکتی۔ آپ اگر نظام الدین کو اپنی خواہش اور ارادے سے بلوا نہیں سکتے تو ہم دونوں ہندوستان، نظام الدین کے پاس پہنچ تو سکتے ہیں۔ یہ بات تو ہمارے اختیار اور بس کی ہے۔"

سالار فخر الدین، بیوی کی اس تجویز پر سناٹے میں آ گئے۔ کچھ سکوت کے بعد کہا۔"بے شک اتنی نادر تجویز ایک ماں کو ہی سوجھ سکتی ہے۔ کیا بہترین تجویز ہے سبحان اللہ!"

بیوی نے کہا۔"ہمیں سفر کی تیاری شروع کر دینا چاہیے تاکہ یہاں سے جلد از جلد روانہ ہو جائیں۔"

سالار فخر الدین نے جواب دیا۔"بیوی! ہم درویش لوگ سفر کی تیاری کیا کریں گے، تم جس دن کہو گی چل پڑیں گے۔"

دونوں نے سفر کے لئے جمعہ کی نماز کے بعد کا وقت طے کر لیا اور حسبِ ارادہ روانہ ہو گئے۔ مہینوں کے سفر کے بعد جب یہ دونوں اپنے بیٹے نظام الدین کے پاس پانی پت پہنچے تو ان کی خوشی کا حال بیان کرنا قوتِ گویائی کے بس میں نہیں رہا۔ ماں باپ بیٹے سے لپٹ لپٹ کر خوشی کے آنسو بہانے لگے۔ بیٹے نے کہا۔"مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں خود نہیں آ سکا اور آپ کو سفر کی زحمتیں گوارا کرنا پڑیں۔"

باپ نے جواب دیا۔"بیٹے! میں تو شاید تیرا انتظار ہی کرتا رہتا لیکن تیرے پاس آنے میں تیری ماں کی بے چینی اور کمالِ محبت کا بڑا دخل ہے۔ میں تو تیری ماں کے سہارے پانی پت تک آ گیا ہوں۔"

نظام الدین نے کہا۔"شاہی رسالے کی ملازمت ایسی ہے کہ میں چھٹی نہیں لے سکتا۔ اب آپ دونوں میرے ساتھ ہی رہیں گے اور اس وقت تک یہیں رہیں گے جب تک مجھے رخصت نہیں مل جاتی۔"

ماں نے جواب دیا۔"بیٹے! میں اب تجھ سے جدا نہیں رہ سکتی۔ ہم تینوں ایک ساتھ، ایک جگہ اور ایک ملک میں رہیں گے۔ یا تو تو ہمارے ساتھ اپنے وطن واپس چلے گا یا ہم دونوں یہیں تیرے پاس رہ جائیں گے۔"

نظام الدین نے کہا۔"ماں! میری خواہش تو یہی ہے کہ آپ دونوں یہیں اس ملک میں میرے ساتھ رہ جائیں۔ آگے آپ کا حکم، آپ کی مرضی، آپ کی خواہش۔"

چنانچہ ماں باپ دونوں نے یہ حتمی فیصلہ کر لیا کہ انہیں پانی پت میں بیٹے ہی کے پاس رک جانا ہے۔

سالار فخر الدین نے پانی پت میں دورانِ قیام کچھ عجیب باتیں محسوس کیں۔ انہیں بارہا یہ احساس ہوا، گویا کوئی انہیں یہ باور کرا رہا ہے کہ وہ پانی پت اپنی مرضی سے نہیں آئے ہیں بلکہ لائے گئے ہیں۔ ان کا بیٹا نظام الدین تو ایک سبب، ایک بہانہ بن گیا ہے ورنہ یہاں ایک ہستی عالمِ وجود میں آنے والی ہے جو اس خاندان کا حاصل ہو گی اور جس سے سالار فخر الدین اور ان کا خاندان امر ہو جائے گا۔

چنانچہ ۶۰۲ھ میں آپ کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ سالار فخر الدین بیٹے کی پیدائش سے بہت خوش ہوئے۔ بھائی نظام الدین کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ماں بھی بے اندازہ خوش تھیں۔ بچے نے دنیا میں قدم رکھتے ہی رونا شروع کر دیا اور نومولود کا رونا چونکہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی اس لئے بچے کے رونے نے کسی کو پریشان نہیں کیا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد ماں اور دوسرے متعلقین کی نظروں میں بچے کا رونا ایک غیر معمولی واقعہ قرار پا گیا۔ ماں نے چپ کرانے کی بڑی کوشش کی لیکن ناکام رہیں۔ پھر باپ نے سنبھالا اور چپ کرانے کی کوشش کرتے رہے لیکن باپ کی کوششیں بھی اکارت گئیں۔ پھر بھائی نظام الدین نے سنبھالا اور چپ کرانے کے سارے جتن کر ڈالے لیکن نومولود برابر روتا رہا۔

بچہ سارا دن روتا رہا، شام کو باپ نے بیٹے کو گود میں لیا اور پورے جسم کا جائزہ لیا کہ کہیں کسی قسم کی چوٹ یا زخم تو نہیں ہے لیکن کہیں خراش تک نہیں تھی۔ بچے کی آنکھیں بند تھیں۔ باپ نے کوشش کی کہ بچہ آنکھیں کھول دے لیکن اس نے آنکھ نہیں کھولی۔

سالار فخر الدین نے بیوی سے کہا۔"نیک بخت! ہو نہ ہو اس کی آنکھ میں تکلیف معلوم ہوتی ہے۔ اس کو دودھ پلا تاکہ کچھ قرار آئے اور اپنی آنکھیں کھول دے اور میں اس کی آنکھوں کا معائنہ کر سکوں۔"

بیوی نے جواب دیا۔"لیکن جناب حیرت تو یہی ہے کہ دودھ بھی نہیں پیتا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ دودھ پلا کر چپ کرا دوں لیکن یہ دودھ کو منہ تک نہیں لگاتا۔ اب میں کیا کروں کچھ آپ ہی بتلایئے۔"

شوہر نے حیرت سے کہا۔"یعنی حیرت ہے کہ یہ دودھ بھی نہیں پی رہا۔ کہیں یہ بھوکا تو نہیں ہے؟"

بیوی نے جواب دیا۔"ہو سکتا ہے بھوکا ہو لیکن اگر یہ بھوکا ہوتا تو دودھ ضرور پیتا۔ یا پھر اس کے پیٹ میں کسی قسم کا [illegible] ہے۔ کیونکہ اگر پیٹ

میں گڑبڑ ہے تو اس کا لازمی اثر یوں ہوگا کہ بچّہ دُودھ نہ پیئے۔"

شوہر نے سر پکڑ لیا۔" بیوی! میں بہت پریشان ہوں۔ کوشش کرو کہ یہ آنکھیں کھول دے اور جب یہ آنکھیں کھول دے گا تو میں اس کے رونے کا سبب بہت جلد معلوم کرلوں گا۔"

بیوی نے شوہر کی ہدایت پر ایک بار پھر یہ کوشش کی کہ وہ نومولود کو دودھ پلادے لیکن نومولود نے نہ تو دودھ پیا اور نہ ہی آنکھیں کھولیں۔ بیوی نے عاجز آکر شوہر کو مطلع کردیا۔" جناب والا! میں اپنی جملہ کوششوں میں ناکام ہوچکی ہوں۔ بچّہ نہ تو آنکھیں کھولتا ہے اور نہ ہی چپ ہوتا ہے۔ میری عقل ماؤف ہوچکی ہے اور میں اس کا اقرار کرتی ہوں کہ میں اب نہ تو اس کو چپ کراسکتی ہوں اور نہ ہی اس کو دودھ پلاسکتی ہوں۔"

شوہر نے پوچھا۔" دائی نے کیا کہا؟"

بیوی نے جواب دیا۔" دائی نے جواب دیا ہے کہ اس نے سارے جتن کرلئے اور ناکام رہی اس لئے اب مزید کوئی جتن کرنا نہیں چاہتی۔ کہتی ہے خدا سے دُعا کرو کہ جب دوائیں اور تدبیریں کام نہیں کرتیں تو دعا کام کرگزرتی ہے۔"

شوہر نے وضو کیا اور مصلّے پر کھڑا ہوگیا۔ وہ نماز پڑھتا رہا اور نماز کے بعد خشوع و خضوع سے دُعا مانگنے لگا۔" الٰہ العالمین! میری عقل نے جو جو تدبیر بتائی، میں نے اس پر عمل کیا اور آج عالم یہ ہے کہ میری ساری کوششیں اور ساری تدبیریں اکارت گئیں اور اب میں تجھ سے ہی اعانت چاہتا ہوں۔ میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتا، سوائے اس کے کہ میرا بچّہ رونا بند کردے اور دونوں آنکھیں کھول دے۔ اگر تُو نے میری دعا قبول نہ کی تو میں ایک بار سجدے میں ایسا گروں گا کہ اس وقت تک سر ہی نہ اٹھاؤں گا جب تک تو میری دُعا قبول نہ کرلے گا۔"

سالار فخرالدین سجدے میں گر گئے اور دعا کی قبولیابی کا انتظار کرنے لگے، ان کا دل شمع کی طرح جل اور پگھل رہا تھا۔ وہ بڑی دیر تک سجدے میں پڑے رہے۔ کئی گھنٹے بعد نیم بیداری اور نیم خوابیدگی میں کسی نے انہیں مطلع کیا۔" فخرالدین! پریشان نہ ہو، تیری دُعا قبول ہوئی مگر دو دن انتظار کر۔"

فخرالدین چونک کر بیدار ہوگئے اور سوچنے لگے، کہیں یہ خواب تو نہیں؟ وسوسۂ شیطانی تو نہیں؟ آخر وسوسۂ شیطانی کے خوف سے وہ دوبارہ سجدے میں گر گئے۔ وہ اپنے اس عہد پر اب بھی قائم تھے کہ جب تک ان کا بچّہ آنکھیں نہیں کھولتا اور دُودھ نہیں پیتا وہ سجدے میں پڑے رہیں گے۔ ذرا دیر بعد عالمِ رویا میں کسی نے انہیں ڈانٹا۔" فخرالدین تو ہاتفِ غیبی کو وسوسۂ شیطانی سمجھ رہا ہے، اُٹھ! اور دو دن بعد اپنی دعا کی تاثیر دیکھ۔"

فخرالدین گھبرا کر اُٹھے اور بیوی کو یہ خوشخبری سنائی کہ ابھی ابھی کسی نے انہیں خواب میں مطلع کیا ہے کہ اُن کی دُعا قبول ہوئی اور دو دن بعد بچّہ آنکھیں بھی کھول دے گا اور دودھ بھی پینے لگے گا۔

لیکن بچّہ اب بھی رو رہا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ابھی تک بچّے کی آواز نہیں بیٹھی تھی۔

پڑوسیوں کو حیرت تھی کہ یہ کیسا بچّہ ہے جو اپنی پیدائش کے بعد سے برابر روتے چلا جارہا ہے۔ آنکھیں بند، دُودھ سے بے نیاز، لیکن توانائی میں کوئی فرق نہیں آرہا۔ یہ صورتِ حال مسلسل تین دن تک رہی تیسرے دن بیوی نے کہا۔" آخر وہ دعا جو ہاتفِ غیبی کے بقول قبول ہوچکی ہے، وہ اپنا اثر کب ظاہر کرے گی؟"

فخرالدین نے کسی قدر تذبذب سے جواب دیا۔" بیوی مجھے اپنے خواب کی صداقت پر کسی قسم کا بھی شبہ نہیں۔ تھوڑا سا انتظار اور کرلو، کچھ نہ کچھ ضرور ظاہر ہوگا۔"

بیوی نے بڑے دُکھ سے کہا۔" میں اپنے رب کی مشیّت پر قانع ہوں لیکن میرا دل خون کے آنسو اس لئے رو رہا ہے کہ میرا بچّہ بھوکا ہوگا۔ آنکھیں نہیں کھول رہا اور تین دن تک مسلسل روتے رہنے کی وجہ سے اس کا پورا جسم نڈھال ہورہا ہوگا۔"

شوہر نے جواب دیا۔" مرضیِ مولا از ہمہ اولیٰ۔"

عصر سے ذرا پہلے فخرالدین نے اپنی بیوی سے کہا۔" بیوی میں ذرا باہر جارہا ہوں اور کسی حاذق کو پکڑنے کی کوشش کروں گا۔ ممکن ہے وہ



کوئی تدبیر کرے۔"

بیوی نے کہا۔" لیکن خدا کے لئے جلدی ہی آجانا کیونکہ جب تک آپ نہیں آئیں گے میرا دل الجھتا رہے گا۔"

فخرالدّین جیسے ہی باہر نکلے انھوں نے دروازے پر ایک فقیر کو کھڑے دیکھا۔ وہ اپنے جسم کو چمڑے میں چھپائے ہوئے تھا۔ فخرالدّین نے ناگواری سے فقیر سے مصافحہ کیا اور کہا۔" بابا! اس وقت میں مشکلات میں ہوں پھر کسی وقت آیئے گا، حسبِ مقدرت و استطاعت حاضر کر دوں گا لیکن اس وقت میں بہت پریشانی میں ہوں۔"

فقیر نے فخرالدّین کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور کہا۔" شیخ! یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ میں تجھ سے کچھ لینے نہیں آیا، مبارکباد دینے آیا ہوں۔ تجھے تیرا صاحبزادہ مبارک۔ میں تو اُس کے دیدار کو حاضر ہوا ہوں، میرے اِس اشتیاق کی آگ کو بجھا دے!"

فخرالدّین کے دل و دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ کچھ تامّل کے بعد کہا "بابا آیئے! مجھے تو شاید آپ ہی کا انتظار تھا۔"

فخرالدّین فقیر کو لے کر اندر گئے اور بیوی سے بچّے کو لے کر درویش کی طرف بڑھا دیا۔ درویش نے بچّے کو غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بدستور رو رہا تھا۔

درویش نے بچّے سے کہا۔" قلندر! مت رو۔ آنکھیں کھول دے! اب تو تُو دنیا میں آچکا، اس سے گھبرانا یا پریشان ہونا کیسا؟"

اس کے بعد درویش نے کان میں ایک آیت پڑھی۔ آیت کی آواز سنتے ہی بچہ چُپ ہو گیا۔ فخرالدّین اور ان کی بیوی کو بڑی حیرت ہوئی — فخرالدّین نے درویش سے کہا۔" بابا۔ یہ دودھ بھی نہیں پیتا اور آنکھیں بھی نہیں کھولتا۔"

درویش نے جواب دیا۔" بھلا فخرالدّین اس میں گھبرانے یا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔؟"

فخرالدّین نے کہا۔" بابا! جو بچّہ دودھ پیئے بغیر تین دن سے رو رہا ہو اور جس نے لمحہ بھر کے لئے اپنی آنکھیں نہ کھولی ہوں، اس کے والدین کے دل سے پوچھیے۔ پھر پریشانی کا سبب معلوم ہو جائے گا۔"

درویش نے جواب دیا۔" جا تُو اس کو اس کی ماں کے حوالے کر دے۔ اب یہ آنکھیں بھی کھولے گا اور دُودھ بھی پینے لگے گا۔ جا، اب دیر نہ کر۔ میں یہیں موجود تیرا انتظار کروں گا۔"

فخرالدّین نے فقیر کو تو بٹھا دیا اور خود بچّے کو بیوی کے حوالے کر دیا۔ بچّے نے ماں کی گود میں جاتے ہی دونوں آنکھیں کھول دیں۔ ماں کی طرف دیکھا اور مسکرا کر دودھ پینے لگا۔

اب ماں باپ کی خوشی کا کچھ پوچھنا ہی کیا۔ فخرالدّین بھاگے بھاگے درویش کے پاس آئے اور کہا" بابا! بچّے نے آنکھیں کھول دیں اور اب وہ خاموش دودھ بھی پی رہا ہے۔"

فقیر نے مسکرا کر جواب دیا۔" بابا! تو ہی پریشان ہو رہا تھا حالانکہ میں مطمئن تھا اور بچّے کی قلندری سے واقف تھا۔ بہرحال تیرا بچّہ ہے نہ بابا!"

فخرالدّین نے کہا۔" بابا! یہ معاملہ کیا ہے۔ کچھ مجھ کو بھی بتلایئے۔"

فقیر نے جواب دیا۔" میں نے کہہ جو دیا کہ تیرا بچّہ کوئی معمولی بچّہ نہیں ہے۔ یہ ایک غیر معمولی اور عظیم رُوح ہے جو تیرے گھر میں نازل ہوئی ہے اب تو اس کی پرورش، تعلیم اور تربیت کا خاص خیال رکھے گا۔"

فخرالدّین نے عاجزی سے جواب دیا۔" بابا! مجھے آپ کی باتوں کی تعمیل سے انکار ہی کیا ہے۔ میں بالکل وہی کروں گا جس کا آپ نے حکم دیا ہے۔ اب اتنا اور بتا دیجئے کہ یہ بچّہ ہے کیا اور بڑا ہو کر کیا نکلے گا؟"

درویش نے جواب دیا۔" بابا۔ یہ بچّہ مادر زاد ولی ہے۔ کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ بچہ تین دن سے رو رہا تھا لیکن جب میں نے اس کے کان میں آیتِ قرآنی پڑھی تو یہ احتراماً خاموش ہو گیا۔ شیخ فخرالدین! تیرا بیٹا... عاشقِ الٰہی ہے۔ عاشقوں کا بھید کسی سے کہنا نہیں چاہیئے!"

بابا چرم پوش یہ بشارت دے کر چلے گئے۔

بابا نے ان کا نام شرف الدّین رکھا اور 'زہے شرف' ۶۰۲ھ سے مادۂ تاریخ نکالا۔

اب والدین کو اپنے بیٹے کی پرورش اور پرداخت پر بڑی توجہ دینی پڑتی تھی۔ انھوں نے شرف الدّین کی طفلی ہی میں غیر معمولی واقعات محسوس کیے۔ اور ایسے ایسے مشاہدات نظر سے گزرے کہ بابا چرم پوش کی پیش گوئی کی تصدیق ہوتی رہی۔

جب آپ کو پڑھنے کے لیے بٹھایا گیا تو آپ نے عربی کی طرف خاص توجہ دی۔ صرف و نحو، فقہ حدیث اور تفسیر اور تشریح جیسے علوم بڑی محنت سے سیکھے۔ عربی اور فارسی کے علاوہ آپ کو ہندی زبان بھی بہت اچھی آتی تھی۔ چنانچہ مبارز خاں کو آپ پسند کرتے تھے۔ انہوں نے ارادۂ سفر کیا اور یہ سفر علی الصباح شروع ہونا تھا۔ چنانچہ آپ نے دوہے میں اس طرح اپنا تاثر ظاہر کیا۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کو بھور کدی نہ ہوئے

(محبوب صبح رخصت ہوگا۔ اس کی جدائی میں آنکھیں رو مریں گی۔ خدایا اس رات کو اتنا طویل کردے کہ صبح کبھی نہ ہو)

○

یہ شیخ شرف الدّین جو بعد میں بو علی قلندر کہلائے، پانی پت سے دہلی تشریف لے جایا کرتے تھے۔ یہاں آپ کی ملاقات حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ سے ہوئی۔ بو علی قلندر ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ اُن کے جی میں کئی بار آیا کہ حضرت سلطان المشائخؒ سے بیعت کرلیں۔ لیکن پھر متامل ہو جاتے۔ یہاں تک کہ آپ کے دل میں ایک عجیب سا خیال آیا — جیسے کوئی بو علی قلندر کو مشورہ دے رہا تھا کہ کسی ایسے بزرگ کی مریدی اختیار کرنا جس کا آسمانوں میں بھی تصرف ہو۔ اس خیال نے آپ کو محبوب الٰہی کی

بیعت سے دور رکھا۔ آپ خود بھی عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے اور انہماک و اشتغال نے یہ اثر پیدا کر دیا کہ عالمِ پنہاں بھی نظروں کے سامنے آجاتے۔

ایک دن آپ نے اپنے مرشد کی تلاش میں آسمانِ اوّل پر سے عروج کیا اور وہاں اپنے معاصر بزرگوں کے اثرات کو تلاش کیا۔ انہوں نے وہاں ایک شخص کو نماز پڑھتے دیکھا۔ زیادہ غور کرنے پر بوعلی نے اس ذات کو پہچان لیا۔ یہ سلطان المشائخ کی ذات تھی جو نماز میں مشغول تھی۔ بوعلی قلندر نے آنکھیں کھول دیں اور نظام الدین اولیاؒ کے مرتبہ و مقام پر حیرت کرنے لگے۔

دوسرے دن آپ نے ایک بار پھر دوسرے آسمان کو بہ نظرِ باطن دیکھا۔ انھوں نے اس دوسرے آسمان پر بھی محبوب الٰہی کو نماز میں مشغول دیکھا۔ تیسرے دن تیسرے آسمان پر یہاں تک کہ ساتویں دن ساتویں آسمان پر بھی حضرت محبوب الٰہی کو نماز میں مشغول دیکھا۔ ساتویں آسمان کے بعد آپ نے عالمِ بالا کا رخ کیا۔ یہاں بوعلی قلندر کو ستر ہزار حجابات سے واسطہ پڑا۔ ان میں سے پچاس ہزار تاریک حجابات طے کرکے جب مزید آگے بڑھنا چاہا تو روک دیا گیا۔ بوعلی قلندر کو حیرت تھی کہ نظام الدین اولیا ان پچاس ہزار حجابات میں بھی محوِ نماز نظر آتے رہے۔

پچاس ہزار تاریک حجابات کے بعد بیس ہزار نورانی حجابات کی منزلیں تھیں۔ آپ نے انہیں بھی عبور کرنا چاہا مگر روک دیا گیا، کسی آواز نے انہیں مطلع کیا "بوعلی! یہاں سے آگے نہ جاؤ کیونکہ اب بقیہ منازل کسی مرشد کی رہنمائی کے بغیر نہیں طے ہوسکتیں۔"

آپ بہت اداس ہوگئے اور ایک دن اور ایک رات صبر کرکے دوسرے دن حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ حضرت محبوب الٰہی نے پوچھا "بوعلی! کیسے آئے؟"

بوعلی قلندر نے جواب دیا "یا حضرت! بڑی مشکل میں ہوں۔ کیا عرض کروں؟"

حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا "کہو، کہو، جھجکو مت۔"

بوعلی قلندر نے درخواست کی "حضرت! مجھ کو بیعت فرمالیں۔"

حضرت محبوب الٰہی نے مسکرا کر جواب دیا "واہ بوعلی کیا درخواست کی ہے، یعنی ہفت افلاک کی سیر تو کسی مرشد اور پیر کے توسط کے بغیر ہی کر آئے اور اب آئے ہو بیعت مریدی کی درخواست لے کر۔ تمہیں مرید ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

بوعلی قلندر نے عرض کیا "میری خواہش ہے آپ مجھے اپنا مرید بنالیں۔"

جواب ملا "تمہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

بوعلی واپس آگئے۔ بھائی نظام الدین نے انہیں اداس جو دیکھا تو پوچھا "شرف الدین! کیا بات ہے، آج تو بہت زیادہ اداس نظر آرہے ہو؟"

بوعلی قلندر نے جواب دیا "بھائی! میں حضرت محبوب الٰہی کے پاس مریدی کی درخواست لے کر گیا تھا جس کو انہوں نے مسترد کر دیا حالانکہ میں یہ درخواست نہایت ذوق و شوق سے لے گیا تھا۔"

بھائی نے پوچھا "انہوں نے کیا کہہ کر درخواست رد کر دی؟"

بوعلی قلندر نے پورا واقعہ سنا دیا اور کہا "حالانکہ ابھی بیس ہزار نورانی حجابات کی منازل باقی تھیں اور ندائے غیب کے مطابق ان منازل کو کسی مرشد کی رہنمائی کے بغیر نہیں عبور کیا جاسکتا۔"

بھائی نظام الدین سناٹے میں آگئے، بولے "شرف الدین! حضرت محبوب الٰہی کا عذرِ استرداد معقول ہے اگر تم کہو تو میں اُن سے تمہاری سفارش کردوں۔ ممکن ہے کام بن جائے۔"

بوعلی قلندر نے جواب دیا "میری تو خواہش یہی ہے کہ محبوب الٰہی کی مریدی اختیار کروں۔ آپ سفارش کر دیجئے، ممکن ہے کام بن جائے۔"

لیکن آپ نے بڑے بھائی کو منع کر دیا، فرمایا "نہیں، سفارش کی کوئی ضرورت نہیں، اگر انہیں مرید بنانا ہوتا تو تعجیل و حجت سے کام نہ لیتے۔"

آپ نے چالیس سال کی عمر میں پانی پت کی سکونت ترک کر دی اور مستقلاً دہلی میں جا بسے۔ وہاں آپ نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ قطب مینار کے پاس مسجد قوۃ الاسلام میں آپ نے درس دینا شروع

کر دیا۔ یہیں آپ کے ذمے فتویٰ دینے کی خدمت بھی کر دی گئی، آپ مفتی ہو گئے۔ ان خدمات اور مشغولیات کے ساتھ ہی مجاہدہ و ریاضت بھی جاری تھا۔ آپ نے ایک عرصہ بعد پانی پت واپس جانا چاہا مگر علمائے عصر کی ایک جماعت آپ سے ملی اور درخواست کی کہ آپ ابھی دہلی ہی میں قیام فرمائیں تاکہ ہم آپ سے چند رسائل اور نکات توحید پڑھ لیں۔"

آپ علما کے اصرار پر دہلی میں رک گئے اور علمائے عصر کو درس دینے لگے۔

علاؤالدین خلجی آپ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا، اس نے از راہِ عقیدت و محبت بو علی قلندر کی خدمت میں کچھ نذرانے بھیجنا چاہے مگر اس کام کے لیے کوئی مناسب آدمی نہیں ملتا تھا، علاؤالدین خلجی آپ کے جلال سے خوف زدہ بھی رہتا تھا۔ اس نے اپنے امرا سے مشورہ طلب کیا اور پوچھا "حضرات! میں بو علی قلندر کی خدمت میں چند نذرانے بھیجنا چاہتا ہوں، آپ لوگ مشورہ دیں کہ اس کام کے لیے کون شخص موزوں رہے گا۔"

کسی امیر نے کسی کا نام لیا اور کسی نے کسی دوسرے کا۔ ایک امیر نے سوچ سمجھ کر مشورہ دیا "یا قبلۂ عالم! مجھے تو اس کارِ خیر کے لیے ایک ہی شخص نظر آتا ہے۔"

سلطان نے کہا "اس کا نام لو، وہ کون شخص ہے؟"

امیر نے جواب دیا "امیر خسرو، کیونکہ بو علی قلندر بھی امیر خسرو کا احترام کرتے ہیں۔"

سلطان نے حکم دیا "پھر امیر خسرو کو اسی وقت طلب کر لیا جائے رائے بہت مناسب ہے، اس کام کے لیے خسرو سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا۔"

اسی وقت شاہی ہرکارہ امیر خسرو کے پاس پہنچا اور انھیں مطلع کیا کہ "سلطان نے آپ کو اسی وقت یاد فرمایا ہے۔"

امیر خسرو فوراً سلطان کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا "حضور نے مجھ کو یاد فرمایا تھا؟"

سلطان نے جواب دیا "ہاں خسرو! میں بہت پریشان ہوں۔ ایک کام ایسا ہے کہ اس کو تمہارے علاوہ کوئی اور کر ہی نہیں سکتا۔"

امیر خسرو نے عرض کیا "جناب ارشاد فرمائیں اگر مجھ میں اس کام کو انجام دینے کی قوت اور صلاحیت ہوگی تو ضرور انجام دوں گا۔"

سلطان نے کہا "خسرو! میں حضرت بو علی قلندر کی خدمت میں چند نذرانے بھیجنا چاہتا ہوں مگر ان کی ہیبت اور جلال سے ڈرتا ہوں۔ وہ انھیں واپس فرما دیں گے اور ہو سکتا ہے کہ برہم بھی ہوں، لیکن میرے امرا اور خود میری اپنی رائے یہ ہے کہ اگر یہ نذرانے اُن کی خدمت میں تم لے جاؤ تو وہ ناراض نہیں ہوں گے اور اس کو شرفِ قبولیت بخش کر میری عزت افزائی کریں گے۔"

امیر خسرو سوچ میں پڑ گئے۔ بڑی دیر تک سوچتے رہے۔ سلطان کو شبہ گزرا کہ امیر خسرو بادشاہ کی درخواست رد کر دیں گے۔

سلطان نے جلدی جلدی کہا "امیر خسرو! میں انکار نہیں سننا چاہتا تمہیں یہ کام بہر طور انجام دینا ہے۔"

امیر خسرو نے جواب دیا "سلطان ذی شان! میں شاہی حکم کی تعمیل میں کہیں بھی جا سکتا ہوں، لیکن بو علی قلندر کی خدمت میں اس وقت تک نہیں جا سکتا جب تک کہ میرے مرشد حضرت نظام الدین اولیا اس کی اجازت مرحمت نہیں فرما دیں گے۔"

سلطان نے کہا "میں محبوب الٰہی سے اس کی اجازت حاصل کر لوں گا...."

خسرو نے کہا "اگر آپ اجازت حاصل کر لیں گے تو میں یہ کام ضرور انجام دوں گا۔"

سلطان نے اسی وقت اپنا ایک آدمی حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں بادشاہ کی درخواست پیش کی گئی، اس میں سلطان نے اپنا مطلب بیان کر کے التجا کی تھی کہ امیر خسرو کو حضرت بو علی قلندر کی خدمت میں سلطان کے نذرانے پہنچانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ سلطان المشائخ نے اجازت مرحمت فرما دی، سلطان نے یہ اجازت نامہ امیر خسرو کے حوالے کر دیا اور کہا "خسرو! اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا!"

امیر خسرو نے جواب دیا "اب میں کس طرح انکار کر سکتا ہوں۔ کل ہی آپ کے نذرانے لے کر حضرت بو علی قلندر کی خدمت میں روانہ ہو جاؤں گا۔"

چنانچہ حسبِ وعدہ امیر خسرو دوسرے دن سلطان کے نذرانے لے کر بو علی قلندر کے پاس روانہ ہو گئے۔

جب بو علی قلندر کو یہ معلوم ہوا کہ امیر خسرو سلطان کے نذرانے لیکر اُن کے پاس پہنچ رہے ہیں تو انہوں نے خسرو کا شاندار استقبال کیا اور امیر خسرو کے پہنچتے ہی انہیں سینے سے لگا لیا۔ پھر اپنے پاس بٹھا کر گفتگو فرمانے لگے۔

کچھ دیر بعد آپ نے امیر خسرو سے کہا کہ "اپنا کلام سناؤ۔"

امیر خسرو نے اپنا کلام سنایا تو بو علی قلندر بہت خوش ہوئے اور امیر خسرو کو بڑی دعائیں دیں۔

اس کے بعد بو علی قلندر نے خسرو سے کہا "اب میرا کلام سنو۔"

امیر خسرو نے بصد عاجزی عرض کیا "ارشاد۔"

بو علی قلندر نے اپنا کلام سنایا تو امیر خسرو زار و قطار رونے لگے۔

بو علی قلندر نے دریافت کیا "امیر خسرو! ان اشعار کا مطلب بھی سمجھے؟"

امیر خسرو نے جواب دیا "حضرت! اسی بات پر تو رو رہا ہوں کہ مجھ میں آپ کے اشعار سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔"

بو علی قلندر اس جواب سے بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد حکم دیا "بادشاہ کے نذرانے پیش کیے جائیں!"

خسرو نے بادشاہ کے نذرانے آپ کی خدمت میں پیش کر دیے آپ نے فرمایا "خسرو! اگر سلطان المشائخ درمیان میں نہ آجاتے تو میں بادشاہ کے تحائف ہرگز قبول نہ کرتا"

امیر خسرو نے عرض کیا "حضرت! [illegible] کا لقب [illegible] لیے اس نے حضرت محبوب الٰہی کا [illegible]"

بو علی قلندر نے فرمایا "میں تو [illegible] سلطان المشائخ نے [illegible] اور دوسرا علاءالدین [illegible]"

امیر خسرو نے جواب دیا "حضرت! آپ کچھ [illegible] کے لیے [illegible] گے میں لے جاؤں گا اور [illegible] شخص کو پہنچا [illegible] گا"

آپ نے سلطان علاءالدین [illegible] دیا۔ [illegible] زندگانی [illegible] کہ پائندگان خداے تعالیٰ زندگانی [illegible]

امیر خسرو نے جب یہ خط بادشاہ کو پہنچایا تو [illegible] کے سامنے پڑھا گیا۔ بعض خوشامدیوں نے منہ بنایا اور بادشاہ [illegible] "جہاں پناہ! یہ کیسا شخص ہے کہ شاہی القاب و آداب بھی نہیں جانتا۔ حضور کو خوطہ دہلی لکھتا ہے!"

دوسرے خوشامدی نے کہا "اگر [illegible] گستاخی پر بو علی کو [illegible] تو لوگ سلطان کو بدنام کرنے کی کوشش کریں گے"

علاءالدین خوشامدیوں کی باتیں سنتا رہا، آخر میں کہا "یہ تو حضرت بو علی قلندر کی نوازش اور مہربانی ہے کہ مجھے خوطہ دہلی کہا ورنہ [illegible] پہلے شحنۂ دہلی (کوتوال دہلی) کہا کرتے تھے۔"

خوشامدی اپنا منہ لے کر رہ گئے۔



بو علی قلندر کا ایک مست مرید اپنے حال میں گم مست [illegible] بازار سے گزر رہا تھا۔ اس وقت سامنے سے حاکم شہر کی سواری [illegible] دی، غلاموں اور چوبداروں کا گروہ آگے پیچھے دائیں بائیں [illegible] چلتا چل رہا تھا "ہوشیار باش خبردار" کی آوازوں سے فضا گونج رہی تھی، لیکن آپ کے مست و سرشار مرید پر ان آوازوں کا کوئی اثر نہ ہوا یہاں تک کہ حاکم کے چوبداروں نے اسے پکڑ لیا اور کہا "نالائق گستاخ، کیا تو نے [illegible] کی آوازیں نہیں سنیں؟"

مرید نے جواب دیا "کچھ شور و غل تو میں نے بھی سنا لیکن [illegible] کہ یہ شور و غل تھا کیسا؟"

ایک چوبدار نے پوچھا "اور تو شاید یہ بھی نہیں جانتا کہ بازار سے سواری کس کی گزر رہی ہے؟"

مرید نے لاعلمی ظاہر کی "مجھ کو نہیں معلوم"

چوبدار نے پھر کہا "اور تو شاید یہ بھی نہیں جانتا کہ اس وقت تجھ کو پکڑا کیوں گیا ہے؟"

مرید نے سادہ لوحی سے جواب دیا "مجھ کو یہ بھی نہیں معلوم"

چوبدار نے ایک زناٹے دار ہاتھ رسید کر دیا اور پوچھا "اور شاید تو یہ بھی نہیں جانتا کہ تیرے رخسار پر یہ زوردار تھپڑ کیوں پڑا ہے؟"

مرید گال سہلانے لگا، بولا "ہاں میں یہ بھی نہیں جانتا"

ایک دوسرے چوبدار نے ہنس کر کہا "جب اس کی لاعلمی کا یہ حال ہے تو اس کی خوب پٹائی کرو تاکہ آئندہ ہوشیار و خبردار رہے"

چوبداروں اور غلاموں نے اس کی پٹائی [illegible] جاتے [illegible] کر دیا۔ چوبدار اور غلام اس کو [illegible] چلے گئے [illegible] بو علی قلندر کی خدمت میں پہنچا۔ آپ نے پوچھا "تجھے کیا ہوا۔ [illegible]"

مرید نے پورا واقعہ سنا دیا، پھر روتے ہوئے کہا "پیر و مرشد! وہ تو ابھی میری زندگی تھی جو بچ گیا ورنہ ظالموں نے تو ابھی [illegible] مجھے جان سے مار دیا تھا"

بو علی قلندر کو جلال آ گیا۔ آپ نے اسی وقت علاءالدین خوطہ کو [illegible] "اے علاءالدین خوطۂ دہلی! کیا میں نے تجھ کو یہ نصیحت نہیں کی ہے کہ بندگانِ خدا کی بھلائی کے سامان کر۔ آج تیرے ایک عامل کے چوبداروں نے میرے مرید کو اس بری طرح مارا پیٹا ہے کہ اگر خدا نے اس کو زندگی نہ دی ہوتی تو وہ مر چکا ہوتا۔ علاءالدین! تجھ کو نہیں معلوم کہ آج میرے غم زدہ مرید کے آہ دل نے عرش کو لرزا کر رکھ دیا ہے۔ میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ تو عامل مذکور کو سزا دے۔ اگر تو نے کوتاہی برتی اور سکوت اختیار کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تو نااہل ہے اور حکومت کا مستحق نہیں۔ اور میں تیری نااہلی اور عدم استحقاق کے پیش نظر دہلی کی سلطنت تجھ سے چھین کر کسی اور کے حوالے کر دوں گا۔"

اس خط نے سلطان کو لرزا دیا۔ وہ کانپنے لگا اور تھوڑی دیر بعد حکم صادر کیا "عامل مذکور کو پابہ زنجیر حاضر کیا جائے۔"

عامل کو زنجیروں میں جکڑا ہوا سلطان کے روبرو پیش کر دیا گیا۔

سلطان نے طیش میں پوچھا "کیا یہ درست ہے کہ تیرے چوبداروں نے حضرت بو علی قلندر کے ایک مرید کو بہت بری طرح مارا پیٹا ہے؟"

عامل نے کانپتے ہوئے جواب دیا "ظل اللہ! میرے چوبداروں نے مرید مذکور کو مارا تو بے شک ہے لیکن اس میں میرا حکم شامل نہیں تھا۔ چوبداروں نے میری خوشنودی میں اپنے طور پر یہ حرکت کی تھی۔"

سلطان نے پوچھا "جب حضرت بو علی قلندر کا مرید تیرے چوبداروں کے ہاتھوں پٹ رہا تھا تو اس وقت تو خود کہاں تھا؟"

عامل نے جواب دیا "میں وہیں موجود تھا لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میں نے انہیں یہ حکم نہیں دیا تھا!"

سلطان نے کہا "اگر تو نے حکم نہیں دیا تھا تو چوبداروں کو اس نامعقول اور نازیبا حرکت سے روکنا چاہیے تھا لیکن تو خاموش رہا جس کا مطلب

مطلب یہ ہوا کہ چوبداروں کی حرکت میں تیری ایما بھی شامل تھی۔"

عامل سلطان کے ارادے بھانپ گیا، روتے ہوئے کہا "جہاں پناہ! بخدا میں بے گناہ ہوں۔"

سلطان نے کہا "اب تو نے ایک اور گناہ کیا یعنی اپنے جھوٹ میں خدا کو گواہ بنا رہا ہے۔"

عامل نے قدم بوس ہو کر عرض کیا "سلطان! رحم۔ مجھ پر رحم کیجیے، میں بے گناہ ہوں۔"

سلطان نے جواب دیا "میں تجھ کو کس طرح بے گناہ مان لوں۔ میری نظر میں، سب کی نظر میں، حضرت بوعلی قلندر اور ان کے مرید کی نظر میں گناہ گار تو ہے۔ تو خدا اور اس کے رسول کی نظر میں بھی گناہ گار ہے، پھر میں اس گناہ گار کو کس طرح معاف کر سکتا ہوں۔"

عامل زار و قطار رو رہا تھا "سلطانِ معظم! معاملے پر نظرِ ثانی فرما لیں۔ میں بے گناہ ہوں۔"

سلطان نے سختی سے کہا "تو بار بار خود کو بے گناہ نہ کہہ کیونکہ اس سے میرے غصے کی آگ اور زیادہ بھڑک جاتی ہے۔ میں تجھ کو معاف نہیں کر سکتا۔"

عامل نے بادشاہ کے پاؤں پکڑنا چاہے لیکن ناکام رہا، بادشاہ نے فیصلہ سنا دیا "عامل کی اتنی ہی پٹائی کی جائے جتنی اس کے چوبدار حضرت بوعلی قلندر کے مرید کی کر چکے ہیں۔ اس کے بعد یہ عامل نہیں رہے گا۔ اس کا اثاثہ ضبط۔ اور آئندہ اس کے خاندان کا کوئی بھی شخص شاہی خدمت کے لیے نااہل اور نالائق متصور ہوگا۔"

عامل کی پٹائی شروع ہو گئی۔

اب بادشاہ کو بوعلی قلندر سے معافی مانگنے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آتی تھی کہ وہ معافی مانگے تو کس طرح اور کس کے ذریعے مانگے؟ بڑے غور و فکر کے بعد ایک بار پھر امیر خسرو کا نام ذہن میں آیا اور انھیں فوراً ہی طلب کر لیا۔

امیر خسرو بادشاہ کی خدمت میں پہنچے تو سلطان نے اپنا مافی الضمیر سمجھایا اور انھیں مجبور کیا کہ وہ بوعلی قلندر کی خدمت میں جائیں اور ان سے سلطان کی طرف سے معافی کے خواستگار ہوں۔"

امیر خسرو دل نہ چاہنے کے باوجود بادشاہ کی خواہش پر بوعلی قلندر کی خدمت میں تشریف لے گئے۔ بوعلی قلندر نے انہیں دیکھتے ہی پوچھا "کہو خسرو! اب سلطان نے کیوں بھیجا ہے؟"

امیر خسرو نے جواب دیا "حضور خود روشن ضمیر ہیں، اب کیا عرض کروں۔"

آپ نے پوچھا "اس ظالم عامل کا کیا ہوا؟"

خسرو نے جواب دیا "بادشاہ نے اس کو بھرے دربار میں ذلیل کر دیا ہے اور اس کے خاندان کے کسی بھی فرد کے لیے شاہی ملازمتوں کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے گئے۔ اس کے اثاثے ضبط کر لیے گئے اور اب وہ کچھ بھی نہیں رہا۔"

آپ نے جوش میں کہا "غضب خدا کا اپنی رعایا پر یہ ظلم۔"

خسرو نے درخواست کی "حضور والا! سلطان نے حضور کی خوشنودی اور عدل و انصاف کے بول بالا کے لیے عامل کو ذلیل و خوار کر دیا۔ اب حضور والا بھی سلطان کو معاف فرما دیں۔"

آپ نے جواب دیا "سلطان کو میں کیا معاف کروں گا، اس کو خدا معاف کرے کیونکہ اس کا گناہ ایسا تھا جس سے عرشِ اعظم بھی کانپ گیا تھا، یوں میں نے معاف کر دیا اور خدا سے دعا ہے کہ وہ بھی سلطان کو معاف کر دے۔"

اس کے بعد خسرو نے بوعلی قلندر کو خوش کرنے کے لیے بانسری بجا کر سنائی۔ بانسری کی سریلی آواز نے آپ کو مست و بے خود کر دیا۔



ایک دن آپ مسجد قوۃ الاسلام میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ ایک درویش کا وہاں سے گزر ہوا، اس نے کچھ دیر کھڑے ہو کر آپ کی مشغولیت کو غور سے دیکھا۔ آپ نے اس درویش کو دیکھا اور پوچھا "بابا، کیا بات ہے، تو کیا دیکھ رہا ہے؟"

درویش نے جواب دیا "شرف الدین! افسوس کہ تو جس مقصد کے لیے پیدا ہوا تھا، اس کو بھلا دیا۔ آخر تو کب تک اس قیل و قال میں مبتلا رہے گا؟"

درویش کے اس جملے نے آپ کے سینے میں آگ سی لگا دی۔ آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ یک لخت ترک کر دیا۔

آپ نے بحالتِ جذب و مستی مسافرت اختیار کی اور بیرونِ ہند نکل گئے۔ دورانِ سفر اُن کی ملاقات شمس تبریزؒ سے ہوئی اور یہیں مولانا جلال الدین رومی سے بھی ملاقات ہو گئی۔ پھر جب یہ واپس آنے لگے تو شمس تبریزیؒ اور مولانا رومی نے آپ کو جبہ و دستار سے سرفراز کیا۔ ہندوستان واپس پہنچے تو شیخیت کی دکان بڑھا دی۔ اور قلندرانہ وضع قطع اختیار کر لی۔

اس عالم کیف و مستی میں آپ کی ریش مبارک اتنی بڑھ گئی کہ اسے تراشنے تک کا ہوش نہ رہا۔ آپ کے ارادت مند آپ کو اس حال میں دیکھتے لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ آپ کو مطلع کرتے کہ ریش مبارک شرعی حدود سے تجاوز کر چکی ہے اور اس کو شرعی حدود میں لایئے۔

لوگوں نے یہ خبر مفتی ضیاالدین سنامی تک پہنچا دی اور عرض کیا کہ مفتی کی حیثیت میں آپ بوعلی قلندر کو مطلع کر سکتے ہیں کہ ریش کو شرعی حد میں لے آئیں، اگر کوئی اور یہ بات کہے گا تو ڈر ہے کہ بوعلی قلندر اس پر برہم نہ ہو جائیں۔

مفتی سنامی نے وعدہ کر لیا کہ وہ یہ خدمت انجام دینے کو تیار ہیں۔

ایک دن فجر کی نماز کے بعد مفتی سنامی آپ کی خدمت میں پہنچ گئے اور ادِھر ادُھر کی باتیں کرنے لگے۔

آپ نے ہوش میں آنے کے انداز میں آنکھ کھولی اور کہا "مفتی سنامی آج تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟ اپنا مطلب بیان کر، پھر کام کر اور گھر کی راہ لے"

مفتی صاحب نے داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "آپ نے کبھی اپنی اس داڑھی پر بھی غور کیا؟ یہ شرعی حد سے آگے جا چکی ہے اور میں چونکہ مفتی ہوں اس لیئے آپ کی داڑھی کو بھی شرعی حد میں لانے کا میں ہی ذمہ دار ہوں۔"

آپ خاموش ہو گئے۔

مفتی صاحب نے کسی سے قینچی طلب کی، جو فوراً ہی حاضر کر دی گئی۔ اس کے بعد مبیلس تراشنے لگے۔ بوعلی قلندر دم سادھے خاموش بیٹھے رہے۔ لوگ سانس روکے یہ منظر دیکھتے رہے۔ ان کا خیال، تھا کہ مفتی ضیاالدین سنامی پر بوعلی قلندر کا عتاب نازل ہوگا لیکن وہ بالکل چپ چاپ بیٹھے رہے۔

جب مفتی سنامی واپس چلے گئے تو بوعلی قلندر نے اپنی ریش مٹھی میں لے لی اور فرمایا "اے میری ریش! تو کتنی عظیم اور مبارک ہے کہ محمدی شریعت کی راہ میں پکڑی گئی۔"

آپ کا ایک مرید اولاد سے محروم تھا۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا کہ بوعلی قلندرؒ اس کے لیے اولاد کی دعا کریں لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ آخر ایک دن ہمت کر کے بولا "حضرت! میں آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔"

آپ نے جواب دیا "پھر اس میں تامل کیوں؟ کر دے دعوت۔"

مرید نے سٹپٹا کر عرض کیا "حضرت! یہ میری ہی خواہش نہیں بلکہ میری بیوی کی بھی یہی آرزو ہے۔"

آپ نے مسکرا کر جواب دیا "بھئی خوب تم دونوں میری دعوت کرنا چاہتے ہو لیکن تم نہیں خوفزدہ کیوں ہو؟"

مرید نے عرض کیا "دراصل بات یہ ہے کہ میری بیوی کی ایک اور خواہش بھی ہے!"

آپ نے پوچھا "اور کون سی خواہش؟"

مرید نے عرض کیا "وہ چاہتی ہے کہ آپ گھر تشریف لائیں، وہ آپ کے ہاتھ دُھلائے اور اس کے بعد بصد احترام کھانا پیش کرے۔"

آپ نے جواب دیا "جب میں تیرے گھر پہنچوں گا تو تیری بیوی کی یہ دونوں خواہشیں بھی پوری ہو جائیں گی۔"

مرید نے ایک بار پھر رک رک کر عرض کیا "حضرت اس کی ایک خواہش اور ہے معلوم نہیں وہ بھی پوری ہوگی یا نہیں!"

آپ نے تبسم فرمایا "اور کون سی خواہش؟"

مرید نے پھر اٹک اٹک کر کہا "حضرت! یہ خواہش محض میری بیوی ہی کی نہیں، میری بھی ہے، معلوم نہیں وہ پوری بھی ہو سکے گی یا نہیں۔"

بوعلی قلندر نے جواب دیا "خواہش کے بیان کرنے میں تامل کیوں؟ بیان کر، شاید وہ بھی پوری ہو جائے۔"

مرید نے عرض کیا "میری بیوی کی خواہش ہے کہ جب آپ غریب خانے میں تشریف لے جائیں تو وہ آپ کے ہاتھ دُھلائے، آپ کو کھانا کھلائے اور آخر میں اولاد کی خواہش کرے تاکہ آپ اسکے حق میں اولاد کیلئے دعا کریں۔"

آپ نے فرمایا "میں تیرے گھر چلوں گا، میں نے تیری دعوت قبول کی۔ اولاد کے لیے بھی دعا کروں گا۔"

معینہ دن، مرید آپ کو اپنے گھر لے گیا۔ بیوی کھانا تیار کرتی رہی۔ کھانا پکانے کے بعد اس نے غسل کیا۔ صاف لباس پہنا اور ایک ہاتھ میں طشت اور دوسرے میں آفتابہ لے کر آپ کی خدمت میں پہنچی۔ عورت بے حد حسین تھی۔ آپ کی اس پر نظر پڑی تو دیکھتے رہ گئے۔ آپ کی محویت جذب و مستی میں بدل گئی کھانے کا ہوش ہی نہ رہا، بے اختیار زبان سے نکلا "بے عیب ذات اللہ کی۔ اللہ بس باقی ہوس۔"

اس کیف و مستی میں ہر چیز ترک کر بیٹھے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے مفتی ضیاالدین سنامی سے شکایت کر دی کہ بوعلی قلندرؒ نے نماز ترک کر دی ہے۔ انہیں زبردستی نماز پڑھائی جائے۔

مفتی ضیاالدین آپ سے ملنے گئے اور مست و وارفتہ دیکھ کر پوچھا۔ "بوعلی! خیریت تو ہے؟ یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "بے عیب ذات اللہ کی۔ اللہ بس باقی ہوس۔"

مفتی نے کہا "پھر بھی میں تمہیں نماز کی تاکید کرتا ہوں، تمہیں نماز نہیں ترک کرنا چاہئیے۔"

آپ نے جواب دیا "مفتی! تو کس خیال میں ہے، نماز تو مجھ کو معاف ہو چکی ہے۔"

مفتی کو غصہ آ گیا، طنزاً کہا "سبحان اللہ۔ کیا جواب دیا ہے تم نے! نماز تو رسول مقبولؐ کو بھی معاف نہیں ہوئی تھی پھر تمہیں کس طرح معاف ہو گئی؟"

آپ نے جواب دیا "مفتی! تو مجھ سے مت اُلجھ۔ میں اپنے اختیار میں نہیں ہوں، مست الست ہوں، افسوس کہ میں دکھاوے کی نماز نہیں پڑھ سکتا۔"

مفتی نے غصے میں کہا "بوعلی! اس معاملے میں تمہارا کوئی حیلہ کارگر نہیں ہو سکتا۔"

بوعلی کو بھی جوش آ گیا۔ غصے میں کہا "مفتی! تو میرے جذب اور کیف کو دیکھنا چاہتا ہے، میں ایک آزاد شخص ہوں۔ مفتی! اُٹھ اور کمربند سے میری کمر باندھ دے، جتنی مضبوطی سے بھی باندھ سکتا ہے، باندھ دے، اگر میری کمربندھی رہے تو میں گرفتاروں میں ہو جاؤں گا۔ اور تجھ کو اختیار ہوگا کہ مجھ پر شریعت کا حکم نافذ کر دے، اور اگر میری کمربندھی نہ رہے اور میں آزادوں میں شامل ہو جاؤں تو پھر مجھ کو شرعی احکام سے معاف سمجھے گا۔"

مفتی صاحب غصے میں اٹھے اور بوعلی قلندرؒ کی کمر کس کے باندھ دی، لیکن بعد میں انہوں نے دیکھا کہ کمربند تو ان سے دور پڑا ہے اور بوعلی قلندرؒ

آزاد کھڑے مسکرا رہے ہیں ۔"

مفتی صاحب شرمندہ ہو گئے ۔ بوعلی قلندرؒ ایک خاص لہجے میں بولے ۔

" بابا ! تو کس کو نماز پڑھانے کی بات کر رہا ہے ۔ میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ میں عاشق ہوں اور اپنے عشق میں مبتلا ہوں ۔ اگر تو بضد ہے تو آ ، میں تیرے ساتھ نماز پڑھتا ہوں ۔ تو فرض ادا کر ، میں تیرے ساتھ شامل ہو جاتا ہوں ۔"

مفتی صاحب خوش ہو گئے کہ میدان مار لیا ۔ مفتی صاحب نماز کے لیے کھڑے ہو گئے ۔ وہ امام بنے اور بوعلی قلندرؒ مقتدی ۔ مفتی صاحب نے باآوازِ بلند نماز پڑھانا شروع کر دی ۔ بوعلی قلندرؒ پر استغراق کا عالم طاری ہو گیا ۔ یہاں تک کہ مفتی صاحب نماز سے فارغ ہو گئے لیکن بوعلی قلندرؒ سر جھکائے کھڑے رہے ۔

مفتی صاحب نے کچھ دیر تو انتظار کیا ۔ آخر پوچھا " بوعلی ! نماز ختم ہو گئی ۔ مگر تم ابھی تک نیت باندھے کھڑے ہو ؟ خیریت تو ہے ؟"

بوعلی قلندرؒ نے مفتی کی طرف دیکھ کر دوہا پڑھا :

انکن کھاتی کرت دھارے ، یہ نماز شرفا نہیں بھاوے

حاضرین میں سے کسی نے کہا " حضرت ! ہم آپ کی بات نہیں سمجھے !"

بوعلی قلندرؒ نے جواب دیا " لوگو ! مفتی کی گھوڑی نے بچہ دیا ہے ، اس کے مکان میں ، جہاں گھوڑی اور اس کا بچہ موجود ہے ، وہیں پر ایک کھاتی (اناج کے ذخیرے کا کنواں ۔ چاہ گندم) بھی ہے ۔ مفتی نماز پڑھا رہا تھا اور دل میں یہ اندیشہ لیے ہوئے تھا کہ کہیں بچہ کھاتی میں نہ گر جائے ۔ میں اس نماز کا قائل نہیں ہوں ۔ میں نے مفتی سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں ایک ایسا عاشقِ الٰہی ہوں جس پر مختلف کیفیتیں طاری ہوتی رہتی ہیں ، میں کبھی تو اپنے ہوش و حواس ہی میں نہیں رہتا اور کبھی ایک غلام کی طرح خاموش ہو جاتا ہوں ۔ میں عشقِ الٰہی کے سوا کچھ بھی نہیں جانتا ۔"

مفتی صاحب یہ باتیں سن کر بے حد شرمندہ ہوئے لیکن بات دل میں رکھ لی اور موقع کی تلاش میں رہے ۔

ایک مدت بعد مفتی صاحب نے پانی پت کے لوگوں کو ورغلایا اور کہا " تم لوگ بوعلی سے پوچھو کہ یہ نماز کیوں نہیں پڑھتے ۔ اگر یہ انکار کریں تو ان کے خلاف ایک محضر نامہ تیار کیا جائے اور بوعلی کو سزا دینے کی سفارش کی جائے !"

چنانچہ جب آپ پانی پت پہنچے تو مفتی کے آدمیوں نے انہیں گھیر لیا اور کہا " بوعلی ! ہم نے سنا ہے کہ تم نماز نہیں پڑھتے ۔ کیا یہ سچ ہے ؟"

بوعلی قلندرؒ نے جواب دیا " میں اپنے اختیار میں نہیں ہوں ۔"

لوگ برہم ہو گئے اور انہوں نے کہا " یہ کوئی عذر نہیں ہے ، تم سزا سے نہیں بچ سکتے !"

اس کے بعد مفتی ضیاء الدین سنامی کے اشارے اور تعاون سے ایک محضر نامہ تیار کیا گیا ۔

" شرف الدین (بوعلی قلندرؒ) عالم و فاضل شخص ہے ۔ یہ دہلی میں چالیس سال تک درس و تدریس ، وعظ و نصیحت اور علمی مشاغل میں مصروف رہا ہے ، اب اپنے وطن پانی پت آیا ہے اور علومِ ظاہری کے دروازے بند کر کے عالموں اور فاضلوں کی صحبت سے متنفر ہو کر گوشہ نشین ہو گیا ہے ۔ متابعِ شریعت سے تہی دست ہے اس لیے سزا کے قابل ہے ۔"

اس محضر نامے پر قاضی ، مفتی حضرات کے علاوہ جملہ اکابر و مشاہیر کے دستخط اور مہریں ثبت ہو گئیں ۔ اُن دنوں ٹھٹھہ میں ہرات کے علماء و فضلاء کے سربراہ خواجہ علی انصاری سکونت پذیر تھے اور اُن کی بابت سب کا یہ یقین تھا کہ یہ بزرگ رموزِ معرفت سے اچھی طرح واقف ہیں ۔ اس محضر نامے کو آخری تصدیق اور تائید کے لیے خواجہ علی انصاری کے پاس بھیج دیا گیا ۔ خواجہ علی انصاری نے اس محضر نامے کو پڑھا اور اسے پھاڑ کر پھینک دیا ۔ یہ بوعلی قلندرؒ سے اچھی طرح واقف تھے ۔

محضر نامے کا چاک کر دینا ایک غیر معمولی واقعہ تھا ۔ مفتی ضیاء الدین کو غصہ آ گیا ۔ انہوں نے خواجہ علی انصاری کے نام عدالت میں حاضری اور اظہارِ وجوہ کا پروانہ جاری کر دیا ۔ خواجہ علی انصاری مسلح ہو کر عدالت پہنچ گئے ۔

مفتی ضیاء الدین سنامی نے حکماً پوچھا " آپ کے پاس محضر نامہ تصدیق اور تائید کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن آپ نے اس کو چاک کر دیا ۔ آخر کیوں ؟ اس کی وجہ بتایئے !"

خواجہ علی انصاری نے جواب دیا " یہ درویش بوعلی قلندرؒ مستِ الست ہے اور ایسے درویش پر شرعی احکام کا اطلاق نہیں ہوتا ۔ آیتِ کریمہ ہے ، **لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ** ۔ النساء (نشے کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ) اور جب درویش بوعلی قلندرؒ کی بابت ہر کوئی جانتا ہے کہ وہ اپنے حواس میں نہیں ہے تو گویا وہ شرعی پابندیوں سے معذور ہے ۔ جب تم لوگ اس کی نظرِ فیض کو پہچان نہیں سکتے تو اس کو نقصان کیوں پہنچاؤ ۔ ایسے درویش کو نقصان پہنچانا کسی مذہب میں بھی جائز نہیں ۔"

مفتی صاحب لاجواب ہو گئے اور بعض دوسرے لوگ بھی خواجہ علی انصاری کے ہم خیال ہو گئے ۔ اس لیے معاملہ ختم ہو گیا ۔

ایک عرصہ بعد خواجہ علی انصاری کے بیٹے خواجہ نصیر الدین اور خواجہ مسعود اپنی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بوعلی قلندرؒ مسجد میں داخل ہوئے ، دونوں بھائی احتراماً کھڑے ہو گئے اور پھر قدم بوسی کی اور ان کی خدمت میں ماحضر پیش کیا ۔ آپ نے ان کے حق میں دعا کی کہ تم پانی پت میں بڑی دل جمعی اور اطمینان سے رہو گے ۔

کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کی اولاد پانی پت میں آج بھی موجود ہے اور ترقی کر رہی ہے ۔

❁

آپ نے اسلام کی اشاعت کا کام بھی خوب کیا ۔ پانی پت کے کتنے ہی راجپوتوں کو مسلمان کر لیا ۔ ان میں صرف مردوں کی تعداد تین سو تھی ۔ پانی پت اور اس کے نواح میں راجپوتوں کی حکومت تھی ، الغ خلجیوں کے ساتھ جنگ و جدل میں یہ خاندان تباہ ہو گیا اور ایک ایک راجپوت قتل کر دیا گیا ۔ کہتے ہیں کہ صرف ایک حاملہ عورت بچ گئی تھی ، یہ عورت چھپتی چھپاتی بچتی بچاتی ضلع سہارنپور کے گاؤں جوالہ پور اپنے والدین کے پاس چلی گئی ۔ جوالہ پور ہی میں اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا ، جس کا نام امر سنگھ رکھا گیا ۔ امر سنگھ جوان ہوا تو اس کو وہ ساری باتیں بتائی گئیں جن

سے اس کی ماں عاجز و درماندہ جوالہ پور پہنچی تھی اور یہ بھی بتایا گیا کہ کبھی پانی پت اور اس کے نواح پر اس کے آباؤ اجداد کی حکومت تھی۔ جو خلجیوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گئے۔

نوجوان امر سنگھ کے گرم خون نے اس کو پانی پت جانے پر مجبور کر دیا۔ اب وہ اس فکر میں تھا کہ کسی طرح اپنے باپ دادا کی جاگیریں واپس لے لے۔

امر سنگھ دریائے جمنا کے کنارے کشتی کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ وہیں قریب ہی ایک شخص نہایت خشوع و خضوع سے نماز پڑھنے میں مشغول تھا۔ امر سنگھ اس شخص کو بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ سلام پھیرنے کے بعد اس بزرگ نے بھی امر سنگھ کی طرف دیکھا اور اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ امر سنگھ ان کے پاس چلا گیا۔ بزرگ نے پوچھا" بیٹے! تمہارا نام؟"

نوجوان نے جواب دیا" امر سنگھ۔ میں راجپوت ہوں اور پانی پت اور اس کے نواح پر میرے باپ دادا عرصے تک حکومت کرتے رہے ہیں۔" پھر سوال کیا" اور جناب آپ کی تعریف؟"

بزرگ نے جواب دیا" میرا نام شرف علی ہے اور لوگ مجھے بو علی قلندرؒ کہتے ہیں۔"

نوجوان نے پوچھا" آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟"

بو علی قلندرؒ نے جواب دیا" یہ معلوم کرنے کے لیے کہ تو کہاں اور کیوں جا رہا ہے؟"

امر سنگھ نے جواب دیا" میں دہلی جا رہا ہوں اور اس نیت سے جا رہا ہوں کہ کوشش کر کے اپنی آبائی جاگیریں واگزاشت کرالوں۔"

بو علی قلندرؒ نے کہا" بیٹے! تو جس نیت سے نکلا ہے، وہ خیال خام ہے لیکن ہاں تیرے پاس سے اسلام کی بو ضرور آرہی ہے۔"

امر سنگھ نے کہا" تو گویا آپ کا یہ مطلب ہے کہ میں اپنی آبائی جاگیریں واگزاشت نہ کراؤں جس سے میں باعزت زندگی گزار سکتا ہوں اور اپنا آبائی دھرم چھوڑ کر مسلمان ہو جاؤں اور رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دوں۔"

بو علی نے جواب دیا" بیٹے! اسلام کی حلقہ بگوشی ہی تیری عزت کا باعث ہو گی۔"

امر سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد کہا" باباجی! میری ماں زندہ ہے اور میں اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا۔"

آپ نے کہا" میں نے یہ کہاں کہا کہ تو اپنی ماں کی مرضی کے خلاف کوئی کام کر۔ اپنی ماں کے پاس واپس جا اور اس کو بتا دے کہ میں اسلام قبول کرنے جا رہا ہوں پھر دیکھ کہ وہ کیا کہتی ہے!"

امر سنگھ اپنی ماں کے پاس واپس گیا۔ ماں نے خلاف توقع بیٹے کو واپس آیا دیکھ کر پوچھا" امر سنگھ خیریت تو ہے؟ واپس کیوں آ گئے۔ کیا کشتی نہیں ملی؟"

امر سنگھ نے جواب دیا" نہیں ماں، یہ بات نہیں ہے۔"

اس کے بعد بو علی قلندرؒ کی ملاقات اور بات چیت کی روداد سنا دی اور کہا" وہ بزرگ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو دونوں جہانوں کی عزت اور سرخروئی حاصل ہو جائے گی ورنہ کچھ بھی نہیں۔"

اس بات چیت کے دوران امر سنگھ نے اپنے پاس ہی بو علی قلندرؒ کو کھڑے دیکھا۔ فوراً ہی ماں سے کہا" ماما! یہ ہیں وہ بزرگ جنہوں نے مجھ کو اسلام کی دعوت دی ہے۔"

عورت نے بو علی قلندرؒ کی طرف دیکھا تو آپ نے کہا" عورت! امر سنگھ کو اسلام قبول کرنے کی اجازت دے دے۔"

عورت بے حد مرعوب ہو گئی۔ بولی" میاں جی! میں اجازت تو دے دوں لیکن مشکل یہ ہے کہ امر سنگھ میرا ایک ہی بیٹا ہے اب اگر میں اس کو مسلمان ہو جانے کی اجازت دے دوں، تو اس سے ناتہ رشتہ کون کرے گا؟"

آپ نے جواب دیا" تو اس کی فکر نہ کر۔ اس کے لواحقین بھی اسلام قبول کر لیں گے۔"

ماں نے کہا" تب پھر مجھے کوئی عذر نہیں۔"

بو علی قلندرؒ اجازت دلوا کر باہر نکل گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے امر سنگھ بھی نکل گیا لیکن بو علی قلندرؒ کا اب کہیں پتہ نہیں تھا امر سنگھ دریا کے کنارے پہنچا تو دیکھا کہ بو علی قلندرؒ بے چینی سے ٹہل ٹہل کر اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

امر سنگھ دہشت زدہ ہو کر بولا" بابا! مجھے مسلمان کر لو۔"

آپ نے اس کو مسلمان کر لیا اور اس کا نام امراللہ خان رکھا۔

کچھ عرصے بعد اس کی آبائی جاگیریں بھی واگزاشت ہو گئیں۔ اور اس کے ننھیال کے سارے لوگ مسلمان ہو گئے۔ اس کی اپنے ہی خاندان میں شادی بھی ہو گئی۔ امراللہ خان کو خدا نے تین بیٹے دیے، شہاب خان، دولت خان اور شہباز خان۔ ان تینوں کی اولاد پانی پت میں اب بھی موجود ہے۔



آپ نے کئی بادشاہوں کا عہد دیکھا۔ چنانچہ غیاث الدین تغلق اپنے بیٹے جونا خان (محمد تغلق) اور بھتیجے فیروز کے ساتھ پانی پت پہنچا اور آپ سے ملاقات کی پھر تینوں نے ایک پیالے میں ایک ساتھ کھانا شروع کر دیا۔ آپ یہ منظر دیکھتے رہے پھر فرمایا۔



[illegible] ایک ہی پیالے میں کھا رہے ہیں۔"

[illegible] یہ پیشن گوئی حرف بہ حرف سچی نکلی۔ غیاث الدین تغلق کے بعد اس کا بیٹا جونا خان، محمد تغلق کے نام سے بادشاہ بنا اور اس کے بعد اس کا چچازاد بھائی فیروز شاہ تغلق کے نام سے حکمران بنا۔

محمد تغلق نے بادشاہ بننے سے پہلے آپ کی خدمت میں ایک رُباعی لکھ کر بھیجی اور لکھا کہ اس کا جواب درکار ہے۔

گر راست کند صورت مردی و زنی ؛ گر بشکند ایں طلسم جانی و تنی
کبھی تو مرد اور عورت کی صورت گری کرتا ہے ؛ کبھی جان و تن کے طلسم توڑ دیتا ہے
کس نیست کہ اُستادِ قضا را پُرسد ؛ کز بہر چہ سازی و چرا می شکنی
ایسا کوئی نہیں جو استادِ قضا سے سوال کرے ؛ کہ تو بنا کر توڑ کیوں دیتا ہے

بوعلی قلندر نے جواب میں رباعی لکھ بھیجی

شرط است کہ در امرِ خدا دم نہ زنی ؛ ایں نوع کہ گفتنی، نہ تو مردی نہ زنی
تجھے چاہیئے کہ اللہ کے احکام کے آگے چون و چرا نہ کر ؛ سوال کی نوعیت سے اندازہ ہوا کہ تو مرد ہے نہ عورت
گِل را چہ مجال است کہ بپرسد ز کلال ؛ کز بہرچہ سازی و چرا می شکنی
مٹی کی کیا مجال جو کمہار سے پوچھے ؛ کہ تو کس لیے بناتا ہے اور کیوں توڑ دیتا ہے

بادشاہ بننے کے ایک عرصہ بعد محمد تغلق نے ایک بار آپ کی خدمت میں حاضری دی۔ بادشاہ آپ کے روبرو ادب سے کھڑا ہو گیا۔ آپ نے پوچھا "اے بادشاہ! تو یہاں کتنے دن رہے گا؟"

محمد تغلق نے جواب دیا "حضرت! تین دن!"

آپ نے مسکرا کر کہا "نہیں، بلکہ چار سال!"

بادشاہ کو فوراً ہی احساس ہو گیا کہ بوعلی قلندرؒ نے اس کی عمر کا ذکر کر دیا ہے، چنانچہ چار سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ لیکن انتقال سے پہلے بادشاہ نے غریبوں اور مسکینوں کی جی بھر کر مدد کی اور ان کی دعائیں حاصل کیں۔

بوعلیؒ نے آخری عمر میں کرنال شہر کے قریب بوڑھ کھیڑہ کے جنگل میں سکونت اختیار کی۔ یہاں آپ نے ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا لی تھی اور اسی میں رہنے لگے تھے دنیا نے آپ کو مختلف طریقوں سے بہت ستایا تھا۔ مفتیانِ دین، قاضی حضرات اور علمائے سُو نے ایکا کر کے بڑی تکلیفیں دی تھیں۔ اس لیے آپ نے پانی پت سے کرنال کے قریب بوڑھ کھیڑہ کے جنگل کو اپنے لیے پسند کر لیا تھا۔

پانی پت میں مولانا سراج الدین مکیؒ نے کشف میں ایک دن دیکھا بوعلی فرما رہے ہیں "مولانا! جلد تشریف لائیے، میں اس دارِ فانی سے رخصت ہو رہا ہوں۔ میری نعش کو پانی پت لے آیئے اور میرے نام کا جو قبہ بنا ہوا ہے وہاں دفن کر دیجئے۔"

مولانا سراج الدین مکیؒ آپ کے بھتیجے شیخ احمد کے پاس پہنچے اور انہیں اپنے کشف سے مطلع کیا۔ شیخ احمد نے اپنے صاحبزادے شیخ محمد اور عبدالسلام چشتی کو اطلاع دی اور پھر یہ خبر پھیلتی چلی گئی۔ پانی پت کے دوسرے برگزیدہ لوگ بھی شیخ احمد اور سراج الدین مکی کے ہم سفر ہو گئے۔

دوسری طرف کرنال والوں کو بھی آپ کے وصال کی خبر نہیں تھی۔ آپ کے وصال کو ایک رات اور ایک دن گزر چکا تھا، اور آپ کا جسدِ مبارک یوں ہی کٹیا میں پڑا رہا۔ دوسرے دن شام کو چند لکڑہارے آپ کی زیارت کو گئے تو انہوں نے آپ کو بے حس و حرکت پڑے دیکھا۔ لکڑہاروں نے یہ خبر کرنال شہر میں پہنچا دی۔ کرنال کے لوگ جب آپ کی کٹیا میں داخل ہوئے تو انہوں نے بوعلی قلندرؒ کی لاش زیرا زیوا نامی چبوترے پر قبلہ رُو پڑی دیکھی۔ وہ لوگ آپ کی لاش کرنال اُٹھا لے گئے۔

ابھی کرنال والوں نے غسل بھی نہیں دیا تھا کہ پانی پت کے لوگ بھی پہنچ گئے۔

اب اہلِ کرنال اور پانی پت والوں میں بحث و اصرار شروع ہوا، کرنال کے لوگ انہیں اپنے شہر میں دفن کرنا چاہتے تھے لیکن پانی پت کے لوگ انہیں اپنے شہر لے جانا چاہتے تھے

کرنال والوں کی دلیل تھی "بوعلی قلندرؒ نے اپنی عمر کا آخری دور کرنال میں گزارا ہے اس لیے وصال کے بعد بھی انہیں یہیں رہنا چاہیئے۔"

پانی پت والوں نے جواب دیا "پانی پت آپ کا وطن تھا اور آپ نے پانی پت ہی میں اپنی تدفین کے لیے زندگی ہی میں سرداب، تعمیر کروا دیا تھا، اور اس سرداب میں آپ کی تدفین عمل میں لائی جائے گی۔"

دونوں فریق اپنی اپنی بات پر اڑے رہے لیکن آخر میں کرنال والوں کو بوعلی قلندر کے عزیزوں کی بات ماننی پڑی اور آپ کی لاش پانی پت لے جائی گئی۔

پانی پت میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ مزار کی تعمیر علاؤالدین کے بیٹوں شادی خان اور خضر خان کی نگرانی میں ہوئی، بعد میں بعہدِ جہانگیر ۱۶۶۱ء، رزق اللہ خان نے مزار میں توسیع کرائی، اس کا فرش سنگِ مرمر کا اور دیواریں دوسرے پتھروں سے تعمیر کی گئیں، اس کے علاوہ سنگِ محک کے آٹھ ستون بھی نصب کرائے گئے اور ان تعمیرات میں لاکھوں روپے خرچ ہوئے۔

آپ نے بڑی طویل عمر پائی تھی، وصال کے وقت آپ کی عمر ایک سو بائیس سال تھی۔ سال ولادت ۶۰۲ھ اور سال وفات ۹ رمضان المبارک ۷۲۴ھ ہے۔



اے خواجہ و پیرِ دولی، شاہِ شرف بوی علیؒ
نورِ کرامت منجلی راچار سوی عنصری

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

اذکارِ ابرار ● اخبار الاخیار ● تحفۃ الکرام ● بزمِ صوفیہ ● خزینۃ الاصفیا ● سفینۃ الاولیا ● تاریخ فیروز شاہی ● حضرت بوعلی قلندر

مؤلفین: ... شطاری ● شیخ عبدالحق محدث دہلوی ● میر علی شیر قانع ● سید صباح الدین عبدالرحمٰن ● مفتی غلام سرور لاہوری ● شہزادہ دارا شکوہ ● ضیاء الدین برنی ● اقبال صلاح الدین



خواجہ اسرار

جاسوسی نشست +92 3331784111
ضیا تسنیم بلگرامی



آپ کی رُوح کی تازگی کے لیے آپ کی جانی پہچانی ادیبہ ضیا تسنیم بلگرامی کے پاکیزہ قلم سے
حاملِ اسرارِ باطن خواجہ عبیداللہؒ - ایک وجد آفریں مضمون

یاغستان میں خواجہ شہاب الدین شاشی کا خاندان علمی سطح پر بڑی شہرت رکھتا تھا، ان کے بیٹے خواجہ محمود کی شادی ایک دوسرے نامور خاندان کے خواجہ داؤد کی بیٹی سے ہوگئی۔ خواجہ داؤد کا تعلق عبداللہ ابن عمر ابن خطابؓ سے تھا اور سولہ واسطوں سے ان کا خاندانی سلسلہ حضرت عمر ابن خطابؓ تک جا پہنچتا تھا۔

شادی کے بعد خواجہ محمود کی مالی حالت بگڑ گئی یہاں تک کہ جب رمضان ۸۰۶ ہجری میں ان کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا تو ان کی معیشت تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ خواجہ محمود بچے کی تعلیم و تربیت کی طرف سے بہت فکرمند رہنے لگے۔ بچے کا نام عبیداللہ رکھا گیا۔

پھر جیسا کہ مشاہیر کے ساتھ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے عبیداللہ کو بھی وہ سارے آلام جھیلنا پڑے جو بڑوں کا مقدر ہیں۔ یہاں تک کہ بارہ سال کی عمر میں وہ بے یار و مددگار ہوگئے اور ان کی معیشت اتنی برباد ہوگئی کہ روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ جو لوگ اس نامی گرامی خاندان کی بزرگی سے واقف تھے انھوں نے اشاروں کنایوں میں امداد و اعانت کی پیش کشیں کیں لیکن غیرتِ فقر نے اس کو گوارا نہ کیا، اور انھوں نے انکار کر دیا۔ غربت کا یہ عالم تھا کہ ایک کوڑی بھی خرچ نہ کر سکتے تھے اور ہمت کا یہ حال تھا کہ ان کے پاس جو کچھ بھی ہوتا سائل یا حاجت مند کے حوالے کر دیتے۔ بارہ سالہ لڑکے عبیداللہ کے لیے یہ ناممکن تھا کہ اس سے کوئی سوال کرے اور وہ اس کا جواب انکار میں دے۔

ایک دن یہ بارہ سالہ لڑکا عبیداللہ بازار سے گزر رہا تھا صاف ستھرے کپڑوں سے یہ اندازہ ہی نہ ہوتا تھا کہ اس لڑکے کی مالی حالت نہایت خستہ ہوگی۔ ایک موڑ پر معلوم نہیں کس طرف سے ایک فقیر نمودار ہوا اور لڑکے کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ فقیر نے ننگ دھڑنگ پیٹ پر ہاتھ پھیر کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کا پیٹ بالکل پچکا ہوا تھا۔ عبیداللہ نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ مجھ سے کوئی کام ہے؟"

بالکل قریب سامنے طباخ اپنی دکان پر کھانے کا سامان بیچ رہا تھا۔ فقیر نے ایک بار پھر اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور دوسرے ہاتھ سے طباخ کی طرف اشارہ کیا۔

عبیداللہ نے پوچھا "بھوکے ہو؟ کھانا کھاؤ گے؟"

فقیر نے اثبات میں گردن ہلادی اور التجا آمیز نظروں سے عبیداللہ کی شکل دیکھنے لگا۔

عبیداللہ کی جیب میں ایک کوڑی بھی نہ تھی اور انکار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے مسئلہ پر غور کیا اور پھر فوراً ہی طباخ کے پاس پہنچ گئے۔ اپنے سر سے صاف ستھری دستار اتاری اور طباخ کی طرف بڑھادی۔ "بھائی! میری یہ دستار تجھ کو کیسی نظر آتی ہے؟"

طباخ نے جواب دیا "اچھی نظر آتی ہے کیوں؟ کیا بات ہے؟"

عبیداللہ نے کہا "میں اس کو فروخت کرنا چاہتا ہوں اور اس کی قیمت بھی زیادہ نہیں لوں گا۔"

طباخ نے تذبذب سے کہا "وہ تو ٹھیک ہے کہ تم اس کی زیادہ قیمت نہیں لوگے، لیکن میاں صاحبزادے! تم یہ تو بتاؤ کہ میں اس دستار کو لے کر کروں گا کیا؟"

عبیداللہ نے کہا "کچھ بھی کرنا، یہ صاف ستھری ہے پاک ہے۔"

طباخ نے چڑچڑے لہجے میں کہا "صاحبزادے! تم بارہ سالہ لڑکے، میں تمھاری اس دستار کو اپنے کام میں بھی تو نہیں لا سکتا۔"

عبیداللہ نے کہا "جناب گھبرانے کی کوئی بات نہیں، میں اس کا مصرف بھی بتادوں گا۔ دستار کا یہی ایک مصرف تو نہیں ہے کہ اس کو سر پر باندھ لیا جائے، اس کے اور کئی مصرف بھی ہیں۔"

طباخ نے مسکرا کر کہا "دستار کا ایک ہی مصرف میں جانتا ہوں اور وہ مصرف ہے اس کا سر پر باندھنا۔ دوسرے مصرف کیا ہیں، میں نہیں جانتا۔ غالباً رومال کا کام بھی دستار ہی سے لیا جا سکتا ہے۔ بازار سے سودا سلف لانا ہو تو وہ اس میں باندھا جا سکتا ہے، اس سے کمر کسی جا سکتی ہے۔ شاید یہی چند مصارف

اور ہیں اس کے ہیں؟"

عبیداللہ نے جواب دیا " ہاں یہ مصارف بھی ہیں اس کے لیکن اس کا ایک ایسا مصرف بھی ہے جس کا تعلق تم سے اور تمھارے پیشہ سے ہے۔"

طبّاخ نے حیرت سے پوچھا " وہ کون سا مصرف ہے جس کا تعلق مجھ سے اور میرے پیشے سے ہے؟"

عبیداللہ نے خالی دیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم اپنی خالی دیگوں کے دھونے میں میری دستار استعمال کر سکتے ہو اور چونکہ میری دستار صاف ستھری اور پاک ہے اس لیے تم کو اس کے اس مصرف میں تامل نہیں ہونا چاہیئے۔"

طبّاخ عبیداللہ کے اصرار اور بحث و مباحثہ سے پسیج گیا۔ بولا " اچھا اگر میں یہ کہوں کہ تیری دستار تجھ سے خریدتا ہوں تو تو اس کی مجھ سے اجرت کیا لے گا؟"

عبیداللہ نے جواب دیا " اجرت بھی نہایت معمولی ہے۔ اتنی معمولی کہ تو اس کی ادائیگی پر آسانی سے آمادہ ہو جائے گا۔"

طبّاخ نے کہا " پھر بھی اجرت معلوم تو ہونا چاہیئے۔"

عبیداللہ نے فقیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا " بس اس کو پیٹ بھر کے کھانا کھلا دو، یہی میری دستار کی اجرت ہے۔"

طبّاخ نے گھبرا کر پوچھا " اور تم؟ کیا تم بھی کھانا کھاؤ گے؟"

عبیداللہ نے جواب دیا " نہیں میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اس دستار کے عوض بس یہی ایک شخص کھانا کھائے گا۔"

طبّاخ نے ذرا دیر کے لیے سکوت اختیار کیا، پھر فقیر سے کہا "آجاؤ بابا! میں تمھیں کھانا دیتا ہوں۔"

فقیر تندور کے پاس بیٹھ گیا۔ طبّاخ نے اس کے آگے کھانا لگا دیا اور کہا " بابا! خوب جی بھر کے کھانا کیونکہ اس لڑکے نے جتنے خلوص سے تیرا سوال پورا کیا ہے اس کی نہ تو کوئی قیمت ہے اور نہ ہی کوئی صلہ۔ سچ کہتا ہوں، میں نے اپنی زندگی میں لڑکا تو لڑکا ایسا کوئی آدمی تک نہیں دیکھا، واللہ اس لڑکے میں بڑائی کے آثار ملتے ہیں۔"

فقیر بڑی بے صبری سے کھانا کھاتا رہا اور تشکر گزار نظروں سے عبیداللہ کی طرف دیکھتا رہا۔

عبیداللہ نے اپنی دستار طبّاخ کے حوالے کرنا چاہی مگر طبّاخ نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ عبیداللہ نے تلخی سے کہا " ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اس فقیر نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ میں یہ دستار واپس نہیں لوں گا۔"

طبّاخ نے بڑی کوشش کی کہ دستار واپس کر دی جائے، لیکن عبیداللہ نے دستار واپس لینے سے صاف صاف انکار کر دیا۔

طبّاخ نے کہا " میاں صاحبزادے! کچھ مجھے بھی ثواب کما لینے دو۔"

عبیداللہ نے جواب دیا " ثواب کمانے سے میں نے تمھیں روکا تو نہیں۔ اس کے راستے ہر ایک کے لیے کھلے ہوتے ہیں لیکن میں نے جو کچھ کیا ہے، ثواب کمانے کی غرض سے نہیں کیا بلکہ ان حالات میں مجھ کو یہی کرنا چاہیئے تھا۔ میں ثواب نہیں کمانا چاہتا۔"

فقیر بڑی جلدی جلدی کھانے پر ہاتھ صاف کر رہا تھا جب وہ پوری طرح شکم سیر ہو گیا تو طبّاخ نے پوچھا " بابا! کچھ اور کھاؤ گے یا بس؟"

فقیر نے نفی میں گردن ہلا دی اور ایک زوردار ڈکار لے کر کھڑا ہو گیا۔

عبیداللہ نے فقیر سے پوچھا " بابا! بس یا اور کچھ؟ اب تو میں جا سکتا ہوں؟"

فقیر نے پہلی بار زبان کھولی " اے پیرِ عالمگیر! جا، خدا تجھ کو بہت کچھ دے گا۔ تو نے اپنی دستار کے عوض ایک وقت کا کھانا ہی نہیں خریدا بلکہ معلوم نہیں کیا کچھ خرید لیا۔ تجھ کو اس کا صلہ زندگی بھر ملتا ہی رہے گا۔"

فقیر کی باتوں نے عبیداللہ اور طبّاخ دونوں ہی کو حیران کر دیا۔ فقیر نے عالمِ جذب میں آواز لگائی " تو نے، اے لڑکے تو نے آج بہت بڑا سودا کیا ہے۔ واللہ اتنا بڑا سودا کہ تو ایک دستار کے عوض پیرِ عالمگیر بن گیا۔"

فقیر تو کہہ کر چلا گیا لیکن عبیداللہ کی حالت ہی کچھ اور ہو گئی۔ عبیداللہ نے سوچنا شروع کر دیا " اے عبیداللہ! خدا نے انسان کو اس لیے تو نہیں پیدا کیا کہ وہ اپنے آپ سے غافل ہو جائے۔ پھر میں کیوں غافل ہوں۔ مجھ کو کچھ کرنا چاہیئے۔ کچھ کرنا چاہیئے، کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ کوئی ایسا کام جس سے میں خود بھی طمانیت حاصل کروں، اور اپنے رب کو بھی راضی رکھ سکوں۔"

عبیداللہ نے گھر پہنچ کر خدا سے لو لگا لی اور یکسو ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔

اس دوران آپ کی عبادت اور ریاضت کا شہرہ ہونے لگا۔ عبیداللہ کا کوئی مرشد نہیں تھا، جو کچھ تھا، اپنا تھا، خود سے کر رہے تھے لیکن پھر خیال آیا کہ اس سفر میں کسی کی رہبری بہت ضروری ہے۔ چنانچہ انھیں مرشدِ کامل کی فکر لاحق ہو گئی۔

✿

چونکہ آپ کے بارے میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ آپ ہر ایک کے کام آ جاتے ہیں اور اتنے زیادہ کام آتے ہیں کہ لوگ انھیں مشکل کشائی کا چلتا پھرتا نمونہ سمجھتے ہیں۔ آپ مراقبے میں تھے کہ





حضرت ابوحفص، عمر بن سالم نیشاپوری خراسان کے رہنے والے تھے اور حضرت جنید بغدادیؒ کے معاصرین بزرگوں میں سے تھے۔ ابتدا میں لوہار کا کام کرتے تھے۔ وہیں ایک لونڈی پر فریفتہ ہو گئے اور ہر وقت اس کے تصور میں گم رہنے لگے۔ کسی نے کہا کہ نیشاپور میں ایک جادوگر ہے وہ تمہارے درد کا درماں کر سکتا ہے۔ اُس یہودی جادوگر کے پاس جا پہنچے۔ اس نے علاج کی صورت یہ بتائی کہ چالیس روز تک نماز ترک کر دو اور دل سے نیکی اور اچھے عمل کے خیالات نکال دو ورنہ جادو اثر نہ کرے گا۔ چنانچہ وہ راضی ہو گئے۔ جادوگر چالیس روز عمل کرتا رہا مگر ابوحفص کی مراد پوری نہ ہوئی۔ انھوں نے جادوگر سے کہا: "اب کہو۔ یہ تمہارا علم کیسا ہے؟"

جادوگر نے کچھ دیر سوچا پھر پوچھا: "میرا علم تو ٹھیک ہے۔ یوں لگتا ہے تم نے کوئی گڑبڑ کر دی ہے۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ ان چالیس دنوں میں تم نے میرے مشورے پر عمل کیا تھا، یعنی نماز تو نہیں پڑھی تھی؟ کوئی اور اچھا کام تو نہیں کیا تھا؟"

حضرت ابوحفص نے کچھ دیر سوچا اور بولے: "مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس دوران تمہارے مشورے سے روگردانی کی ہو، البتہ میں نے ایک دن راستے میں پڑا ہوا ایک پتھر ضرور پرے کیا تھا کہ مبادا کسی کو ٹھوکر نہ لگ جائے۔"

مرسلہ: محمد عمران احمد



آپ کو اطلاع دی گئی کہ ایک ضرورت مند آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔

آپ نے مراقبے کو توڑ دیا اور کہا: "اس شخص کو حاضر کرو، اس کا مجھ سے کیا کام ہے؟"

اس ضرورت مند کو آپ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ آپ نے پوچھا۔ "مجھ سے کوئی خاص کام ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا: "جناب! میں بہت پریشان ہوں۔ ایک بیوی اور کئی بچے رکھتا ہوں۔ مالی حالت سقیم ہی نہیں بالکل تباہ ہے۔ دو دن سے گھر میں کچھ بھی نہیں پکا۔ آپ کی بڑی شہرت ہے۔ کہا جاتا ہے آپ کسی کو مایوس نہیں کرتے کچھ میری بھی مدد کیجیے ورنہ میں خودکشی کر لوں گا۔"

آپ نے تسلّی دی: "خودکشی حرام ہے اور اس بات کی علامت کہ تو خدا کی رحمتوں سے مایوس ہو چکا ہے۔ میں تیرے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔"

اس شخص نے بے تابی سے کہا: "جناب! کب کیجیے گا؟ بھوک تو اس وقت لگی ہے اور آپ وعدہ مستقبل کا کر رہے ہیں۔ میرے لیے اگر کچھ کرنا ہے تو فوراً کیجیے ورنہ میں مایوسی میں معلوم نہیں کیا کچھ کر گزروں گا۔"

آپ خاموشی سے کچھ سوچنے لگے۔ ذرا دیر بعد سر اٹھایا اور ہرات کے حاکم کے نام ایک رقعہ لکھا۔

"حاکم ہرات کے نام اللہ کے کمترین بندے عبیداللہ ابن خواجہ محمود کا مکتوب:۔

حامل ہذا معاشی بدحالی کا شکار ہے اور یہ بدحالی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکی ہے۔ یہ ایک بیوی اور کئی بچوں کا کفیل ہے۔ اللہ ربّ العالمین ہے اور اس نے انسان کو انسانوں کے رزق کا امین بنا لیا ہے۔ تو ہرات کا حاکم ہے، اس لیے تیرا یہ فرض ہے کہ یہاں کے بھوکوں کی خبر گیری کرے اور ان کے رزق کا انتظام کرے۔ تو نے اس کی معاش کا کوئی مستقل بندوبست نہ کیا تو یہ حالات سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کرے گا۔ اس کے بعد اس کی بیوی کیا کرے گی خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے حالات اس کو معصیت پر مجبور کر دیں، اس کی اولاد بے تربیت اور آوارہ و ناکارہ ماری ماری پھرے گی۔ کوئی چور بنے گا، کوئی اُچکا، اور یہ سارے گناہ تیرے نامۂ اعمال میں بھی شامل ہوں گے کیونکہ تو نے ایک بیوی کے شوہر اور کئی بچوں کے باپ کے معاشی معاملات پر غور و خوض اور دلچسپی سے کام نہیں کیا، تو نے ایک شخص کو حرام موت مر جانے کی اجازت دے دی اور مرحوم شوہر کی بیوی کو بدکاری اور حرام کاری پر مجبور کر دیا۔ چند بے سہارا اور بے یار و مددگار یتیموں کو دریوزہ گری اور چوری چکاری پر مجبور کر دیا۔ اے حاکم! اس دن کی پکڑ سے ڈر، جس دن کوئی کسی کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔ اس دن کوئی رشتہ کام نہیں آئے گا۔ مال و زر، جائداد، دولت، اقتدار، اختیار کوئی شے کام نہ آئے گی۔ ہاں اچھے اعمال، نیکیاں، جود و سخا اور وہ شمہ برابر بھلائی جو کسی کے ساتھ کی گئی ہوگی، کام آ

جائے گی۔ اے حاکم! آخرت کی کھیتی کے لیے بیج بو دے تاکہ موت کے بعد تجھے کھیتی تیار ملے۔

میں امید کرتا ہوں کہ تجھ پر میری نصیحتوں کا خاطر خواہ اثر ہوگا اور یہ شخص مایوسیوں کے اندھیرے سے نکل کر اللہ کی رحمت کی روشنی میں آجائے گا۔"

آپ نے اس شخص کو یہ خط دیا اور کہا "جا، حاکم ہرات کو میرا یہ خط پہنچا دے اور وہ اس کا جو بھی جواب دے، میرے پاس لے آ۔"

اس شخص نے مایوسی سے سوال کیا "حضرت! کیا آپ کی حاکم ہرات سے اچھی یاد اللہ ہے؟"

آپ نے جواب دیا "اے شخص! نیکی اور بھلائی کے لیے کسی یاد اللہ کی ضرورت نہیں۔"

اس مایوس اور لاچار شخص کے دل کو کوئی خوشی نہیں ہوئی کیونکہ اس کو ایک فیصد بھی کامیابی کا یقین نہیں تھا، لیکن تین دن بعد جب وہ واپس آیا تو نہایت ہشاش بشاش تھا۔ اسکی آنکھوں میں چمک ہی کچھ اور تھی۔ آپ نے پوچھا "حاکم ہرات کو میرا خط پہنچا دیا؟"

اس نے جواب دیا "جناب! پہلے تو دربانوں نے آگے بڑھنے ہی نہیں دیا۔ میں نے انھیں خدا اور رسولؐ کا واسطہ دیا لیکن وہ نہیں پسیجے۔ آخر میں نے یہ طے کیا کہ میں حاکم کے راستے میں بیٹھ جاؤں اور جیسے ہی اس کی سواری سامنے سے گزرے دوڑ کر آپ کا خط اس کو پیش کردوں۔ چنانچہ میری یہ ترکیب کارگر ہوئی اور میں حاکم ہرات کو آپ کا خط دینے میں کامیاب ہوگیا۔"

آپ نے پوچھا "میرا خط پڑھ کر حاکم نے کیا کہا؟"

اس نے جواب دیا "اس نے خط پڑھ کر مجھ کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ سواری محل میں واپس گئی۔ مجھ سے پوچھا کیا تو بھوکا ہے؟"

میں نے جواب دیا "جناب! میں اپنی بھوک سے نہیں اپنی بیوی بچوں کی بھوک سے پریشان ہوں۔ اس لیے اگر میں آپ کے دستر خوان پر اپنی بھوک مٹا بھی لوں گا تو بیوی بچوں کی بھوک کی خلش مجھے برابر تنگ کرتی رہے گی۔"

حاکم نے اسی وقت اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ اس کو پچاس دینار دے دیئے جائیں تاکہ یہ ان سے اپنے گھر کا انتظام کر سکے۔ اس کے بعد مجھ سے کہا "جاؤ، ایک ہفتہ بعد کام پر آجانا۔ تجھے میں نے اپنے خزانچی کے حوالے کیا۔ اس سے کام سیکھ اور اس کی مدد کر۔ تیرا معقول مشاہرہ مقرر کردیا جائے گا۔"

اور پھر جب میں پچاس دینار لے کر وہاں سے چلنے لگا تو حاکم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھ کو روکا اور کہا کہ عبیداللہ سے جا کر کہہ دینا کہ آپ کی نصیحتوں کا بہت بہت شکریہ۔ دنیا کا نظام آپ ہی جیسے لوگوں سے چل رہا ہے۔ آپ آئندہ بھی مجھ کو نصیحتیں فرماتے رہیئے گا تاکہ میں ادھر ادھر ہونے سے بچا رہوں۔"

آپ نے فرمایا "جزاک اللہ۔ اللہ اس کو صراطِ مستقیم پر رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

جب اس بات کا شہرہ ہوا تو کسی حاسد نے کہا "حضرت! آپ نے اس شخص کا کام کردیا، خوب کیا۔ مگر جب لوگوں نے یہ سنا کہ آپ نے مراقبے کو توڑ کر حاکم ہرات کو خط لکھا تھا تو بہت افسوس کیا۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔"

آپ نے جواب دیا "اے شخص! یہ تو نے کیسی بات کردی، کیسا اعتراض کردیا ہے۔ میں کسی مسلمان کے کام کو اپنے مراقبے سے زیادہ ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نفل کے مقابلے میں کسی مسلمان کا کام کردینا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔"

معترض نے پوچھا "یہ کس کی تعلیمات پر آپ چل رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "یہ کسی اور کی تعلیم یا تلقین سے میں نے اخذ نہیں کیا بلکہ خدمات کے ثمرے سے یہ اخذ کیا ہے۔ چنانچہ جب میں کسی کے کام آجاتا ہوں تو میرے ضمیر اور نفس کو بڑی فرحت اور خوشی محسوس ہونے لگتی ہے اور اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اللہ ہر شخص کو اپنا قرب ایک مخصوص دروازے سے عطا فرماتا ہے۔ اس نے میرے لیے مخلوق کی خدمت کا دروازہ رکھا ہے۔ چنانچہ مجھ کو مخلوق کی خدمت زیادہ محبوب ہے۔"

معترض اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

ہرات میں شیخ بہاؤالدین عمر بھی بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان کی محفل میں علماء، فضلاء اور فقراء تک حاضریاں دیا کرتے تھے۔ عبیداللہ بھی وقتاً فوقتاً پہنچ جایا کرتے تھے۔ ایک دن جو یہ شیخ بہاؤالدین عمر کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے سوال کیا۔

"عبیداللہ! شہر کا کیا حال ہے، لوگ کیا کر رہے ہیں؟"

عبیداللہ نے جواب دیا "حضرت دو اہم خبریں ہیں۔"

انھوں نے پوچھا "کون کون سی؟"

عبیداللہ نے جواب دیا "حضرت شیخ زین الدین اور ان کا حلقہ کہتا ہے ہمہ از اوست، اور سید قاسم اور ان کے پیرو کہتے ہیں ہمہ از اوست نہیں بلکہ ہمہ اوست۔"

شیخ بہاؤالدین عمر نے پوچھا "اور تم کیا کہتے ہو؟"

عبیداللہ نے جواب دیا "میں ہمہ از اوست کا قائل ہوں۔"

شیخ بہاؤالدین نے فرطِ خوشی میں کہا "اور درست بھی یہی ہے۔ یہاں جو کچھ ہے اسی سے ہے، حالانکہ درست یہ بھی ہے

کہ یہاں جو کچھ بھی ہے وہی ہے، اس کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن اس عقیدے میں عوام کی گمراہی کا اندیشہ موجود ہے۔ اگر یہاں اس کے سوا کچھ بھی نہیں، تو کفار بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اشجار، مظاہر فطرت اور بتوں کی پرستش کہاں کرتے ہیں، کیونکہ جب اس کے سوا یہاں کچھ ہے ہی نہیں، اور جو کچھ بھی ہے اس میں وہی موجود ہے تو اشجار مظاہر فطرت اور بتوں میں بھی وہی موجود ہے۔ اس طرح نہ کوئی کافر ہے نہ کوئی مسلمان۔ کفر و اسلام کا فرق ہی ختم ہو جاتا ہے، لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہاں جو کچھ بھی ہے اس سے ہے تو گویا ہم خالق اور مخلوق کے درمیان ایک فصل پیدا کر دیتے ہیں اور غیر اللہ کے سجدے سے بچ جاتے ہیں۔"

ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کے فلسفے اور معانی و مطالب نے عبیداللہ کو بہت متاثر کیا اور انھوں نے خود کو ہمہ از اوست پر قائم کرلیا۔

یہ عبیداللہ کی جوانی کا واقعہ ہے۔ ان دنوں مولانا سعدالدین کاشغری بھی ہرات ہی میں مقیم تھے اور ان کے فضل و کمال کا بڑا چرچا تھا۔ مولانا سعدالدین کاشغری عبیداللہ کے پاس ہی رہتے تھے اب عبیداللہ کی معیشت خاصی مضبوط ہو چکی تھی۔ حاکم ہرات نے انھیں زمینیں عطا کر دی تھیں جن پر مزدوروں کی مدد سے کاشت کی جانے لگی۔ مزدوروں کے ساتھ خود بھی لگ جاتے۔ خدا نے انھیں بہت جلد مالا مال کر دیا۔ چنانچہ مولانا کاشغری کی تشریف آوری اور اقامت سے عبیداللہ کو فکر مند نہیں ہونا پڑا، اور وہ بڑی تواضع سے پیش آئے۔ دونوں الگ الگ ریاضتیں کرتے اور روحانی کمال میں اضافہ کرتے رہتے۔ شام کو دونوں ایک ساتھ ادھر ادھر نکل جاتے اور مختلف طریقوں سے اپنی ہمت اور استعداد کا جائزہ لیتے رہتے۔ شہر کے بیچوں بیچ میں ایک اکھاڑہ تھا جس میں شہر بھر کے پہلوان زور آزمائی کرتے تھے اور ان کشتیوں کو دیکھنے کے لیے شہر کی کثیر آبادی اکھاڑے کے چاروں طرف جمع ہو جاتی تھی۔ عبیداللہ نے مولانا کاشغری سے کہا۔

"حضرت! ہم دونوں کیوں نہ اکھاڑے چلیں اور مقابلوں سے جی بہلائیں۔"

مولانا کاشغری نے جواب دیا۔ "عبیداللہ! ہم نے جو راہ پکڑی ہے اس میں جی بہلانے کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ تم نے یہ کیسی بات کردی۔"

عبیداللہ نے کہا۔ "حضرت! میں صرف تماشبین کی حیثیت سے نہیں جا رہا ہوں، بلکہ میں وہاں اپنی ہمت اور استعداد کا امتحان کروں گا۔ مولانا! میں وہ کارنامے دکھاؤں گا کہ آپ دنگ رہ جائیں گے اور لوگوں کو سکتہ ہو جائے گا۔"

مولانا کاشغری نے پوچھا۔ "کیا ہم دونوں اکھاڑے چلیں گے؟"

عبیداللہ نے جواب دیا۔ "ہاں ہم دونوں اکھاڑے چلیں گے کیونکہ ہمیں وہاں روحانی کمال کے مظاہرے کرنے میں آسانی رہے گی اور اس طرح لوگوں کو بھی وہ سب کچھ دیکھنے کا موقع ملے گا جو ہم دکھانا چاہتے ہیں۔"

چنانچہ یہ دونوں شہر کے اکھاڑے کی طرف چل دیئے۔ دور ہی سے اکھاڑے کا ہجوم انھیں دکھائی دینے لگا۔ شہر کے مختلف حصوں سے مقابلے میں حصہ لینے والے پہلوان اکھاڑے کی طرف چلے جا رہے تھے۔ عبیداللہ نے ایک دبلے پتلے پہلوان کو راستے ہی میں روک لیا اور اس سے پوچھا۔

"کیوں بھائی! کیا تو بھی کشتی لڑے گا؟"

پہلوان نے جواب دیا۔ "ہاں جناب میں بھی کشتی لڑوں گا کیوں بات کیا ہے؟"

عبیداللہ نے مسکرا کر کہا۔ "لیکن تیرا جثہ اور صحت تو ایسے نہیں ہیں کہ تو کسی بھی پہلوان کو پچھاڑے۔ پھر تو کس سے کشتی لڑے گا؟ یہاں تو ہر پہلوان تجھ سے بڑا اور طاقتور دکھائی دیتا ہے۔"

پہلوان نے سرد آہ کھینچی اور کہا۔ "بس یہی خیال تو میرا دل توڑ دیتا ہے۔ میں کشتی میں نام پیدا کرنا چاہتا ہوں اور میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش بھی یہی ہے کہ میں لوگوں میں پہلوان کی حیثیت سے پہچانا جاؤں۔"

عبیداللہ نے کہا۔ "اگر میں تیری یہ خواہش پوری کر دوں تو؟"

پہلوان اچھل گیا اور بے چینی سے پوچھا۔ "میری یہ خواہش کس طرح پوری ہو سکتی ہے؟"

عبیداللہ نے جواب دیا۔ "یہ کام تو مجھ پر چھوڑ دے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس کو صرف تو ہی نہیں پورا شہر دیکھ اور سن لے گا۔"

پہلوان نے عاجزی سے کہا۔ "حضرت! اگر آپ خدا کے خاص بندے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ میں بڑا نامی گرامی پہلوان بن سکتا ہوں تو خدا کے لیے میری یہ تمنا پوری کر دیجئے۔ میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔"

عبیداللہ نے پوچھا۔ "تو کس کس پہلوان سے لڑنا چاہتا ہے؟"

پہلوان نے جواب دیا۔ "ہر اس پہلوان سے جو اپنے مقابل کو شکست دے کر آگے آیا ہو۔"

عبیداللہ نے کہا۔ "تب پھر میں حکم دیتا ہوں کہ تو جس جس کو زیر کرنا چاہتا ہے اس کو مقابلے کی دعوت دے دے۔ اللہ نے چاہا تو تو ہی جیتے گا۔ کوئی بھی پہلوان تجھ کو شکست نہیں دے سکتا۔"

پہلوان نے آپ کو کچھ تحفے کے طور پر پیش کیا اور کہا۔ "حضرت فی الحال میں آپ کو کوئی بڑا تحفہ نہیں پیش کر سکتا اس لیے جو کچھ

حاضر ہے پیش کر رہا ہوں، قبول فرمائیں۔"

عبیداللہ نے بڑے ناگوار لہجے میں کہا "اے شخص! میں نے جو یہ جتانے کی پیش کش کی ہے اس کے پیچھے حرص و طمع اور لالچ کو کوئی دخل نہیں۔ تجھ کو جتوا کر میں اپنے روحانی تصرفات کا کمال اور ہمت دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس طرح دو بڑے کام ہو جائیں گے پہلا یہ کہ میں اپنے روحانی کمال اور ہمت سے واقف ہو جاؤں گا اور دوسرا یہ کہ تو اس شہر کا نامی گرامی بلکہ سب سے بڑا پہلوان بن جائے گا اور اس طرح تیری ایک دیرینہ خواہش پوری ہو جائے گی۔"

پہلوان جھوم جھوم گیا اور نشے کی کیفیت میں بہکنے لگا۔

مولانا کاشغری نے ٹھوکا دیا اور آہستہ سے کہا "عبیداللہ! یہ کیا کر رہے ہو؟ کیا کسی اور طرح روحانی تصرفات اور ہمت کا اندازہ نہیں کر سکتے ہو؟"

عبیداللہ نے جواب دیا "فی الحال یہی کافی ہے میں زیادہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں اپنے اس طریقے میں کیف سا محسوس کر رہا ہوں۔"

مولانا کاشغری نے پہلوان کی طرف اشارہ کیا "میں تو اس پہلوان میں ایک بھی ایسی کوئی بات یا خوبی نہیں محسوس کر رہا ہوں، جس سے اس کی تمام پہلوانوں پر سبقت اور برتری کی امید کی جائے۔"

عبیداللہ نے پہلوان سے کہا "اب تو پہلوانوں میں شامل ہو جا اور جس پہلوان سے بھی مقابلہ کرنا چاہے، مقابلہ کر، جیت تیری ہی ہوگی۔"

پہلوان بھاگ کر پہلوانوں میں شامل ہو گیا۔ عبیداللہ اور مولانا کاشغری بعد میں پہنچے۔

کمزور پہلوان اچانک اکھاڑے میں کود پڑا اور اعلان کیا۔

"لوگو! اس وقت میں ہرات کا سب سے بڑا پہلوان ہوں اور اس بڑائی کو ثابت کرنے کے لیے میں اس اکھاڑے میں اترا ہوں، جس جس کو اپنی طاقت اور داؤ پیچ پر ناز ہو وہ میرے مقابلے میں آجائے اللہ نے چاہا تو میں اپنے دعوے کی صداقت ثابت کر دوں گا۔"

نامور اور نامی گرامی پہلوانوں نے کمزور پہلوان کی طرف ہنس کر دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ تماش بینوں میں سے بعض نے مسکرا کر کہا "غریب کی شامت ہی آگئی ہے شاید، کوئی بھی بڑا پہلوان اس کی ہڈی پسلی برابر کر دے گا۔ یہ ہے ہی کیا، ایک جھنگا۔"

عبیداللہ اور مولانا کاشغری اکھاڑے کے قریب بیٹھ گئے۔

جوڑ کا اعلان کیا جانے لگا اور آخر تک اس کمزور پہلوان کا نام تک نہ آیا۔ اس نے احتجاج کیا "میں بھی مقابلہ کروں گا، میں بھی کشتی لڑوں گا اور ہر اس شخص سے لڑوں گا جس کو اپنی پہلوانی پر ناز ہوگا۔ آخر میرا نام کیوں نہیں لیا جا رہا۔ میں بھی تو کشتی لڑنے آیا ہوں۔"

اعلان کرنے والے نے ازراہِ مذاق اعلان کیا "چونکہ اس ٹڈے پہلوان کا یہاں کوئی جوڑ ہی نہیں اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جو پہلوان اوّل آئے گا اس کا مقابلہ اس ٹڈے پہلوان سے کرایا جائے گا۔"

کمزور پہلوان پھولا نہ سمایا اور مارے خوشی کے اکھاڑے میں کئی قلابازیاں کھائیں۔

کشتیاں ہونے لگیں۔ عبیداللہ نے اپنے روحانی کمال اور ہمت کا امتحان لینا شروع کر دیا۔ جو پہلوان زیر ہونے لگتا، آپ اس پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتے۔ توجہ کا یہ اثر ہوتا کہ زیر ہونے والے کو اوپر آتا اور طاقتور پہلوان کمزور پڑ جاتا۔ پھر جب دوسرا زیر ہونے لگتا تو آپ پہلے کو کمزور کر دیتے اور دوسرا حاوی آجاتا۔ یہاں تک کہ اس آخری مقابلے نے اتنا طول کھینچا کہ گھنٹوں بعد بھی کسی کے حق میں فیصلہ نہ ہو سکا اور دونوں پہلوان شل ہو کر پسینہ پسینہ ہو گئے، زور زور سے ہانپنے لگے اور یہ مقابلہ ہار جیت کے بغیر ہی ختم ہو گیا۔

دوسرا مقابلہ شروع ہوا اور آپ نے اپنی توجہ اس پہلوان پر مرکوز کر دی جو نسبتاً کمزور محسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ کمزور پہلوان نے طاقتور کو شکست دے دی۔ لوگوں نے خوشی سے نعرے بلند کیے اور کمزور پہلوان کو تماشائیوں نے کاندھے پر اٹھا لیا۔

اس کے بعد تیسرا مقابلہ ہوا اور اس مقابلے میں بھی وہی جیتا جس پر عبیداللہ کی توجہ تھی۔ جب سارے مقابلے ہو گئے اور ایک پہلوان ان سب میں اوّل آیا تو کمزور پہلوان ایک بار پھر اکھاڑے میں اتر پڑا اور اعلان کیا "حضرات! اب میں اپنے مقابلے کا منتظر ہوں اور حسبِ وعدہ اوّل آنے والے پہلوان کا مجھ سے مقابلہ کرایا جائے۔"

اعلان کرنے والے نے ہنس کر جواب دیا "میں نے وہ اعلان تو یوں ہی مذاق میں کر دیا تھا ورنہ کیا مجھ کو اندازہ نہیں ہے کہ کون کتنی طاقت رکھتا ہے اور کتنے داؤ پیچ جانتا ہے۔ اگر تیری شامت ہی آگئی ہے تو بے شک مقابلے پر ڈٹا رہ۔ ورنہ میرا مشورہ مان اور اپنا راستہ لے۔ کسی بھی پہلوان کو تجھ پر غصہ آگیا تو وہ تجھ کو اٹھا کر اکھاڑے کے باہر پھینک دے گا جس سے تیری پسلیاں ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائیں گی۔"

کمزور پہلوان نے شور کیا "واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو لڑے بغیر اکھاڑے سے بھی نہ نکلوں گا۔"

عبیداللہ نے بھی مداخلت کی، کہا "لوگو! یہ تو واللہ بڑی زیادتی

ہے اس پہلوان کے ساتھ۔ جب اعلان کیا ہے کہ آخر میں اوّل آنے والے پہلوان کو اس منحنی پہلوان سے مقابلہ کرنا ہوگا تو اب کیوں گریز اختیار کیا جا رہا ہے؟"

تماشبین بھی اس مقابلے سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے، شور کیا "یہ مقابلہ ہوگا ضرور ہوگا۔"

چنانچہ منتظم اکھاڑہ نے طوعاً و کرہاً کہا۔ کمزور اور اوّل آنے والے پہلوانوں کو یکجا کیا اور اعلان کیا "حضرات! بظاہر تو ان دونوں کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں لیکن آپ لوگ اس کشتی پر مصر ہیں تو میں بھی مجبور ہو گیا ہوں۔ اب ان دونوں کا مقابلہ ہوگا اور ان میں جو جیتے گا وہی آج کا فاتح کہلائے گا۔"

دونوں میں مقابلہ شروع ہوا۔ طاقتور پہلوان نے غصے میں کمزور کو پٹخنی دینا چاہی لیکن عبید اللہ کی پوری توجہ کمزور کے حق میں تھی۔ چنانچہ کمزور پہلوان نے زور لگا کر طاقتور پہلوان کو دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا اور سر سے اونچا کر کے اکھاڑے میں دے مارا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی اور غیر متوقع ہوا کہ کسی کو اس نتیجے پر یقین ہی نہ آیا۔ تماشائی پہلوان، منتظمین ہر کوئی حیرت زدہ اور پریشان، دیکھتے ہوئے بھی یقین کرنے کو تیار نہ تھے۔

طاقتور پہلوان نے کہا "یہ مقابلہ صحیح نہیں تھا اور اس شخص نے مجھ کو دھوکے سے زیر کر لیا ہے اس لیے یہ مقابلہ دوبارہ کرایا جائے۔"

کمزور پہلوان سے پوچھا گیا "تو کیا کہتا ہے؟ کیا یہ مقابلہ دوبارہ ہونا چاہیے؟"

اس نے جواب دیا "نہ صرف دوبارہ بلکہ سہ بارہ کے لیے بھی میں تیار ہوں۔ مجھ کو اپنی طاقت اور داؤ پیچ پر ناز ہے، اس لیے میں دس بار مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔"

کمزور پہلوان کے اس جواب نے ہر ایک کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا اور ہارا ہوا پہلوان خوفزدہ ہو گیا۔

دونوں کا مقابلہ پھر شروع ہوا۔ اس بار عبید اللہ نے روحانی تصرف میں کمی کر دی اور مقابلے کو طول دینا شروع کر دیا۔ کبھی طاقتور اوپر آجاتا کبھی کمزور طاقتور کو مغلوب کر لیتا۔ کافی دیر تک مقابلہ جاری رہا۔ آخر عبید اللہ نے روحانی تصرف میں اضافہ کر دیا اور کمزور نے طاقتور کو ایک بار پھر سر سے اونچا اٹھا کر دے مارا اور اس بار اس کو اتنے زور سے گرایا گیا تھا کہ وہ اٹھ نہیں سکا، آنکھیں بند کیے دیر تک پڑا رہا۔ کمزور پہلوان فخریہ اکھاڑے کے چاروں طرف چکر لگاتا رہا اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر لوگوں کی دادِ تحسین کا جواب دیتا رہا۔

نتیجے کا اعلان کمزور پہلوان کے حق میں کر دیا گیا۔

کمزور پہلوان نے ایک بار پھر اعلان کیا ہے کہ کوئی پہلوان جو میرے مقابلے پر آئے میں ہر ایک سے لڑنے کو تیار ہوں۔"

حضرت جنید اور ابنِ منصور حلاج

مجذوب حسین بن منصور حلاج جو انا الحق کے نعرے کے جرم میں قتل ہوئے، ایک بار حضرت جنید بغدادیؒ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ آپؒ کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں۔ حضرت جنیدؒ نے جواب دیا "میں دیوانوں کو اپنی صحبت میں نہیں رکھ سکتا۔"

ابن منصور حلاج نے کہا "یا مرشد ہوش اور مدہوشی دو صفتیں ہیں، جب تک ساری صفات انسان سے ختم نہ ہوں وہ خالقِ حقیقی سے دور اور پوشیدہ ہے۔"

حضرت جنید نے جواب دیا۔

"تم غلطی پر ہو۔ ہوش خدا کے معاملے میں سلامتیٔ عقل پر دلالت ہے اور مدہوشی تمنا کے حد سے گزر جانے کی علامت۔ یہ دونوں صفتیں ایسی ہیں کہ انسان جدوجہد کے بل پر پورا انہیں اتر سکتا اور مجھے تمہارے افکار میں زیادہ تر حماقت اور دیوانگی نظر آتی ہے۔"

جب ابن منصور آمادہ بہ اصلاح نہ ہوئے اور انھیں پھانسی ہوئی تو حضرت جنیدؒ کے ایک ہم عصر نے کہا۔

"یہ اس لیے ہوا کہ اس نے کسی کا راز دوسروں پر افشا کر دیا تھا۔"

ایک پہلوان کو دیکھ دیکھ کر غصہ آ رہا تھا، بولا "میں تجھ سے لڑنے کو تیار ہوں۔"

کمزور نے ہاتھ کے اشارے سے بلایا "آجا بھائی تو بھی آجا اور اپنے ارمان نکال لے۔"

دوسرا پہلوان مشتعل ہو کر اکھاڑے میں اتر گیا۔

پہلا پہلوان ابھی تک اکھاڑے میں پڑا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دوسرے پہلوان کو اکھاڑے میں اترتے دیکھا تو چپکے سے اٹھ کر اس کے پاس پہنچا اور کان میں کہا "بھائی! اس کے کمزور جسم پر نہ جانا، یہ بہت طاقتور ہے اور میرا دوبارہ کا یہ تجربہ ہے کہ اگر اس کی گرفت میں پھنس گئے تو یہ اوپر تک لے جا کر بڑی زور

سے دے مارے گا۔ بس لڑنے کے دوران یہی خیال رکھنا کہ کہیں تم اس کی پکڑ میں نہ آجانا۔"

دوسرے نے جواب دیا۔"میں احتیاط کروں گا۔ میں نے بھی کچھ یہی اندازہ لگایا ہے کہ اس کی گرفت سخت ہوتی ہے اور خود کو اس کی پکڑ سے محفوظ رکھا جائے۔"

اکھاڑے میں ایک بار پھر اعلان ہوا۔"حضرات! ایک دوسرے پہلوان نے آخری جیتے ہوئے پہلوان کو دعوتِ مقابلہ دے دی ہے اس لیے ذرا دیر بعد دوسرا مقابلہ ہوگا۔ مزید گزارش یہ ہے کہ آپ لوگ اس دوسرے مقابلہ کو بہت غور سے دیکھیں کیوں کہ بظاہر کمزور مگر اس غیر معمولی پہلوان میں یہ خاص بات دیکھی گئی ہے کہ یہ اپنے حریف کو توقع سے پہلے ہی شکست دے دیتا ہے، اور تماشائی سب کچھ دیکھ کر بھی انجام کو سمجھ نہیں پاتے اور اگر سمجھ بھی جاتے ہیں تو اس پر یقین نہیں کرتے۔"

تماشائی دم بخود اکھاڑے کی طرف دیکھنے لگے۔

مقابلہ شروع ہوا اور عبیداللہ نے آہستہ آہستہ تصرف بڑھانا شروع کیا۔ آپ نے اپنا تصرف بڑھا کر ایک دم کم کر دیا، جس کے نتیجے میں کمزور پہلوان زمین پر آرہا۔ پہلے پہلوان نے خوشی میں نعرہ بلند کیا۔"وہ مارا۔"

لیکن دوسرے ہی لمحے آپ نے اپنی پوری توجہ کمزور پر مرتکز کر دی۔ اس نے طاقتور پہلوان کو اچانک دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا اور بیچ اکھاڑے میں دے پٹکا۔ اب دوسرے مغلوب پہلوان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے آپ سے اٹھ ہی سکتا۔ وہ کچھ دیر دم سادھے پڑا رہا۔

کمزور پہلوان نے اعلان کیا۔"اصولی طور پر یہ دوسرا پہلوان بھی مجھ سے ہار چکا ہے لیکن میں حسبِ سابق اس سے بھی دوبارہ مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔ اگر اس کا جی چاہے تو۔"

ہارا ہوا پہلوان فوراً اٹھ کھڑا ہوا، بولا۔"میں ایک شرط پر دوبارہ لڑنے کو تیار ہوں۔"

کمزور نے پوچھا۔"کس شرط پر؟"

جواب ملا۔"یہ جو تو اوپر تک اٹھا کر پٹک دیتا ہے کشتی میں یہ نہیں ہونا چاہیے تو اپنے داؤ لگا، میں اپنے داؤ لگاؤں گا غرضیکہ جو بھی جیتے، داؤ سے جیتے۔ میں اس اجڈ کشتی سے بالکل واقف نہیں کہ اپنے حریف کو اونچا اٹھا کر اکھاڑے میں دے مارا۔"

کمزور نے جواب دیا۔"مجھے یہ شرط منظور ہے، چلو میں نہیں پٹکوں گا، اور کچھ؟"

مقابلہ پھر شروع ہوا اور عبیداللہ نے روحانی تصرفات سے کام لینا شروع کر دیا۔ کبھی یہ روحانی تصرف طاقتور کے حق میں ہو جاتا اور کبھی کمزور کے حق میں۔ دونوں کا لڑتے لڑتے بُرا حال ہو گیا۔ کمزور پہلوان کو پسینہ آگیا۔ اس نے عبیداللہ کی طرف التجا آمیز نظروں سے دیکھا۔ آپ مسکرائے اور اپنی پوری توجہ کمزور پر مرکوز کر دی۔ اس بار کمزور نے طاقتور کو اپنی پشت پر لے لیا، بالکل مشک کی طرح اور کئی زور زور کے جھٹکے دے کر اکھاڑے میں گرا دیا۔ گرنے والے کی ریڑھ کی ہڈیاں جواب دے گئیں اور وہ دم سادھے دیر تک پڑا رہا۔

کمزور نے پھر ہاتھ ہلا ہلا کر اعلان کیا۔"اور کوئی ہے جو مقابلے پر آئے۔ آج میں ایک لنگوٹ پر دس پہلوانوں سے لڑنے کے لیے تیار ہوں۔ اللہ چاہے گا تو میں سبھی کو شکست دے دوں گا۔"

اعلان کرنے والے نے بآوازِ بلند کہا۔"ہے کوئی اور پہلوان جو اس عظیم پہلوان سے مقابلہ کرے؟"

سب نے دم سادھ رکھا تھا۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کھڑے ہو کر باقاعدہ مقابلے کا اعلان کر دے۔

کمزور پہلوان نے فیصلہ کن لہجے میں پوچھا۔"کوئی ہے جو میرے مقابلہ پر آئے۔ میں آج ہرات کا عظیم پہلوان ہوں اگر کسی کو میرے اس دعوے پر اعتراض ہو تو میرے مقابلے پر آجائے اور میری کمتری کو ثابت کر دے۔"

اس اعلان کے بعد وہ بڑی دیر تک اکھاڑے میں کھڑا رہا۔ اور اپنے حریف کا انتظار کرنے لگا لیکن کوئی بھی سامنے نہ آیا۔ آخر مقابلے کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا اور کمزور پہلوان کو ہرات کا عظیم پہلوان قرار دے دیا گیا۔

کمزور پہلوان کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے اور وہ آپ کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔"حضرت یہ جو کچھ بھی مجھ کو حاصل ہوا ہے آپ کی توجہ سے، میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔"

آپ نے جواب دیا۔"اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں بس جا، اللہ کو یاد کر اور گھمنڈ سے کام نہ لینا۔"

پورے ہرات میں ان مقابلوں کا بڑا چرچہ ہوا لیکن یہ بات کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکی کہ یہ سارا کیا دھرا عبیداللہ کا تھا۔

مولانا کاشغری ہرات سے سمرقند چلے گئے اور عبیداللہ کو دعوت دے گئے کہ ہرات چھوڑ کر سمرقند کی سکونت اختیار کریں۔ آپ نے وعدہ کر لیا کہ میں ضرور آؤں گا۔

مولانا کاشغری نے کہا۔"وہاں میری زمینیں ہیں ان پر ہم دونوں مل جل کر کاشت کریں گے اور اللہ نے چاہا تو کایا پلٹ کر رکھ دیں گے۔"

عبیداللہ نے جواب دیا۔"میں سمرقند ضرور پہنچوں گا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لوں گا۔ مجھ کو سمرقند کی طرف سے بوتے

یگانگت آتی محسوس ہو رہی ہے۔"

ان دنوں سمرقند میں مولانا نظام الدّین خاموش رُوحانی کمال میں دوسروں سے بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک دن مراقبے میں کچھ دیکھا اور ایک دم چونک کر چیخ ماری اور کپکپی سی طاری ہو گئی۔ وہاں مولانا کاشغری بھی موجود تھے۔ انھوں نے مولانا نظام الدّین خاموش سے پوچھا "حضرت! کیا بات ہے، خیریت تو ہے؟"

مولانا نظام الدّین نے جواب دیا "کاشغری! ابھی ابھی مراقبے میں میں نے ایک جوان کو سمرقند کی طرف آتے ہوئے دیکھا ہے بس اس کو دیکھ کر میں کانپ گیا کیونکہ اس کی شاندار چال اور پُرشکوہ چہرہ، دونوں ہی کچھ اعلان کر رہے ہیں۔"

مولانا کاشغری نے پوچھا "حضرت! میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔"

مولانا نظام الدّین نے جواب دیا "مولانا کاشغری! میں نے اس پورب سے آنے والے کی پیشانی پر اس کا نام پڑھ لیا ہے عبیداللہ احرار، یہ شخص پورے عالم کو اپنے تحت کر لے گا۔"

مولانا کاشغری خاموش ہو گئے کیونکہ انھیں خوب معلوم تھا کہ عبیداللہ ان کی دعوت پر عنقریب آنے والے ہیں۔

کچھ دنوں بعد عبیداللہ سمرقند پہنچ گئے اور مولانا کاشغری اور مولانا نظام الدّین خاموش کے مہمان ہوتے۔ مولانا نظام الدّین ان کی صورت دیکھتے ہی احتراماً کھڑے ہو گئے اور کہا "خوش آمدید عبیداللہ۔ میں تو تمھارا انتظار ہی کر رہا تھا۔"

عبیداللہ نے جواب دیا "حضرت! آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ میں تو آپ کی خدمت میں درس کی خاطر حاضر ہوا ہوں۔"

مولانا نظام الدّین نے کہا "وہ اپنی جگہ لیکن اس سے تمھارا مرتبہ کم نہیں ہو جاتا۔"

عبیداللہ کئی سال سمرقند میں مقیم رہے اس کے بعد ہرات واپس گئے۔ ان دنوں ہرات میں مشہور زمانہ نقشبندی بزرگ یعقوب چرخی بھی آئے ہوئے تھے۔ ان بزرگ کی شہرت نے سبھی کو متاثر اور مرعوب کر رکھا تھا۔ عبیداللہ کے دل میں بھی ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ ابھی تک عبیداللہ نے کسی کی مُریدی اختیار نہیں کی تھی۔ اب وہ کسی کے مُرید ہو جانا چاہتے تھے، چنانچہ یعقوب چرخی کی ذات اسی غرض سے انھیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

عبیداللہ ڈرتے ڈرتے یعقوب چرخی کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے ان پر کوئی توجہ نہ دی۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو اور میرے پاس کیوں آئے ہو۔

عبیداللہ کو اپنی حاضری پر بڑا افسوس ہوا اور دل میں سوچا کہ میں نے ان کی خدمت میں ناحق حاضری دی۔ مجھ کو یہاں نہیں آنا تھا۔ یہ اسی تذبذب اور تاسف میں تھے کہ مولانا یعقوب چرخی نے کہا "اے شخص! میں نے تجھ سے یہ کب کہا تھا کہ تو میرا مُرید ہو جا۔ تو یہاں اپنی مرضی سے آیا ہے اور اپنی مرضی سے مُرید ہونا چاہتا تھا لیکن اب میں تجھ کو مُرید نہیں کروں گا، واپس جا اور کسی اور کا در دیکھ۔"

ابھی ان کی بات ختم ہی نہ ہوئی تھی کہ عبیداللہ کی نظر یعقوب چرخی کی پیشانی پر گئی، وہاں ایک سفید داغ نظر آیا، جس سے عبیداللہ کے دل میں کراہیت اور تنفر پیدا ہو گیا۔ ان کے دل میں یعقوب چرخی کی طرف سے بیزاری پیدا ہو گئی۔

مولانا یعقوب چرخی نے کہا "تو گویا میری پیشانی کا سفید داغ تجھ کو اور دور کر رہا ہے اور تو بیعت میں تامل سے کام لے رہا ہے۔"

عبیداللہ نے جواب دیا "حضرت! دل کا معاملہ براہِ راست خدا سے تعلق رکھتا ہے۔ میری کیا مجال کہ میں آپ سے نفرت کروں یا بیعت میں تامل سے کام لوں۔"

مولانا یعقوب نے کہا "عبیداللہ! اپنی آنکھیں بند کر اور دیکھ کہ تجھ کو کیا نظر آ رہا ہے؟"

عبیداللہ نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیکھنے کی کوشش کی اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ یہاں بھی مولانا یعقوب چرخی موجود تھے لیکن اب ان کی پیشانی پر کوئی سفید داغ نہیں تھا اور چہرے پر بلا کی نورانیت پائی جاتی تھی۔ انھوں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور حیرت سے مولانا یعقوب کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہاں بھی خلع لبس (تبدیلِ لباس) ہو چکا تھا اور ان کے سامنے وہ پہلے جیسے مولانا یعقوب نہیں ہیں جن کی پیشانی پر سفید داغ موجود تھا، اب ان کے سامنے جو ذات تھی وہ بڑی حسین و جمیل اور پُرکشش تھی۔

مولانا یعقوب نے مسکراتے ہوئے کہا "عبیداللہ! کیا تجھ کو معلوم ہے کہ میری بابت حضرت بہاؤالدّین نقشبند نے کیا فرمایا تھا؟"

عبیداللہ نے جواب دیا "جو کچھ فرمانا ہے حضور ہی فرما دیں، میں کیا عرض کروں۔"

مولانا یعقوب نے کہا "بہاؤالدین نقشبند نے فرمایا تھا کہ میرا ہاتھ یعقوب کا ہاتھ ہے اور جو شخص یعقوب کے ہاتھ پر بیعت کرے گا گویا میرے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔ اس لیے عبیداللہ میرے ہاتھ پر بیعت کر کے حضرت بہاؤالدّین نقشبند کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی سعادت حاصل کر۔"

مولانا یعقوب خاموش ہوئے تو عبیداللہ نے بے اختیار ان کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور ان سے بیعت ہو گئے۔

اب عبید اللہ کی زندگی میں ایسا موڑ آچکا تھا جہاں سے انھیں دوسروں کی رہنمائی کا فرض ادا کرنا تھا۔ اب وہ عبید اللہ احرار ہو چکے تھے اور ان کا لقب ناصر الدّین قرار پا چکا تھا۔

ایک دن مراقبے میں آپ کو القا ہوا کہ اسلام کو تقویت اور شریعت کو عروج بادشاہوں کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے، چنانچہ آپ ہرات سے سمرقند تشریف لے گئے۔ ان دنوں سمرقند میں امیر تیمور کے بیٹے مرزا شاہ رُخ کا پوتا مرزا عبد اللہ حکومت کر رہا تھا آپ کی تشریف آوری کی خبر عام ہوئی تو لوگوں کا ہجوم ٹوٹ پڑا۔ ان میں مرزا عبد اللہ والیٔ سمرقند کا ایک امیر بھی شامل تھا۔ آپ نے اس امیر سے کہا ”کیا تو جانتا ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟“

امیر نے جواب دیا ”میں نہیں جانتا اور نہ جاننے کی ضرورت ہی محسوس کرتا ہوں۔“

آپ نے فرمایا ”تو نے بڑی غلط بات کہی۔ تو سلطان کا امیر ہے اس لیے تجھ کو ملک کے معاملات سے باخبر رہنا چاہیئے۔“

امیر نے جواب دیا ”ہمیں بہت سی باتوں کی خبر رہتی ہے، براہِ کرم یہ بھی بتا دیجیے کہ آپ سمرقند کیوں تشریف لائے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا ”مجھ کو مراقبے میں القا ہوا ہے کہ اسلام کو تقویت اور شریعت کو عروج بادشاہوں کی مدد کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے میں سمرقند میں تیرے حکمران مرزا عبد اللہ سے ملاقات کرنے آیا ہوں اور تو اُس ملاقات کا اہتمام کرے گا۔“

امیر نے بے ادبی اور گستاخی سے جواب دیا ”حضرت! آپ ٹھہرے درویش۔ آپ کہاں بادشاہ سے ملیں گے اور پھر یہ کہ ہمارا مرزا عبد اللہ بڑا لاپرواہ جوان ہے، میں نہیں سمجھتا کہ وہ آپ سے ملاقات کرنے پر رضامند ہو جائے۔“

آپ کو غصّہ آگیا، فرمایا ”اے شخص! میں یہاں خود نہیں آیا لایا گیا ہوں۔ مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں سلاطین سے ملاقات کروں اور انھیں بتاؤں کہ اس دور میں ان کے فرائض کیا ہیں۔ اگر تیرا مرزا لاپرواہ ہے اور پرواہ نہیں کرتا تو مجھے بھی اس کی کوئی پرواہ نہیں، میں اس کا نام فہرست سے نکال دوں گا اور اس کی جگہ کسی اور کو لے آیا جائے گا۔ ایک ایسا سلطان اس کی جگہ بٹھایا جائے گا جو لاپرواہ نہیں ہوگا۔“

امیر نے منہ بنا کر کہا ”سبحان اللہ! آپ بڑی بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے ہیں، اور آپ کی باتوں سے ایسا لگتا ہے گویا سلاطین کا عزل و نصب آپ ہی کے ذمہ ہے۔ ایک درویش کو یوں اکڑ کر بات نہیں کرنا چاہیئے۔“

آپ نے جواب دیا ”تو کس قسم کی جاہلانہ باتیں کر رہا ہے۔ ہمارے ذمے بھی انتظام و انصرام ہے۔ جس طرح سلاطین کو ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں، اسی طرح مجھے بھی ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ میں نے تجھ کو بھی امارت کی فہرست سے خارج کیا۔“

امیر نے جاتے جاتے کہا ”آپ کی یہ بات بھی دیکھ لیں گے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔“

امیر چلا گیا۔

امیر کے جاتے ہی آپ اپنی جگہ سے اٹھے اور کوئلے سے دیوار پر امیر کا نام لکھا اور مٹا دیا اس کے بعد مرزا عبد اللہ کا نام لکھا اور اس کو بھی مٹا دیا، فرمایا ”اس بادشاہ اور اس کے امیروں سے ہمارا کام نہیں چل سکتا۔“

اس عمل کے بعد آپ نے سمرقند چھوڑ دیا اور تاشقند کی طرف روانہ ہو گئے۔

آپ کے سمرقند چھوڑے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ امیر بیمار پڑ گیا۔ طبیبوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر مرض میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ امیر کو شبہ گزرا کہ یہ سب عبید اللہ احرار کی خفگی کے نتیجے میں ہو رہا ہے۔ اس نے اپنا ایک آدمی آپ کی خدمت میں روانہ کیا، اور اس سے کہا ”حضرت سے کہہ کہ میں شرمسار ہوں اور گستاخی پر نادم ہوں۔ خدا کے لیے مجھ کو معاف فرما دیں اور اپنی خدمت میں حاضری کی اجازت مرحمت فرما دیں۔“

خادم گیا اور ذرا دیر بعد یہ خبر لے کر واپس آگیا کہ عبید اللہ احرار سمرقند چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔

امیر کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ رونے لگا، مایوسی سے کہا ”خدا مجھ پر اور سلطان پر رحم کرے۔ اس وقت میں معلوم نہیں کس ترنگ میں تھا جو میں نے آپ سے باندازِ گستاخی گفتگو کی۔“

چند دنوں بعد امیر کا انتقال ہو گیا۔ مرزا عبد اللہ کو امیر کے انتقال سے افسوس ہوا۔ اس کو عبید اللہ احرار اور امیر کی گفتگو کا علم ہو چکا تھا۔ اس نے نہایت افسوس سے کہا ”یہ امیر بڑا سادہ دل شخص تھا۔ ایک فضول درویش کی باتوں سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ اندر ہی اندر گھل کر چل بسا۔ اس کی جان اس کے وہم نے لے لی۔“

بادشاہ یہ کہہ کر اپنے محل میں واپس گیا۔

ایک ماہ بعد بادشاہ کو یہ خبر ملی کہ اس کا چچا ابو سعید مرزا ترکستان سے سمرقند کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔ مرزا عبد اللہ نے اپنے چچا کا مقابلہ کرنے کے لیے لشکر تیار کیا اور یہ طے کیا کہ ابو سعید مرزا کو سمرقند سے دور ہی روک دیا جائیگا۔

ایک دوسرا امیر جو مرحوم امیر اور عبید اللہ کی بات چیت سے واقف تھا، اس نے بادشاہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ بولا ”حضور والا! یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے ہوشیار اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، میں بہت ڈر رہا ہوں۔“

سلطان نے منہ ٹیڑھا کر کے پوچھا ”آخر تو کیوں خوفزدہ ہے؟ میں تیرا مطلب نہیں سمجھا۔“

امیر نے جواب دیا ”حضور والا! میں نے بزرگوں سے سُن

رکھا ہے کہ جس طرح عالمِ ظاہر پر سلاطین حکومت کرتے ہیں اسی طرح سلاطین اور عالمِ باطن پر درویشوں کی حکومت ہوتی ہے اور سلاطینِ عالم کا عزل نصب انہی کے سپرد کیا گیا ہے۔ میں نے یہ سن رکھا ہے کہ عبیداللہ احرار نے سمرقند چھوڑنے سے پہلے اپنی دیوار پر چند نام لکھ کر لعابِ دہن سے مٹا دیئے تھے۔ مجھ کو نہیں معلوم کہ دیوار پر کس کس کے نام لکھے گئے تھے اور کس کس کے نام مٹا دیئے گئے۔"

سلطان کا پارہ چڑھ گیا "آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

امیر نے جواب دیا "مجھ کو یہ بات تو معلوم ہو چکی ہے کہ آپ نے دیوار پر مرحوم کا نام لکھ کر مٹا دیا تھا اور سوئے اتفاق کہ ہم سب امیر کے حشر سے باخبر ہیں، بقیہ کے نام نہیں معلوم ہو سکے ورنہ ان کا حشر بھی لوگوں کے علم میں آجاتا۔"

سلطان نے امیر کو ڈانٹ دیا "بکواس بند کر۔ شاید تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس درویش نے دیوار پر میرا نام بھی لکھ کر مٹا دیا تھا اور اس طرح مجھ کو بھی مٹ جانا چاہیئے۔ لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ یہ میں جانتا ہوں۔ ایسا اس لیے نہیں ہوگا کہ میں نہیں چاہتا اور یہ میں کہہ رہا ہوں۔"

امیر نے دبی زبان میں عرض کیا "حضور کلمۂ غرور اپنی زبان سے نہ نکالیں، اللہ سے اپنے کبر و غرور کی معافی چاہیں، خدا آپ کی معافی قبول کرے گا اور آپ پریشانیوں سے بچ جائیں گے۔"

سلطان نے امیر کو دھکے دے کر نکلوا دیا۔ اس کے منہ سے جھاگ اڑنے لگی بولا "اگر وہ درویش اس وقت سمرقند میں ہوتا تو میں اس کو ایسی سزا دیتا کہ زندگی بھر یاد رکھتا۔"

امیر چلا گیا لیکن سلطان کے دل میں وہم ڈال گیا۔

انہی دنوں سلطان کو خبر ملی کہ ترکستان سے اس کا چچا ابوسعید بڑھا چلا آرہا ہے۔ سلطان مرزا عبداللہ غصے میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ وہ اپنے چچا کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا لیکن اب وہ شک و شبے میں پڑ گیا تھا۔ اس کو رہ رہ کر عبیداللہ کی یہ بات یاد آرہی تھی کہ اگر سلطان لاپروا ہے اور میری بات نہیں سنتا تو اس کو مٹا کر کسی دوسرے کا انتظام کیا جائے گا، جو پروا بھی کرے اور میری بات بھی سنے۔

مرزا ابوسعید سمرقند پر حملہ آور ہوا اور ایک خونریز مقابلے میں مرزا عبداللہ کو شکست دے کر قتل کر دیا۔

جب حکومت بدل گئی اور مرزا ابوسعید نے سمرقند کا اقتدار سنبھالا تو عبیداللہ سمرقند واپس آگئے۔ سلطان سے ملاقات کی اور اس کو مفید مشورے دیئے۔ سلطان آپ کی باتوں سے نہ صرف بہت متاثر ہوا بلکہ ان کے مشوروں پر عمل بھی کیا۔

آپ کے پاس کھیتی باڑی سے اتنا مال اکٹھا ہو گیا تھا کہ لوگ رشک کرنے لگے تھے۔ آپ اس مال سے دوسروں کی مدد کیا کرتے تھے۔ ایک عالم کہیں دور دراز سے آپ کی ملاقات کو حاضر ہوا۔ آپ کی امارت دیکھ کر اس نے سوچا کہ یہ کیسا درویش ہے جو مال و زر کا لالچی معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے اس کو قریب بلایا اور پوچھا "تو مجھ سے اتنی دور رک کیوں گیا؟ میرے قریب آ۔"

عالم کچھ آگے بڑھا اور عرض کیا "نہ آں مردے کہ دنیا دوست دارد۔"

آپ نے یہ مصرعہ سنا اور خاموشی اختیار کرلی۔

عالم نے درخواست کی "حضرت! چونکہ میں دور دراز علاقے سے ملاقات کو حاضر ہوا ہوں اور خیال یہ تھا کہ چند دن آپ کی صحبت میں گزاروں گا لیکن افسوس کہ میں نے یہاں جو کچھ دیکھا وہ درویشی اور فقر کے برعکس ہے۔ اس لیے میں ایک رات یہاں گزار کر واپس چلا جاؤں گا۔ شب بسری کی اجازت مرحمت فرمائیں۔"

آپ نے جواب دیا "یہ تیرا گھر ہے، جب تک جی چاہے رہ۔ کوئی تجھ سے کچھ نہ کہے گا۔"

عالم کو وہیں ایک کمرہ رہنے کو دے دیا گیا۔

رات کو عالم بڑی دیر تک جاگتا رہا۔ آپ اس کی خبر گیری کو پہنچے اور پوچھا "بھائی! کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

عالم نے جواب دیا "تکلیف کوئی نہیں، آپ کی نوازش کا بہت بہت شکریہ۔"

آپ نے فرمایا "میں تجھ کو پریشان کرنے نہیں آیا۔ صرف یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ تجھ کو کوئی تکلیف تو نہیں۔ سو اب مطمئن ہو گیا اور واپس جا رہا ہوں، تو سو جا۔"

آپ وہاں سے چلے گئے تو عالم نے ایک بار پھر سو جانے کی کوشش کی، نیند آگئی اور وہ سو گیا۔ اس نے خواب میں لوگوں کو ایک طرف بھاگتے ہوئے دیکھا اور یہ لوگ اس طرح بھاگ رہے تھے کہ اس بھاگ دوڑ میں جو گرا وہیں گرا رہ گیا۔ یہ لوگ ایک وسیع و عریض میدان میں جمع ہو گئے۔ اس ہجوم میں یہ عالم بھی شامل تھا۔ یہ اس ہجوم اور اس کی بھاگ دوڑ سے پریشان تھا۔ اس نے کسی سے پوچھا "بھائی! یہ سب لوگ یہاں میدان میں کیوں جمع ہو رہے ہیں؟"

جواب ملا "یہاں لوگ کیوں جمع ہو رہے ہیں؟ ارے او شخص! تو یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ کون سی جگہ ہے، یہ عرصۂ حشر ہے نادان، یہاں حساب کتاب کیا جائے گا۔"

"حساب کتاب، عرصۂ حشر!" عالم کا دماغ گھوم گیا۔ اتنے میں ایک گوشے سے ایک ایسا شخص نمودار ہوا جس نے اس عالم کو بطور قرض ایک بڑی رقم دے رکھی تھی اور عالم میں اس کی ادائی کی استطاعت نہیں تھی۔ وہ عالم کو دیکھتے ہی اس کی طرف لپکا اور ڈپٹ کر کہا "اے شخص! آج میں تجھ کو کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑوں گا۔ تو میرا

قرضہ چکا دے ورنہ میں تیرا دامن پکڑتا ہوں اور تجھ کو لے جاتا ہوں جہنم کی طرف۔"

عالم گڑگڑانے لگا۔ "بھائی یہاں میرے پاس رقم کہاں سے آئے گی؟ خدا کے لیے مجھ کو معاف کردے۔"

قرض خواہ نے سختی سے کہا "معافی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا میں تو وہی کروں گا جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ چل جہنم کی طرف یہ معاملہ خالص حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہے اس لیے ہمارے معاملے میں خدا بھی دخل نہیں دے گا۔"

عالم بے بس و مجبور ہو گیا۔ قرض خواہ نے اس کو کھینچنا شروع کر دیا۔ ابھی وہ عالم کو تھوڑی ہی دور لے گیا تھا کہ سامنے سے عبیداللہ احرار آتے دکھائی دیئے۔ عبیداللہ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ اے شخص تو اس عالم کو کہاں لیے جا رہا ہے؟"

قرض خواہ نے جواب دیا۔ "اس پر میرا قرض واجب الادا ہے اب میں خدا سے کہوں گا کہ تو اس کو جہنم میں جھونک دے کیونکہ میں اپنا قرض معاف نہیں کر سکتا۔"

عبیداللہ احرار نے کہا "جلدی نہ کر ابھی ذرا صبر سے کام لے میں اس عالم کا قرض ابھی چکاتا ہوں۔" اس کے بعد آپ نے عالم کے ذمہ واجب الادا رقم اسی وقت ادا کر دی اور قرض خواہ نے عالم کا دامن چھوڑ دیا۔

عالم کی آنکھ دہشت سے کھل گئی اور وہ رات بھر پریشان رہا۔ کیونکہ جس قرض خواہ کو اس نے خواب میں دیکھا تھا، عالم اس کا واقعی مقروض تھا۔

صبح رخصت ہونے کے ارادے سے عبیداللہ احرار کے پاس پہنچا اور کہا "حضرت! بہت بہت شکریہ، رات مزے کی نیند آئی۔"

آپ نے فرمایا۔ "وہ مصرعہ ایک بار پھر تو دہرانا!"

عالم نے شرمندگی سے مصرعہ دہرا دیا۔ "نہ آں مردے کہ دنیا دوست دارد۔"

خواجہ عبیداللہ نے فرمایا۔ "اس میں دوسرے مصرعے کا اضافہ کر لے۔ 'اگر دارد برائے دوست دارد' (یعنی خدمتِ خلق کے لیے دولت نفع بخش اور نعمت ہے)

عالم بے حد شرمندہ تھا۔ آپ نے اس کو اپنے پاس بٹھا لیا اور آہستہ سے پوچھا۔ "اس شخص کو کتنی رقم ادا کرنا ہے؟"

عالم نے شرمندگی سے جواب دیا۔ "دس ہزار درم۔"

آپ نے فرمایا۔ "یہ رقم مجھ سے لے اور اس کو ادا کر دے۔"

عالم ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ وہ بدگمانی سے اتنا شرمندہ تھا کہ آپ سے آنکھیں نہیں ملا سکتا تھا۔

آپ نے صوفیائے کرام کی طرح سیاحت بھی کی اور برصغیر بھی تشریف لائے۔ ان دنوں سندھ میں شیخ مبارک (والد ابوالفضل و فیضی کے باپ) یہاں نہایت عسرت اور افلاس کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ شیخ مبارک نے خواجہ عبیداللہ احرار سے ملاقات کی اور ان کے مریدوں میں داخل ہو گئے۔ شیخ نے اپنی عسرت کا ذکر کیا اور دعا چاہی۔ آپ نے دعا دی اور فرمایا۔ "مبارک ہمت پریشان ہو خدا تجھ کو دولتِ زر اور عزت و شہرت سے مالا مال کر دے گا جس سے تو دوسروں کا محسود ہو جائے گا۔"

آپ سمرقند پھر واپس تشریف لے گئے۔ اٹھاسی سال کے دسویں مہینے سے آپ کی علالت کا سلسلہ شروع ہوا۔ آپ کو بخار رہنے لگا تھا۔ اطبّا نے علاج شروع کیا۔

جس دن پہلی بار بخار چڑھا آپ نے اپنے بڑے بیٹے خواجہ محمد عبداللہ سے کہا "بیٹے اسّی میں نو جوڑو تو کیا بنے گا؟"

صاحبزادے نے جواب دیا "نواسی، یعنی ایک کم نوّے۔"

آپ نے فرمایا "یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نواسی دن بعد پورے نواسی سال کا ہو جاؤں گا۔"

بیٹے نے پوچھا۔ "بابا جان میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

آپ نے جواب دیا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے حُمّیٰ یومٍ کفّارۃُ سَنَۃٍ" (ایک دن کی تپ ایک سال کا کفارہ ہوتی ہے)، بیٹے! میں نواسی دن بخار میں مبتلا رہ کر نواسی سالہ زندگی کا کفارہ ادا کر دوں گا۔ شاید خدا نے میرے حق میں یہی فیصلہ کر رکھا ہے۔"

چنانچہ محرم کی پہلی تاریخ (۸۹۵ھ) سے بیماری کا آغاز ہوا اور یکم ربیع الاوّل ۸۹۵ھ کو آپ نے وصال فرمایا۔

کہتے ہیں کہ جس وقت آپ کا انتقال ہوا آس پاس بہت سی شمعیں روشن تھیں، دفعتاً آپ کے دونوں ابروؤں کے درمیان سے روشنی نمودار ہوئی اور آناً فاناً یہ روشنی تمام شمعوں کی روشنی پر غالب آ گئی اور آپ کا وصال ہو گیا۔ سمرقند میں آپ کا مزار آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔



اس مضمون کی تیاری میں مندرجۂ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

اذکارِ ابرار (محمد غوثی شطاری) • دربارِ اکبری (مولانا محمد حسین آزاد) • انوار الصفا (محمد خصلت حسین جابری) • صوفیائے نقشبند (سید امین الدین) • انوار الاصفیا (غلام علی اینڈ سنز) • سکینۃ الاولیاء (دارا شکوہ)







ضیاء تسنیم بلگرامی

اللہ کے ایک برگزیدہ بندے کے پاکیزہ واقعات

حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کے حلقۂ ارادت میں ایک ایسا شخص بھی موجود ہے جس کے مستقل گریہ و زاری کی وجہ سے کبھی آنسو خشک ہی نہیں ہوتے اور اسے درہم و دینار سے اتنی نفرت ہے کہ مال دار ہونے کے باوجود انھیں چھونے میں ایک گھن سی محسوس کرتا ہے۔ ایک دن حسن بصریؒ نے اپنے اس ارادت مند کو اپنے روبرو طلب کیا۔ یہ ایک نوجوان شخص تھا۔ آپؒ نے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا اور پوچھا "تمھارا نام کیا ہے؟"

جواب ملا "عبدالواحد۔"

پھر سوال ہوا "باپ کا نام؟"

انھوں نے جواب دیا "زید۔"

"خوب خوب!" حسن بصریؒ نے متبسم لہجے میں فرمایا "تو تم زید کے بیٹے ہو! واہ بھئی وا۔ کیا یہ درست ہے کہ تم مستقل گریہ و زاری کرتے رہتے ہو؟"

واحد نے نظر بھر کے اپنے پیر و مرشد کی طرف دیکھا۔ دونوں کی ایک دوسرے سے نظریں ملیں تو حسن بصریؒ نے واحد کی آنکھوں کے دونوں گوشے آنسوؤں سے تر محسوس کیے۔ آپؒ نے کہا "واحد! زیادہ رونے کے انجام سے واقف ہو؟"

واحد نے جواب دیا "خوب اچھی طرح، بس یہی نا کہ بینائی جاتی رہے گی یا اور کچھ بھی ہے؟"

حسن بصریؒ نے کہا "کیا یہ مصیبت کم ہے تمھارے نزدیک؟"

واحد نے عرض کیا "میری بینائی نے اب تک جو کچھ دیکھا ہے اس نے مجھے دنیا میں الجھا کر رکھ دیا ہے۔ اب میں اپنے مالک سے لو لگانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے میں اپنے دل کی بینائی برقرار رکھنا چاہتا ہوں اور بس۔"

حسن بصریؒ نے اپنے ارادت مندوں سے کہا "لوگو! واحد سے تصوّف کا درس لو، یہ بہت بڑا آدمی ہے!"

اسی دن شام سے ذرا پہلے حسن بصریؒ، واحد کے گھر تشریف لے گئے۔ انھوں نے دیکھا واحد اپنے دونوں ہاتھ دھونے میں مشغول ہیں اور انھیں کچھ پتہ نہیں کہ ان کے پیچھے کون کھڑا ہے۔ حسن بصریؒ کچھ دیر کھڑے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ واحد نے ہاتھوں کو اتنی بار اور اتنی زور زور سے رگڑ رگڑ کر دھویا کہ کھال اُدھڑ گئی۔ حسن بصریؒ نے دریافت کیا "واحد! کیا بات ہے؟ ان ہاتھوں پر یہ ظلم کیوں کر رہے ہو؟"

واحد نے گھوم کر اپنے پیر و مرشد کو دیکھا اور عرض کیا "حضرت! ابھی کچھ دیر پہلے ایک حاجت مند آ گیا تھا، اسے چند دیناروں کی ضرورت تھی۔ میں یہ دینار اسے دینا تو ضرور چاہتا تھا لیکن اپنے ہاتھ سے چھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت گھر میں غلام بھی موجود نہیں ہے ورنہ یہ دینار اسی سے دلوا دیتا آخر میں نے اپنے ہاتھوں سے یہ دینار دے دیے اور اب دیناروں کی نجاست دھو دھو کر اور ہاتھوں کو رگڑ رگڑ کر دور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

حسن بصریؒ نے رشک سے کہا "واحد! زر و مال سے نفرت اور بے نیازی تم پر ختم ہے۔"

آپؒ نے حضرت علیؓ سے بھی بالواسطہ فیض حاصل کیا تھا اور اپنی زندگی کے چالیس سال شدید عبادت و ریاضت میں صرف کر دیے تھے۔ آپؒ کی بے نیازی اور توکّل کا یہ عالم تھا کہ گھر میں جو کچھ بھی تھا درویشوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ذکرِ الٰہی میں زندگی گزار دی اور شادی تک کا خیال نہ آیا۔

آپؒ نے جب یہ دیکھا کہ دنیاوی کاموں کی وجہ سے آپ کی عبادت و ریاضت متاثر ہو رہی ہے تو لوگوں کے مشورے پر گھر کے کام کاج کیلئے

ایک غلام رکھ لیا۔ آپ نے غلام کو اس شرط پر رکھا تھا کہ وہ رات کو بھی حاضر رہا کرے گا۔

ایک بار آپ نصف رات کے بعد اٹھے اور غلام کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ آپ نے اٹھ کر غلام کو ادھر ادھر تلاش کیا لیکن اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ باہری دروازہ اندر سے بند تھا اور غلام کی کوٹھری خالی پڑی تھی۔ آپ کو حیرت تھی کہ غلام اگر باہر جاتا تو دروازہ کھلا ہوتا اور گھر میں کہیں موجود نہیں تھا۔ کافی تلاش اور جستجو کے بعد بھی جب غلام کا کچھ پتہ نہ چلا تو آپ صبر کر کے اپنے حجرے میں چلے گئے۔

صبح فجر کی اذان کے وقت غلام آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ آپ نے ناراضی سے دریافت کیا ”تم رات کہاں چلے گئے تھے؟“

غلام نے عرض کیا ”حضرت! افسوس کہ میں رات کی حاضری سے معذور رہوں گا!“

آپ نے پوچھا ”وہ کیوں؟“

غلام نے کہا ”حضور بندہ پردہ رہیں، بس یہ سمجھ لیجئے کہ میں کسی کام سے نکل جاتا ہوں۔ رات کی غیر حاضری کے عوض میں حضرت کی خدمت میں ایک دینار پیش کر دیا کروں گا جو حضرت مستحقین کی امداد و اعانت پر صرف فرما سکتے ہیں۔“

اس کے بعد فوراً ایک دینار آپ کو پیش کر دیا۔ اس دینار پر سورۂ اخلاص کا نقش کھدا ہوا تھا۔ آپ نے یہ دینار لے لیا اور سکوت اختیار کیا۔

غلام ہر رات غائب ہو جاتا اور صبح حاضر ہوتے ہی ایک دینار آپ کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔

کچھ عرصہ بعد، غلام کی غیر حاضری کے دوران، نصف رات کے بعد آس پاس پڑوس کے لوگوں نے آپ کے دروازے پر دستک دی۔ آپ نے اپنے حجرے میں سے بہت سی ملی جلی بے ہنگم آوازیں سنیں۔ کچھ لوگ آپس میں زور زور سے باتیں کر رہے تھے اور کچھ دروازہ پیٹنے میں مشغول تھے۔

آپ نے حجرے سے نکل کر دریافت کیا ”کون ہو تم لوگ؟ اور اتنی رات گئے کیا لینے آئے ہو؟“ کئی آوازیں ایک ساتھ نکلیں ”حضرت! دروازہ کھولیے ہمیں آپ سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

آپ نے دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر بہت سے پڑوسی جمع تھے ان میں سے ایک عمر رسیدہ شخص آپ کے قریب پہنچا اور سوال کیا ”اس وقت آپ کا غلام کیا کر رہا ہے؟“

آپ نے پوچھا ”میرے غلام سے تمہارا کیا کام آپڑا ہے؟“

اس شخص نے کہا ”پہلے آپ میری بات کا جواب دیجیے پھر میں آپ کی بات کا جواب دوں گا۔“

آپ نے جواب دیا ”میرا غلام عموماً رات کو موجود نہیں رہتا، کہیں چلا جاتا ہے۔“

ایک پڑوسی طنزاً بولا ”اور آپ اس سے کبھی پوچھتے بھی نہیں کہ تو کہاں جاتا ہے؟“

آپ نے جواب دیا ”میں اس سے یہ سوال کیوں کروں؟ کیونکہ خدا نے خود منع فرمایا ہے کہ لاتجسسو (جستجو مت کرو)۔ میں دوسروں کے ذاتی معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا۔“

بوڑھے پڑوسی نے گہرا طنز کیا ”کمال ہے جناب یعنی اس سے آپ ایک دینار روز تو وصول فرما لیتے ہیں لیکن وہ یہ دینار لاتا کہاں سے ہے؟ اس سے یہ نہیں پوچھتے۔“

آپ نے جواب دیا ”تم لوگ مجھے بلاوجہ مت پریشان کرو۔ ہاں اگر اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتے ہو تو میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔“

پڑوسیوں نے ایک بار پھر کھسر پھسر شروع کر دی۔

آپ نے مزید فرمایا ”کھسر پھسر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، باتیں صاف صاف کرو۔“

آخر ایک پڑوسی نے کہا ”حضرت! آپ اللہ والے آدمی ٹھہرے آپ کا غلام ہر رات غائب ہو کر قبرستان سے کفن چوری کر کے فروخت کر دیتا ہے اسی قیمت میں سے ایک دینار آپ کی نذر کر دیتا ہے۔ کیا آپ کے لیے یہ دینار جائز ہے؟“

آپ نے کہا ”دیکھئے ایک بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہر رات کو کون سا بازار کھلا ہوتا ہے جہاں میرا غلام تمہارے بقول چوری کا کفن بیچ آتا ہے؟“

کسی بدمزاج پڑوسی نے کہا ”میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ان سادہ لوح بزرگ سے ان کے غلام کی شکایت کرنا فضول ہے تم لوگوں نے دیکھ لیا اپنی شکایت کا انجام! میں تو یہ کہتا ہوں کہ اب تمہیں جو کچھ کرنا ہے خود ہی کر ڈالو۔ ان بزرگ سے اس کی شکایت کرنا فضول ہے۔“

کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں ”بھائی! تمہارا مشورہ سر آنکھوں پر، اس سلسلے میں واقعی جو کچھ کرنا ہے ہم خود ہی کر ڈالیں گے۔“

آپ نے کہا ”ابھی تم لوگ خاموش ہو جاؤ، میں پہلے خود اس کے جرم کی سراغ رسی کروں۔ اگر میں اس میں ناکام رہا تو میں آپ سب کو اجازت دے دوں گا کہ میرے غلام کے خلاف جو رویہ مناسب سمجھیں روا رکھیں۔“

ایک سیدھے سادے پڑوسی نے آپ کے خیال کی تائید کی، بولا ”لوگو! حضرت واحد میاں درست فرماتے ہیں۔ ہمیں ذرا دیر صبر سے کام لینا چاہیے اور صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔“

تھوڑی دیر تک تو یہ سب آپس میں بحث و مباحثہ کرتے رہے، آخر میں سبھی نے اس رائے سے اتفاق کیا اور واپس جاتے جاتے آپؒ سے کہتے گئے ''حضرت! ہم کچھ نہیں کہیں گے سرِ دست، لیکن ہم یہ ضرور جاننا چاہیں گے کہ آپؒ نے اس سلسلے میں کیا کچھ کیا؟''

آپؒ نے جواب دیا ''ہاں، تمھیں اس بات کی آزادی ہوگی کہ میرے غلام کے بارے میں جب چاہو مجھ سے سوال جواب کرنے آجاؤ۔''

لوگ ہنستے مسکراتے اپنے اپنے گھروں میں واپس چلے گئے۔

اس رات آپؒ افسوس اور صدمے کی وجہ سے سو نہیں سکے، آپؒ کو اپنے غلام پر غصہ بھی آرہا تھا اور افسوس بھی ہو رہا تھا کہ دیکھو تو اس نالائق نے آپؒ کی مروّت اور شرارت سے کیا فائدہ اٹھایا؟

اسی رات، صبح، علی الصبح وہ اپنے غلام کا انتظار فرما رہے تھے کہ وہ آگیا اور ایک دینار آپؒ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

آپؒ نے اسے حقارت سے دیکھ کر جواب دیا ''اٹھالے اپنا دینار اور جو کچھ میں دریافت کروں، اس کا صحیح صحیح جواب دے ورنہ میں تجھے اس گھر سے نکال دوں گا۔''

اس نے عرض کیا ''حضرت! آپؒ اس پر اصرار نہ کریں، میں آپؒ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ میری رات کی غیر حاضری کا وہ سبب ہرگز نہیں ہے جو آپؒ غلطی سے سمجھ بیٹھے ہیں۔''

آپؒ نے پوچھا ''اچھا تو بس یہ بتادے کہ تو رات کو چپلا کہاں جاتا ہے؟''

غلام نے جواب دیا ''میں کہہ چکا ہوں کہ آپؒ مجھ سے یہ سوال نہ کیجیے اور ایک بار پھر یہی عرض کروں گا کہ مجھے اپنے سوال کے جواب میں لب کشائی پر مجبور نہ کیجیے۔''

آپؒ نے خاموشی اختیار کی اور فیصلہ کرلیا کہ وہ رات میں غلام کا تعاقب کرکے موقعۂ واردات پر جا پکڑیں گے اور وہاں اس بُری طرح لتاڑیں گے کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔

اس رات عشاء کی نماز پڑھ کر واحدؒ غلام کی کوٹھری ہی میں چھپ رہے۔ غلام نے کسی پریشانی یا تجسّس کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے کوٹھری کے بند دروازے کی طرف دُور ہی سے اشارہ کیا، دروازہ فوراً کھل گیا، غلام کوٹھری سے باہر نکل گیا اور دروازے کی طرف بند ہونے کا اشارہ کیا۔ دروازہ خود بخود بند ہوگیا۔ آپؒ نہایت حیران ہوگئے، چپ چاپ کوٹھری سے باہر نکلے اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ وہ آبادی اور قبرستان سے گزر کر ایک چٹیل میدان میں داخل ہوگیا۔ آپؒ کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور اس بات سے خفیف اور شرمندہ ہو رہا تھا کہ کہیں پڑوسیوں کی بات سچ نہ نکل جائے! اس چٹیل میدان میں پہنچ کر غلام نے اپنے سارے کپڑے اتار دیے اور ٹاٹ کا ایک بڑا ٹکڑا احرام کی طرح جسم پر لپیٹ لیا اور نماز پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔ واحد کا خیال تھا کہ یہ سلسلہ شاید زیادہ دیر نہ قائم رہے اور چند رکعت پڑھ کر یہیں اور چلا جائے لیکن غلام تو کچھ اس طرح خشوع و خضوع سے نماز پڑھنے میں مشغول تھا کہ اسے کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا! اسی طرح صبح ہوگئی۔ ابھی فجر کی اذان میں ذرا سا وقت باقی تھا، آخر غلام نے مناجات شروع کردی۔ وہ خدا کے حضور گڑگڑا رہا تھا ''خداوند! مجھ پر رحم فرما۔ اے میرے بڑے آقا میرے چھوٹے آقا کی مزدوری مرحمت فرما!''

ابھی اس کی دُعا ختم ہی ہوئی تھی کہ ایک سکّہ اس کے قدموں میں آگرا۔ غلام نے یہ سکّہ اٹھاکر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ واحدؒ یہ سب کچھ دیکھ کر ضرورت سے زیادہ پریشان ہوگئے۔ آپؒ نے اس دہشت پر قابو پانے کے لیے دو رکعت نماز کی نیت باندھ لی اور نماز پڑھ چکنے کے بعد خدا سے توبہ و استغفار کرنے لگے کہ وہ سہواور وہ سوءِ ظنی جو انھیں اب تک غلام کی جانب سے اپنے دل میں جاگزیں محسوس ہوتی رہی تھی، اس کی معافی چاہنے لگے۔ انھوں نے گڑگڑا کر خدا سے عرض کیا ''اے اللہ! میں دنیا والوں کے کہنے سُننے میں آگیا اور اپنے متقی اور پرہیزگار غلام کے لیے بُرے بُرے خیالات کو دل میں جگہ دی، اب اس کی اصل حقیقت اور پاکی مجھ پر ظاہر ہوچکی ہے اس لیے میں نادم اور شرمسار ہوں، مجھے معاف کردے!''

وہ کچھ دیر اسی طرح گڑگڑاتے اور آنسو بہاتے رہے اور جب دل کو ذرا سکون ملا تو آپؒ اس نیت سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے کہ اپنے غلام سے بھی معافی مانگ لیں اور اسے آزاد کردینے کی خوشخبری سنائیں لیکن وہاں غلام کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ اِدھر اُدھر تلاش کرتے ہوئے دُور تک چلے گئے لیکن غلام کا کہیں پتہ نہ چلا۔

مشرق سے سورج طلوع ہو رہا تھا اور اس کی روشنی میں گرد و پیش کی ہر شے بہت صاف اور واضح دکھائی دے رہی تھی۔ غلام کا دُور دُور تک پتہ نہ تھا۔ آپؒ کو یقین ہوگیا کہ غلام گھر واپس جاچکا ہے۔ تھک ہار کر خود بھی جس راہ سے آئے تھے اسی سے واپس ہوئے لیکن انھیں یہ عجیب بات چند قدم چلنے کے بعد ہی محسوس ہوگئی کہ وہ جس راستے پر چل رہے ہیں، اجنبی اور غیر مانوس ہے۔ وہ بصرے میں ایک عرصے سے رہ رہے تھے یعنی پیدا یہیں ہوئے تھے اور ہوش کی آنکھیں بھی یہیں کھولی تھیں لیکن اس وقت وہ جس جگہ موجود تھے یہاں پہلے کبھی بھی نہ آئے تھے اور اختیار کیا ہوا راستہ اتنا غیر مانوس اور اَن دیکھا تھا کہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرف چلیں جو اپنے گھر پہنچ جائیں، آپؒ پھر اسی جگہ واپس چلے گئے جہاں سے چلے تھے۔ ان کی پشت پر ایک گھنا جنگل تھا۔ وہ ایک درخت کے تنے سے پشت لگا کر بیٹھ گئے کہ کوئی مسافر سامنے سے گزرے تو اس سے راستہ پوچھ کر یہاں سے چل پڑیں۔

کافی دیر بعد ایک سیاہ رنگ کے گھوڑے پر سفید بُراق جیسے کپڑے پہنے ایک سوار گزرا۔ اس نے واحدؒ کو دیکھتے ہی حیرت سے پوچھا۔ ”عبدالواحد! تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟“

آپؒ نے پوچھا ”کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟“

”ہاں، میں تمھیں خوب اچھی طرح پہچانتا ہوں اور تمھیں یہاں دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔“

آپؒ نے پورا واقعہ سنا کے عرض کیا ”بھائی! میں اس طرح یہاں آکر پھنس گیا ہوں۔ بصرے واپس جانا چاہتا ہوں لیکن راستہ نہیں مل رہا، سمجھ میں نہیں آتا کہ گھر تک کس طرح پہنچوں؟ اگر تم میری رہنمائی کر سکو تو کردو۔ بہت شکر گزار رہوں گا۔“

سوار بے اختیار ہنس دیا، بولا ”عبدالواحد! اگر میں تمھاری رہنمائی کر بھی دوں اور تمھیں ایک تیز رفتار گھوڑا بھی میسر آجائے تو تمھیں بصرے تک پہنچنے میں تقریباً دو برس لگ جائیں گے۔“

واحد بہت زیادہ گھبرا گئے، بولے ”تب پھر میں گھر تک کس طرح پہنچوں گا؟“

سوار نے جواب دیا ”اس کی بس ایک ہی آسان راہ ہے!“

آپؒ نے بے چینی سے پوچھا ”وہ کیا، خدارا جلدی بتلاؤ۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

سوار نے جواب دیا ”تمھارا غلام رات کو پھر آئے گا، تم اس کا انتظار کرو اور اسی کے ساتھ واپس چلے جانا۔“

سوار تو یہ کہہ کر چلا گیا اور آپؒ اپنے غلام کی واپسی کی امید میں رات کا انتظار کرنے لگے۔

کہاں کا آرام، کہاں کا کھانا، کیسا پانی، سنسان ویرانے میں شام اور پھر رات کا انتظار اور اپنی بے بسی کا احساس، ان کا عجیب سا حال ہو رہا تھا۔ جب سورج نے مغرب میں جھکنا شروع کیا تو رات کی آمد نے انھیں بہت زیادہ بے چین کر دیا۔ شام گزری، رات آئی اور پھر عشاء کے بعد انھیں سامنے کے میدان سے ایک سایہ سا آتا دکھائی دیا۔ آپؒ نے محسوس کیا وہ اپنے سر پر کچھ اٹھائے ہوئے ہے۔ آپؒ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ بے ساختہ اس کی طرف بڑھے اور غلام کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ غلام کے سر پر ایک خوان رکھا تھا، اس نے خوان اتار کر آپؒ کے سامنے رکھ دیا اور افسوس کرتا ہوا بولا ”میرے آقا! مجھے بہت افسوس ہے کہ آپؒ کو بڑی پریشانی اٹھانی پڑی۔ آپؒ کو میرا پیچھا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

آپؒ نے کہا ”میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں، اس خوان میں کیا ہے؟“

اس نے جواب دیا ”کھانا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپؒ سارا دن بھوکے رہے ہیں۔“

آپؒ نے کھانا کھا کر ایک بار پھر شرمندگی اور خجالت کا اظہار کیا۔ ”میں اپنی سوءظنی اور تیرے تعاقب پر بہت نادم ہوں۔“

غلام نے کہا ”آقا! میں عبادت کروں گا، آپ بھی نماز پڑھ لیں، جب یہاں سے چلوں گا تو اپنے ساتھ آپ کو بھی لے چلوں گا۔“

واحدؒ نماز پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ صبح سے ذرا پہلے غلام نے آپؒ سے کہا ”آقا! چلنے کے لیے تیار ہو جائیے، میں واپس جا رہا ہوں۔“

یہ فوراً تیار ہو گئے۔ غلام نے آپؒ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ زیرِ لب کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ جدھر سے آیا تھا، اسی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی یہ دونوں کچھ ہی دور گئے ہوں کہ واحد کو ایک بستی کے آثار نظر آنے لگے۔ انھوں نے بستی میں داخل ہو کر غور سے جو دیکھا تو یہ بصرے کا وہی محلہ تھا جس میں ان کا مکان تھا۔ ان کے مکان کا دروازہ ان کے سامنے تھا۔ واحدؒ کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

غلام نے آپؒ سے عرض کیا ”میرے آقا! کیا آپ نے میری آزادی کی نیت نہیں کر رکھی ہے؟“

آپؒ نے جواب دیا ”تو درست کہتا ہے۔ بے شک میں تجھے آزاد کر رہا ہوں۔“

غلام نے کہا ”اس طرح نہیں بلکہ میں اپنی آزادی کی قیمت ادا کرنا چاہتا ہوں۔“

اس کے بعد اس نے جھک کر زمین سے ایک پتھر اٹھایا اور واحدؒ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”میری طرف سے یہ حقیر سا معاوضہ قبول فرمائیں۔“

آپؒ نے اس پتھر کو روشنی میں لیجا کر دیکھا تو وہ سونے کا نکلا۔ آپؒ فوراً واپس آئے اور غلام کو تلاش کیا لیکن وہ جا چکا تھا۔ اس کے چلے جانے کا آپؒ کو بے حد ملال ہوا اور ایک عرصے تک حسرت سے اس کا ذکر کرتے رہے۔

کچھ دنوں بعد آپؒ کے پڑوسیوں نے آپؒ سے دریافت کیا ”حضرت! آپ کا وہ کفن کھسوٹ غلام نظر نہیں آتا، کیا آپ نے اسے نکال دیا؟“

پڑوسیوں کے اس لب و لہجے سے آپؒ کو تکلیف پہنچی۔ غلام کی پوری تفصیل سنا کر آپؒ نے افسوس سے کہا ”اسے جس طرح تم لوگ نہیں پہچان سکے تھے، میں بھی لاعلم رہا اور جب اس کی اصل شخصیت کا انکشاف ہوا تو وہ میرے پاس سے رخصت ہو چکا تھا۔“

آپؒ کا زہد و تقویٰ اور کشف و کرامات کا شہرہ حجاز تک پہنچ گیا۔ چند قریش آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سب کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ آپؒ نے ان اہلِ قریش سے پوچھا ”تم لوگ میرے پاس کسی خاص مقصد سے آئے ہو یا یوں ہی ملاقات کرنے؟“

ان لوگوں نے جواب دیا "حضرت! آپ سے کیا پردہ، اصل واقعہ یہ ہے کہ ہماری معیشت تباہ ہو چکی ہے اور اس لائق نہیں رہ گئے ہیں کہ کوئی کام کر کے بال بچّوں کے لیے روزی مہیّا کر سکیں۔ آپؒ کے پاس اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپؒ کا شہرہ سُنا ہے اور اب دیکھتے ہیں کہ آپؒ ہماری کیا مدد کرتے ہیں!"

آپؒ اپنی جگہ سے اٹھے اور حُجرے میں جا کر سر بسجود ہو گئے، روتے ہوئے فرمایا "یا اللہ! اہلِ قریش کے چند لوگ میری اُس حیثیت کا اندازہ لگا کر میرے پاس آئے ہیں جو مجھے تیرے ذکر و فکر سے حاصل ہوئی ہے۔ وہ مجھ سے اپنی معیشت کی بہتری کی دُعا اور اس کے اثر کے طالب ہیں۔ اِس وقت تو ہی میری عزّت آبرو بچا سکتا ہے۔ اپنے اس عاجز کو شرمندگی سے بچا لے۔"

آپؒ ابھی دُعا میں مشغول ہی تھے کہ مہمان قریش آپؒ کے پاس حُجرے میں پہنچ گئے۔ انھوں نے آپؒ کے سامنے بہت سارے دینار رکھ دیے اور عرض کیا "حضرت! خدا نے آپؒ کو جب اتنی ساری دولت دے رکھی ہے تو آپؒ کا ہماری استدعا سُن کر، جواب دیے بغیر اپنے حُجرے میں چلا آنا کچھ عجیب سی بات ہے۔"

آپؒ نے ان دیناروں کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا "یہ تمھیں کہاں سے ملے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا "آپؒ کی چھت سے۔ ہم حیران ہیں کہ آپؒ نے انھیں اپنی چھت کے کس حصّے میں چھپا رکھا تھا؟ یہ اچانک ہم پر اس طرح برسنے لگے گویا کوئی تھیلی پھٹ گئی ہو اور یہ اس میں سے بکھر پڑے ہوں۔"

آپؒ نے جواب دیا "لوگو! میں نے ان دیناروں کو نہ تو کہیں چھت میں چھپایا تھا اور نہ اس گھر میں کہیں اور دینار موجود ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس طرح خدا نے مجھے شرمندگی اور ندامت سے بچا لیا ہے اور کچھ نہیں۔"

قریش کے لوگوں کو آپؒ کی باتوں پر کچھ یقین آیا کچھ نہیں آیا۔ لیکن انھیں تو کافی دینار مل چکے تھے اس لیے شکریہ ادا کر کے اپنی راہ لی۔

آپؒ کہیں تشریف لیے جا رہے تھے کہ ایک بے آب و گیاہ ویرانے میں ایک ضعیف بیمار کو دھوپ میں پڑے دیکھا۔ اُس پاس درختوں کا نشان تک نہ تھا۔ آپؒ اس کے بڑھاپے اور بیماری سے پریشان ہوئے، اس کے سرہانے جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ بوڑھا دھوپ کی تمازت سے بے حال ہو رہا تھا۔ آپؒ نے اسے مخاطب کیا "بڑے میاں! آپ اس ویرانے میں کس طرح آ گئے ہیں؟"

بوڑھے نے آنکھیں کھول دیں، نہایت کمزور آواز میں بولا۔ "وہ کون؟ عبدالواحدؒ زید کے بیٹے؟"

آپؒ نے جواب دیا "ہاں! میں ہوں خواجہ عبدالواحدؒ زید کا بیٹا۔"

بوڑھے نے کہا "خواجہ! میں ایک عرصے سے بیمار چلا آ رہا ہوں، اس پر بڑھاپے نے اور زیادہ ناکارہ کر دیا ہے۔ گھر والوں نے مجھے بیکار اور غیر مفید سمجھ کر اس ویرانے میں مرنے کے لیے ڈال دیا ہے۔"

آپؒ نے افسوس سے کہا "لیکن یہاں تو دُھوپ اور پانی کا بھی گزر نہیں۔ جیو گے کس طرح؟"

بوڑھے نے جواب دیا "انھوں نے مجھے یہاں مرنے ہی کے لیے تو ڈالا ہے۔"

آپؒ نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ دُور مشرق میں بادلوں کے ٹکڑے منتشر بھاگ رہے تھے۔ آپؒ نے دُعا کی "خدایا! میں تجھ سے یہ نہیں کہتا کہ تو اِس بے آب و گیاہ ویرانے کو فوراً سبزہ زار میں بدل دے بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تو بادلوں کے ٹکڑوں کو حکم دے کہ وہ یہاں اس ضعیف اور بیمار کے اوپر آ کے سایہ کر دیں۔ یہ پانی کو ترس رہا ہے، بادلوں کو حکم دے کہ اسے سیراب کر جائیں۔ میں اپنے لیے کچھ نہیں چاہتا، اس بے یار و مددگار کی تیرے سوا اور کون مدد کر سکتا ہے۔"

مشرق کے بادلوں نے اسی وقت اس بوڑھے کی طرف حرکت شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے دُھوپ کی تمازت سے جہنم زار ویرانہ بادلوں کے زیرِ سایہ آ گیا اور بوندا باندی کے ساتھ ہی خنک ہواؤں نے جھلسا دینے والے ماحول کو پُر لطف اور کیف آور بنا دیا۔

بوڑھے نے دُعا کی زود اثری کو جو دیکھا تو عرض کیا "حضرت! میں آپؒ سے اور کچھ نہیں چاہتا، آپؒ میرے حق میں خدا سے یہ دُعا کریں کہ وہ مجھے صحت یاب کر دے تاکہ میں اس ضعیفی میں بھی کسی کا دستنگر یا بار نہ بنوں۔"

آپؒ نے دُعا کی "اے اللہ العالمین! تو سمیع و بصیر ہے تو دیکھ بھی رہا ہے اور سُن بھی رہا ہے کہ یہ پریشان حال بیمار بوڑھا مجھ سے کیا کہہ رہا ہے؟ تیری عنایات اور مہربانیوں نے تیرے بندوں میں مجھے معزز اور فیض رساں مشہور کر دیا ہے لیکن میں جو کچھ بھی ہوں تیری نوازش اور مہربانی سے ہوں۔ اگر تو چاہے گا تو میں اپنی عزّت قائم اور برقرار رکھ سکوں گا ورنہ میں اس بیمار بوڑھے سے بھی کمتر سمجھا جانے لگوں گا۔"

بوڑھا آپؒ کے دعائیہ کلمات سُنتا رہا اور آپؒ بدستور گڑگڑاتے رہے۔ یکایک بوڑھے نے اندر سے بشاشت اور توانائی سی محسوس کی اور ذرا سی دیر میں وہ اس لائق ہو گیا کہ آپؒ کا شریکِ سفر ہو سکے۔ بڑھاپے کا اثر تو اب بھی باقی تھا لیکن بیماری رخصت ہو چکی تھی۔ اس نے آپؒ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور روتا ہوا بولا "خواجہ! اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپؒ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔"

بوڑھا کچھ دُور تک تو آپؒ کے ساتھ چلا، اس کے بعد اپنے گھر جانے لگا، آپؒ نے فرمایا "بڑے میاں! دنیا کو تم نے اپنی آنکھوں اور تجربوں

سے سمجھ لیا، اب تم دنیا والے سے لَو لگا لو اور دنیا داری کے ساتھ ساتھ دنیا والے کو کسی حال میں نہ بھولنا۔"

بوڑھے نے آنسوؤں کی نمی سے اللہ کو یاد رکھنے کا عہد کیا اور اپنے گھر چلا گیا۔

چند درویش آپؒ کے پاس آئے، پہلے تو وہ سب اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، فقر و استغناء کشف و کرامات، عبد و معبود اور ذاکر و مذکور پہ باتیں کرتے رہے اس کے بعد اچانک درخواست کی "حضرت! پیٹ بڑی ظالم شے ہے۔ بھوک نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔"

آپؒ نے کہا "ارے تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ کھانا ابھی حاضر کرتا ہوں۔"

درویشوں نے کہا "کھانے کی تو کوئی بات نہیں لیکن ہم لوگ اس وقت حلوہ کھانا چاہتے ہیں۔"

"آپ لوگ حلوہ کھانا چاہتے ہیں!" آپؒ نے کسی قدر تردّد سے کہا "خوب! اچھا بھائی آپ سب کو حلوہ ہی کھلاؤں گا۔ بس ذرا صبر کرنا ہوگا۔"

کسی درویش نے پوچھا "کتنی دیر صبر کرنا ہوگا؟"

"بس ذرا دیر!"

اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ آپؒ اٹھ کر دروازے پر پہنچے اور دریافت کیا "کون ہو بھائی؟"

باہر سے کسی نے جواب دیا "کیا اندر خواجہ عبدالواحدؒ تشریف رکھتے ہیں؟ ذرا دروازہ تو کھولیے۔"

آپؒ نے دروازہ کھول دیا، بولے "میں ہی خواجہ عبدالواحد ہوں، کہو کیا کام ہے مجھ سے؟"

وہ شخص ایک بہت بڑا قاب سر پر رکھے ہوئے تھا، اس نے جواب دیا "حضرت! اس قاب کو اُتروا لیجیے۔ حاکمِ شہر نے حلوے کی یہ قاب آپؒ کی خدمت میں روانہ کی ہے تاکہ آپؒ اور آپؒ کے ارادت مند حاکمِ شہر کے حق میں دُعائے خیر فرمائیں۔"

آپؒ نے حلوے کی قاب درویشوں کے سامنے لیجا کر رکھ دی اور خود حجرے میں جا کر بارگاہ ایزدی میں سربسجود ہو کر رونے لگے، بولے "اے اللہ! تو میرا کتنا خیال رکھتا ہے۔ میں کس زبان سے تیرا شکریہ ادا کروں۔"

اس حلوے کو تمام درویشوں نے شکم سیر ہو کر کھایا لیکن آپؒ نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

دریائے دجلہ کے کنارے مسافروں کا ہجوم تھا۔ لوگ دوسرے کنارے تک پہنچنے کے لیے بہت بے چین تھے۔ کشتی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ان میں ہی ایک بے نیاز درویش بھی شامل تھے۔ کچھ دیر بعد مسافروں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ دریا کے دوسرے کنارے سے آتی ہوئی کشتی کو خوشی سے دیکھ رہے تھے۔ لوگ اپنی اپنی جگہ پر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں کوئی نظم و ضبط نہ تھا بلکہ ہر کوئی عین اس جگہ کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا تھا جہاں کشتی ٹھہرنے والی تھی۔ درویش ان سب کے پیچھے بے نیاز کھڑے تھے۔

کشتی جیسے ہی ساحل پر رُکی، دوسرے کنارے سے آنیوالے مسافروں نے اُترنے کی کوشش کی لیکن جانے والوں نے انھیں دھکا دے کر چڑھنے کی جد و جہد شروع کر دی۔ اس دھکّا پیل میں چند مسافر پانی میں گر گئے۔ ملّاح نے ڈانٹ کر کہا "پہلے آنے والوں کو اُتر تو جانے دو، اس کے بعد باری باری چڑھنے کی کوشش کرنا۔"

لیکن لوگوں پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر آنے اور جانے والوں میں معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ اس مار پیٹ میں کچھ زخمی ہوئے، کچھ پانی میں گر گئے اور کچھ کے لباس تار تار ہو گئے۔ بمشکل اُترنے والے اُتر گئے اور چڑھنے والے چڑھ گئے۔ درویش ان کا تماشا ہی دیکھتے رہ گئے۔ جب ذرا سکون



شمس الدین التمش کو بچپن ہی میں بیچ دیا گیا تھا، اس کے مالک نے ایک دن اس سے انگور منگوائے، لیکن ابھی یہ بازار تک پہنچا بھی نہ تھا کہ اس کے پیسے کہیں گر گئے۔ التمش سزا کے خوف سے سرِ راہ کھڑے ہو کر رونے لگا۔ اس وقت پاس سے ایک درویش گزرا۔ اس نے پوچھا "بچے! تو رو کیوں رہا ہے؟"

التمش نے جواب دیا "میں اپنے مالک کے لیے انگور خریدنے جا رہا تھا کہ راستے میں پیسے کہیں گر گئے۔ اب میں اپنے مالک کو کیا جواب دوں گا؟"

درویش نے التمش کو انگور اپنے پاس سے خرید دیئے اور کہا "بیٹے جب تم صاحبِ دولت ہو جاؤ تو درویشوں کا احترام کرنا اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنا۔"

ایک عرصے بعد التمش ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا، وہ اکثر درباریوں اور اپنے اُمرا سے کہا کرتا "میری دولت اور سلطنت اسی درویش کا عطیہ ہے اس لیے میں اپنے کئے ہوئے وعدے کی پابندی اور ایفا پر مجبور ہوں۔"

اور آج تاریخ میں التمش کو درویش سلطان اور اپنے وقت کا قطب مانا جاتا ہے۔

ہوا تو درویش بھی کشتی کی طرف بڑھے۔ ملّاح نے ان کی صورت اور کیفیت سے ان کی بے بضاعتی اور تہی دستی کا اندازہ لگا لیا، پوچھا "درویشو! کشتی میں قدم رکھنے سے پہلے یہ تو بتاؤ کہ تمھارے پاس کشتی کا کرایہ بھی ہے یا یوں ہی بغیر کرایہ ادا کیے پار اُترنا چاہتے ہو؟"

کسی درویش نے جواب دیا "ہمارے پاس کرایہ نہیں ہے اور ہم چند درویش ہی تو ہیں، کسی کونے میں کھڑے ہو جائیں گے۔"

ملّاح نے سختی سے کہا "خبردار جو میری کشتی میں قدم رکھا۔ اگر کرایہ ہے تو آجاؤ ورنہ یہیں ساحل پر کھڑے کھڑے دریا کی لہریں گنو اور کشتی کے بہاؤ کا پُر لطف منظر دیکھتے رہو۔"

ملّاح کی بات نے درویشوں کو بہت دُکھ پہنچایا۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور ساحل پر ہی بیٹھ گئے۔ وہیں معلوم نہیں کدھر سے عبدالواحدؒ آگئے۔ درویشوں سے پوچھا "کیا بات ہے درویشو؟"

ایک درویش نے اپنی بپتا سُنا کے عرض کیا "بابا عبدالواحد! ہمارے پاس کرائے کی رقم نہیں ہے اور دریا کے پار اُترنا ہے، ملّاح نے بٹھانے سے انکار کر دیا، اب سمجھ میں نہیں آتا، دجلہ کو کس طرح عبور کریں۔"

آپؒ نے دیکھا، کشتی بتدریج ساحل سے دُور ہوتی جا رہی تھی اور کشتی کے مسافر درویشوں کو طنز و تمسخر کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ آپؒ نے درویشوں سے کہا "چلو میں تمھیں دجلہ کے پار لیے چلتا ہوں۔"

درویشوں نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

آپؒ نے جواب دیا "یہاں سے دجلہ کا دوسرا کنارہ دُور ہی کتنا ہے۔ ابھی پار اُترتے ہیں۔"

درویشوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آپؒ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپؒ پانی میں اُتر گئے اور درویشوں سے کہا "تم سب میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ، اللہ نے چاہا تو اس کشتی سے پہلے ہی دوسرے کنارے پر پہنچ جاتے ہیں۔"

درویش دجلہ کی گہرائی سے ڈرے، بولے "بابا عبدالواحد! کیا تمھیں دجلہ کی گہرائی کا علم نہیں ہے؟"

"خوب ہے لیکن میں تمھیں اس کے پایاب راستے سے لیجاؤں گا تم لوگ وقت نہ ضائع کرو، میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

اتنا کہہ کر آپؒ دجلہ میں دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے لگے۔ آپؒ کی دیکھا دیکھی ایک درویش بھی پانی میں اُتر گیا۔ پھر دوسرا اُترا، پھر تیسرا، اس طرح سبھی آپؒ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ انھیں حیرت تھی کہ دجلہ میں کسی جگہ بھی ٹخنوں سے زیادہ پانی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد جب یہ لوگ دوسرے کنارے پر پہنچ گئے تو دیکھا کشتی ابھی تک دریا کی سطح پر ڈول رہی ہے۔ اس کی رفتار میں حیرت انگیز حد تک کمی آگئی تھی۔

جب ملّاح نے درویشوں کو دوسرے کنارے پر پہلے ہی کھڑے دیکھا تو مسافروں کے ساتھ خود بھی شرم و ندامت سے گر گیا۔

درویشوں نے عبدالواحدؒ سے پوچھا "اب آپؒ کہاں تشریف لے جائیں گے؟"

آپؒ نے جواب دیا "میں دجلہ کے اسی کنارے پر واپس جاؤں گا جہاں سے لے کر تمھیں آیا تھا۔"

درویشوں نے عاجزی سے عرض کیا "حضرت! آپؒ نے ہم پر جو کرم کیا ہے اس کے پیشِ نظر ہم آپؒ سے ایک اور درخواست کریں گے۔"

آپؒ نے کہا "کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

درویشوں نے کہا "بابا عبدالواحد! جیسا کہ آپؒ ہماری حالت سے اندازہ لگا چکے ہوں گے کہ ہماری معاشی حالت بہت خراب ہے اور بظاہر سُدھرنے کے آثار بھی نہیں ہیں، آپؒ دُعا کریں کہ ہماری معاشی حالت بہتر ہو جائے۔"

آپؒ نے کہا "تم سب کی معاشی حالت بہتر تو ہو جائے گی لیکن اس کے لیے تم وعدہ کرو کہ خوش حالی میں خدا اور شرعی احکام کو فراموش نہیں کرو گے۔"

درویشوں نے اس کا عہد کیا اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

جب یہ لوگ اپنے اپنے فاقہ زدہ گھروں میں داخل ہوئے تو گھر کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ ان کے گھروں میں خوش حالی کا دَور دورہ تھا۔ خوش ذائقہ، لذیذ کھانے پک رہے تھے۔ گھر کی عورتوں اور بچّوں کے چہروں پر خوشی کی لہریں دوڑی ہوئی تھیں۔ درویشوں نے حیرت سے پوچھا "گھروں میں یہ خوش حالی کہاں سے آگئی ہے؟"

عورتوں نے جواب دیا "ہم اور تو کچھ جانتی نہیں، بس اتنا جانتی ہیں کہ دو دن گزرے ایک شخص دیناروں کی تھیلیاں لے کر آیا تھا، اس نے یہ تھیلیاں دیتے ہوئے کہا تھا کہ جب تمھارے شوہر واپس آئیں اور پوچھیں کہ یہ رقم کہاں سے آئی تو ان سے کہہ دینا کہ عبدالواحدؒ بن زید کے دوستوں میں سے ایک فقیر یہ مال و زر دے گیا ہے۔"

درویشوں کو عورتوں کے جواب سے بڑی حیرت ہوئی اور انھوں نے اپنی بیویوں کو پورا واقعہ سُنا کے بتایا کہ عبدالواحدؒ نے ان پر اور کیا احسان کیا ہے اور اس مال و زر کے لیے انھوں نے کس طرح پہلے ہی بشارت دے دی تھی۔

پوری روداد سُن کر عورتوں نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "درویشو! تم پر افسوس ہے کہ تمھیں ایک ایسا مردِ کامل ملا اور تم نے اس سے دُنیا مانگ لی، حالانکہ مانگنے کی چیز تو عقبیٰ تھی۔"

درویش شرم سے گردنیں جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

آپؒ نے فیصلہ کیا کہ بیت المقدس ضرور دیکھیں گے۔ مسلمانوں کا یہ قبلۂ اوّل نبیوں کی سرزمین بھی ہے، آپؒ سراپا اشتیاق بن کر بیت المقدس کی طرف روانہ ہو گئے۔ کافی مسافت طے کرنے کے بعد آپؒ راستہ بھول گئے۔ بڑی کوشش کی کہ صحیح راہ پر پڑ جائیں لیکن ناکام رہے۔ اگر کسی سے آپؒ نے بیت المقدس کا راستہ پوچھا بھی تو اس نے مذاق اُڑا کر یہی کہا کہ "میاں کہاں بیت المقدس اور کہاں تمھاری یہ راہ، اس راہ سے تو تم گرماں ہوتے ہوئے خراسان اور ماوراء النہر پہنچ سکتے ہو، بیت المقدس اس راہ پر کہاں!"

آپؒ پر پریشانی نے غلبہ کر لیا! اسی وقت اپنے سامنے سے ایک عورت آتی دکھائی دی، حواس باختہ، پریشان اور دہشت زدہ سی۔ آپؒ کو خیال گزرا کہ شاید یہ عورت بھی گم کردہ راہ ہے، آپؒ نے اس سے دریافت کیا "اے عورت! تجھے اس بات کا افسوس نہیں کرنا چاہیے کہ میں تجھ سے مخاطب ہوں، بلکہ میں تو بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا میری طرح تو بھی بیت المقدس کی راہ بھول چکی ہے کیونکہ بڑی دیر سے میں نے تیری پریشان حالی پر غور کیا تو اس امر کا انکشاف ہوا کہ میری طرح تو بھی راستہ بھول چکی ہے۔"

عورت نے ذرا تلخی سے جواب دیا "جناب محترم! میں اس بات پر خاصی پریشان بھی ہوں اور حیران بھی کہ تیرے جیسا مردِ راہ نما بھی اپنی راہ سے بھٹک گیا حالانکہ یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ اس کا پہچاننے والا کبھی غلط راستے پر نہیں چل سکتا!"

آپؒ نے جواب دیا "لیکن میں واقعی راستہ بھول چکا ہوں، اب اور کس طرح یقین دلاؤں۔"

عورت نے کہا "خواجہ واحدؒ بن زید! ایک بار پھر میری بات ذرا غور سے سن۔" کچھ رُک کر بولی "اس کا پہچاننے والا کیونکر مسافر ہو سکتا ہے اور جس کے دل میں اس کی محبت ہو گی وہ گمراہ کس طرح ہو سکتا ہے۔" پھر واحدؒ سے کہا "میری لاٹھی کی موٹھ پکڑ کر میرے ساتھ ساتھ چل۔"

واحدؒ نے اس کی لاٹھی پکڑ لی۔ عورت نے کہا "تو میرے آگے آگے چل۔"

آپؒ نے لاٹھی کا سرا پکڑ کر آگے آگے چلنا شروع کر دیا۔ ابھی بمشکل سات آٹھ ہی قدم چلے ہوں گے کہ عورت نے کہا "زید کے بیٹے واحدؒ! ذرا سامنے تو دیکھ، وہ کیا نظر آ رہا ہے!"

آپؒ نے سامنے جو دیکھا تو بیت المقدس کی مسجدِ اقصیٰ کے مینار واضح دکھائی دینے لگے۔ آپؒ کو ان میناروں پر شک و شبہہ گزرا، سوچا اتنی جلدی بیت المقدس کس طرح آ سکتا ہے۔ عورت سے پوچھا "محترم خاتون! یہ مینارے کس مسجد کے ہیں؟"

عورت نے جواب دیا "بیت المقدس کی مسجدِ اقصیٰ کے۔ کیوں، تجھے شک کیوں ہوا؟"

آپؒ نے کہا "اس لیے کہ میں اتنی جلدی بیت المقدس پہنچ جانے کا دل میں خیال تک نہیں لا سکتا!"

"آخر کیوں؟ یہ کیوں؟"

آپؒ نے جواب دیا "کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جس جگہ میں نے تیری لاٹھی کو پکڑا تھا، وہاں سے بیت المقدس کا فاصلہ کئی ہفتوں کا تھا۔ پھر میں سات آٹھ قدم چل کر اتنی طویل مسافت کس طرح طے کر سکتا تھا۔"

عورت نے کہا "واحدؒ زید کے بیٹے! تیری سیر و سیاحت زاہدوں کی سیر و سیاحت ہے اور میری سیر عارفوں کی سیر ہے اور یہ نکتہ یاد رکھ کہ زاہد چلتا ہے اور عارف اُڑتا ہے اور اب تو خود ہی فیصلہ کر دے کہ ایک چلنے والا کسی اُڑنے والے کا کس طرح مقابلہ کر سکتا ہے۔" اس کے بعد وہ عورت غائب ہو گئی اور دوبارہ کہیں بھی نظر نہ آئی۔

واپسی میں ایک جگہ آپؒ نے ایک حبشی کو سر پر لکڑیوں کا بوجھ اٹھائے دیکھا! اس وقت آپؒ کے ساتھ ایک اور صاحب ایوب بھی سفر کر رہے تھے۔ آپؒ نے ازراہِ مذاق اس حبشی سے دریافت کیا "اے حبشی! کیا تو بتا سکتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟"

حبشی نے افسوس سے کہا "تو مجھے نادان اور جاہل سمجھ کر اس قسم کا سوال کر رہا ہے یا کوئی اور بات بھی ہے؟"

آپؒ نے جواب دیا "میں نے نہایت سنجیدگی سے یہ سوال کیا ہے۔"

حبشی نے لکڑیوں کا گٹھا زمین پر رکھ دیا اور آسمان کی طرف دیکھتا ہوا بولا "الٰہ العالمین! یہ مجھ سے میرے ایمان کا امتحان لے رہا ہے، تو اپنی قدرتِ کاملہ سے ان کے سوال کا کوئی ایسا جواب دے دے کہ اس کی زبان گنگ ہو جائے اور مجھ سے پھر کبھی ایسا بونگا سوال نہ کرے۔"

اسی وقت واحدؒ بن زید اور اس کے ساتھی ایوب نے یہ دلچسپ تماشا دیکھا کہ پورا گٹھا سونے کا بن چکا تھا۔ اس نے اس گٹھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "دیکھ میرا خدا وہ ہے جس نے لکڑیوں کو سونا بنا دیا، اب بول کیا کہتا ہے؟"

آپؒ نے پوچھا "کوئی اور ثبوت!"

اس نے اسی وقت دُعا کی "خدایا! ان کو پہلے جیسا بنا دے۔" لکڑیاں پھر لکڑیاں بن گئیں۔ حبشی نے آپؒ سے کہا "واحدؒ! عارفین سے سوال کرتے ہو، یاد رکھو ان کے عجائب فنا نہیں ہوتے۔"

واحدؒ اور ان کے ساتھی حبشی سے سوال کرنے پر شرمندہ ہو گئے۔

حبشی نے ان دونوں سے اچانک سوال کیا "تم دونوں کے پاس کچھ کھانے کو ہے؟"

جواب ملا "نہیں۔"

حبشی نے پوچھا "کچھ کھانے کی خواہش محسوس ہو رہی ہے؟"
خواجہ واحدؒ کے ساتھی ایوب نے جواب دیا "ہاں، بھوک تو محسوس ہو رہی ہے!"

حبشی نے اپنے دامن میں ہاتھ ڈال کر جو باہر نکالا تو اس میں ایک پیالہ دبا ہوا تھا۔ پیالہ شہد سے لبالب بھرا تھا جس کا رنگ برف کی طرح سفید اور خوشبو مشک سے زیادہ تیز تھی۔ حبشی نے یہ پیالہ ان دونوں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اسے کھالو، یہ شہد کی مکھیوں کا نہیں ہے۔"

ان دونوں نے اسے کھایا تو پتہ چلا، اس سے بہتر شہد نہ تو انھوں نے پہلے کبھی کھایا تھا اور نہ آئندہ کھانے کا خیال تک لایا جاسکتا تھا۔ ان دونوں کے چہروں پر چھایا ہوا استعجاب حبشی نے بھی محسوس کر لیا، بولا۔ "تم تو مجھ سے خدا کی بابت سوال کر رہے تھے اور اب جو کچھ تم نے دیکھا اس پر حیرت کر رہے ہو۔"

واحد کے ساتھی ایوب نے کہا "میں تمھاری کرامت پر حیرت زدہ ہوں۔"

حبشی نے جواب دیا "تو میرا یہ نکتہ بھی سن لو جس نے کرامتوں پر حیرت کی، وہ عارف نہیں ہو سکتا اور جس نے تعجب کیا، سمجھ لو کہ وہ اللہ سے بہت دور ہے۔"

ایوب نے کہا "اور اگر کوئی شخص ان کرامتوں کو دیکھ کر خدا کی عبادت میں مشغول ہو جائے اس کی بابت تمھارا کیا خیال ہے؟"

حبشی نے جواب دیا "ان کرامتوں کو دیکھ کر جس نے اللہ کی عبادت شروع کی، وہ کرامتوں سے واقف ہے نہ اللہ سے۔"

خواجہ واحدؒ اور ایوب اس حبشی کی باتوں سے نہ صرف مرعوب ہوئے بلکہ اس کے مقام اور مرتبے کے آگے عقیدت اور احترام سے خود کو ختم کر دیا۔

آپؒ نے اپنے ہمسفر ایوب سے کہا "اس دنیا میں عارفوں کی کمی نہیں اور انھیں پہچاننا ہی بہت بڑا عرفان ہے۔"

دونوں آگے بڑھے تو ان کا گزر ایک مسیحی عبادت گاہ میں ہوا۔ انھوں نے سوچا گرجے کے مسیحی عبادت گزار سے بھی بات کر لی جائے۔ جب یہ دونوں گرجے کے دروازے پر پہنچے تو وہاں راہب کو اپنے استقبال کے لیے کھڑا دیکھا۔ راہب کی وضع قطع سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ بڑی مدت سے گوشہ نشیں رہا ہوگا۔ بال بڑھے ہوئے تھے اور چہرے اور اعصاب میں ایک مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔

خواجہ واحدؒ اپنے ساتھی سمیت راہب کی خانقاہ میں چلے گئے۔
راہب نے عاجزی سے پوچھا "میں تم دونوں کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

واحدؒ نے جواب دیا "تمھارا اخلاق اور محبت سے پیش آجانا ہی ہمارے لیے بہت کچھ ہے۔"

راہب نے کہا "تم لوگ کہاں سے آرہے ہو؟"
آپؒ نے جواب دیا "بیت المقدس سے۔ ہم وہاں مسجدِ اقصیٰ کی زیارت اور انبیائے کرام کی سرزمین کے دیدار کو گئے تھے چنانچہ ان کی زیارت سے روحانی خوشی حاصل ہوئی اور اب ہشاش بشاش بصرے واپس جا رہے ہیں۔"

راہب نے ایک سرد آہ بھری، بولا "تم خوش قسمت ہو کہ اس پاک سرزمین کی زیارت کر کے آرہے ہو اور ایک میں ہوں کہ اس خانقاہ کے علاوہ کچھ جانتا ہی نہیں۔"

خواجہ واحدؒ نے پوچھا "تم اس خانقاہ میں کتنے عرصے سے رہ رہے ہو؟"
راہب نے جواب دیا "چوبیس سال سے۔"
پوچھا "یہاں، تمھارا کوئی دوست، ہمدرد؟"
جواب دیا "خدا، کیونکہ وہ سب سے بڑا اور قابلِ اعتبار دوست ہے اور یکتا اور بے نیاز بھی ہے۔"

آپؒ نے پوچھا "میں خدا کی بابت کوئی سوال نہیں کر رہا ہوں۔ مخلوق میں سے تمھاری کسی سے دوستی ہے؟"
اس نے ہنس کر جواب دیا "وحشی جانور۔"
آپؒ نے پوچھا "اس ویرانے میں تم کھاتے کیا ہو؟"
اس نے جواب دیا "اللہ کا ذکر، اس کی یاد۔"
آپؒ نے کہا "میں ماکولات میں سے پوچھ رہا ہوں۔"
اس نے جواب دیا "درختوں کے پھل اور زمین کی نباتات!"
آپؒ نے پوچھا "تمھیں خدا کی مخلوق میں سے کسی کی ملاقات کا بھی شوق ہوا کبھی؟"

جواب دیا "بس عارفین سے ملاقات کرنے کو جی چاہتا ہے، تم دونوں کی پیشوائی اور ملاقات کے پیچھے بھی میرا یہی شوق کارفرما ہے۔"
آپؒ نے پوچھا "تم نے دنیا سے علیحدگی کیوں اختیار کر لی؟"
جواب دیا "دنیا چور اور ہدایت کی راہ میں ایک قزاق جیسی حیثیت رکھتی ہے۔"

آپؒ نے پوچھا "تمھارے خیال میں آدمی ہدایت کی راہ پر کب پہنچتا ہے؟"
راہب نے جواب دیا "جب وہ اللہ کے سوا، ہر شے کا خیال دل سے نکال دیتا ہے اور ہر وقت اللہ کی یاد میں محو ہو جاتا ہے۔"
آپؒ نے اپنے ساتھی سے کہا "تم نے اس راہب کی باتیں سنیں؟ کیا ان میں عرفان کی راہ کی نمائی نہیں پائی جاتی۔" پھر راہب سے

کہا ”تمھاری ساری باتیں دُرست ہیں لیکن اس میں اک ذراسی تبدیلی کر لو۔ تم یہ بھی کہتے ہو کہ محبّت خدا ہے اور خدا محبّت ہے، تو اس محبّت کو عام کردو۔ اس خانقاہ سے باہر نکل کر اللہ کی مخلوق کی خدمت اور محبّت کرو۔ دنیا مخلوق کے لیے بنی ہے اور خدا کی مخلوق میں سب سے بڑا درجہ انسان ہی کو حاصل ہے۔ اب اگر یہ انسان ہی اس دنیا کو بے کار سمجھ کر لات مار دے گو یا اس طرح انسان خدا کی کاریگری پر عملاً یہ اعتراض کرے گا کہ اس نے دنیا جیسی بے کار چیز بنا ڈالی۔“

راہب آپؒ کی صورت دیکھتا رہا، پلک جھپکائے بغیر تھوڑی دیر بعد ان دونوں نے اپنی راہ لی اور راہب نے وہ خانقاہ چھوڑ دی، باہر نکل آیا۔

دورانِ سفر آپؒ کا ایک ایسی جگہ بھی گزر ہوا جہاں برف کی تہیں جمی ہوئی تھیں، وہاں آپؒ نے ایک شخص کو دیکھا جو برف پر پڑا سو رہا تھا۔ آپؒ کچھ دیر اس کے سرہانے کھڑے رہے۔ جب وہ بیدار ہوا تو آپؒ نے پوچھا۔ ”تو اس برف پر نہایت بے نیازی سے سو رہا ہے، کیا تجھے سردی نہیں لگ رہی ہے؟“ اس نے ہنس کر جواب دیا ”بابا عبدالواحدؒ! یہ سوال تم کر رہے ہو! تم خود ہی سوچو کہ جس کے دل میں اللہ کی یاد اور محبّت کی گرمی موجود ہو اس کا جسم سردی کس طرح محسوس کرے گا۔“

آپؒ بصرے میں واپس پہنچ کر وعظ و ارشاد میں مشغول ہوگئے۔

ایک دن آپؒ صدقات اور اللہ کی راہ میں مال و متاع دینے کے فضائل بیان فرما رہے تھے۔ آپؒ نے فرمایا ”لوگو! جب تم اللہ کے لیے اس کی مخلوق پر خرچ کرو گے تو جانتے ہو اللہ تمھیں اس کا کیا اجر دے گا؟ وہ اس کے عوض تمھیں جنّت میں ایک ایسا گوشہ رحمت فرمائے گا جہاں آنکھوں میں کھب جانے والی حور اس کے انتظار میں بیٹھی ہوگی۔“

اسی مجلس میں چار متموّل بھائی بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک بھائی کے دل پر اس وعظ کا بڑا اثر ہوا! اس نے وعظ کے خاتمے پر گھر پہنچ کر اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں دے ڈالا اور فارغ ہو کر آپؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا ”آپؒ نے جو کچھ فرمایا تھا، میں نے اس پر بہ خلوصِ دل عمل کر ڈالا، اب آپؒ مجھے ذکرِ الٰہی میں مشغول فرما دیں۔“

آپؒ نے اسے چند دعائیں بتائیں اور ہدایت کی کہ جب تک میں ان کے وِرد سے منع نہ کروں تو انھیں پڑھتا رہ۔“

وہ آپؒ ہی کے پاس رہنے لگا۔

ایک دن اوراد و وظائف کے بعد جب وہ سویا، اس نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔

اس نے دیکھا، وہ ایک سرسبز و شاداب باغ میں داخل ہوگیا ہے۔ باغ میں ایک زمرد کا خوبصورت محل کھڑا ہے۔ اس محل میں بہت ساری حسین و جمیل عورتیں جمع ہیں۔ انھوں نے اس نوجوان کو دیکھ کر آپس میں چہ میگوئیاں شروع کردیں۔ انھوں نے نوجوان کی صورت دیکھتے ہی ایک دوسرے سے کہنا شروع کردیا ”دیکھنا، وہ حورِ عین المرضیہ (آنکھوں کو اچھی لگنے والی حور) کا شوہر آرہا ہے!“

اس نوجوان نے ان کے قریب پہنچ کر دریافت کیا ”ذرا بتانا تو تم میں میری بیوی عین المرضیہ کون سی ہے؟“

عورتوں نے جواب دیا ”اللہ اللہ اے نوجوان تو کیسی بات کر رہا ہے۔ کہاں ہم اور کہاں حورِ عین المرضیہ۔ ہم تو ان کی لونڈیاں تک ہونے کے لائق نہیں ہیں۔“

نوجوان نے پوچھا ”پھر وہ کہاں ہے؟“

عورتوں نے جواب دیا ”اگر تم اسے دیکھنا ہی چاہتے ہو تو اور آگے جاؤ۔“

یہ شخص اور آگے بڑھ گیا۔ وہاں ایک اور محل نظر آیا اور یہ محل پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت تھا۔ اس محل میں بھی نہایت حسین اور پری جمال دوشیزائیں موجود تھیں۔ انھوں نے بھی اس نوجوان کو دیکھ کر آپس میں کہنا شروع کردیا ”دیکھنا تو، وہ دیکھو شاید یہی وہ نوجوان ہے جسے حورِ عین المرضیہ کا شوہر بنایا گیا ہے۔“

اس نوجوان نے آگے بڑھ کر پوچھا ”معزز خواتین! کیا تم بتاؤ گی کہ تم میں حورِ عین المرضیہ کون ہے؟“

انھوں نے جواب دیا ”اگر تم عین المرضیہ سے ملنا چاہتے ہو تو آگے جاؤ۔ ہم تو اس کی لونڈیاں بھی نہیں بن سکتیں۔“

وہ نوجوان اور آگے بڑھ گیا۔ آگے ایک اور باغ نظر آیا۔ اس باغ میں ایک نہایت حسین محل کھڑا تھا۔ یہ محل ان دونوں سے زیادہ خوبصورت تھا۔ یہ نوجوان اس محل میں داخل ہوگیا۔ یہاں پچھلی عورتوں سے زیادہ حسین دوشیزائیں جمع تھیں، اس نوجوان نے یقین کرلیا کہ ان میں حورِ عین المرضیہ ضرور موجود ہوگی۔ یہ ان کے قریب پہنچا اور نہایت نرمی سے سوال کیا ”معزز خواتین! کیا آپ بتائیں گی کہ آپ میں عین المرضیہ کون ہے؟“

ایک نہایت حسین عورت نے جواب دیا ”جناب! ہم تو عین المرضیہ کی لونڈیاں ہیں اور آپ، شاید آپ ہی ان کے شوہر ہیں۔“

نوجوان نے کہا ”میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

عورت نے جواب دیا ”اندر تشریف لے جائیے“

نوجوان کا دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔ سامنے ایک زرتار پردہ لٹک رہا تھا۔ نوجوان پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوگیا۔ وہاں ایک نہایت خوبصورت دوشیزہ بنی سنوری بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ نوجوان اشتیاق میں آگے بڑھا اور فرطِ بے قراری میں اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن دوشیزہ

نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ نوجوان نے نہایت دلدوز چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر اس کے قدموں میں گر گیا۔ کچھ دیر بعد جب اسے ہوش آیا تو اس دوشیزہ نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے قریب بلایا۔ یہ اس کے قریب جا کھڑا ہوا! اس نے ایک طرف کھسکتے ہوئے کہا "تم یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

وہ اس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔ دوشیزہ کے پاس سے خوشبو کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ یہ نوجوان اس کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر یارائے دید نہ تھا۔ رُعبِ حُسن نے اسے مرعوب مگر بے اختیار کر رکھا تھا آخر جب یارائے صبر نہ رہا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے اپنی آغوش میں لے لینا چاہا۔ وہ ذرا سمٹ کر دُور ہٹ گئی اور اندازِ دل ربائی اور نرمی سے کہنے لگی "جناب! آپ اتنے بے قرار اور بے چین کیوں ہو رہے ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ہیں اور ہمیں ایک ہو جانے میں بس تین ساعتیں باقی ہیں تین ساعتوں بعد ہماری وصل کی گھڑی آجائے گی۔"

نوجوان نے خوشامدانہ درخواست کی "مرضیہ! تین ساعتیں بہت ہوتی ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اس سے پہلے ممکن نہیں ہے؟"

"اگر یہ بات پہلے ممکن ہوتی تو میں آپ کی آغوش میں پڑی ہوتی۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ تین ساعتیں کتنی جلدی گزر جائیں گی۔ اللہ نے چاہا تو یہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر جائیں گی۔"

نوجوان نے پوچھا "پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟"

عین المرضیہ نے جواب دیا "پھر ہم دونوں شادکام ہو جائیں گے۔"

نوجوان نے ایک بار پھر اسے آغوش میں لے لینے کی کوشش کی لیکن وہ اٹھ کر دُور چلی گئی "بس تین ساعتیں۔"

اس کے بعد نوجوان کی آنکھ کھُل گئی۔ عین المرضیہ کی صورت اب بھی اس کی آنکھوں میں گھوم رہی تھی۔ اس کی بے چینی اتنی بڑھی کہ وہ بے قراری میں اِدھر اُدھر چلنے پھرنے لگا۔ کسی مُرید نے اس کی بے قراری کی خبر خواجہ عبدالواحدؒ کو پہنچا دی۔ وہ فوراً اس کے پاس پہنچے اور بے چینی کی وجہ پوچھی "او بے وقوف! یہ بے قراری کیسی؟ آخر تجھے کیا ہو گیا؟"

نوجوان نے اپنا خواب سُنا کر کہا "حضرت! اب میں عین المرضیہ سے کس طرح ملوں گا؟"

آپؒ نے اس کے کان میں کہا "لیکن کیا تو یہ بھول گیا کہ اس نے تین ساعتوں بعد ملنے کا وعدہ کیا ہے!"

نوجوان نے کہا "بیشک اس نے تین ساعتوں بعد ملاقات کا وعدہ کیا ہے۔ کیا اس کا یہ وعدہ واقعی دُرست ہے؟"

آپؒ نے جواب دیا "عالمِ بالا میں جھوٹ نہیں بولا جاتا۔ تو اپنی بے چینی اور بے قراری سے پیچھا چھڑا اور تین ساعتوں کے گزر جانے کا انتظار کر۔" آپؒ اسے تسلی دے کر چلے گئے۔

اسی دن بصرے کے قرب و جوار میں کسی جگہ جنگ کا آغاز ہو گیا۔ یہ جنگ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان چھڑی تھی۔ شہر کے لوگ جہاد میں شرکت کی غرض سے نکل کھڑے ہوئے۔ اس نوجوان کو بھی جوش آگیا اور دل سے عین المرضیہ کا خیال نکال کر جہاد میں شریک ہو گیا اور کفار پر شیر کی طرح جھپٹ پڑا۔ بہت سے کافروں کو ہلاک کر کے شہید ہو گیا۔ اس جنگ کا خاتمہ مسلمانوں کی فتح اور غیر مسلموں کی شکست و ہزیمت پر ہوا۔

خواجہ واحد شہدا کی لاشوں میں اس نوجوان کی لاش تلاش کرتے رہے آخر جب یہ لاش مل گئی تو آپؒ نے اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا جلال دیکھا۔ ایک ایسا جلال، جس میں جمال کی بھی آمیزش تھی۔ آپؒ نے اس کی تجہیز و تکفین اور تدفین خود اپنے ہاتھوں سے کی نمازِ جنازہ بھی آپؒ ہی نے پڑھائی۔ آپؒ نے خواب سے بیداری اور شہادت کے درمیانی وقت کا حساب جو لگایا تو پتہ چلا تین ساعتیں پوری ہو چکی ہیں۔

جب آپؒ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو کمزوری نے آپؒ پر اتنا غلبہ پا لیا کہ اٹھنا بیٹھنا تک محال ہو گیا۔ ایک دن آپؒ کو اپنی اس حالت پر نہایت افسوس ہوا آپؒ نے خدا سے دُعا کی "خدایا! میں تجھ سے یہ نہیں کہتا کہ تو مجھے بالکل ہی صحت یاب کر دے، میں یہ بھی نہیں کہتا کہ تو میری زندگی میں مزید اضافہ فرما دے لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تو مجھ میں اتنی طاقت ضرور پیدا کر دے کہ میں اپنے خادم کی عدم موجودگی میں خود سے وضو کر لوں اور نماز پڑھ ڈالوں۔ اس کے بعد جیسی تیری مرضی ہو، کرتا رہ۔"

اس دُعا کا فوری اثر یہ ظاہر ہوا کہ آپؒ میں اتنی طاقت واپس آگئی کہ خود سے وضو بھی کر لیا اور نماز بھی ادا کر لی۔ نماز پڑھ چکنے کے بعد آپؒ لیٹ گئے اور ایسا محسوس کیا گویا توانائی زائل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہ کمزوری اتنی بڑھی کہ ۷ صفر ۱۷۷ھ میں آپؒ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

آپؒ کے مرتبے کا اندازہ لگانے کے لیے اتنا بتلا دینا کافی ہے کہ خواجہ فضیلؒ بن عیاض آپؒ ہی کے مُرید اور خلیفہ تھے اور یہ خواجہ فضیل بن عیاض وہی بزرگ ہیں جنھیں حضرت ابراہیمؒ ادہم کے پیرو مرشد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اِس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

روضۃ الریاحین — ابی محمد عبداللہ
افانین الیاسمین — ترجمہ مولانا جعفر علی
سفینۃ الاولیا — شہزادہ دارا شکوہ
سیر الاقطاب — ابن شیخ عبدالرحیم
خزینۃ الاصفیا — مفتی غلام سرور لاہوری
انوار الاصفیا — مرتبہ: غلام علی اینڈ سنز



قبلۂ حاجات



ضیا تسنیم بلگرامی

مشہور بزرگ شیخ بہاؤالدین زکریاؒ ملتانی اپنی خانقاہ میں تشریف فرما تھے۔ ارادت مند اور مُرید ادب و احترام سے آپ کے ملفوظات سُن رہے تھے۔ لوگوں کی عقیدت اور احترام کا یہ حال تھا کہ ان کی خاموشی میں سانسوں کے سوا کوئی اور آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ آپ سامعین کو بتا رہے تھے کہ حقوق العباد کتنی ضروری شے ہیں، آپ نے فرمایا۔ "لوگو! اگر تم اس دنیا میں جنّت کا مزہ لُوٹنا چاہتے ہو تو حقوق العباد پر عمل کرو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر انسان، انسان کے ساتھ صحیح ہوجائے تو اسے ایک شاندار جنّت اسی دنیا میں حاصل ہوجائے۔ بیوی شوہر سے، شوہر بیوی سے، اولاد والدین سے، والدین اولاد سے، دکاندار گاہک سے، گاہک دوکاندار سے، اگر یہ سب اپنے اپنے فرائض اور حقوق پر دیانت داری سے عمل کریں، تو یہی دنیا جنّت بن جائے۔ انسان انسان کا احترام کرے۔"

آپ کا وعظ جاری ہی تھا کہ کسی نے مطلع کیا۔ "حضرت! آپ کی بہو قدم بوسی کے لئے حاضر ہوئی ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "ان سے کہو میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

آپ وعظ ختم کرکے گھر میں تشریف لے گئے۔ ان کی بہو راستی بی بی حسنِ کردار اور اعمال و اشغال میں اسم با مسمّٰی تھیں۔ ان دنوں راستی بی بی سات ماہ سے اُمید سے تھیں۔ بہاؤالدین زکریاؒ بہو سے نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔ وہ جتنا احترام کر رہے تھے، راستی بی بی شرم و ندامت سے گڑی جا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے خُسر سے کہا۔ "قبلہ بزرگوار! میں آپ کی بہو ہوں، بیٹی کی طرح۔ آپ کی عظمت اور بزرگی مسلّم ہے پھر آپ میری تعظیم بجالاکر مجھے کیوں شرمندہ کر رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "بی بی! تو غلط سمجھی، میں تیری تعظیم کہاں کر رہا ہوں، میں تو اُس بچّے کی تعظیم کر رہا ہوں جو دو ماہ بعد تیرے بطن سے پیدا ہوگا۔ اس بچّے کو سرتاجِ اولیاء، چراغِ اقلیم اصفیاءؒ اور شمع ایوانِ اتقیاء، جو کچھ بھی کہا جائے کم ہے، میں اس کے احترام اور تعظیم پر مجبور ہوں۔"

بی بی راستی کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہ ایک شاندار اور قابلِ فخر بشارت تھی۔ بے چینی سے اس یگانۂ روزگار بچّے کی ولادت کا انتظار کرنے لگیں۔ بچّہ پیدا ہوا اور بی بی راستی نے بچّے میں وہ نشانیاں اور علامتیں تلاش کرنا شروع کردیں، جن سے اس نومولود کی عظمت اور بزرگی کا اندازہ کیا جاسکتا۔ بچّے میں کئی غیر معمولی علامتیں موجود تھیں۔ بی بی راستی عموماً وضو سے رہتی تھیں، لیکن جب وہ وضو سے نہ ہوتیں تو بچّے کو دودھ پینے میں تامّل ہوتا۔

بچّے کا نام رُکن الدینؒ رکھا گیا۔ دادا کی آغوشِ جسمانی اور رُوحانی میں اس بچّے کی پرورش ہونے لگی۔ کبھی کبھی بچّے پر غیر معمولی محویت طاری ہوجاتی، بی بی راستی اگر اس محویت کو ختم کرنا چاہتیں تو ناکام رہتی۔ اس وقت بزرگ دادا مُسکرا کر ہدایت دیتا۔ "بی بی! کلام اللہ کی تلاوت شروع کرو، بچّے کی توجہ کلام اللہ کی طرف منعطف ہوجائے گی۔"

ماں نے آپ کے قول پر عمل کیا اور فوراً ہی یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ بچّہ پوری توجہ سے اللہ کا کلام سُن رہا ہے اور اس کے انگ انگ سے مسرّت و انبساط کا اظہار ہو رہا ہے۔

پھر یہ بات بھی محسوس کی کہ بچّہ اذان کے دوران بالکل خاموش اور منہمک رہتا ہے اور جب بچّے نے بولنے کی ابتداء کی تو اس کی زبان سے ادا ہونے والا پہلا لفظ "اللہ" تھا۔ یہاں تک کہ یہ بچّہ چار سال کا ہوگیا۔

اس دن رُکن الدینؒ کے دادا حضرت بہاؤالدین زکریاؒ ملتانی خود کو تھکا تھکا محسوس کر رہے تھے۔ وہ آرام کرنے کی غرض سے پلنگ پر لیٹ گئے۔ بہاؤالدینؒ کے صاحبزادے اور چار سالہ رُکن الدینؒ کے والد شیخ صدرالدین عارفؒ پلنگ کے قریب فرش پر مؤدّب بیٹھ گئے۔ دادا نے اپنی دستار پلنگ کے سرہانے ایک پائے پر رکھ دی تھی۔ چار سالہ رُکن الدینؒ اپنے دادا کے پلنگ کے گرد چکر لگانے لگے۔ صدرالدین عارفؒ بیٹے کو سرزنش کرنے لگے۔ "رُکن الدینؒ! یہ کیا کر رہے ہو، دادا جان کا ادب کرو اور میری طرح فرش پر ادب سے بیٹھ جاؤ۔"

دادا نے صدرالدینؒ کو منع کیا۔ "صدرالدینؒ! یہ جو کچھ کر رہا ہے، کرنے دو۔ اسے منع نہ کرو۔ میں اس کے مرتبے سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

صدرالدینؒ نے ادب سے عرض کیا۔ "قبلہ و کعبہ! یہ آپ کی خورد پروری ہے ورنہ میں رُکن الدینؒ کی یہ بے تکلفی بالکل پسند نہیں کرتا، اسے آپ کا ادب کرنا چاہیئے۔"

دادا نے مُسکرا کر کہا۔ "بیٹے صدرالدینؒ! اپنے بیٹے کا مرتبہ پہچانو۔"

ضیا تسنیم بلگرامی ہر ماہ آپ کے لیے ایک بصیرت افروز مضمون تحریر کرتی ہیں

چار سالہ پوتے نے اور زیادہ جسارت دکھائی اور اپنے دادا کی دستار پلنگ کے پائے سے اُٹھا کر اپنے سر پر رکھ لی۔ صدر الدین ؒ نے غصے میں اُٹھ کر بیٹے کو پکڑ لیا جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "رُکن الدین ؒ! تم نہیں مانو گے؟ اب تمہاری جرأت اور گستاخی حد سے بڑھتی جا رہی ہے، یہ دستار اُتارو اپنے سر سے، تم ابھی اس دستار کی عظمت اور بڑائی سے واقف نہیں ہو، ورنہ یوں اپنے سر پر نہ رکھتے۔"

دادا نے صدر الدین ؒ کو ڈانٹ دیا۔ "کیا کرتے ہو؟ اس سے دستار مت چھینو، پہنے رہنے دو، کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ اس نے میری دستار یوں ہی بچپنے کی نادانی یا شرارت میں پہن لی ہے؟ ہرگز نہیں، ایسا نہیں ہے، بلکہ اس نے میری دستار اپنا حق سمجھ کر پہنی ہے۔ میری یہ دستار رُکن الدین ؒ کا حق ہے اور بالآخر اسی کو پہننا ہے، اس نے میری نہیں اپنی دستار پہنی ہے۔"

ننھا رُکن الدین ؒ اپنے باپ اور دادا کی گفتگو بڑے غور سے سُنتا رہا۔ اس کے بعد دستار اپنے سر سے اُتار کر دادا کے حوالے کر دی۔ دادا نے اپنے بیٹے صدر الدین ؒ کو حکم دیا۔ "تم میری یہ دستار امانتاً اپنے صندوق میں رکھ دو، جب رُکن الدین ؒ بڑا ہو جائے گا یہ دستار اس کے حوالے کر دینا۔"

صدر الدین عارف ؒ نے وہ دستار لیکر صندوق میں محفوظ کر دی اور رشک و محبت سے اپنے ننھے رُکن الدین ؒ کو دیکھنے لگے لیکن بی بی راستی بہت خوش تھیں کیونکہ آج انہیں اپنے ننھے رُکن الدین ؒ کے علوئے مرتبہ کا بہت بڑا ثبوت مل گیا تھا۔ وہ بیٹا، جس کو اس کی پیدائش سے پہلے ہی سرتاجِ اولیاء، چراغِ اقلیمِ اصفیاء اور شمعِ ایوانِ اتقیاء جیسے خطابات سے نوازا جا چکا تھا۔

تین سال بعد، جبکہ رُکن الدین ؒ کی عمر سات سال ہو چکی تھی یہ باہر گلی میں کھیل رہے تھے۔ انہوں نے ایک عورت کو گود میں بچہ لئے روتے ہوئے دیکھا وہ عورت بچے کو گود میں لئے زار و قطار رو رہی تھی۔ رُکن الدین ؒ نے کھیلنا بند کر دیا اور عورت کے پاس جا کر دریافت کیا۔ "عورت! تم کیوں رو رہی ہو؟"

عورت نے گود کے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "رُکن الدین ؒ! میرا بچہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ میں تمہارے دادا کے پاس دُعا کے لئے حاضر ہوئی ہوں، کیا وہ اندر موجود ہیں؟"

رُکن الدین ؒ نے جواب دیا۔ "دادا اندر موجود تو ضرور ہیں لیکن ان کے پاس خوشخبری کی اُمید لیکر مت جاؤ۔ میں جانتا ہوں وہ کیا جواب دیں گے۔"

غرض مند عورت دیوانی ہو رہی تھی، بولی۔ "بچے! میں تمہاری باتوں میں وقت تو ضائع نہیں کر سکتی۔ میں ان سے اپنے بیٹے کی زندگی کے لئے دُعا کراؤں گی۔"

رُکن الدین ؒ نے جواب دیا۔ "میں نے تمہیں روکا ہی کب ہے جو تم یوں باتیں کئے جا رہی ہو، جاؤ دادا کے پاس اور کراؤ ان سے دُعا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کیا دُعا کریں گے۔"

عورت نے رُکن الدین کی باتیں بے توجہی سے سُنیں۔ اس کے خیال میں ایک سات سالہ بچے کی باتوں میں اسرار و رموز تلاش کرنا بے معنی کوشش تھی۔ وہاں سے شیخ بہاؤ الدین زکریا ؒ جدھر بیٹھتے تھے، تیز تیز قدم اٹھاتی ان کے حجرے میں داخل ہو گئی۔ شیخ زکریا ؒ ذکرِ خفی میں مشغول تھے۔ عورت نے بے قراری سے اپنا بچہ ان کے آگے ڈال دیا اور گڑگڑاتی ہوئی بولی۔ "بابا! یہ بچہ میں آپ کے حوالے کئے جا رہی ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ اس کی قسمت میں کتنی زندگی لکھی ہے لیکن یہ نظر آ رہا ہے کہ یہ زندگی اور موت کی سخت کشمکش میں مبتلا ہے۔ بابا! یہ میری اکلوتی اولاد ہے، میں کچھ نہیں جانتی، میں آپ کی کچھ بھی نہ سنوں گی۔ میں اسے آپ کے سپرد کئے جا رہی ہوں اور ہفتہ بھر بعد اسے آپ کے پاس سے صحیح و سلامت لے جاؤں گی۔ میں اس کی زندگی چاہتی ہوں۔"

آپ نے بچے کو ایک نظر دیکھا، اس پر نزع کی تشنج کی کیفیت طاری تھی، ایسا لگتا تھا گویا آخری ہچکی آنے ہی والی ہے۔ آپ نے اسے دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کشف سے اس کا مستقبل تلاش کیا۔ اس کے مستقبل میں موت کا اندھیرا تھا۔ ہست کا آخری سرا عدم سے ملا ہوا تھا۔ پید کا خاتمہ اور ناپید کا آغاز صاف نظر آ رہا تھا۔ زندگی فنا کے آگے سرنگوں تھی۔ 'ہے' مٹ رہا تھا 'نہیں' اس کی جگہ لے رہی تھی۔ آپ نے آنکھیں کھول دیں اور بڑے افسوس کے ساتھ کہا۔ "خاتون! میں تجھے کسی آسرے میں نہیں رکھنا چاہتا اور نہ ہی میں یہ چاہتا ہوں کہ تو مشیتِ ایزدی سے لاعلم رہے۔ میں نے کشف سے جو کچھ دیکھا ہے اسے بیان کر دینا ضروری ہے۔ میں نے عالمِ کشف میں تیرے بچے کی زندگی تلاش کی اور یہ دیکھ کر بہت مایوس ہوا کہ مشیتِ ایزدی یہی ہے کہ تیرا بچہ دارِ فانی سے دارِ عقبیٰ کی طرف سفر کر جائے۔ مشیتِ ایزدی کے آگے عاجز بندے کی کیا مجال کہ دم بھی مار سکے۔"

عورت نے بڑی دردناک چیخ ماری، روتی ہوئی بولی۔ "بابا! میں آپ کے پاس بڑی اُمیدیں لیکر آئی ہوں، آپ مجھے مایوس نہ کیجئے۔ آپ کے در کے بعد کس کا در ہے جہاں میں اپنا دُکھ درد لے کر پہنچوں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "بی بی! در تو بس ایک ہی ہے جہاں ہر انسان کو جانا چاہیئے اور وہ در ہے اللہ کا، خدا کا اور اُس کارسازِ حقیقی کا جہاں سے کاموں کے بننے اور بگڑنے کے فیصلے صادر ہوتے ہیں۔ وہاں ہر کوئی عاجز اور بے بس ہے، میں بھی بے بس اور مجبور ہوں۔"

عورت زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ اس کے سینے میں ایک آگ سی جل رہی تھی، اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے آپ کی طرف دیکھا، پوچھا۔ "تب پھر میں جاؤں، آپ کچھ نہیں کر سکتے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "بی بی! میں مجبور ہوں۔"

عورت نے بچے کو سینے سے لگایا اور روتی ہوئی حجرے کے باہر آ گئی۔ اُس وقت تک سات سالہ رُکن الدین ؒ کھیل بند کر چکے تھے اور عورت کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ آپ نے عورت کو روتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔ "دادا نے کیا جواب دیا؟"

عورت نے کہا۔ "تمہارے دادا نے وہ جواب دیا ہے جس کی میں ان سے اُمید بھی نہ کر سکتی تھی۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میرے بچے کی زندگی ختم ہو چکی ہے اب اس کے حق میں دُعا کرنا فضول ہے۔"

رُکن الدین ؒ نے کہا۔ "کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ دادا کے پاس

خوش خبری کی اُمید لیکر مت جاؤ لیکن تم نہیں مانیں اور وہاں سے وہ صدمہ لے کر واپس آئیں کہ جس سے بڑا کوئی اور صدمہ ہی نہیں۔"

عورت نے جواب دیا۔ "رُکن الدینؒ! تم ابھی بچے ہو اور مامتا کے اُس باؤلے پن کا اندازہ نہیں لگا سکتے، جس میں مَیں پاگل ہو رہی ہوں۔"

رُکن الدینؒ نے کہا۔ "ذرا بچے کو دکھانا تو۔"

عورت نے پوچھا۔ "تم میرے بچے کو دیکھ کر کرو گے کیا؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "کروں گا کیا، یہ نہ پوچھو۔ وہ کروں گا جو دادا نے بھی نہیں کیا۔ تمہارے بچے کے حق میں دُعا کروں گا اور اس یقین کے ساتھ دُعا کروں گا کہ میرا اللہ مجھے مایوس نہیں کرے گا۔"

عورت نے اس مادر زاد ولی کو بڑے غور سے دیکھا، اس کے چہرے پر خوشی اور اُمید کی تابانی نمودار ہو گئی، بولی "رُکن الدینؒ! سچ، جو کچھ تم کہہ رہے ہو، سچ کہہ رہے ہو؟"

رُکن الدینؒ نے جواب دیا۔ "میں جھوٹ کیوں اور کس کی خاطر بولوں گا، تم مجھے اپنے بچے کی صورت تو دکھاؤ۔"

عورت نے بچے کا مُنہ آپ کی طرف کر دیا۔ بچے کی گردن اس طرح جھول گئی، گویا اس کا منکا ڈھل چکا ہے۔ عورت نے ایک چیخ ماری، بولی۔ "بابا رُکن الدین! اب تو یہ مَر چکا۔ اب تم کس کے لئے دُعا کرو گے؟"

رُکن الدینؒ نے بچے کو بڑے غور سے دیکھا، بولے۔ "بی بی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تمہارا بچہ مرا تھوڑی ہے، زندہ ہے، مستی مار کے پڑا ہے، تم دیکھ لینا یہ جلدی ہی اُٹھ کھڑا ہو گا۔"

عورت نے ان کی باتوں کو بڑی بے یقینی سے سُنا، بولی۔ "رکن الدینؒ! تم مجھ دُکھیا سے مذاق مت کرو۔"

رکن الدینؒ نے جواب دیا۔ "بی بی! میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، سچی بات کر رہا ہوں۔"

عورت نے پوچھا۔ "اگر یہ لڑکا مر چکا ہے تو اس ہیر پھیر کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔"

رُکن الدینؒ نے جواب دیا۔ "اچھا، اب تم گھر جاؤ اور اپنے لڑکے کی زندگی کا جشن مناؤ۔"

عورت نے عاجزی سے کہا۔ "چھوٹے میاں! میں کس کا جشن مناؤں، معلوم نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں، کیوں کہہ رہے ہیں اور کس لئے کہہ رہے ہیں۔"

رکن الدینؒ نے جواب دیا۔ "میں تمہارے بچے کی زندگی کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ تم اس پر بین مت کرو کیونکہ بین کرنا ناجائز اور ممنوع ہے۔"

عورت بچے سے اُلجھنا نہیں چاہتی تھی، چُپ چاپ اپنے بچے کو لے کر رفو چکر ہو گئی اور اس دن شام تک یہ خبر پورے ملتان میں پھیل گئی کہ جس عورت کو بہاؤ الدین زکریاؒ نے مایوس کر دیا ہے، ان کے پوتے رُکن الدینؒ نے اسے بشارت دی اور لڑکا جلا دیا۔

لوگ جوق در جوق اس عورت کے پاس پہنچنے لگے اور عورت بھاگی بھاگی رُکن الدینؒ کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ "بیٹا! تو مادر زاد ولی ہے، میں تیرا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔"

رُکن الدینؒ نے جواب دیا۔ "شکریے کی کوئی بات نہیں، مجھے تم پر رحم آگیا۔ میں نے اپنے خدا سے دُعا کی اور اُس نے میری سُن لی، مجھے مایوس نہیں کیا۔"

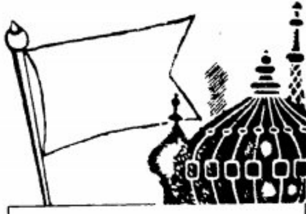
عورت نے کہا۔ "رکن الدینؒ! اگر اسلام غیر اللہ کی پرستش کی اجازت دیتا تو میں تمہاری پرستش شروع کر دیتی۔ لیکن افسوس کہ میں یہ نہیں کر سکتی۔ مگر میرا دل جن جذبات اور احساسات سے مملو ہو رہا ہے، وہ مجھے بے اختیار اور بے خود کئے دے رہے ہیں۔"

رکن الدینؒ عورت کے سامنے سے ہٹ گئے کیونکہ انہیں ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں یہ عورت فرطِ جذبات میں انہیں سجدہ نہ کر بیٹھے۔

جب یہ خبر دادا کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے رکن الدینؒ کو اپنے پاس بلایا اور محبت سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دریافت کیا۔ "بیٹے! یہ تم نے کیا کیا؟"

پوتے نے نظریں جُھکا لیں اور ادب سے جواب دیا۔ "دادا! میں نے اسے روتے ہوئے دیکھا تو میرا دل پسیج گیا اور میں نے اللہ سے اس یقین کے ساتھ اس بچے کے حق میں دُعا کی کہ اس تغیر پذیر دنیا میں عاجزی اور انکساری سے نکلی ہوئی دعائیں اللہ کو اس پر ضرور آمادہ کر سکتی ہیں کہ وہ مایوس نہ کرے۔ جب وہ ہماری رگِ گلو سے بھی زیادہ قریب ہے تو اس قُربت کا ہمیں کوئی فائدہ تو ملنا چاہیئے، ہمیں اس کے کرم پر ناز ہے اور وہ ناز پرور ہے۔"

دادا نے پوتے کو سمجھایا۔ "بیٹے رکن الدینؒ! میں تیرے مرتبے سے واقف ہوں۔ اور یہ جو کچھ ہوا، میں اس پر ذرا بھی حیران نہیں۔ لیکن کہنا تو صرف یہ ہے کہ



مرد عورت

چند آدمی جو حضرت رابعہ بصریؒ کی خداداد شہرت کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے، رابعہؒ کے پاس آئے اور اُن سے کہنے لگے۔۔۔

"بہترین اوصاف مردوں ہی میں پائے جاتے ہیں، عورتوں میں نہیں، اب تک مردوں ہی نے اپنے روحانی کمالات سے دُنیا کو حیرت میں ڈالا تھا آپ نے یہ روحانی عظمت کیسے پالی؟" حضرت رابعہؒ نے جواب دیا۔

ممکن ہے آپ جو کہہ رہے ہیں صحیح ہو، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آج تک دُنیا میں کسی عورت نے خدائی کا دعویٰ کیا ہو اور لوگوں سے کہا ہو کہ آ سے پوجیں نمرودیت اور فرعونیت مردوں ہی کی ایک خصوصیت ہے۔ عورتیں اس سے بری ہیں۔

اہلِ طریقت ایسی دلیری کو پسند نہیں کرتے۔ اس لئے آئندہ ایسی جسارت نہ کرنا۔"

فرماں بردار پوتے نے خود کو دادا کی آغوش میں گرا دیا اور شرمندگی اور ندامت سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

رکن الدینؒ انہی حالات اور واقعات سے گزرتے ہوئے جوان ہو گئے آپ کی ریاضت اور عبادت کا یہ حال تھا کہ اس کا دور دور شہرہ پھیل گیا۔ ہر شخص ان سے ملاقات کرنے کا متمنی نظر آنے لگا۔ ان کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا کہ اس مخلوق سے پیچھا کس طرح چھڑائیں۔ آپ کو چھتیس سال کی عمر میں خرقہ اور دستار عطا کر دی گئی اور آپ اب خود کو براہِ راست اس لائق سمجھنے لگے تھے کہ اپنے دادا کی خالی مسند سنبھال لیں۔

ان دنوں دہلی میں کچھ ہنگامے ہو رہے تھے۔ وہاں حضرت محبوبِ الٰہی نظام الدین اولیاءؒ کی روحانی حکومت تھی۔ یہ قطب الدین خلجی کا دورِ حکومت تھا۔ اور اسے محبوبِ الٰہیؒ سے کد تھی۔ وہ آپ کی خانقاہ کے آس پاس جب بھی ہجوم دیکھتا حسد اور نفرت سے تلملا کر رہ جاتا۔ وہ ایک عرصے تک کسی ایسے طریقے کے بارے میں سوچتا رہا جس سے محبوبِ الٰہیؒ کو شرمسار کر سکتا۔ آخر یہ ترکیب سمجھ میں آئی کہ وہ ملتان سے شیخ رکن الدینؒ کو بلائے اور ان کا شاہانہ کر و فر سے استقبال کر کے شاہی مہمان بنا لے۔ پھر جب یہ خبریں محبوبِ الٰہیؒ کو پہنچیں گی تو وہ رشک و حسد کی آگ میں جلنے بھُننے لگیں گے۔ چنانچہ بادشاہ نے آپ کو دہلی آنے کی دعوت دی۔ آپ دہلی روانہ ہو گئے۔ آپ سے پہلے دہلی میں آپ کی تشریف آوری کی خبر پہنچ چکی تھی۔ دہلی والوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ ان استقبال کرنے والوں میں بادشاہ بھی شامل تھا اور انہی میں حضرت محبوبِ الٰہیؒ بھی شامل تھے۔

بادشاہ نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور نہایت احترام اور ادب سے پیش آیا۔ آپ کو معلوم تھا کہ بادشاہ محبوبِ الٰہیؒ سے عناد رکھتا ہے، بادشاہ نے پوچھا "حضرت! دہلی میں آپ کا سب سے پہلے کس نے استقبال کیا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اس شخص نے، جو اس شہر کا سب سے اچھا آدمی ہے یعنی خواجہ نظام الدینؒ۔"

بادشاہ آپ کا جواب سن کر چپ ہو گیا۔

بادشاہ نے آپ کی خدمت کی پانچ لاکھ تنکے نذرانے میں پیش کئے۔ آپ نے لے لئے اور باہر آتے ہی انہیں ان لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا جو آپ کے راستے میں استقبال اور زیارت کی خاطر گھنٹوں سے دھوپ میں کھڑے تھے۔

دوسرے دن جب آپ دوبارہ بادشاہ کے پاس جا رہے تھے تو راستے میں لوگوں نے آپ کو روک لیا۔ آپ نے پوچھا "تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے؟" لوگوں نے جواب دیا۔ "شیخؒ! یہ تو آپ خود بھی جانتے ہیں کہ ہم غریبوں کی بادشاہ تک رسائی ناممکن ہے، ہمارے بہت سارے مسائل بادشاہ کی توجہ کے مستحق ہوتے ہیں لیکن بادشاہ کی توجہ حاصل کرنا ہم سب کے لئے بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اس لئے ہم سب نے مل جل کر یہ متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ جب تک آپ دہلی میں تشریف فرما ہیں اور بادشاہ سے ملاقاتیں جاری ہیں، ہم سب اپنی درخواستیں آپ کے حوالے کر دیا کریں اور آپ انہیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا کریں۔ اس طرح ہماری درخواستوں پر ہاتھ کے ہاتھ عمل درآمد ہو جایا کرے گا۔"

آپ نے کہا۔ "کوئی مضائقہ نہیں، لاؤ اپنی درخواستیں، کہاں ہیں؟ میں انہیں اسی وقت بادشاہ کے روبرو پیش کر کے ان پر اس کے احکام لکھوالوں گا۔"

پورے ہجوم نے اپنی اپنی درخواستیں آپ کی طرف بڑھا دیں، یہ اچھا خاصا بوجھ ہو گیا۔ آپ ان درخواستوں سمیت شاہی محل میں داخل ہو گئے۔ شاہی محل کا پہلا دروازہ گزر گیا لیکن آپ سواری سے نہیں اترے۔ دوسرا دروازہ بھی گزر گیا لیکن آپ بدستور سوار رہے، یہاں تک کہ تیسرا دروازہ آ گیا۔ وہاں بادشاہ اپنے امرا اور مصاحبین کے ساتھ آپ کے استقبال کے لئے مؤدب کھڑا تھا۔ آپ کی سواری جیسے ہی اس کے سامنے پہنچی، بادشاہ نے آپ کو سلام کیا۔ آپ اپنے چوڈولے میں سے باہر نکلے اور ساری درخواستیں اسی وقت بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیں۔ بادشاہ نے پوچھا "حضرت! یہ کیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ان اہلِ غرض اور حاجتمندوں کی درخواستیں جو تیرے پاس تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔"

بادشاہ نے اپنے ایک خادم کو حکم دیا۔ "ان درخواستوں کو شیخؒ کی عدم موجودگی میں دوبارہ پیش کیا جائے۔"

آپ نے کہا۔ "نہیں، میں اس وقت تک تجھ سے باتیں نہیں کروں گا جب تک تو ان درخواستوں پر اپنے احکام نہیں لکھتا۔"

بادشاہ نے قدرے تامل سے کہا۔ "کیا اسی وقت؟ فوراً؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں ابھی، اسی وقت، میرے سامنے ہی۔"

بادشاہ نے ساری درخواستیں اپنے سامنے پھیلا دیں اور انہیں پڑھ پڑھ کر احکام لکھنا شروع کر دیئے۔ امرا اور مصاحبین بادشاہ کے روبرو مؤدب کھڑے رہے۔ جب ان درخواستوں پر کام مکمل ہو گیا تب آپ نے بادشاہ سے گفتگو شروع کی۔

واپسی میں آپ نے درخواست والوں کو شاہراہ کے کنارے، دونوں طرف کھڑے انتظار کرتے دیکھا۔ آپ کا چوڈولہ رک گیا اور آپ نے نام لے لے کر درخواست دہندوں کو ان کی درخواستیں واپس کرنا شروع کر دیں۔ لوگوں کو یقین نہیں تھا کہ ان کی درخواستوں پر اتنی جلدی عمل درآمد ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے فرطِ جوش اور انتہائے عقیدت میں آپ کو قبلۂ حاجات کہنا شروع کر دیا۔

بادشاہ قطب الدین خلجی کا دل محبوبِ الٰہیؒ کی طرف سے اب بھی صاف نہیں تھا۔ اس کی شرارت آمیز باتیں آپ کے کانوں تک پہنچتیں تو بڑی اذیت محسوس کرتے لیکن خاموش رہتے۔ بادشاہ نے جب یہ دیکھا کہ رکن الدینؒ بھی محبوبِ الٰہیؒ کی بڑی عزت کرتے ہیں تو حسد اور بڑھا۔ رکن الدینؒ کو روک تو نہ سکتا تھا لیکن لوگوں سے شکایتاً کہتا کہ جب میں نے بابا رکن الدینؒ کو ملتان سے بلایا تھا اور وہ میرے مہمان تھے تو خواجہ نظام الدینؒ کو ان سے نہیں ملنا جلنا چاہیے تھا۔ جب رکن الدینؒ نے بادشاہ کی بات سنی تو صاف صاف کہہ دیا کہ بادشاہ، نظام الدینؒ کے خلاف بغض و حسد رکھ کر اچھا نہیں کر رہا ہے، اسے اس کی سزا ضرور ملے گی۔



نیکی وہ ہے جس سے نفس کو سکون اور اطمینان حاصل ہو، اور قلب کو طمانیت حاصل ہو۔ گناہ وہ ہے جس سے نہ نفس کو سکون ہو اور نہ قلب کو اطمینان ہو اگرچہ فتویٰ دینے والے کتنے ہی فتوے دیا کریں۔

جب تم کسی کام کو کرنا چاہو تو اس کے انجام پر غور کرلو۔ اگر وہ بہتر ہے تو کر گزرو، اگر وہ برا ہو تو باز رہو۔

جس نے میانہ روی اختیار کی وہ کبھی محتاج نہ ہوا۔

(شاہین ہما حبیس آباد)

ایک دن آپ نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ" بابا! فقیروں سے عناد رکھنا بادشاہوں کو زیب نہیں دیتا۔"

بادشاہ نے جواب دیا" فقیروں کو بھی یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ بادشاہوں سے عناد رکھیں۔ یہ خواجہ نظام الدینؒ اپنے تئیں بڑا سمجھ کر ہمیں کیوں چھوٹا اور کمتر سمجھتے ہیں۔"

رکن الدینؒ نے دلیری سے کہا۔" ہم فقیر کسی کو بھی چھوٹا اور کمتر نہیں سمجھتے لیکن ہم چونکہ خود بھی دنیا کے مکروفریب سے بچتے اور دور رہتے ہیں، اس لئے جو لوگ اس میں مبتلا ہوتے ہیں ان سے بچتے اور دور رہتے ہیں اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ان کی برائیاں دور کردیں۔"

بادشاہ لاجواب ہوکر چپ ہوگیا۔

بابا رکن الدینؒ نماز جمعہ پڑھنے مسجد تشریف لے گئے۔ وہاں نظام الدینؒ پہلے ہی سے موجود تھے۔ آپ خاموشی سے کنارے بیٹھ گئے۔ جب نماز ختم ہوگئی تو خواجہ نظام الدینؒ اپنی جگہ سے اٹھے اور رکن الدینؒ کے پاس پہنچے۔ وہ سنتیں اور نفل پڑھ رہے تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ ان کے پیچھے بیٹھ گئے۔ سلام کے بعد دونوں کی ایک دوسرے سے نظریں چار ہوئیں اور دونوں نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ کچھ دیر دونوں نے کام کی باتیں کیں، اس کے بعد دونوں بزرگ اپنے اپنے ڈولوں میں بیٹھ کر رخصت ہوگئے۔

رکن الدینؒ تھے تو بادشاہ کے مہمان لیکن ان کا زیادہ وقت محبوب الٰہیؒ کے پاس گزرتا۔ ایک دن وہ خاص طور سے محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ میں تشریف لے گئے۔ اس دن رکن الدینؒ کے پاؤں میں بڑی تکلیف تھی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے کہا" حضرت! پاؤں میں تکلیف تھی تو ناحق تکلیف فرمائی، میں خود آجاتا۔"

بابا رکن الدینؒ نے جواب دیا" بابا نظام الدینؒ! میں تمہاری زیارت کو حج سے کم نہیں سمجھتا۔"

اس کے بعد بابا رکن الدینؒ نے ڈولے سے اترنے کی کوشش کی لیکن حضرت محبوب الٰہیؒ نے انہیں روک دیا، فرمایا" آپ ڈولے سے نہ اتریئے، ہم سب یوں ہی ڈولے کے پاس بیٹھ کر باتیں کرلیں گے۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ اپنے مریدوں کے ساتھ، ڈولے کے پاس بیٹھ گئے۔ اور بابا رکن الدینؒ سے باتیں کرنے لگے۔

بابا رکن الدینؒ نے کہا۔" بابا نظام الدینؒ! میں تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔"

محبوب الٰہیؒ نے جواب دیا" فرمایئے، بلکہ حکم دیجیے۔"

بابا رکن الدینؒ نے کہا" تمہارے بارے میں میں نے بادشاہ سے بات کی تھی، اور اسے منع کردیا ہے کہ وہ فقیروں سے عناد نہ رکھے۔ اگر ایسا کرے گا تو خود نقصان اٹھائے گا۔"

محبوب الٰہیؒ نے جواب دیا" یہ بادشاہ لوگ عناد اور کینہ کے مجسمے ہوتے ہیں، حالانکہ انہیں مخلوق کی اور ہم فقیروں کی مخالفت نہیں مول لینی چاہیے۔"

بابا رکن الدینؒ نے کہا" حکومت کا نشہ اور تعیشات انہیں خودسر اور عقل وخرد سے عاری کر دیتے ہیں لیکن ہمارا کام یہ ہے کہ ان کی اصلاح کا کوئی موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ چنانچہ ایک ایسا ہی وقت اس بادشاہ پر بھی پڑنے والا ہے اور اس وقت بادشاہ تم سے مدد چاہے گا تو تم اسے مایوس نہ کرنا۔"

محبوب الٰہیؒ نے جواب دیا" آپ خوب جانتے ہیں کہ درویشوں کا سینہ صاف ہوتا ہے اور یہ انتقام نہیں لیتے، پھر میں بادشاہ کو کیوں مایوس کروں گا۔"

اس وقت بابا رکن الدینؒ کے ساتھ ان کے بھائی شیخ عماد الدین اسماعیل بھی تشریف رکھتے تھے۔ انہوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی موجودگی کو غنیمت جانا اور سوال کیا" اگر آپ دونوں بزرگ اجازت دیں تو یہ ناچیز آپ دونوں سے بعض علمی نکات معلوم کرنے کی جسارت کرے۔"

دونوں نے اجازت دے دی، عماد الدینؒ نے پوچھا" یہ ہجرت نبوی میں، آپ دونوں کی نظر میں کیا مصلحت پنہاں تھی؟"

بابا رکن الدینؒ نے جواب دیا" رسول مقبولؐ کے بعض کمالات کی تکمیل مدینہ منورہ کی ہجرت ہی پر موقوف تھی، اس لئے آپ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ نے جواب دیا" لیکن اس ناچیز کے ذہن میں ایک اور بات آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبؐ کو مدینہ طیبہ اس لئے بھیجا تھا کہ وہ اصحاب مدینہ، جو اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے مکہ معظمہ حاضر ہونے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، وہ بھی رسول مقبولؐ کی ذات بابرکات سے مستفیض و مستفید ہوکر ظاہری اور باطنی کمالات میں مکمل ہوجائیں۔"

اس گفتگو کے بعد حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے ڈھلے ہی کے پاس کھانا منگوایا اور کھانے کے بعد اعلیٰ درجے کا کپڑا اور سو اشرفیاں بابا رکن الدینؒ کی خدمت میں بطورِ نذرانہ پیش کیں۔ آپ نے اشرفیاں دیکھ کر حضرت محبوبِ الٰہیؒ سے کہا ــ "اُستُر ذَھَبَکَ ط (آپ اپنا سونا چھپائیے۔)"

حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے برجستہ جواب دیا۔ "اُستُر ذَھَبَکَ وَذِھَابَکَ وَمَذھَبَکَ (اپنے سونے کو، جانے کو اور جانے کی جگہ کو چھپائیے۔)"

بابا رکن الدینؒ اس جواب پر مسکرائے، مگر اشرفیاں قبول کرنے میں تامل ہی رہا۔ حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے یہ اشرفیاں ان کے بھائی شیخ عماد الدین کے حوالے کردیں۔

اس کے بعد بابا رکن الدینؒ ملتان واپس تشریف لے گئے۔

کچھ ہی دنوں بعد بادشاہ کے پیٹ میں درد اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہی طبیبوں نے نہایت توجّہ اور انہماک سے علاج شروع کردیا لیکن عالم یہ تھا کہ جیسے جیسے حلق سے دوائیں اُتر رہی تھیں، بادشاہ کی حالت غیر ہوتی چلی گئی۔ بادشاہ کے اُمراء اور مقرّبینِ بارگاہِ شاہی بادشاہ کے روبرو فکرمند اور آزردہ کھڑے تسلّی تشفّی دیتے رہتے۔ بادشاہ نے بعض علماء سے پوچھا۔ "میری بیماری کو شاہی اطباء سمجھنے سے قاصر ہیں، میں خود بھی حیران ہوں کہ آخر یہ کیسا مرض ہے کہ جیسے جیسے دوائیں اندر پہنچ رہی ہیں، مرض میں شدّت اور سختی پیدا ہوتی جارہی ہے۔ کیا آپ لوگ بتاسکتے ہیں کہ یہ مرض ہی ہے یا کچھ اور؟"

کسی عالم نے ڈرتے ڈرتے اٹک اٹک کر جواب دیا۔ "اگر اس ناچیز کی صاف گوئی مزاجِ شاہی پر گراں نہ گزرے تو کچھ صاف صاف عرض کردیا جائے، کیونکہ حضورِ والا نے ہم ناچیزوں سے جس باب میں استفسار چاہا ہے، ضروری ہے کہ اسے صاف صاف، بے لاگ عرض کردیا جائے۔"

بادشاہ نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ "میری طرف سے اجازت ہے۔"

عالم نے عرض کیا۔ "حضورِ والا! ہماری ناچیز رائے میں حضور کی یہ پیچیدہ بیماری کوئی مرض نہیں ہے بلکہ اس گستاخی کا طمانچہ ہے جو بادشاہ کے دل میں حضرت نظام الدینؒ سے سوءِ ظنی کی صورت میں پیدا ہوئی ہے، اس لئے اس مرض کا اگر کوئی علاج ممکن ہے تو یہ ہوسکتا ہے کہ حضرت نظام الدینؒ سے بادشاہ کی طرف سے معافی چاہی جائے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "تمہارے دل میں یہ خیال کس طرح آیا؟"

عالم نے جواب دیا۔ "میں نے کسی شخص سے یہ سُنا ہے کہ بابا رکن الدینؒ ملتان روانہ ہونے سے پہلے یہ فرما چکے ہیں کہ بادشاہ کا فقیروں کے خلاف عناد اچھا نہیں ہے اور اس کی مضرّت عنقریب ظاہر ہوکر رہے گی۔"

بادشاہ نے بے چینی سے پوچھا۔ "اور، اور کیا فرمایا تھا بابا رکن الدینؒ نے؟"

عالم نے جواب دیا۔ "اور یہ فرمایا تھا کہ جب بادشاہ پر اس نوع کی ناقابلِ فہم افتاد پڑے تو بادشاہ کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ حضرت نظام الدینؒ سے معافی چاہے، اگر وہ معاف کردیں گے تو بادشاہ کو اس ناگہانی افتاد اور مضرّت سے نجات مل جائے گی۔"

بادشاہ خوفزدہ ہوگیا، کچھ دیر آنکھیں بند کئے سوچتا رہا اور روتا رہا۔ آنسوؤں نے داڑھی بھگودی اور شبنمی قطرات اس کے دونوں رخساروں پر زلمت کے موتی بن کر چمکتے رہے۔ پھر بادشاہ نے آنکھیں کھول دیں اور سرد آہ بھر کر کہا۔ "مجھ میں تو اتنی ہمّت ہے نہیں کہ میں خواجہ نظام الدینؒ کا سامنا کرسکوں۔"

عالم اور اس کے ساتھ چند اُمراء نے متفقہ عرض کیا۔ "اگر حضورِ والا اجازت مرحمت فرمائیں تو ہم لوگ خواجہؒ کی خدمت میں جاکر الحاح و زاری سے شفاعت کی کوشش کریں۔ ممکن ہے خواجہ نظام الدینؒ کو رحم آجائے اور چند الفاظ عفو و درگزر کے ادا ہوجائیں۔"

بادشاہ نے روتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں، آہستہ سے کہا۔ "ہاں، تم لوگ ان کی خدمت میں جاؤ اور جس طرح بھی مناسب اور ممکن سمجھو میری طرف سے معافی مانگ لو، اور ہر طرح یہ کوشش کرو کہ وہ مجھے معاف کردیں اور اگر وہ معاف کرنے پر رضامند نہ ہوں تو ان سے میری طرف سے درخواست کرنا کہ وہ میرے لئے موت کی دُعا کردیں تاکہ میں اس نزع سے زیادہ ناقابلِ برداشت اذیّت سے نجات حاصل کرلوں۔"

بادشاہ کا بہت بُرا حال تھا۔ وہ عالم اپنے ساتھ چند اُمراء کو لیکر اسی وقت حضرت محبوبِ الٰہیؒ کی خدمت میں روانہ ہوگیا۔ آپ کی خانقاہ کے باہر سائلوں اور حاجتمندوں کا میلہ سا لگا ہوا تھا۔ یہ لوگ چونکہ شاہی فرستادے تھے اس لئے کوشش کی کہ انہیں شاہی مناسبت سے کچھ رعایت عطا کی جائے اور انہیں فوراً ہی محبوبِ الٰہیؒ کی خدمت میں پہنچا دیا جائے۔ لیکن حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے خدمتگار نے عرض کیا۔ "بابا! یہ شاہی دربار نہیں ہے جہاں لوگ اپنے دنیاوی مراتب سے رعایتیں حاصل کرلیا کرتے ہیں۔ یہ درویشی دربار ہے، جو پہلے آیا ہے، پہلے جائے گا۔ جو بعد میں آیا ہے، بعد میں جائے گا۔"

عالم نے انتہائی خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "ہم رعایت نہیں چاہتے، بادشاہ کی حالت انتہائی خراب ہے، اس کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ تم اندر جاکر حضرت خواجہؒ صاحب سے یہ کہہ دو کہ چند صد درجہ غرض مند فوری باریابی کے طالب ہیں۔ وہ جیسا جواب دیں گے، ہم اُس پر راضی ہوجائیں گے۔"

خدمتگار مُنہ بناتا ہوا اندر چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس آکے جواب دیا۔ "آپ لوگوں کو اندر طلب کیا جارہا ہے۔"

عالم درباری اُمراء کے ساتھ حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے سامنے جا کھڑا ہوا، علیک سلیک کے بعد عالم نے بڑے فصیح و بلیغ لہجے میں بادشاہ کی تقصیر، سوءِ ظنی اور بیماری کے بارے میں عرض کیا اور بعد میں کہا۔ "حضور تو جانتے ہی ہیں کہ شاہوں میں ظرف اور استغنار کی کمی ہوتی ہے، چنانچہ اس کی انہیں سزا بھگتنا پڑتی ہے۔ ہمارے بادشاہ نے بھی ایسی ہی غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے لیکن یہ دربار، جہاں اس وقت ہم گنہگار کھڑے ہیں، ایسا ہے کہ گنہگاروں کو بخشش اور خطا کاروں کو عفو و ترحم کے مژدے سُنائے جاتے ہیں۔ بادشاہ نے حضورِ والا کے خلاف اپنے اندر عناد اور کینہ کا پھوڑا پال رکھا ہے، اب وہ پھوڑا بادشاہ کے چین اور سکون کو غارت کرکے اسے زندگی سے عاجز اور درماندہ کردیا ہے۔ ہم خدّامِ شاہی اور نمک خوارانِ عالم پناہی حضور کی خدمت میں عفوِ تقصیر کے لئے حاضر ہوئے ہیں اور بادشاہ کی طرف

سے معافی کی درخواست کرتے ہیں۔"

حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے دریافت کیا۔"خود بادشاہ کیوں نہیں آیا؟"

ایک امیر نے جواب دیا۔"خواجۂ خواجگانؒ! ظلِ اللہ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ حاضری دے سکیں۔"

آپ نے کہا۔"شاہی رعونت اور کبرِ اقتدار و اختیار ابھی تک سر میں موجود ہے۔"

عالم نے بادشاہ کی وکالت کی۔"حضرت! یہ بات نہیں ہے، بادشاہ سلامت بھی حضور کی خدمت میں شکرانے کے لئے حاضر ہوں گے اور شاید دو ایک دن میں ہی حاضر ہو جائیں۔"

آپ نے جواب دیا۔"اگر بیٹ کا یہ مہلک درد بھی بادشاہ کی رعونت دور نہیں کر سکا تو میری دعا اس درد کو کس طرح دور کرے گی۔ جاؤ، اپنے بادشاہ سے جا کر کہہ دو کہ صبر کرے اور انتظار کرے کہ مکافاتِ عمل کا ظہور کس طرح ہوتا ہے۔"

عالم نے بڑے افسوس سے کہا۔"تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ حضور مراحمِ درویشانہ سے کام نہیں لیں گے؟"

آپ نے جواب دیا۔"یہ بات بھی نہیں ہے بلکہ بادشاہ سے کہو کہ پیاسے کنوئیں کے پاس جاتے ہیں، کنواں پیاسوں کے پاس نہیں جاتا۔"

عالم نے پوچھا۔"تو گویا بادشاہ کو یہاں آنا ہی پڑے گا؟"

"ہاں، اگر اس کی انا یہاں آنے کی اجازت دے، میں اس کے حق میں دعا ضرور کروں گا۔"

ایک امیر نے کہا۔"حضرت! بیماری نے بادشاہ کو اتنا عاجز اور پریشان کر رکھا ہے کہ اس نے ہم سے یہ بھی کہا ہے کہ اگر آپ ان کی صحت کے بارے میں دعا نہ کر سکیں تو موت کے لئے دعا ضرور کریں تاکہ انہیں ایک ایسی اذیت سے نجات مل جائے، جس نے ان کے سوتے جاگنے اور کھانے پینے کو حرام کر رکھا ہے۔"

آپ نے ناراض ہو کر جواب دیا۔"اے شخص! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ہم درویش حسد اور انتقام کی دکان کھولے بیٹھے ہیں۔ یاد رکھ، ہم انسانوں کے روحانی اور معاشرتی امراض کا علاج کرتے ہیں، مرض نہیں دیتے۔ تو نے ہمیں غلط سمجھا ہے اور تو بھی کیا کرے، مجبور ہے۔ کیونکہ شاہوں کے مرض متعدی ہوتے ہیں۔ جو روحانی امراض شاہوں کو لگتے ہیں، ان ہی میں ان کے امراء اور مصاحبین بھی گرفتار ہو جاتے ہیں۔ جاؤ، پہلے درویشوں سے بات کرنے کا سلیقہ اور ادب سیکھ آؤ، اس کے بعد اپنے بادشاہ کی وکالت کرو۔ ورنہ تم نادان دوست اپنے آقا کو اور زیادہ دکھوں میں مبتلا کر دو گے۔"

وہ لوگ بے نیل و مرام، افسردہ اور اداس وہاں سے چلے آئے اور بادشاہ کو ساری تفصیل سنا دی۔

عالم نے کہا۔"خواجہ نظام الدینؒ بضد ہیں کہ حضور خود حاضری دیں اور اپنی زبان سے معذرت اور معافی چاہیں۔"

اس امیر نے، جسے حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے ڈانٹ دیا تھا، عرض کیا۔"اس ناچیز کی سمجھ میں تو آئے نہیں خواجہ نظام الدینؒ۔ میں تو ان سے بات کر کے بہت مایوس ہوا۔"

بادشاہ نے کراہتے ہوئے امیر کو ڈانٹ دیا۔"او نامراد! بند کر اپنی بکواس۔ میں تو بھگت ہی رہا ہوں، تو بھی کسی آزار میں گرفتار ہو جائے گا۔ میرے حق میں حضرت خواجہؒ کی تشخیص بالکل درست ہے۔ میں ان کی خدمت میں خود حاضری دیتا لیکن میری شاہی انا میرے پاؤں پکڑے ہوئے ہے۔"

عالم نے پوچھا۔"تو کیا حضورِ والا حضرت خواجہؒ کی خدمت میں تشریف لے جائیں گے؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔"میرے مرض اور انا میں جنگ جاری ہے، پتہ نہیں کون جیتے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ میری انا دب جائے، مر جائے۔ میرے مرض نے مجھے زندگی سے عاجز کر دیا ہے۔ شاید زندگی کی خواہش ہی میری شاہی انا کو شکست دے دے۔"

عالم اور امراء خاموش ہو گئے۔

بادشاہ پریشان اور سوگوار اپنی آنکھیں بند کر کے آہ آہ کرنے لگا۔

درد میں اور اضافہ ہو گیا، زندگی ہی میں موت کی لذت کا اندازہ ہونے لگا۔ بادشاہ کے چاروں طرف شاہی خواتین اور بیگمات جمع تھیں، انہی میں بادشاہ کی ماں بھی موجود تھی۔ ماں نے بیٹے پر جھک کر دریافت کیا۔"بیٹے! تکلیف کا کیا حال ہے؟"

بادشاہ نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔"ماں! اتنا برا حال ہے کہ میں اس

معراج کی پانچ منزلیں

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کون ہے جو مجھ سے یہ چند کلمات حاصل کرے پھر ان پر عمل کرے یا پھر کسی ایسے شخص کو سکھائے جو ان پر عمل کرے۔

میں نے عرض کیا۔" یا رسول اللہ میں۔"

پھر آپ نے میرا سیدھا ہاتھ پکڑا اور گن کر پانچ باتیں ارشاد فرمائیں۔

۱۔ ممنوعات سے بچو۔ سب سے بڑے عبادت گذار بن جاؤ گے۔

۲۔ اللہ نے جو کچھ تمہارے نصیب میں رکھ دیا ہے اس پر راضی رہو سب سے زیادہ خوشحال بن جاؤ گے۔

۳۔ اپنے پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کرو، مومن بن جاؤ گے۔

۴۔ لوگوں کے لئے وہ ہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرو، مسلم بن جاؤ گے۔

۵۔ زیادہ ہنسنے سے پرہیز کرو، کیونکہ زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔

(ربیعہ مریم۔ کراچی)

تکلیف پر موت کو ترجیح دیتا ہوں اور جس اذیّت سے دوچار ہوں، اُسے لفظوں میں نہیں بیان کیا جاسکتا۔"

ماں نے آنسو بہاتے ہوئے دریافت کیا۔ "خواجہ نظام الدّینؒ کے پاس جو مُنکواران شاہی گئے تھے، وہ کیا جواب لائے ہیں؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "میں نے اُن کا اتنا دل دُکھایا ہے کہ خواجہ نظام الدّینؒ کا میرے لئے دُعا پر دل راغب ہی نہ ہوتا ہوگا۔ ہاں، اگر میں خود ان کے قدموں میں جاگروں تو وہ مجھ پر ضرور توجّہ دیں گے۔"

ماں نے پوچھا۔ "پھر وہاں جانے میں کیا امر مانع ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "وہاں جانے میں کون سا امر مانع ہوسکتا ہے، جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔"

ماں نے کہا۔ "وہاں تم نہیں جاؤ گے، میں جانتی ہوں، وہاں جانے میں شاہی انا مانع آرہی ہے۔"

بادشاہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "کیسی انا اور کہاں کا کبر شاہی؟ میں خواجہ نظام الدّینؒ کی پابوسی کو ضرور جاؤں گا۔"

ماں نے کہا۔ "نہیں، وہاں تم نہیں، میں جاؤں گی اور دیکھوں گی نظام الدّینؒ تمہاری صحت یابی کے لئے کیوں دُعا نہیں کرتے۔"

بادشاہ کے چہرے پر تازگی سی دوڑ گئی، کہا۔ "اگر ایسا ہوجائے تو بہت اچھا ہو۔"

ماں نے اُسی وقت جانے کی تیاری کردی۔

خواجہ نظام الدّینؒ کو جب یہ بتایا گیا کہ مادرِ بادشاہ باریابی کی اجازت چاہتی ہیں، تو حکم دیا۔ "انہیں اسی وقت عزّت اور احترام کے ساتھ حاضر کیا جائے۔"

چنانچہ مادرِ سلطان آپ کی خدمت میں پہنچا دی گئیں۔ خواجہ نظام الدّینؒ نے پوچھا۔ "آپ نے کیسے زحمت فرمائی ہے؟"

بادشاہ کی ماں نے جواب دیا۔ "یا خواجہؒ! جس ماں کا بیٹا زندگی اور موت کی کشمکش میں بدترین اذیّتیں جھیل رہا ہو اس کے دل سے پوچھو، میں اسی سلسلے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں، میں اپنے بیٹے کے لئے پاتال تک کا سفر کرسکتی ہوں۔"

آپ نے کہا۔ "مائی! تم یہ بتاؤ کہ نظام الدّینؒ کوئی طبیب ہے۔ تمہارا بیٹا بیمار ہے تو علاج کراؤ۔ وہ تو ظلِ اللہ ہے، عالم پناہ ہے، اس کے پاس کس چیز کی کمی ہے؟"

دُکھیاری ماں نے جواب دیا۔ "یا خواجہؒ! آپ نے جو کچھ فرمایا بجا ہے۔ میرا بیٹا ظلِ اللہ کہلاتا ہے، عالم پناہ کہا جاتا ہے، لیکن یہ سارے خطابات اسے اس کے اُمرا اور منصب داروں نے دے رکھے ہیں، اس میں اس کی کیا خطا ہے؟"

محبوب الٰہیؒ نے کہا۔ "وہ کسی نے بھی دے رکھے ہوں لیکن یہ بتاؤ کہ خدائی کارخانے میں نظام الدّینؒ کا کیا دخل ہے؟"

ماں نے کہا۔ "خواجہؒ! اتنے بے تعلق نہ بنیے، میں بڑی اُمیدیں لے کر آئی ہوں۔" آپ نے جواب دیا۔ "اُمیدیں خدا سے رکھو، ایک عاجز بندے سے اُمیدیں وابستہ کرنا زیب نہیں دیتا۔"

ماں نے کہا۔ "اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں یوں ہی بے نیل و مرام چلی جاؤں گی تو غلط ہے، میں دُعائے صحت یابی لینے آئی ہوں اور اسے لیکر ہی ٹلوں گی، چاہے کچھ بھی ہوجائے۔"

آپ نے فرمایا۔ "مائی! میں نے کہہ جو دیا کہ خدائی کارخانے میں نظامؒ کا کیا دخل؟ اور رہا یہ امر کہ تمہارے بیٹے کا علاج معالجے سے فائدہ نہیں ہو رہا تو یاد رکھو، دوا اور درد دونوں ہی تقدیری حرف ہیں، ان پر انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے۔"

بادشاہ کی ماں نے کوئی جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کی۔ آپ نے محسوس کرلیا کہ یہ بڑی بی اپنا مطلب حاصل کئے بغیر نہیں اٹھیں گی تو آپ نے فرمایا۔ "میں تمہارے بیٹے کے لئے ایک شرط پر دعا کرسکتا ہوں۔ جاؤ، اور اپنے بیٹے سے معلوم کرو کہ اسے میری یہ شرط منظور ہے یا نہیں؟"

ماں نے دریافت کیا۔ "کون سی شرط؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اگر میری دُعا سے تیرا بیٹا صحت یاب ہوجائے تو اسے اپنی سلطنت میرے حوالے کردینا ہوگی۔"

یہ بہت بڑی شرط تھی لیکن زندگی سے قیمتی نہیں تھی۔ آپ نے متامّل جو دیکھا تو فرمایا۔ "کیا سوچنے لگیں ہمارا اپنے بادشاہ بیٹے کو میری شرط بتادو اگر وہ میری شرط مان لے تو میرے پاس اس کا قارورہ بھیج دینا تاکہ میں اس کا علاج شروع کروں۔"

ماں نے کہا۔ "جب یہ سلطنت آپ کی ہوچکی ہوگی تو ہماری کیا حیثیت ہوگی؟"

آپ نے جواب دیا۔ "کل کس کی کیا حیثیت ہوگی، اس کا صحیح علم اس خدا کو ہے جو عالم الغیب کہلاتا ہے۔"

ماں جانے لگی تو آپ نے مزید فرمایا۔ "اور ہاں، میری شرط کے مطابق بادشاہ اس کی منظوری اور پابندی کے لئے ہمیں ایک تحریری عہدنامہ بھیجے گا اس میں وہ صاف صاف اقرار کرے گا کہ اگر بادشاہ میری دُعا کے بعد اچھا ہوگیا تو وہ اپنی حکومت ہمارے حوالے کردے گا، اور اپنے اس عہدنامے پر اپنے نامی گرامی اُمرا اور منصب داروں کے گواہی میں دستخط ضرور کرائے گا۔"

ماں یہ سوچتی ہوئی شاہی محل واپس ہوئیں کہ شاید اتنی بڑی قیمت ادا کرنے پر ان کا بیٹا آمادہ نہ ہو۔ لیکن جب بادشاہ کو اس شرط کا علم ہوا تو اس نے ماں سے کہا۔ "ماں! میں تو اپنی زندگی سے عاجز آیا ہوا ہوں، یہ حکومت کیا چیز ہے؟ خواجہ نظام الدّینؒ کو مطلع کردیجئے کہ مجھے ان کی شرط منظور ہے، میں خود بھی اس حکومت سے عاجز آیا ہوا ہوں، وہ سنبھالیں میری سلطنت۔"

ماں نے جواب دیا۔ "تب پھر اس کا ایک عہدنامہ تیار کرو اور اس پر اپنے نامی گرامی اُمرا اور منصب داروں کے دستخط کرا کے اپنے قارورے کے ساتھ خواجہ نظام الدّینؒ کی خدمت میں روانہ کردو۔ وہ فوراً ہی دوا یا دُعا کر کے تمہیں صحت یاب کردیں گے۔"

بادشاہ نے اس پر فوراً عملدرآمد کیا اور دوسرے ہی دن عہد نامہ اور قارورہ ایک ساتھ آپ کی خدمت میں بھجوا دیئے۔

آپ نے ان دونوں چیزوں کو پلٹتے ہی بادشاہ کی صحت یابی کے لئے دُعا کی، جو قبول ہوئی اور بادشاہ کو پیٹ کے درد سے نجات ملی۔ جب وہ بالکل صحت یاب ہوگیا تو اس نے اپنے چند اُمراء آپ کی خدمت میں بھیجے اور معلوم کیا کہ از روئے معاہدہ وہ حکومت اپنی تحویل میں لینے کے لئے کب تشریف لا رہے ہیں؟"

آپ نے بادشاہ کے عہد نامے کو گول گول لپیٹ کر قارورے میں ڈال دیا اور کہا "جاؤ! اپنے بادشاہ سے جاکر کہہ دو کہ میں نے رکن الدینؒ کی خواہش اور سفارش پر اس کے حق میں صحتیابی کی دُعا کر دی تھی۔ اور رہا دولت اور حکومت اپنی تحویل میں لینے کا معاملہ، تو بادشاہ کو واشگاف لفظوں میں بتا دینا کہ اس کی سلطنت، درویش کے نزدیک بیمار کے پیشاب کے برابر ہے۔ میں اس کی حکومت لیکر کیا کروں گا۔"

جب بادشاہ کو یہ پیغام ملا تو وہ زار و قطار رویا اور اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔

بابا رکن الدینؒ ایک بار پھر دہلی تشریف لے گئے۔ آپ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی دُعا نے بادشاہ کو صحتیاب کر دیا تھا۔ قطب الدین خلجی کا دور ختم ہوا، اس کی جگہ غیاث الدین تغلق نے سنبھالی۔ یہ بھی خواجہ نظام الدینؒ سے بُغض رکھتا تھا، لیکن رکن الدینؒ کی عزت کرتا تھا۔ ایک دن بادشاہ غیاث الدین تغلق نے اپنے ایک ایسے امیر سے، جو رکن الدینؒ کے پاس آتا جاتا رہتا تھا، کہا۔ "ظہیر الدین! تم ایک عرصے سے رکن الدینؒ کے پاس آ جا رہے ہو، مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے ان کی کوئی کرامت بھی دیکھی ہے؟"

ظہیر الدین نے جواب دیا۔ "ظلِ الٰہی! میں آپ کی بات کا جواب دو دن بعد دوں گا۔"

اس کے بعد ظہیر الدین، رکن الدینؒ کی خدمت میں پہنچ گیا، لیکن کسی قسم کے سوال جواب کے بغیر ہی واپس آ گیا۔ رات کو بستر پر لیٹے لیٹے وہ سوچتا رہا کہ بادشاہ نے رکن الدینؒ کی بابت جو کچھ پوچھا تھا، وہ غور طلب ضرور ہے۔ اس نے سوچا کہ میرا علم رکن الدینؒ سے کچھ زیادہ ہی ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ رکن الدینؒ کی تو بہت زیادہ عزت کرتے ہیں مگر میری نہیں کرتے۔ کیا اس کی یہ وجہ تو نہیں کہ رکن الدینؒ کے پاس کوئی ایسا عمل ہو جس کے زیر اثر لوگ ان کی عزت کرنے پر مجبور ہوں۔

یہ سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔ اس نے خواب میں دیکھا رکن الدینؒ اُسے حلوہ کھلا رہے ہیں۔ حلوہ کھا چکنے کے بعد اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے حلوے کی لذت اپنے مُنہ میں محسوس کی اور یہ لذت صبح تک باقی رہی۔ ظہیر الدین نے سوچا، شاید یہی رکن الدینؒ کی کرامت ہو۔ لیکن پھر فوراً ہی یہ خیال آیا کہ اگر یہ کرامت ہے تو اس کرامت پر یقین کیسے کیا جائے۔ شیطان بھی تو حلوہ کھلا سکتا ہے۔ یہ صبح ہی صبح رکن الدینؒ کی خدمت میں چل دیئے اور راستے بھر یہ سوچتے رہے کہ آج میں ان سے پوچھوں گا کہ وضو کے دوران کُلّی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے کا کیا مطلب ہے اور اس میں کون سی حکمت پوشیدہ ہے؟

جب یہ رکن الدینؒ کی خدمت میں پہنچے تو انہیں دیکھتے ہی آپ نے فرمایا۔ "بابا ظہیر الدین! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا، آج میں تم پر چند باتیں واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ جنابت کی کتنی قسمیں ہیں؟"

ظہیر الدین نے جواب دیا۔ "نہیں، شیخ! میں نہیں جانتا۔"

آپ نے فرمایا۔ "دو طرح کی، جنابتِ جسمانی، جنابتِ قلبی۔ جنابتِ جسمانی کا سبب تو ہر کوئی جانتا ہے لیکن یہ دوسری جنابت، جسے میں نے جنابتِ قلبی کہا ہے، یہ ناہموار لوگوں کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے۔ جنابتِ جسمانی کو تو پانی سے پاک کیا جا سکتا ہے، لیکن دل کی جنابت آنکھوں کے پانی سے دُور ہوتی ہے۔ تم دل کی جنابت کی ناپاکی میں مبتلا ہو۔"

اس کے بعد آپ نے ذرا خاموشی اختیار کی، پھر فرمایا۔ "جانتے ہو، پانی میں کتنی صفتیں ہوتی ہیں؟"

ظہیر الدین نے جواب دیا۔ "آپ ہی ارشاد فرمائیں۔"

آپ نے کہا۔ "پانی میں تین صفتیں پائی جاتی ہیں، رنگ، بُو اور مزہ۔ شریعت نے اس لئے وضو میں کُلّی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے کو مقدم رکھا ہے، آنکھ سے پانی کا رنگ معلوم ہو جاتا ہے، کُلّی سے اس کے مزے کا علم ہو جاتا ہے اور ناک میں پانی ڈالنے سے اس کی بُو کا پتہ چل جاتا ہے۔" سب سے آخر میں فرمایا۔ "ظہیر الدین! میرا یہ نکتہ بھی خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ جس طرح شیطان کسی نبی کی شکل اختیار نہیں کر سکتا اسی طرح وہ شیخِ حقیقی کی صورت بھی نہیں اختیار کر سکتا۔"

ایفائے عہد

ایران کا سردار ہرمزان حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے اُس کے قتل کا فرمان صادر کر دیا۔

ہرمزان نے آپ سے پانی طلب کیا۔ حضرت عمرؓ نے اُسے پانی پیش کیا۔

ہرمزان نے آپ سے درخواست کی "امیرالمومنین! اگر آپ مجھے قتل ہی کرنا چاہتے ہیں تو پانی پینے کے بعد قتل کیجئے گا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "منظور۔"

ہرمزان نے پانی پھینک دیا۔ بولا "یہ لیجئے۔ میں پانی پیوں گا ہی نہیں، مجھے آزاد کر دیجئے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "گو کہ تو نے مجھ سے وعدہ لینے میں بڑی چالاکی سے کام لیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں اس کی پابندی کروں گا۔"



[redacted]

ظہیر الدّین کو اپنے تمام وسوسوں کا جواب مل چکا تھا۔ اس وقت ظہیر الدّین کا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔

جب غیاث الدّین تغلق کو اس واقعے کا علم ہوا تو وہ آپ کی بیحد عزّت کرنے لگا۔

ایک دن ایک عرب درویش آپ کی خانقاہ میں آکر ٹھہرا۔ آپ نے اپنے خادمِ خاص کے ذریعے اس کی خدمت میں کھانا بھجوایا۔ خادم نے عرب درویش سے پوچھا۔ "کیا تم نے شیخؒ سے ملاقات کی ہے؟"

عرب درویش نے جواب دیا۔ "نہیں تو۔"

خادم نے پوچھا۔ "کیا تم شیخ کو دیکھنا چاہتے ہو؟"

عرب درویش نے جواب دیا۔ "میری کیا مجال کہ ان سے ایسی کوئی بات کہوں یا وابستہ کروں۔"

خادم نے یہ باتیں آپ کو بتا دیں۔ آپ نے کہا۔ "عرب درویش سے کہہ دو، اس کے آنے کی ضرورت نہیں ہے، میں خود حاضر ہوا جاتا ہوں۔"

آپ اس ٹوہ میں رہے کہ جب بھی آپ اس درویش کو فارغ بیٹھے دیکھیں گے، اس کے پاس پہنچ کر باتیں کرنے لگیں گے۔

ایک دن یہ موقع ہاتھ آ ہی گیا اور آپ اس عرب درویش کے پاس بیٹھ کر دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے لگے۔ عرب درویش آپ کی اس خوش اخلاقی سے بہت متاثر ہوا۔ آپ عرب درویش کے پاس سے اُٹھ کر اپنے خیمے کی طرف جا رہے تھے کہ ایک شخص سے راستے ہی میں مڈبھیڑ ہو گئی، اس نے آپ کا راستہ روک لیا، بولا۔ "رکن الدّینؒ! تم نے مجھے نہیں پہچانا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، اس وقت میرا حافظہ کام تو نہیں دے رہا ہے لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ میں اُن کے بیشتر لوگوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

اس شخص نے پوچھا۔ "آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں آپ سے اچھی طرح واقف ہوں گا اور یہ کہ میں ان کے بیشتر لوگوں سے اچھی طرح واقف ہوں، یہ 'اُن کے بیشتر لوگوں' کا کیا مطلب ہوا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "کیا تُو مجھے ایک ایسے رشتے کا حوالہ نہیں دے گا جس میں تُو میرے استاد کا بیٹا ثابت ہو جائے گا۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "بیشک میں آپ کا اُستاد زادہ ہوں۔"

آپ نے اس لڑکے کے باپ سے صرف سورۂ اخلاص پڑھی تھی اس کے بعد کسی اور سے پڑھنے لگے تھے۔ آپ نے اس پڑھائی کا بھی بہت زیادہ خیال کیا، بولے۔ "بیشک تُو میرا استاد زادہ ہے۔ تُو مجھے اس طرح حکم دے سکتا ہے جس طرح آقا اپنے غلاموں کو دیا کرتے ہیں۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "بابا رکن الدّینؒ! میں آپ پر حکم چلانے نہیں آیا، مجھے دنیا کا مال درکار ہے اور اسی کی طلب میں حاضر ہوا ہوں، میری مُراد جتنی جلدی پوری کر سکیں، کر دیں تاکہ میں جہاں سے چلا آ رہا ہوں، وہیں واپس چلا جاؤں۔"

آپ نے اُسی وقت اسے مالا مال کر کے رخصت کر دیا۔

اُن دنوں بادشاہ نے سماع پر پابندی لگا دی تھی۔ دورانِ قیامِ دہلی بابا گنج شکرؒ کے عرس کے دن آ گئے۔ چنانچہ پاک پٹن کی طرح دہلی میں بھی عرس کا اہتمام کیا گیا۔ اس عرس میں بابا رکن الدّینؒ اور خواجہ نظام الدین اولیاءؒ دونوں برابر برابر بیٹھے اور محفلِ سماع شروع ہو گئی۔ کچھ دیر بعد خواجہ صاحبؒ پر وَجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ مضطرب ہو کر کھڑے ہونے لگے لیکن بابا رکن الدّینؒ نے دخل دیا اور زبردستی پکڑ کے بٹھا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد خواجہ صاحبؒ پر پھر وَجد کی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ کھڑے ہو گئے۔ اس مرتبہ رکن الدّینؒ نے انہیں نہیں بٹھایا اور دوسرے بزرگوں کی طرح خود بھی دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

محفلِ سماع کے خاتمے پر کسی شخص نے رکن الدّینؒ سے پوچھا۔ "یا شیخؒ! پہلی بار جب خواجہ نظام الدّینؒ کھڑے ہونے لگے تھے تو آپ نے انہیں بٹھا دیا تھا لیکن جب دوسری بار وہ کھڑے ہوئے تو آپ نے ایسا نہیں کیا۔ آخر کیوں؟ کوئی خاص وجہ؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، پہلی بار اُن کی رسائی عالمِ ملکوت (ملائکہ، ارواح اور نفوس کی دنیا) تک ہوئی تھی، وہاں تک میرا گزر بھی تھا، اس لئے میرا ہاتھ بھی وہاں تک پہنچ گیا اور میں نے انہیں بٹھا دیا تھا۔ لیکن دوسری بار خواجہ نظامؒ کی رسائی عالمِ جبروت (مقامِ وحدت) تک ہو گئی اور میں وہاں تک پہنچنے سے قاصر رہا۔"

کسی شخص نے خواجہ نظام الدّینؒ سے شکایت کی کہ میں آپ کے پاس جب بھی آتا ہوں، آپ مجھے کچھ نہ کچھ کھلاتے ضرور ہیں، لیکن اس کے برعکس میں بابا رکن الدّینؒ کے پاس کئی بار گیا مگر انہوں نے مجھے کچھ بھی نہیں کھلایا۔

خواجہ نظام الدّینؒ نے جواب دیا۔ "میں ہمیشہ اس حدیث پر عمل کرتا ہوں یعنی جو شخص زندہ کی زیارت کرے اور اس کے یہاں کچھ نہ چکھے تو گویا اس نے مُردہ کی زیارت کی۔"

اس شخص نے پوچھا۔ "کیا بابا رکن الدّینؒ نے یہ حدیث نہیں سُنی ہے؟"

حضرت خواجہ نظام الدّینؒ نے جواب دیا۔ "سُنی کیوں نہیں، لیکن شیخ رکن الدّینؒ عملِ معنوی کرتے ہیں اور زیارت کرنے والوں کو ذوقِ رُوحانی چکھاتے ہیں۔"

یہی شخص شیخ رکن الدّینؒ کے پاس گیا اور کہا۔ "خواجہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ آپ اپنے زیارت کرنے والوں کو ذوقِ روحانی دیتے ہیں اور میں ذوقِ جسمانی دیتا ہوں، کیا یہ درست ہے؟"

شیخ رکن الدّینؒ نے جواب دیا۔ "بھائی! نظام الدّینؒ میں دونوں وصف موجود ہیں، وہ ذوقِ رُوحانی بھی عطا کرتے ہیں اور ذوقِ جسمانی بھی۔"

عشرہ ذی الحجہ کا دن تھا، شیخ رکن الدّینؒ خواجہ نظام الدّینؒ سے



"جب تم کسی کے بارے میں کچھ سنو تو فوراً اس پر یقین مت کرو بلکہ اس کی چھان بین کر لو۔ یہاں تک کہ اس کی تحقیق ہو جائے، کیونکہ لوگوں کی عادت ہے کہ جب کسی کے بارے میں کوئی بُری بات سُنیں گے تو اس پر جلد یقین کر لیں گے اور پھر اُس کے پھیلانے کی فکر میں ہو جائیں گے"۔

(حدیثِ نبوی)

(رعنا سلیم۔ کراچی)

ملنے تشریف لے گئے۔ جب دونوں بزرگوں کا آمنا سامنا ہوا تو رکن الدینؒ نے محبوبِ الٰہیؒ سے کہا۔ "بابا نظام الدینؒ! یہ حج کا زمانہ ہے، میں حج کے لئے نہیں جا سکا لیکن یہ جانتا ہوں کہ حج کا ثواب میں تمہاری زیارت سے حاصل کر لوں گا۔"

خواجہ نظام الدینؒ آبدیدہ ہو گئے، فرمایا۔ "یہ تو آپ مجھ کو شرمندہ کر رہے ہیں۔"

شیخ رکن الدینؒ کے ایک مُرید تھے شیخ وجیہہ الدین سیاح۔ یہ سنام کے رہنے والے تھے، اسی نسبت سے سیاح سنامی کہلاتے تھے۔ انہیں شیخ رکن الدینؒ نے حکم دیا کہ۔ "خواجہ نظام الدینؒ کی خدمت میں رہو اور اس وقت تک رہو جب تک میں واپسی کی اجازت نہ دوں۔"

چنانچہ سیاح سنامی خواجہ نظام الدینؒ کی خدمت میں رہنے لگے۔

ایک دن یہ دونوں یکجا تھے۔ اتفاق سے ان کے سامنے سے اس عہد کا مشہور قوّال امیر حسن اپنے ساتھیوں سمیت گزرا۔ خواجہ نظام الدینؒ امیر حسن کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس نے ان دونوں بزرگوں کو یک جا جو دیکھا تو ان کے سامنے دست بستہ آکھڑا ہوا۔ عثمان سیاح، قوّال سے بہت اچھی طرح پیش آئے اور کچھ سُنانے کی فرمائش کی۔ امیر حسن نے جواب دیا۔ "حضرت! قوالی ممنوع ہے اور بادشاہ نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے۔"

شیخ عثمان نے کہا۔ "میں دروازہ اندر سے بند کر لوں گا، تم اپنے ساتھیوں کو لیکر اندر آجاؤ اور بادشاہ سے مت ڈرو۔"

خواجہ نظام الدینؒ نے بھی اصرار کیا۔ "امیر حسن! عثمان کو قوالی سُنا دو۔"

امیر حسن اپنے ساتھیوں سمیت اندر داخل ہو گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا اور امیر حسن نے دھیمی آواز میں قوالی شروع کر دی۔ جیسے جیسے وقت گزرا، عثمان پر جذب و بیخودی طاری ہوتی چلی گئی، عالمِ جذب و کیف میں قوال کو حکم دیا۔ "قوالی زور زور سے سُنائی جائے۔"

کسی مُرید نے کان میں کہا۔ "حضرت! اگر بادشاہ کو پتہ چل گیا تو سخت ناراض ہو گا اور معلوم نہیں کس مصیبت میں گرفتار کر دے۔"

عثمان نے جواب دیا۔ "بادشاہ سے مت ڈرو، بادشاہ سے مت ڈرو۔"

امیر حسن نے زور زور سے قوالی شروع کر دی، عثمان نے دوسرا حکم دیا۔ "دروازہ کھول دیا جائے۔"

لوگوں کو خوف ہوا کہ شاید اب قیامت آ کے رہے گی، لیکن دروازہ کھول دیا گیا۔ جس وقت دروازہ کھُلا، اُس وقت امیر حسن یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

زاہد زدیں برآمد و صوفی زاعتقاد ترسا محمدی شد و عاشق ہما کہ نیست

(زاہد دین سے اور صوفی اعتقاد کے دائرے سے نکل گیا، عیسائی مسلمان ہو گیا مگر عاشق میں کوئی تبدیلی نہ آئی، عاشق، عاشق ہی ہے)

شیخ عثمان کی اس شعر پر حالت بے قابو ہو گئی اور وہ خود بھی وارفتگی میں اسے بار بار دُہرانے لگے۔ اس جذب و کیف و مستی میں وہ مکان سے باہر نکل گئے۔ قوال اور اس کے ساتھی بھی آپ کے ساتھ ہو لئے اور اس شعر کو بار بار پڑھنے لگے۔ راستے میں تماشائی بھی ساتھ ہو لئے اور ان پر بھی وجدانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ یہ جمِ غفیر تغلق آباد کی طرف روانہ ہو گیا، یہاں تک کہ یہ لوگ شاہی محل کے سامنے پہنچ گئے۔ بادشاہ اس ہجوم کو دیکھ کر گھبرا گیا اور حکم دیا کہ "معلوم کیا جائے یہ ہجوم کیسا ہے؟"

کچھ دیر بعد خدام نے مطلع کیا کہ "شیخ عثمان نے محفلِ سماع قائم کر رکھی ہے۔"

بادشاہ سخت برہم ہوا، اس نے حکم دیا۔ "شرکاء و حضار کی فہرست پیش کی جائے۔"

کچھ دیر بعد ان کی فہرست بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دی گئی۔ اس میں خواجہ نظام الدینؒ کا نام نہیں تھا۔ بادشاہ کا غصّہ کم ہوا، اس نے شیخ عثمان کو بلوایا اور جب یہ لوگ بادشاہ کے سامنے پہنچے تو وہ ان لوگوں سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے شیخ عثمان اور ان کے ساتھیوں کو شاہی محل میں ٹھہرایا، شاہی مطبخ سے ان کی ضیافت و مہمان نوازی کی گئی۔ شیخ عثمان اپنے ساتھیوں سمیت تین دن تک بادشاہ کے مہمان رہے۔ بوقتِ رخصت بادشاہ نے شیخ عثمان کی خدمت میں ایک خطیر رقم پیش کی، لیکن شیخ نے اسے قبول نہیں کیا اور وہاں سے غیاث پور کی طرف روانہ ہو گئے۔

شیخ رکن الدینؒ نے بادشاہ کو سمجھایا کہ وہ خواجہ نظام الدینؒ سے عناد نہ رکھے، لیکن بادشاہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بادشاہ بنگالے کی ایک مُہم پر روانہ ہو گیا۔ شیخ رکن الدینؒ نے کہا۔ "خدا خیر کرے، درویش سے بادشاہ کا عناد رنگ لائے گا۔ بادشاہ کی سمجھ میں فقیر کی یہ بات نہیں آ رہی۔"

بادشاہ بنگالے کی مُہم سے فارغ ہو کر دہلی آ رہا تھا، دہلی میں داخلے سے پہلے ہی اس نے خواجہ نظام الدینؒ کو حکمیہ پیغام بھیجا کہ "میں دہلی آ رہا ہوں اور تمہیں حکم دیتا ہوں کہ میرے آنے سے پہلے ہی تم دہلی کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ۔"

بادشاہ کے حکم نے ہر کسی کو پریشان کر دیا لیکن آپ نے پیغام لانے والوں سے کہا۔ "ہنوز دِلّی دُور است۔ (ابھی دہلی دُور ہے)۔"

جب یہ بات شیخ رکن الدینؒ کو معلوم ہوئی تو آپ نے 'إنا للہ' پڑھ دی اور فرمایا۔ "لو بھائی! یہ بادشاہ بھی گیا۔ کیا میں نے اسے سمجھایا نہیں تھا کہ درویش

سے بادشاہ کا عناد رنگ لائے گا۔ اب وہ وقت زیادہ دُور نہیں ہے۔"

جب بادشاہ دہلی کے قریب آگیا تو شیخ رکن الدینؒ بھی اپنے مُریدوں کے ساتھ اس کے استقبال کو پہنچے، بادشاہ کے لئے ایک خاص کوشک تیار کی گئی تھی۔ بادشاہ نے اس کوشک میں قیام کیا۔ یہ کوشک افغان پور کے قریب تعمیر کی گئی تھی۔

بادشاہ نے کسی سے دریافت کیا۔ "کیا خواجہ نظام الدینؒ کو شاہی فرمان پہنچا دیا گیا ہے؟"

جواب دیا گیا۔ "پہنچا دیا گیا۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "انہوں نے کیا جواب دیا ہے؟"

کسی نے جواب دیا۔ "خواجہ نظام الدینؒ نے جواب دیا ہے 'ہنوز دِلّی دُور است'۔"

بادشاہ نے حیران ہو کر سوال کیا۔ "اس کا مطلب؟ اس طرح وہ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

شیخ رکن الدینؒ نے جواب دیا۔ "بابا نظام الدینؒ کے بزرگوں میں یہ دستور نہیں رہا ہے کہ شاہوں کی محفلوں اور درباروں میں حاضریاں دی جائیں، نظام الدینؒ کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھانا چاہتے جو ان کے بزرگوں نے نہ اُٹھایا ہو۔"

بادشاہ نے کہا۔ "حضرت! میں آپ کی باتوں کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکا۔"

شیخ رکن الدینؒ نے جواب دیا۔ "میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بادشاہوں کو درویشوں سے نہیں اُلجھنا چاہیئے کیونکہ وہ خود بھی بادشاہوں کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "حضرت! آخر آپ بھی تو ہیں کہ یہاں تک تشریف لا کر عزت افزائی فرمائی، اگر خواجہ نظام الدینؒ بھی اس طرح تشریف لے آتے تو کیا فرق پڑ جاتا۔"

شیخ رکن الدینؒ نے جواب دیا۔ "میں نے بتا تو دیا کہ بادشاہوں سے دُوری ان کے بزرگوں کا وتیرہ رہی ہے، بابا نظام الدینؒ نے اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر سفر کیا ہے، بادشاہ ان سے یہ اُمید نہ کرے کہ وہ شاہی رُعب اور ہیبت سے اپنا راستہ بدل دیں گے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "'ہنوز دِلّی دُور است' سے خواجہؒ کا کیا مطلب ہے؟"

شیخ رکن الدینؒ نے جواب دیا۔ "اشارۃً اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اس میں بادشاہ کو متنبہ کیا گیا ہے کہ بادشاہ نے یہی حکم تو دیا ہے کہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی بابا نظام الدینؒ دہلی سے کہیں اور چلے جائیں، جس پر انہوں نے یہ کہلا دیا ہے کہ ابھی دِلّی دُور ہے یعنی بادشاہ کے لئے دِلّی دُور ہی رہے گی، نہ بادشاہ دِلّی میں داخل ہو گا نہ بابا نظام الدینؒ کو دِلّی چھوڑنی پڑے گی۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "اب میں دِلّی میں نہیں داخل ہوں گا تو پھر جاؤں گا کہاں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اس کا علم تو بس عالم الغیب ہی کو ہو گا۔"

شاہی دسترخوان بچھا تو اس پر بادشاہ کے اُمراء اور خاص مصاحبین کے ساتھ شیخ رکن الدینؒ اور ان کے مُریدِ خاص شیخ عثمان سیاح سنامی اور دوسرے مُرید بھی شریکِ طعام ہوئے۔ شیخ رکن الدینؒ نے اچانک کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور بادشاہ سے کہا۔ "اب اکل و شرب بند کیجئے اور یہاں سے اُٹھ چلیئے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "کیا کوئی خاص بات ہے؟ میں تو اکل و شرب سے فارغ ہو کر ہی اس جگہ سے اُٹھوں گا۔"

شیخ رکن الدینؒ نے کچھ دیر بعد بادشاہ سے دوبارہ کہا۔ "بابا! اب زیادہ وقت نہ گنواؤ، یہاں مت ٹھہرو۔ اگر زندگی ہے تو ایسے ایسے ہزار موقع اکل و شرب کے ملیں گے۔"

بادشاہ نے ترنگ میں کہا۔ "اگر آپ کو جلدی ہے تو تشریف لے جائیے، میں بعد میں آجاؤں گا۔"

شیخ رکن الدینؒ اُسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ ہی ان کے مُرید بھی اُٹھ گئے۔ بادشاہ اپنے مخصوص اُمراء اور مصاحبین کے ساتھ وہیں بیٹھا رہا۔

شیخ رکن الدینؒ نے کوشک سے نکلتے ہوئے فرمایا۔ "بابا نظام الدینؒ کا قول پورا ہو گیا، بادشاہ کے لئے دِلّی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دُور ہو گئی۔"

ابھی آپ کا یہ فقرہ پورا ہی ہوا تھا کہ کوشک سے شور و غل بلند ہوا، سب نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، کوشک اپنے در و دیوار اور چھت سمیت غائب ہو چکی تھی، یہ ساری چیزیں بادشاہ اور اس کے ساتھیوں پر گر چکی تھیں گویا شاہی کوشک شاہی قبرستان بن چکی تھی۔ بادشاہ اپنے ساتھیوں سمیت اس میں دفن ہو چکا تھا۔

اس واقعے نے خواجہ نظام الدینؒ کا رُعب طاری کر دیا اور 'ہنوز دِلّی دُور است' نے ایک ابدی اور تاریخی حیثیت حاصل کر لی۔

شیخ رکن الدینؒ ملتان واپس چلے گئے۔ آپ کا اصول تھا کہ وضو کے بعد دُعائے وضو ضرور پڑھتے، لیکن ایک دن آپ یہ دُعا پڑھنا بھول گئے صرف الحمدللہ ہی کہہ کر رہ گئے۔ خادمِ خاص نے یہ تبدیلی بڑی شدت سے محسوس کی اور شیخ رکن الدینؒ کے نانا جان کو اس سے مطلع کیا۔ وہ شیخ کے پاس پہنچے اور اس کی وجہ دریافت کی۔ آپ نے جواب دیا۔ "آج جب میں وضو کر رہا تھا تو دل میں دنیا اور آخرت کا کوئی خیال ہی نہ آیا جس سے میں یہ سمجھا کہ آج میرا وصال ہو جائے گا۔ اس لئے میں الحمدللہ کہہ کر رہ گیا۔"

اس کے بعد آپ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ بس نماز فرض ادا کرنے کے لئے ہی حجرے سے باہر تشریف لاتے، اس کے بعد باہر نہیں نکلتے تھے۔

۱۶ رجب ۷۳۵ھ بروز جمعرات آپ نے اپنے خادمِ خاص کو بلایا اور اپنی تجہیز و تکفین کی باتیں کرنے لگے، کچھ وصیتیں کیں، اس کے بعد اپنے ایک بھائی کو خرقہ مسند و خلافت عطا کیا اور نمازِ مغرب ادا کرتے ہوئے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کی آخری آرامگاہ آپ کے والد اور دادا کے قریب ہی ملتان میں ہے اور آج بھی مرجع خواص و عوام ہے۔



سے آخری تو اس کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ وہ اس کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔

بیکی جب تک اسکول میں رہی، رالف کا یہی معمول رہا۔ برسوں تک وہ روزانہ سڑک کے کنارے لیٹ کر گھنٹوں بیکی کا انتظار کرتا رہا۔

گو کہ زمینوں پر وہ بہت خوش رہتا تھا لیکن موسم بہار آتا تو وہ کئی ہفتوں کے لیے پہاڑوں میں غائب ہو جاتا۔ موسم بہار درندوں کے لیے خاص موسم ہوتا ہے۔ ہمیں اس کی سلامتی کی فکر لگی رہتی کیونکہ عموماً انھی دنوں میں زمینداروں کے باڑوں میں نوزائیدہ بچھڑوں وغیرہ کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اور وہ درندوں کی طرف سے بہت محتاط رہتے تھے۔ راتوں کو باڑوں کے آس پاس کسی درندے کی موجودگی کا شبہ ہوتے ہی گولی چلا دیتے تھے لیکن رالف خوش قسمت تھا کہ ہر موسم بہار کے بعد وہ خیر و عافیت سے لوٹ آتا۔

ہم اکثر سوچا کرتے کہ اس کی مادہ نہ جانے کہاں ہوگی اور اس کے نہ جانے کتنے بچے ہوں گے۔ ہم نے سنا تھا کہ بھیڑیے کے بچے جب چھوٹے ہوتے ہیں اور مادہ ان کی نگرانی کر رہی ہوتی ہے تو بھیڑیا اپنی خوراک اٹھا کر اپنے کنبے کے پاس لے جاتا ہے تاکہ سب مل کر کھا سکیں۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہم رالف کو کھانے کے لیے جو کچھ دیتے تھے اس میں سے کتنا وہ اپنے بچوں کے لیے اٹھا کر لے جاتا تھا۔ ہر سال جون کے مہینے میں خاص طور پر بیکی اسے فاضل گوشت وغیرہ ڈالتی تھی کیونکہ ان دنوں وہ دُبلا ہونا شروع ہو جاتا تھا۔

ہماری زمینوں پر بارہ سال گزار کر رالف اور اس کے معمولات ہماری زندگی کا حصہ بن گئے اور ہماری بچی سے اس کی محبت میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی تھی لیکن ایک بار موسم بہار کے دوران وہ اس عالم میں واپس آیا کہ اس کے جسم پر دوبارہ گولی کا زخم تھا۔

چند زمیندار جن کی زمینیں ہماری زمینوں سے متصل تھیں، انھوں نے دوسرے روز یونہی باتوں ہی باتوں میں ہمیں بتایا کہ گزشتہ رات انھوں نے ایک بھیڑیے کی بڑی جسیم مادہ کو گولی مار کر ہلاک کیا ہے۔ انھوں نے اس کے ساتھی بھیڑیے پر بھی فائر کیے تھے لیکن وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہمارے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ وہ غالباً ہمارا رالف اور اس کی مادہ ہی تھے۔

بیکی اب پندرہ سال کی تھی۔ وہ ایک بار پھر رالف کا سر گود میں رکھ کر اس کی تیمارداری کے لیے بیٹھنے لگی۔ رالف کی عمر بھی یقیناً پندرہ ہی کے قریب ہو چکی تھی۔ یہ اس کے لیے بڑھاپے کی عمر تھی۔ اس کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس بار بل نے ہی رالف کے جسم سے گولی نکالی اور اس کی مرہم پٹی وغیرہ کی...

بیکی اس کا سر گود میں لیے بیٹھی ہوتی تو میرا ذہن ماضی کی طرف لوٹ جاتا اور میں چشم تصور میں تین سال کی گول مٹول بچی کو سیاہ رنگ کے جسیم بھیڑیے کا سر گود میں رکھے دیکھتی۔

رالف کا زخم زیادہ خطرناک نہیں تھا لیکن وہ صحت یاب نہیں ہو سکا۔ اس کا وزن تیزی سے کم ہوتا چلا گیا اور رفتہ رفتہ اس نے بیکی کی تلاش میں ادھر اُدھر دوڑنا یا دُم ہلاتے ہوئے اس کے پیچھے پھرنا بھی چھوڑ دیا۔ عموماً وہ سارا دن سر ڈالے خاموش پڑا رہتا لیکن رات کو وہ کسی نہ کسی طرح اُٹھ کر غائب ہو جاتا اور ساتھ ہی اس کی خوراک بھی غائب ہو جاتی۔

ایک روز ہم نے اُسے کھوکھلے تنے کے قریب مُردہ پڑا پایا — اس کا سر زمین پر ڈھلکا ہوا تھا اور زرد آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔ بیکی اس کا سر گود میں رکھ کر زار و قطار رونے لگی اور یہ منظر دیکھ کر میرا گلا بھی رُندھ گیا۔ بیکی بار بار یہی کہے جا رہی تھی۔ "مجھے اس کی اتنی کمی محسوس ہوگی... اتنا یاد آئے گا مجھے..."

میں اسے کمبل سے ڈھانپنے لگی تو کھوکھلے تنے کے اندر سے سرسراہٹ کی سی آوازیں سن کر ایک لمحے کے لیے ہم خوفزدہ سے ہو گئے پھر میں نے اور بیکی نے تنے میں جھانکا تو چھوٹی چھوٹی دو زرد آنکھیں معصومیت سے ہماری طرف دیکھتی نظر آئیں۔ وہ بھیڑیے کا ننھا سا بچہ تھا۔ رالف کا بچہ! اس کی ماں کی موت کے بعد رالف نے تنہا اس کی پرورش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر یقیناً اُسے احساس ہو گیا تھا کہ اس موسم بہار میں زندگی اس کا ساتھ نہیں دے سکے گی اور وہ اس بچے کو اٹھا کر وہیں لے آیا تھا جہاں سے خود اسے نئی زندگی، محبت اور تحفظ ملا تھا۔

بیکی نے بڑھ کر اس لرزتے کانپتے بچے کو گود میں اُٹھا لیا۔ وہ ریشم کے گولے کی طرح تھا۔ بیکی کے آنسو اس کے وجود میں جذب ہونے لگے۔

"گھبراؤ نہیں چھوٹے رالف۔" وہ مرتعش آواز میں بولی۔ "یہ میری ممی ہیں اور یہ بھی تم سے پیار کریں گی۔"

مجھے یوں لگا جیسے کھوکھلے تنے میں رالف نے ممنونیت سے دُم ہلائی ہو اور میں نے ہلکی سی 'تھپ تھپ' کی آواز سنی ہو۔

THE TAIL OF THE LOBO
Penny Porter.

خوش علی شاہ قلندرؒ

ضیاء تسنیم بلگرامی

دُنیائے تصوف کے ایک عہد کی داستان اُس دور میں دوسرے باکمال بھی موجود تھے۔
آپ نے اُن سے ملاقاتیں کیں اور اُن سے جو کچھ جس شکل میں بھی ملا، ہمارے
آپ کے لیے کتابی شکل میں محفوظ کر دیا۔
ہماری آپ کی اس نظر آنے والی دُنیا میں کوئی ایسی دُنیا بھی موجود ہے جو نظر نہیں
آتی۔ غیر نظری اور غیر مرئی دُنیا۔ اسے انسانی آنکھوں سے دیکھا اور عقل و منطق
سے سمجھا نہیں جا سکتا۔ حضرت خوش علی شاہ کا جن سے واسطہ پڑا
آپ نے اُن کو بھی اپنے سوانح میں شامل کر لیا
عالمِ بے بدل ایسے کہ ان کی موشگافیاں دلوں میں گھر کر گئیں۔
ایک قلندرِ بے مثل کی رُوداد جو کئی سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

ہندو جوگی

اور اس کی کھترانی بیوی کے بارے میں آپ کے ارادت مندوں نے پوچھا "حضرت! کہاں تو ایک زمانہ اس جوگی کا مرید اور عقیدت مند تھا۔ یہاں تک کہ راجا بھی اس پر اپنا بہت کچھ قربان کر چکا تھا پھر یہ شادی کرتے ہی کیسا انقلاب آ گیا کہ راجا نے اسے اپنی ریاست کی حدود سے نکلوا دیا!"

آپ نے فرمایا "اس سوال کا جواب مشکل نہیں ہے۔ اللہ کی مخلوق کا رویہ ایسا ہی ناپائیدار ہوتا ہے، ہمیں اس پر تکیہ نہیں کرنا چاہیے۔"

آپ کے ارادت مندوں کو جوگی اور اس کی بیوی سے بڑی ہمدردی ہو گئی تھی۔ پوچھا "ان دونوں کا مستقبل کیسا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "ایک چیز ہے صبر۔ اگر دونوں نے صبر و شکر سے کام لیا تو میں یہ یقین اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے مشکل دن گزر جائیں گے کیونکہ یہ محاورہ ہی نہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے یہ ایک امر بدیہی ہے ایک حقیقتِ ثابتہ، صبر کے بعد خوشی یقینی ہے اور بڑے بڑے تجربوں سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔"

آپ نے سیر و سیاحت کے بعد پانی پت میں قیام کیا تو آپ کے ارادت مندوں نے آپ کی صحبت سے فیض اُٹھانا شروع کر دیا۔

آپ سے مختلف نوعیت کے سوالات کیے جاتے۔ اور آپ اُن کے علمی، منطقی اور روحانی جوابات مرحمت فرماتے۔

ایک ایسے ہی اجتماع میں توحید اور سلوک پر بات ہونے لگی۔ اس موضوع پر آپ پہلے بھی کئی بار طلاقتِ لسانی کا مظاہرہ کر چکے تھے لیکن جن لوگوں نے آپ کی زبان سے اس موضوع پر کچھ نہیں سنا تھا وہ اصرار کرنے لگے کہ آپ انھیں بھی محظوظ اور مستفید فرمائیں۔

آپ سے پوچھا گیا "توحید کیا ہے اور اس کی کتنی قسمیں ہیں؟"

آپ نے لمحے بھر کے لیے سکوت اختیار کیا اس کے بعد فرمایا "توحید کی تین قسمیں ہیں اور جب میں ان اقسام کو الگ الگ بیان کروں گا تو اس میں توحید کی تعریف بھی آ جائے گی۔"

سامعین گوش بر آواز تھے، دنیا و مافیہا سے غافل، یہاں تک کہ اپنے ماحول تک سے بے نیاز اور بے خبر۔ ان کی آنکھیں آپ کے چہرے پر تھیں اور کان ہونٹوں سے نکلنے والی آواز کے منتظر۔

آپ نے فرمایا "توحید کی تین قسمیں ہیں۔ توحیدِ عام، اس کو توحیدِ شریعت بھی کہتے ہیں۔

دوسری توحیدِ خاص و توحیدِ طریقت۔

تیسری توحیدِ خاص الخاص و توحیدِ معرفت و حقیقت۔ اسے توحیدِ عالی بھی کہتے ہیں۔

توحیدِ عام میں جمہور خلائق شامل ہوتے ہیں۔ اس توحید کا احوال احکامِ شرعی کی اتباع پر منحصر ہے، زبان سے

لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہنا اور دل سے یکتائی حق پر اعتقاد رکھنا توحیدِ عام ہے اسے اچھی طرح سمجھ لو اور دل میں بٹھا لو۔"

سامعین نے سبحان اللہ، ماشاء اللہ، واہ وا کے نعرے لگائے اور ہجوم میں ہلچل اور بے چینی سی پیدا ہوگئی۔

"اب آئیں توحیدِ خاص کی طرف۔ تجلیاتِ ذاتِ مطلق کا قلب سالک پر متجلی ہونا اور ذرہ در آفتاب میں بے امتیازانہ کمی بیشی نورِ حق نظر آنا اور نورِ ذات کے سامنے ذراتِ وجودِ عالم کا معدوم ہو جانا اور ایک ذات کا نور پیشِ نظر رہنا توحیدِ خاص ہے۔"

اس کے بعد آپ نے قدرے توقف سے کام لیا۔ اس کے بعد توحیدِ خاص الخاص کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

"موحد کا بحر ناپیدا کنار توحید میں شناوری کرتے کرتے قعر دریائے اقدس میں غوطہ مارنا اور محو در محو اور فنا در فنا ہو جانا اور کل کائنات کو اپنی ہستی سمیت محو کرنا توحیدِ خاص الخاص ہے۔ توحیدِ خاص الخاص سے آمد و ئے فیوضِ باطنی حاصل ہوتی ہے۔ یہ توحید انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کا حصۂ خاص ہے۔"

سامعین ایسے محو اور مستغرق تھے کہ ان کی سانسوں کی آواز سنی جاسکتی تھی۔ توحید کا بیان ختم ہوا اور کسی کو ہوش ہی نہ آیا۔

کچھ دیر بعد کسی طرف سے آواز آئی۔ "حضور والا! اب ذرا سلوک کا بیان ہو جائے۔"

آپ نے فرمایا۔ "سلوک کے معنی از روئے عربی لغات 'چلنا' کے ہیں خواہ یہ سفر ظاہری ہو خواہ باطنی۔ لیکن اہلِ تصوف سیر فی اللہ مراد لیتے ہیں۔ سیر فی اللہ کی منازل بھی بہت زیادہ ہیں۔ اپنی ہستی سے گزر کر ہمہ تن اللہ کی طرف مائل ہو جانا بھی سلوک میں شامل ہے جس وقت تزکیۂ نفس ہو گیا اسی وقت تزکیۂ قلب بھی کرنا چاہیے اور تزکیۂ قلب، پاسِ انفاس کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ جب تو اللہ کے ساتھ ہو گیا تو تجھ کو کسی اور کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔"

آپ کی باتوں کا سحر سامعین پر دیر تک طاری رہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آپ بولتے رہیں اور وہ سنتے رہیں اور یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہ ہو۔

آپ کچھ دن پانی پت میں رہے اس کے بعد سیر و سیاحت کے شوق نے آپ کو پھر سفر پر کمربستہ کر دیا۔ آپ کے ارادت مند بھوپال میں بھی تھے۔ آپ بھوپال روانہ ہو گئے۔ بھوپال میں عبدالصمد خان نامی ارادت مند کے مہمان ہوئے۔ آپ عبدالصمد خان کو دوست رکھتے تھے۔ عبدالصمد کچھ پریشان پریشان نظر آتے تھے۔

آپ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے عبدالصمد خان؟ تم پریشان کیوں ہو؟"

عبدالصمد خان نے جواب دیا۔ "حضرت! میں پریشان کم اور حیران زیادہ ہوں۔"

آپ نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟ اس کا سبب؟"

عبدالصمد خان کو فکر تھی کہ وہ جو کچھ بتانا چاہتا ہے اس پر آپ یقین بھی کریں گے یا نہیں؟

آپ نے پوچھا۔ "تم کیا سوچ رہے ہو؟"

عبدالصمد خان نے جواب دیا۔ "یہی کہ میں جو کچھ بیان کرنے والا ہوں آپ اس پر یقین بھی کریں گے یا نہیں؟"

آپ نے فرمایا۔ "تم بیان تو کرو۔"

عبدالصمد نے بیان کیا۔ "آپ کی عدم موجودگی میں میں نے ایک مولوی صاحب سے درس لینا شروع کیا۔ مولوی صاحب میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے مجھے ان کی طرف متوجہ کر دیا۔ میں ان سے پڑھتا رہا، پڑھتا رہا۔ ان کی باتیں بڑی سادہ لوحی کی تھیں۔"

عبدالصمد خان اچانک چپ ہو گیا۔

آپ نے فرمایا۔ "پھر کیا ہوا؟"

عبدالصمد نے جواب دیا۔ "پھر میں نے یہ محسوس کیا کہ مولوی صاحب بیمار ہیں۔ ان کی صحت ان کا ساتھ نہیں دے رہی۔ میں نے ان سے پوچھا۔ مولوی صاحب! کیا بات ہے آپ اداس کیوں ہیں؟ مولوی صاحب نے جواب دیا۔ میں اداس نہیں، ذرا فکر مند ہوں۔"

میں نے پوچھا: وہ کیوں؟"
مولوی صاحب نے رازداری سے کہا: میری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تیری پڑھائی کا کیا ہوگا؟"

اس خبر نے مجھے بھی پریشان اور فکر مند کر دیا اور میں نے عرض کیا: استادِ محترم! آپ میری پڑھائی کی فکر نہ کریں، میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرے سامنے رہیں:

میرے جواب سے مولوی صاحب بہت خوش ہوئے اور فرمایا: اگر یہ بات ہے تو میں فکرمند یا پریشان نہیں ہوتا:

میں مولوی صاحب کی بات سمجھ نہیں سکا۔

ایک دن سو کے جو اٹھا تو مولوی صاحب کے پڑوسی نے غمزدہ آواز میں بتایا: مولوی صاحب وصال فرما گئے ہیں:

میں پریشان اُفتاں و خیزاں مولوی صاحب کے حجرے میں پہنچا، وہاں ان کا جسدِ خاکی اور بے روح جسم ساکت و صامت پڑا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

ایک شخص نے مجھے دلاسا دیا: کیوں روتے ہو؟ اس راہ سے ایک نہ ایک دن ہم سب گزریں گے۔ اس لیے اب ہمیں تجہیز و تکفین کی فکر کرنا چاہیے:

اس کی بات میری سمجھ میں بھی آگئی اور میں دوسروں کی مدد سے آپ کا جسد مردہ حجرے سے باہر لے آیا اور اسے غسل دیا۔ کفن تیار تھا۔ کسی نے مجھ سے کہا: ذرا حجرے میں جاؤ اور دیکھو وہاں عطر وغیرہ ہے یا نہیں، اگر ہے تو لے آؤ، ورنہ کہیں اور سے منگا یا جائے:

میں عطر کی تلاش میں حجرے میں داخل ہوا اور مولوی صاحب کے سامان میں اسے تلاش کرنے لگا۔

اتنے میں مولوی صاحب کی آواز سنائی دی: کیا تلاش کر رہے ہو عبدالصمد خان؟ عطر؟ وہ تو میرے پاس ہے، لو:

میں نے آواز کی طرف گھوم کر دیکھا تو مولوی صاحب بیٹھے نظر آئے۔ شاید میری چیخ نکل جاتی لیکن میں معلوم نہیں کس طرح خاموش رہا۔

مولوی صاحب نے عطر میری طرف بڑھایا: لو اور باہر جاؤ:

میں نے کہا: مولوی صاحب! میں عطر لے کر باہر چلا جاؤں گا لیکن اس سے پہلے آپ میری حیرت دور کریں:

مولوی صاحب نے پوچھا: وہ کس طرح؟"

میں نے پوچھا: آپ کا جسد بے جان تو باہر پڑا ہے مگر آپ یہاں نظر آ رہے ہیں، یہ کیا ہے؟"

مولوی صاحب نے جواب دیا: تم کو یاد ہوگا کہ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ پڑھائی کوئی خاص بات نہیں، میری جدائی تمھیں گراں گزرے گی چنانچہ میں نے خود دیکھ لیا کہ تم نے جو کچھ کہا تھا وہ درست تھا اس لیے میں حجرے میں آگیا:

میں نے پوچھا: تھوڑی سی دیر کے لیے یا...؟"

مولوی صاحب نے جواب دیا: میں اسی جگہ تم سے روز ملوں گا مگر..."

میں نے پوچھا: مگر کیا؟ مولوی صاحب؟"

مولوی صاحب نے جواب دیا: مگر یہ کہ ہم دونوں میں جو طے پایا ہے اس کا کسی اور کو علم نہیں ہونا چاہیے:

میں نے کہا: ”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

اتنے میں حجرے کے باہر سے آواز آئی: ”بھائی عبدالصمد خان! اندر حجرے میں کیا کرنے لگے؟ عطر ملا؟“

میں نے مولوی صاحب سے کہا: ”اچھا مولوی صاحب! میں چلتا ہوں۔ پھر آؤں گا۔“ اور باہر والوں کو جواب دیا: ”ہاں! عطر مل گیا، لا رہا ہوں۔“

جب میں عطر لے کر باہر نکلا تو کسی نے پوچھا: ”یہ اندر تم کس سے باتیں کر رہے تھے؟“

میں نے جواب دیا: ”کسی سے بھی نہیں، خالی حجرے میں میں کس سے باتیں کروں گا؟“

اس شخص نے میری بات پر یقین نہیں کیا اور کہا: ”باتیں تو تم کسی سے کر رہے تھے۔“

میں نے جواب دیا: ”میں وہاں بڑبڑا رہا تھا کہ مولوی صاحب نے حجرے کو کباڑ خانہ بنا دیا ہے اس میں عطر کہاں تلاش کروں۔“

کچھ دیر بعد میں نے مولوی صاحب کو اپنے پاس کھڑے دیکھا، وہ مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے، میں نے گھبرا کر دوسروں کی طرف دیکھا، وہ سب بے خبر اپنے اپنے کام میں مشغول تھے، ان کو مولوی صاحب دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

جنازہ تیار ہو گیا تو اسے لے کر مسجد کی طرف چلے گئے، مولوی صاحب ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت میں بہت پریشان تھا۔

نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ نمازِ جنازہ کے بعد میں ہجوم سے ہٹ کر ایک طرف گیا تو مولوی صاحب نے پوچھا: ”کیا بات ہے تم پریشان کیوں ہو؟“

میں نے جواب دیا: ”مولوی صاحب۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر آپ کو کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہو گا؟“

مولوی صاحب نے جواب دیا: ”تم بالکل فکر نہ کرو، عبدالصمد خان! تمھارے سوا مجھے کوئی بھی نہ دیکھ سکے گا، میری آواز بھی کوئی نہ سن سکے گا۔“

کسی نے مجھے آواز دی: ”عبدالصمد خاں! جنازہ قبرستان جا رہا ہے، تم یہاں کس سے باتیں کر رہے ہو؟“

میں نے مولوی صاحب سے کہا: ”میں آپ کے جنازے میں جا رہا ہوں، باقی باتیں بعد میں کروں گا۔“

جب میں دوبارہ شریک ہوا تو ایک شخص نے مجھ سے کہا: ”میرا خیال ہے تمھارا دماغی توازن برقرار نہیں رہا، یہ تم اپنے آپ سے کیوں باتیں کرتے رہتے ہو؟“

میں اس کو کیا جواب دیتا، کہا: ”میں نہیں جانتا کہ یہ مجھ کو کیا ہو گیا ہے۔“

کچھ دوسرے لوگ بھی مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

میں نے قبرستان میں ان کی قبر کے قریب بھی مولوی صاحب کو دیکھا، وہ اپنی تدفین کا منظر بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

تدفین کے بعد ہم سب نے فاتحہ پڑھی، مولوی صاحب مسکراتے رہے، واپسی میں بھی وہ ہمارے ساتھ تھے۔

میں اپنے گھر کی بجائے مولوی صاحب کے حجرے میں گیا، مولوی صاحب ساتھ ساتھ تھے، میں نے کہا: ”مولوی صاحب میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

انھوں نے پوچھا: ”وہ کیوں؟“

میں نے جواب دیا: ”آپ میرے ساتھ ہیں اس لیے طرح طرح کے سوالات ذہن میں پیدا ہو رہے ہیں۔“

مولوی صاحب نے کہا: ”جو سوال چاہو کرو، میں جواب دوں گا۔“

میں نے پوچھا: ”مولوی صاحب! آپ یہاں اپنے حجرے میں میرے ساتھ ہیں اور وہاں قبر میں منکر نکیر کس سے سوالات کر رہے ہوں گے؟“

مولوی صاحب نے جواب دیا: ”یہ راز کی باتیں ہیں، میں اس سوال کا جواب نہیں دوں گا۔“

میں نے کہا: ”اب میں آپ سے کیا پوچھوں؟“

مولوی صاحب نے کہا: "اچھا اب میں چلا، کل پھر ملوں گا۔"
مولوی صاحب چلے گئے اور میں اپنے گھر چلا آیا۔ یہاں میرے بارے میں مشہور ہو چکا تھا کہ کسی وجہ سے میرا دماغی توازن درست نہیں ہے۔

میں نے کسی کی پروا کیے بغیر حجرے ہی میں سکونت اختیار کی۔ میرے گھر والوں کو اور مسجد کے منتظمین کو اس پر اعتراض ہوا لیکن میں نے انھیں بتایا کہ میں یہاں اپنی مرضی سے نہیں ہوں۔ وقت آنے پر میں سب کچھ بتا دوں گا لیکن فی الحال جواب پر مجبور نہ کیا جائے۔

لوگوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا اور میں حجرے میں رہنے لگا۔
مولوی صاحب ہر روز تشریف لاتے، چہل قدمی فرماتے اور باتیں کر کے چلے جاتے۔
جن لوگوں کو میرے معاملات سے دلچسپی تھی، وہ میری نگرانی کر رہے تھے۔ میری حرکات و سکنات پر نظریں رکھ رہے تھے۔ میری باتیں سننے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے مولوی صاحب سے پوچھا: "یہ لوگ مجھے نقصان تو نہیں پہنچائیں گے؟"
مولوی صاحب نے جواب دیا: "تم اس کی فکر نہ کرو۔"
ایک دن مسجد کے مؤذن نے مجھ سے پوچھا: "یہ آپ تنہائی میں کس سے باتیں کرتے ہیں؟"
میں نے جواب دیا: "کسی سے بھی نہیں۔ یہ تم لوگوں کا وہم ہے اور کچھ نہیں۔"
مؤذن نے جواب دیا: "یہ میرا وہم نہیں، سبھی کا وہم ہے آپ کسی سے باتیں ضرور کرتے ہیں۔"
میں نے اس گفتگو کا ذکر مولوی صاحب سے کیا کہ اب لوگ زیادہ جستجو کر رہے ہیں، میں کیا کروں؟
مولوی صاحب نے جواب دیا: "میں کیا جواب دوں؟ مجھ کو تو ایسا لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے بیزار ہو گئے ہو!"
میں نے عرض کیا: "مولوی صاحب! واللہ یہ بات نہیں ہے۔ میں آپ سے جتنی محبت کرتا ہوں دوسرا اس کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ بس یہی محبت مجھے حجرے میں رہنے پر مجبور کر رہی ہے!"
مولوی صاحب نے جواب دیا: "اگر تم لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو میں یہاں نہیں آؤں گا۔"
میں گھبرا گیا اور کہا: "مولوی صاحب! کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا۔"
اس وقت تو مولوی صاحب چلے گئے۔ میں ان کے بارے میں معلوم نہیں کیا کیا سوچتا رہا۔

اس رات میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ رات کے پچھلے پہر میں نے بخار محسوس کیا۔ اجابت محسوس ہوئی تو میں خود میں اتنی کمزوری کا احساس کر رہا تھا کہ بیت الخلا تک نہ جا سکا۔ قریب ہی موری تھی اس میں پیشاب کر کے میں بستر پر دوبارہ لیٹ گیا۔ صبح دیر تک سوتا رہا۔ میں نیم مدہوش ہو رہا تھا۔

باہر لوگ حجرے کا در پیٹ رہے تھے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ دروازہ کھولا۔ مسجد کا صحن دھوپ سے بھر گیا تھا دروازے پر کئی متفکر چہرے مجھے گھور رہے تھے۔
میں نے پوچھا: "آپ لوگ پریشان نظر آ رہے ہیں، خیریت تو ہے؟"
ایک نے غصّے میں کہا: "یہ سوال تو ہمیں آپ سے کرنا چاہیے۔ یہ اتنی دیر حجرے میں بند کیا کرتے رہے؟ فجر کی نماز بھی نہیں پڑھی۔"
میں نے جواب دیا: "رات میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے مدہوش سا پڑا رہا۔"
وہ لوگ تو باتیں کر کے چلے گئے۔ میں نے دیکھا مولوی صاحب بھی ایک طرف کھڑے مجھے گھور رہے تھے۔
میں نے انھیں سلام کیا۔ وہ سلام کا جواب دے کر مجھ سے کچھ اور دُور ہو گئے۔
میں نے ان سے پوچھا: "یہ آپ مجھ سے دور کیوں کھڑے ہیں؟ قریب کیوں نہیں آتے؟"
مولوی صاحب نے جواب دیا: "مجھ کو یہاں بدبو محسوس ہو رہی ہے۔"
میں نے پوچھا: "کس چیز کی بدبو؟"
انھوں نے جواب دیا: "پیشاب کی بدبو۔"

میں نے اپنے حافظے پر زور دیا تو یاد آیا کہ میں نے رات کے پچھلے پہر موری میں پیشاب کیا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ مولوی صاحب! میں شرمندہ ہوں کہ رات مجھ سے یہ غلطی سرزد ہوئی ہے۔ بخار کی شدت میں میں دور نہیں جا سکتا تھا۔

مولوی صاحب بہت اداس نظر آرہے تھے۔ کہنے لگے: میاں عبدالصمد! تم اور عالم میں، ہم اور عالم میں، بھلا ہماری تمھاری ملاقات کیا۔ اب ہم نہیں آئیں گے۔

میں نے مولوی صاحب کی بڑی خوشامد کی، مگر وہ نہیں پسیجے اور ہوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گئے۔ اس کے بعد وہ نہیں آئے۔ میں اب بھی ان کو یاد کرتا رہتا ہوں۔"

عبدالصمد خان بہت اُداس تھے۔ آپ نے فرمایا: "اس میں اداسی کی کیا بات ہے؟"

عبدالصمد خان نے جواب دیا: "میں اس لیے اداس ہوں کہ اگر میں موری میں پیشاب نہ کرتا تو مولوی صاحب سے میری ملاقات ہوتی رہتی۔"

آپ نے جواب دیا: "یہ تیری سمجھ کا پھیر ہے ورنہ مولوی صاحب کی یہ بات کہ تم اور عالم میں اور ہم اور عالم میں، بھلا ہماری تمھاری ملاقات کیا۔ یہ جواب اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ مولوی صاحب بھی مجبور ہو گئے تھے۔ ان کا تمھارے پاس مستقل آنا جانا تمھارے لیے بھی دردِ سر بن جاتا اور مولوی صاحب بھی پریشان ہو جاتے۔"

آپ نے عبدالصمد خان کو کھویا کھویا پریشان پریشان جو دیکھا تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور بھوپال کے مشہور قاری عبیداللہ کے گھر چلے گئے۔ یہ ہندوستان کے مشہور ترین قاری تھے اور قاری لالہ کہلاتے تھے۔ آپ کے ان سے بھی بڑے اچھے تعلقات تھے اور قاری لالہ آپ کے ارادت مندوں میں تھے۔

قاری لالہ آپ کو اپنے گھر میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے، فرمایا: "یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں آپ کو اپنے گھر میں دیکھ رہا ہوں۔"

آپ نے پوچھا: "اس کی کوئی خاص وجہ؟"

انھوں نے جواب دیا: "اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میں آپ کو یاد کر رہا تھا۔"

آپ نے پوچھا: "وہ کیوں؟"

قاری لالہ نے جواب دیا: "حضرت! میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ میں اسے اگر کسی اور کے سامنے بیان کروں گا تو میرا مذاق اُڑے گا لیکن آپ اسے سنجیدگی سے سُن لیں گے۔"

آپ نے فرمایا: "یہ عجیب بات ہے کہ میں جہاں بھی جاتا ہوں عجیب و غریب واقعات میرے علم میں آتے ہیں۔ تم بھی بیان کرو۔"

قاری لالہ نے بیان کیا: "یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اس وقت میں کس پائے کا قاری ہوں۔"

آپ نے جواب دیا: "اس پائے کے کہ دوسرا کوئی قاری آپ کے پائے کا نہیں ہے۔"

قاری لالہ نے آپ سے پوچھا: "آپ بھی قرأت کر لیتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا: "کیوں نہیں، لیکن میری قرأت میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔"

قاری لالہ نے کہا: "پھر سنائیے کچھ تاکہ اس سے ہم بھی لطف اندوز ہوں۔"

آپ نے سیدھے سادے انداز میں قرأت شروع کر دی۔

قاری لالہ سنتے رہے اور ذرا دیر بعد ہی آپ کو قرأت سے روک دیا اور کہا: "آپ کے لیے یہ سیدھا سادہ طریقہ ہی کافی ہے۔"

آپ نے پوچھا: "اگر میں آپ سے قرأت سیکھنا چاہوں تو؟"

قاری لالہ ہنسنے لگے: "آپ کو جو کمال عطا ہوا ہے اس کے بعد اس کی کیا ضرورت ہے؟"

آپ نے پوچھا: "اچھا قاری لالہ! ایک بات تو بتائیں؟"

قاری لالہ نے کہا: "پوچھیں۔"

آپ نے پوچھا: "آپ تو اپنے ہی شہر کے لوگوں سے ملتے رہے ہوں گے، کیا کوئی باکمال قاری کبھی آپ کو ملا؟"

قاری لالہ نے جواب دیا: "میں وہی تو آپ کو بتانے والا تھا کہ دوسری باتیں ہونے لگیں۔"

آپ خاموشی سے قاری لالہ کی باتیں سننے لگے۔

قاری لالہ نے کہنا شروع کیا: "ایک بار میں دکن جارہا تھا کہ راستے میں میں ایک گاؤں میں ٹھہر گیا۔ حسبِ عادت میں نے وہاں والوں سے پوچھا، 'یہاں کوئی قاری بھی ہے؟'

لوگوں نے جواب دیا، 'ہاں! ایک قاری ہے تو نہیں۔ اندھا حافظ ہے۔ ہو سکتا ہے، وہ قاری بھی ہو۔'

قاری لالہ نے پوچھا، 'وہ کیا کرتے ہیں؟'

جواب ملا، 'بچوں کو پڑھاتے ہیں۔'

قاری لالہ نے کہا، 'میں ان سے ملنا چاہتا ہوں، مجھے ان کے پاس لے چلو۔'

لوگوں کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا، وہ مجھے ان کے پاس لے گئے۔

میں نے دیکھا اندھے حافظ بچوں کو پڑھانے میں مشغول ہیں۔ میں نے جاتے ہی ان کو سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا۔

ان کے پڑھانے کا طریقہ ذرا مختلف تھا۔ وہ جہاں بیٹھے تھے، وہاں ایک ایک لڑکا آتا تھا، باقی دور بیٹھے پڑھتے رہتے تھے۔

حافظ جی نے پوچھا، 'آپ خیریت سے تو ہیں؟'

قاری لالہ نے جواب دیا، 'خیریت سے ہوں، بس آپ سے ملنے کا شوق مجھے یہاں کھینچ لایا۔'

حافظ جی نے پوچھا: مجھ میں کیا خاص بات ہے جو آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے ؟

قاری لالہ نے جواب دیا: میں آپ سے قرآن پاک سننا چاہتا ہوں۔

حافظ جی نے کہا: آپ کون ہیں ؟ کہاں سے آئے ہیں ؟ میں نہیں جانتا لیکن مسلمان ہونے کی وجہ سے قرآن پاک تو آپ بھی سنا سکتے ہیں !

قاری لالہ نے جواب دیا: کیوں نہیں۔

حافظ نے جواب دیا: پھر سنائیں !

قاری لالہ نے قرأت شروع کر دی اور ذرا سی دیر میں سماں باندھ دیا۔ جو بھی سن رہا تھا وجد میں آ گیا۔

جب وہ خاموش ہوئے تو حافظ جی نے کہا: تو یہ بات ہے۔ آپ قاری لالہ ہیں شاید !

قاری لالہ نے پوچھا: ہاں میں قاری لالہ ہوں مگر آپ نے مجھے کس طرح پہچانا ؟

انھوں نے جواب دیا: جس طرح تم نے قرأت کی ہے آج پورے ہندوستان میں ایسی قرأت کرنے والا کوئی دوسرا قاری نہیں، سبحان اللہ !

قاری لالہ نے درخواست کی: میں نے آپ کی خواہش پوری کر دی اب آپ بھی اپنا وعدہ پورا کریں۔

حافظ جی نے کہا: بہتر ہے سنیں !

اور اس نے قرأت شروع کر دی۔

حافظ جی کے پاس ایک برتن رکھا تھا، اس پر سرپوش ڈھکا ہوا تھا، اچانک وہ ہلنے لگا، سرپوش خود بخود ہل رہا تھا۔

قاری لالہ یہ منظر حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ جب ایک رکوع ختم ہوا تو سرپوش دور جا گرا۔ ابھی آپ کی تلاوت جاری تھی، سرپوش اپنی جگہ سے اٹھا اور فضا میں معلق ہو گیا لیکن جب وہ قرأت کر چکے تو سرپوش برتن کے منہ پر دوبارہ آ گیا۔

قاری لالہ نے یہ منظر زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ میں خاموش سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا تھا آخر ؟

حافظ جی نے پوچھا: یہ تم خاموش کیوں ہو ؟

قاری لالہ نے جواب دیا: قرأت کے دوران جو کچھ میں نے دیکھا، وہ آپ نے نہیں دیکھا اور جو کچھ دیکھا اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔

حافظ جی نے جواب دیا: قاری لالہ! ہم دونوں میں فرق ہے تم قال میں یہ خوبی رکھتے ہو اور میں حال میں۔

قاری لالہ نے پوچھا: آپ کو یہ کمال کس طرح حاصل ہوا ؟

حافظ جی نے جواب دیا: میں قرآن پاک کا عامل ہوں۔ اگر تم کہو تو میں شام کو کچھ اور دکھاؤں۔

قاری لالہ نے اشتیاق ظاہر کیا: میں ضرور دیکھوں گا ایسے موقعے بار بار کہاں میسر آتے ہیں۔

حافظ جی نے قاری لالہ کو ساتھ لیا اور کہا: تم مجھے ادھر جنگل کی طرف لے چلو۔ میں سمت بتا دوں گا لیکن کسی کے بغیر جا نہیں سکتا۔

قاری لالہ انھیں جنگل کی طرف لے گئے اور کہا: جنگل میں ایک کنواں ہو گا جب وہ آ جائے تو مجھے بتا دینا۔

کچھ دیر بعد یہ دونوں کنوئیں کے پاس پہنچ گئے۔ قاری لالہ نے کہا: آؤ ہم دونوں وضو کر کے ظہر کی نماز پڑھ لیں۔

قاری لالہ نے کہا: لیکن کنوئیں سے پانی نکالیں گے کس طرح۔ کوئی ڈول بالٹی تو لائے نہیں۔

حافظ جی نے کہا: یہاں رہٹ تو ہوتا ہے ؟

قاری لالہ نے رہٹ دیکھ لیا اور کہا: ہاں کسی کاشت کار کا رہٹ تو موجود ہے مگر کاشت کار نظر نہیں آ رہا۔

حافظ جی نے کہا: اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رہٹ کی ہمیں ضرورت بھی نہیں۔

قاری لالہ نے کہا: پھر پانی کس طرح نکالیں گے ؟

حافظ جی نے کہا: تم کنوئیں کے کنارے کھڑے ہو کر سورۂ یٰسین پڑھو اور تماشا دیکھو۔

ایک مرتبہ حضرت ابو محمد امام جعفر صادقؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے سوال کیا کہ دانشمند کی کیا تعریف ہے؟ امام صاحب نے جواب دیا کہ بھلائی اور بُرائی میں امتیاز کر سکے۔ آپ نے کہا کہ یہ امتیاز تو جانور بھی کر لیتے ہیں کیونکہ جو اُن کی خدمت کرتا ہے، اُن کو ایذا نہیں پہنچاتے اور جو تکلیف دیتا ہے اس کو کاٹ کھاتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ نے پوچھا کہ پھر آپ کے نزدیک دانشمندی کی کیا علامت ہے؟ جواب دیا کہ جو دو بھلائیوں میں سے بہتر بھلائی اختیار کرے اور دو بُرائیوں میں سے مصلحتاً کم بُرائی پر عمل کرے۔

قاری لالہ نے سورۂ یٰسین پڑھنا شروع کر دی۔ کنوئیں میں پانی نے جوش مارنا شروع کر دیا اور کچھ دیر بعد ہی وہ اوپر آ گیا۔

دونوں نے اس سے وضو کیا اور نمازِ ظہر ادا کی۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد حافظ جی اور قاری لالہ اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے رہے اور دونوں ایک دوسرے کنوئیں کے پاس پہنچے۔

حافظ جی کی حس بہت تیز تھی، پوچھا: کیا یہاں کوئی اور کنواں ہے؟،

قاری لالہ نے جواب دیا: ہاں یہاں بھی ایک کنواں ہے اور اس پر بھی ایک رہٹ معلق ہے:

حافظ جی نے کہا: مجھ کو تو پیاس لگ رہی ہے، پانی پلاؤ:

قاری لالہ نے پوچھا: کیا اسی طرح پانی نکالوں؟،

حافظ جی نے جواب دیا: نہیں، یہاں تم سورۂ رحمٰن پڑھو گے:

قاری لالہ نے پوچھا: بس یا کچھ اور؟

حافظ جی نے جواب دیا: سورۂ رحمٰن پڑھ کر اپنی انگلی پر دم کر دو اور تین بار رہٹ کی طرف اشارہ کر کے اسے چکر دے دو، پانی اوپر آ جائے گا:

قاری لالہ نے یہی کیا۔ رہٹ خود بخود چلنے لگا۔ دونوں نے خوب پانی پیا اور آگے چل دیئے۔ رہٹ بدستور چلتا رہا اور رہٹ کا پانی قریب کے کھیت میں جاتا رہا۔

کھیت کا مالک یہ منظر دیکھ کر پریشان ہو گیا اور دونوں کے پیچھے دوڑا۔ کچھ دیر بعد انھیں روک کر اپنی مصیبت بیان کی: پورا کھیت جل تھل ہو گیا ہے۔ اگر وہ رہٹ یوں ہی چلتا رہا تو ساری فصل برباد ہو جائے گی:

دونوں کنوئیں پر واپس آئے، حافظ جی نے کہا: قاری لالہ! سورۂ رحمٰن پڑھ کر انگلی پر دم کر دو اور اُلٹے تین چکر دے دو، رہٹ رُک جائے گا:

قاری لالہ نے پہلے تو رہٹ کو یوں ہی روکنا چاہا لیکن وہ نہیں رُکا اور پھر اسی ترکیب سے رہٹ روک دیا جو حافظ جی نے بتائی تھی۔

حافظ جی نے پوچھا: کیوں قاری لالہ! کیا تم اسے اپنی قوت سے روکنا چاہتے تھے؟،

قاری لالہ نے شرمندگی سے عرض کیا: ہاں، میں نے کوشش تو کی تھی مگر روک نہیں سکا:

حافظ جی نے کہا: ہاں! اسے ہاتھی بھی نہیں روک سکتا تھا:

قاری لالہ نے خواہش کی: حافظ صاحب! آپ نے تو کمال ہی کر دیا، کچھ مجھے بھی عطا ہو:

حافظ جی نے جواب دیا: تم کو میرے پاس رہنا پڑے گا:

قاری لالہ نے عرض کیا: میں رہ لوں گا:

حافظ جی نے کہا: جب کچھ سیکھنے کا ارادہ ہو آ جانا:

قاری لالہ بے تاب تھے۔ جواب دیا: اب میں اور کہیں نہیں جاؤں گا، آپ سے کچھ سیکھ کر ہی جاؤں گا:

حافظ جی نے کہا: بہتر ہے، بسم اللہ:

قاری لالہ ان کے پاس رہ گئے اور حافظ جی نے انھیں والضّحٰی سے والنّاس تک کا عامل بنا دیا۔
قاری لالہ کو اس سال حج پر جانا تھا، عرض کیا: "حافظ صاحب! اس سال میں حج پر جانے والا ہوں، واپسی پر آپ کو دوبارہ زحمت دوں گا۔"
اس کے بعد قاری لالہ اپنے گھر چلے گئے اور وہاں سے حج پر روانہ ہو گئے۔
جب حج سے واپس آئے تو نابینا حافظ کے پاس گئے۔ اب وہاں حافظ جی کے سوا سب کچھ تھا۔ حافظ جی کا انتقال ہو چکا تھا۔
آپ نے ان واقعات کو قلم بند کرایا کیوں کہ یہ دلچسپ بھی تھے اور عجیب بھی۔ قاری لالہ نے آپ کو کچھ دن اور روکنا چاہا لیکن آپ نہیں رُکے۔

آپ کو نادر لوگوں سے ملنے کا بے حد شوق تھا۔ آپ ان سے ملتے، باتیں کرتے اور کام کی باتیں اخذ کر کے آگے بڑھ جاتے۔
کسی نے آپ کو ایک گاؤں کا پتا دیا اور کہا: "بظاہر تو اس گاؤں میں کچھ بھی نہیں لیکن وہاں ایک ایسا انسان رہتا ہے جو کیمیا بنانا جانتا ہے اور اسے عمل بھی آتا ہے۔"
آپ کو جو پتا بتایا گیا تھا اس پتے پر روانہ ہو گئے اور اس شخص کو بھی پا لیا جس کا ان سے ذکر کیا گیا تھا۔ وہ شخص بھی آپ سے مل کر بے حد خوش ہوا۔ آپ نے اس سے پوچھا: "میں اپنی خوشی کے بارے میں تو جانتا ہوں لیکن تم کیوں خوش ہو مجھ سے مل کر۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں۔"
اس نے جواب دیا: "آپ کی بزرگی کے بڑے چرچے ہیں۔ آج ملاقات بھی ہو گئی۔ بس یہ خوشی ہے مجھے۔"
اس شخص نے آپ کی بڑی خاطر مدارات کی۔ وہ آپ کے تزکیۂ نفس اور عبادت و ریاضت کا قائل تھا۔
آپ اس سے باتیں کر رہے تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ آفتاب ابھی زیادہ بلند نہ ہوا تھا۔ دھوپ دیواروں سے نیچے نہیں آئی تھی کہ ایک شخص ان صاحب کے پاس آیا۔ عامل نے اس کا بڑا احترام کیا اور پوچھا: "کہیے زمین دار صاحب! کیسے آنا ہوا؟"
زمین دار نے جواب دیا: "بس حضرت ایک چھوٹی سی پریشانی لاحق ہو گئی ہے۔"
عامل نے کہا: "پریشانی بیان کریں۔ شاید اس کا علاج ہو جائے۔"
زمین دار نے جواب دیا: "میری ایک گائے گم ہو گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کہاں تلاش کروں؟"
عامل نے پوچھا: "کیا کوئی ایسا شخص ہے جو آپ کو یہ بتا سکے کہ اس نے آپ کی گائے کو فلاں سمت جاتے دیکھا تھا۔"
زمین دار نے مغرب کی طرف ہاتھ اُٹھایا: "کئی گواہ ہیں جو بتاتے ہیں کہ گائے اُدھر جا رہی تھی۔"
عامل نے جواب دیا: "میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔"
اس کے بعد وہ اندر گیا اور کاغذ پر زعفران سے کچھ لکھ کر لایا اور کہا: "تو گائے کو اُدھر جاتے دیکھا گیا تھا۔" انھوں نے اپنے کاغذ کا رُخ اُدھر کر دیا اور خاموشی سے بیٹھ گئے اور زمیندار سے کہا... "آپ بھی میرے پاس بیٹھ جائیں۔"
زمین دار بھی وہیں بیٹھ گیا اور غوث علی شاہ کے بارے میں پوچھا: "آپ کی تعریف؟"
عامل نے جواب دیا: "یہ غوث علی شاہ ہیں۔ اس دور کی ایک باکمال شخصیت۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ ہمارے مہمان ہیں۔"
زمین دار نے آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہا لیکن آپ نے اسے منع کر دیا۔
ذرا دیر بعد سبھی نے یہ منظر دیکھا کہ گائے بھاگی چلی آ رہی ہے۔
عامل نے کاغذ کا رُخ اپنی طرف کر لیا تو وہ تیزی سے واپس جانے لگی۔ عامل نے زمین دار سے کہا: "اگر آپ کہیں تو میں اسی طرح دوڑا بھگا کر گائے کا کام تمام کر دوں۔"

حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ ایک بڑے دواخانے کے مالک تھے۔ایک روز اپنے کاروبار میں مصروف تھے کہ ایک فقیر نے آکر صدا لگائی اور جب دیکھا کہ کچھ اثر نہیں ہوتا تو بولا "ایسے دھندے میں لگے ہوئے ہو تو جان کیسے دو گے؟" یہ جھنجلا کر بولے "جیسے تم دو گے۔" فقیر نے کہا "بھلا میری طرح کیا دو گے؟" یہ کہہ کر وہ سر کے نیچے کشکول رکھ کر لیٹ گیا' زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہا اور روح پرواز کر گئی۔ شیخ کے قلب پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ کھڑے کھڑے دواخانہ لٹا دیا اور درویشی اختیار کر لی۔

زمین دار نے عرض کیا "نہیں جناب، آپ یہ کام نہ کریں۔"
عامل نے تعویذ کا رُخ بدل دیا اور گائے زمین دار کے پاس آکر رُک گئی۔ زمین دار نے اس کے گلے میں بندھی ہوئی رسّی پکڑی اور ان کا شکریہ ادا کر کے اپنی حویلی کی طرف چلا گیا۔ عامل آپ سے باتیں کرنے لگا۔
آپ نے فرمایا "جناب والا! آپ نے تو کمال ہی کر دیا اس وقت!"
اس شخص نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "کمال میں کیا کروں گا وہ تو آپ کرتے ہیں اور آئندہ بھی کریں گے۔"
آپ کی تعریف و توصیف میں اضافہ ہونے لگا۔ آپ جس کے مہمان تھے وہ آپ کی پہلے سے زیادہ خاطر مدارات کرنے لگا تھا۔
آپ نے اس سے پوچھا "اللہ خیر کرے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ میری تعریفیں کیوں کرتے رہتے ہیں؟"
اس نے جواب دیا "آپ میں ایسی خصوصیات موجود ہیں کہ ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔"
آپ نے پوچھا "یعنی؟"
اس نے جواب دیا "یعنی یہ کہ آپ کا استغنا اور بے نیازی کسی کو بھی آپ کی تعریف پر راغب بلکہ ملتفت کر سکتی ہے۔"
آپ نے فرمایا "یہ تو کوئی ایسی خوبی نہیں کہ کوئی اور اس سے متصف نہ ہو۔"
اس نے جواب دیا "مثلاً یہ بات کہ آپ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کیمیاگر ہوں، میں یہ ہنر جانتا ہوں لیکن آپ نے آج تک مجھ سے اس موضوع پر بات تک نہیں کی۔"
آپ نے فرمایا "میں کیا بات کرتا۔ علم کیمیا کی اور کیمیا سیکھنے کی، میری نظر میں یہ فضول ہنر ہے۔"
اس شخص نے کہا "اور میرے پاس جو بھی آتا ہے مجھ سے یہی کہتا ہے کہ یہ ہنر سکھا دو مجھے۔"
آپ نے فرمایا "دنیاداری اسی کو کہتے ہیں۔"
اس شخص نے کہا "اب ایک سوال میں آپ سے کروں گا آپ جواب دیں گے اس کا؟"
آپ نے فرمایا "کریں سوال۔ میں ضرور جواب دوں گا۔"
اس نے کہا "آپ پہلے سے جانتے ہیں کہ میں کیمیاگر ہوں پھر آپ نے یہ علم مجھ سے سیکھنے کی خواہش کیوں نہیں کی۔"
آپ نے جواب دیا "یہ علم میرے کسی کام کا نہیں۔ میں نے شادی نہیں کی اس لیے کوئی اولاد بھی نہیں۔ میں فکروں سے بے نیاز اِدھر اُدھر گھومتا رہتا ہوں۔ دو روٹیاں جو زندگی کے لیے بے حد ضروری ہیں کہیں نہ کہیں سے مل ہی جاتی ہیں پھر کیوں فضول باتوں پر دھیان دوں میں؟"
وہ شخص آپ کا اور زیادہ گرویدہ ہو گیا۔

آپ کے بھائی فیض الحسن بنارس میں تھانے دار تھے۔ آپ اپنی عمر کے پینتالیسویں سال میں داخل ہو چکے تھے سوچا بنارس چلو بھائی سے مل لو۔

آپ بنارس پہنچے اور بھائی فیض الحسن سے ملاقات کی، دونوں ایک دوسرے سے مل کر بے حد خوش ہوئے۔
فیض الحسن نے پوچھا "یہاں آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟"
آپ نے جواب دیا "مسجد میں۔ اس سے بہتر ٹھکانا کیا ہو سکتا ہے۔"
فیض الحسن نے کہا "جب میں یہاں موجود ہوں تو آپ کہیں اور کیوں ٹھہریں!"
آپ نے جواب دیا "بھائی! میں جس کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں اس کا گھر ہر شہر، ہر آبادی میں موجود ہے اور تم صرف بنارس میں رہتے ہو اس لیے میں نے اللہ کے گھر کو ترجیح دی۔"
بھائی فیض الحسن کہنے لگے "پوری زندگی اسی طرح گزار دی، آپ کا کھانا میرے ذمے، میں کھانا پکوا کے آپ کو بھیج دیا کروں گا۔"
آپ نے فرمایا "ٹھیک ہے جیسی تمہاری خوشی۔"
اس کے بعد کھانا بھی آنے لگا اور بھائی فیض الحسن بھی ان کے پاس پہنچنے لگے۔
یہ مسجد گھاٹ کے کنارے واقع تھی۔ مسجد کے ایک طرف تو گھاٹ تھا اور دوسری طرف شارعِ عام، یہ سڑک ہر وقت آنے جانے والوں سے آباد رہتی۔
آپ نماز پڑھ کے کسی نہ کسی وقت مسجد کی دیوار پہ بیٹھ جاتے اور سڑک کا نظارہ کرتے رہتے۔ ایک دن انھیں ایک حسین نازنین نظر آئی۔ آپ کے اپنے لفظوں میں نازنین مہ جبیں، غارت گرِ دنیا و دیں چودہ پندرہ کا سن، قیامت کی چال ڈھال، اس کے ساتھ کچھ اور لڑکیاں بھی تھیں وہ سب حسین تھیں مگر یہ ان میں آفتاب کی طرح تھی۔ آپ کی نظریں خیرہ ہو گئیں۔
کچھ دیر بعد اس لڑکی نے بھی آپ کی طرف دیکھا، دونوں کی نظریں متصادم ہوئیں اور وہ وحشی ہرنی کی طرح یہ جا، وہ جا نظروں سے اوجھل ہو گئی۔
آپ دیوار سے اتر کر مسجد کے صحن میں آ گئے، مسجد کے مُلّا نے پوچھا "شاہ صاحب! خیریت تو ہے؟"
آپ نے جواب دیا "خیریت نہیں ہے۔"
مُلّا نے پوچھا "کیا ہوا کچھ مجھے بھی تو پتا چلے۔"
آپ نے فرمایا "وہ تو میں بعد میں سب کچھ بتا دوں گا لیکن اس دوران آپ میرا ایک کام کریں گے۔"
مُلّا نے جواب دیا "آپ ایک کام کی بات کر رہے ہیں، میں آپ کے دس کام کرنے کو تیار ہوں۔"
آپ نے کہا "اب میں چلّے میں چلا جاؤں گا، بھائی فیض الحسن کا آدمی سامان لے کر آتا ہے اس سے کہہ دیں کہ جب تک میں چلّے میں ہوں وہ زحمت نہ کرے۔ مجھ کو جو کچھ کھانا ہو گا اس کا انتظام آپ کریں گے۔"
مُلّا نے جواب دیا "یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے آپ فکر نہ کریں۔"
اس کے بعد آپ حجرے میں معتکف ہو گئے، آپ کا اتنا برا حال تھا کہ اب اس لڑکی کا تصوّر تھا اور آپ تھے، کھانا پینا، روزہ نماز سب کچھ ترک ہو چکا تھا۔ لڑکی کا تصوّر اتنا شدید اور اثر انگیز تھا کہ وہ رگ و پے میں اتر گیا۔
مُلّا جی باہر کھڑے ہو جاتے اور پوچھتے "حضرت! کچھ درکار ہے؟"
اور اندر سے جواب نہ پا کر وہ واپس چلے جاتے۔
اس طرح آٹھ دن گزر گئے۔
آپ ہنوز چلّے میں تھے کہ دروازے پر کسی نے دستک دی، آپ کو یقین تھا کہ باہر وہی دوشیزہ ہو گی جس کے تصور میں آپ نے حجرے میں خود کو قید کر لیا تھا۔
آپ نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر پوچھا "کون؟"
باہر سے جواب ملا "میں ہوں آپ کی ایک داسی۔ دروازہ کھولیں۔"
کانوں میں رس گھل گیا۔ آپ نے دروازہ کھول دیا۔ آپ کے سامنے وہ ایک نوجوان کے ساتھ کھڑی تھی۔
آپ نے پوچھا "تو کون ہے؟"

اس نے جواب دیا "میں ذات کی برہمن ہوں اور میرا آبائی وطن کشمیر ہے۔" اس نے اپنے ساتھی نوجوان کی طرف اشارہ کیا "یہ میرا شوہر ہے۔"

آپ نے اس کے شوہر کو غور سے دیکھا تو دل میں اعتراف کیا کہ وہ بھی غضب کا حسین ہے۔

پوچھا "تو میرے پاس کیا لینے آئی ہے؟"

اس نے جواب دیا "میں نے آپ کی بزرگی کا چرچا سنا ہے۔ ہم دونوں کی شادی کو دو سال ہو گئے۔ اب تک اولاد سے محروم ہوں آپ دعا کریں کہ..."

آپ کو ہنسی آ گئی "دو سال ہو گئے شادی کو اور تو اولاد سے محروم ہے؟"

اس نے جواب دیا "ہاں میاں جی۔ آپ ہمارے حق میں دعا کریں۔"

آپ نے فرمایا "ابھی اولاد لے کر کیا کرو گی۔ اللہ نے چاہا تو اولاد بھی ہو جائے گی۔ ابھی تو تم دونوں عیش کرو۔"

آپ نے برہمن زادی کو اپنی طرف دیکھتے دیکھا اس پر محویت طاری تھی۔

آپ نے اس کے شوہر سے کہا "اگر تو مناسب سمجھے تو باہر چلا جا میں تیری بیوی سے تخلیے میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

سادہ لوح شوہر باہر چلا گیا اور خود دروازہ بند کر گیا۔

اس وقت آپ کے دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کوئی اندر سے مخاطب تھا "ہاں غوث علی شاہ! اب کیا ارادے ہیں؟ اس سے شادی کرو گے؟ کس طرح؟ اس کا شوہر موجود ہے۔ کیا گھر میں ڈالو گے؟ کس گھر میں؟ کہاں ہے تمہارا گھر؟ ہمیں بتانا پسند کرو گے؟ اگر یہ ارادہ ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ تم نے اپنے حقیقی رشتہ داروں سے کیوں منہ موڑا؟"

آپ اس وقت بہت پریشان تھے۔ آپ خود کو سمجھا رہے تھے۔ یہ بے چینی اور بے قراری کیوں تھی؟ آخر اب تیری عمر کیا ہے؟ تیرے اعضا میں وہ چستی اور پھرتی کہاں؟ ایک تماشا تھا سو دیکھ لیا" ایک کھیل تھا سو کھیل لیا۔

آپ نے اس سے پوچھا "سچ سچ بتا کہ تو میرے پاس کیوں آئی ہے؟"

اس کی نظریں جھک گئیں جواب دیا "میں کیا عرض کروں۔ میں خود نہیں جانتی کہ یہاں کیوں آئی ہوں؟"

آپ نے فرمایا "جب تو خود ہی نہیں جانتی کہ یہاں کیوں آئی تو میرے پاس سے چلی جا۔"

اس نے آپ کی خوشامد کی "میاں جی! یوں نہ دھتکاریں۔"

آپ نے جواب دیا "میں تجھ کو دھتکار نہیں رہا۔ دروازہ کھول دے اور اپنے شوہر کو یہیں بلا لے۔"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ شوہر اندر آ گیا۔

آپ نے فرمایا "میں نے تم دونوں کے حق میں دعا کی ہے اللہ نے چاہا تو بہت جلد گوہر مقصود حاصل کر لو گے۔"

شوہر نے کہا "ہم یوں ہی کیوں چلے جائیں کوئی تعویذ وغیرہ تو دیں۔"

آپ نے ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیا۔ وہ دونوں چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی آپ نے سوچا کہ یہ بات اس طرح ختم نہیں ہوگی۔ یہ معاملہ طول کھینچے گا اور عشق رنگ لائے گا۔

آپ نے ایک یکہ پکڑا اور اس سے معاملہ طے کر کے اسی وقت وہاں سے روانہ ہو گئے۔ یکہ کافی دیر تک چلتا رہا اور اس طرح بیس کوس کی مسافت طے ہو گئی۔ یہاں آپ نے یکے کو چھوڑا اور ایک مسجد میں قیام کیا۔ آپ کا ارادہ تھا کہ آپ یہاں ایک دن گزار کے اور آگے جائیں گے۔

لیکن چند گھنٹے بعد آپ نے دیکھا کہ اسی مسجد کے سامنے ایک دوسرا یکہ رکا اور اس پر سے وہی دونوں میاں بیوی اتر کر مسجد کی طرف بڑھے۔

(جاری ہے)

مضمون کے مآخذ

خم خانۂ تصوف	بائیس خواجہ کی چوکھٹ	اخبار الاخیار	تذکرۂ غوثیہ
ڈاکٹر ظہور الحسن شارب	ڈاکٹر ظہور الحسن شارب	عبدالحق محدث دہلوی	شاہ گل حسن

غوث علی شاہ قلندر

ضیاء تسنیم بلگرامی

آپ اس مضمون میں عشق کی طرف آتے ہیں۔ عشق جس سے نہ تو کوئی بشر خالی ہے اور نہ دنیا کی کوئی اور شے۔ ہر طرف اس کی جلوہ نمائی ہے۔ عشق اپنے وسیع معنوں میں انسانوں کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس کی کارفرمائیاں عجب ہیں یہ رُوح اور جسم پر حاوی آتا ہے تو انہیں کندن بنا دیتا ہے اور پھر جو کچھ بھی ان کے طفیل رُونما ہوتا ہے، عام انسانوں کے لیے حیرت و استعجاب کا باعث بن جاتا ہے۔ عشق کی حکایات دل نشیں بھی ہوتی ہیں اور حیرت انگیز اور حیرت افزا بھی۔ یہ وہ سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ یہ وہ عمق ہے جس کی کوئی تھاہ نہیں۔ قلندر کی عجیب دنیا کی عجیب باتیں۔ یہاں جو کچھ نظر آتا ہے کہیں اور نظر نہیں آتا ـــــ مضمون اپنے انجام سے قریب۔

آپ پر یہ کیفیت کچھ عرصہ طاری رہی، اس کے بعد معمول پر آگئی۔ جیسے جیسے عمر بڑھ رہی تھی، سیر و سیاحت میں کمی آتی جا رہی تھی۔ آپ نے شادی بھی نہیں کی کیونکہ آپ فرماتے تھے کہ جس نے اللہ سے لَو لگالی ہو اور جو مستقل حالتِ سفر میں رہتا ہو، وہ بیوی بچوں کی ذمّے داری کیونکر پوری کر سکتا ہے۔

آپ پر عشق و محبت نے ایسا غلبہ پایا کہ کائنات کی ہر شے عشق و محبت میں ڈوبی ہوئی نظر آتی۔ اس مضمون کو آپ حکایات اور قصص کی شکل میں بیان کرتے اور اس پر زور دیتے کہ دل میں سوز و گداز پیدا کرو۔ اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ آپ کو اس قسم کی بے شمار حکایات ازبر تھیں اور آپ انھیں موقع محل سے مزے لے کر بیان فرماتے رہتے۔

مُریدوں کو اِن حکایات میں بڑا مزہ آتا لیکن وہ آپ سے یہ بھی پوچھتے کہ آپ جس سوز و گداز کا ذکر کرتے ہیں کیا وہ انسان کے اختیاری چیز ہے اور اُسے قصد اور ارادے سے وجود میں لایا جا سکتا ہے۔ آپ جواب میں فرماتے کہ کوشش لازم ہے جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے یعنی تلاش جاری رکھو اور اللہ پر بھروسا رکھو۔

کسی نے آپ سے پوچھا۔ "آپ جس عشق اور جذبے کی بات کرتے ہیں کیا وہ یکطرفہ ہوتا ہے؟"

آپ نے بلا تأمل جواب دیا۔ "کیوں نہیں، عشق پہلے تو عاشق کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ وسعت اختیار کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اپنے زیرِ اثر کر لیتا ہے۔"

آپ حالتِ جذب میں بالکل سکوت اختیار فرما لیتے۔ بولنے کو جی نہ چاہتا، کبھی کبھی حالتِ گریہ طاری ہو جاتی۔ اسی حال میں ایک دن آپ نے فرمایا۔ "بے شک، مَیں اُس دھوبی کے لڑکے سے بھی کمتر ہوں جس کا ذکر حضرت محبوبِ الٰہی نے ایک بار کیا تھا۔"

مُریدوں کو جستجو ہوئی کہ اس کا مفہوم کیا ہے اور اس طرح آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

جب آپ کی حالت کسی قدر معمول پر آئی تو ایک مُرید نے آپ سے پوچھا۔ "حضرت! آپ نے حضرت محبوبِ الٰہی کے حوالے سے کسی دھوبی کے ایک بیٹے کا ذکر کیا تھا۔ اس کا کیا مطلب تھا؟"

آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ مرید بھی خاموش ہو گئے۔ مریدوں کی بے چینی بڑھتی رہی اور آخر کار اُن کا اصرار زیادہ بڑھ گیا۔ آپ نے فرمایا۔ "حضرت محبوبِ الٰہی کو سماع کا بے حد شوق تھا اور سماع سے اُن کے جذب اور عشق میں تحریک ہوتی تھی۔"

مُرید انہماک اور استغراق سے اُن کی باتیں سن رہے تھے۔ آپ کا ذرا سا سکوت بھی انھیں گراں گزرتا تھا۔ مریدوں نے پھر اصرار کیا۔ "حضرت! آپ کچھ فرما رہے تھے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، مَیں حضرت نظام الدین اولیاؒ اور اُن کے جذب و عشق کی بات کر رہا تھا اور اُن کی محفلِ سماع کا ذکر کر رہا تھا۔"

ایک مُرید نے یاد دلایا۔ "اور دھوبی کے اُس لڑکے کا ذکر بھی کر رہے تھے جو مقام اور مرتبے میں صوفیوں سے آگے نکل گیا تھا۔"

آپ نے فرمایا۔ "ایک بار محفلِ سماع میں حضرت محبوبِ الٰہی نے بحالتِ جذب فرمایا کہ افسوس ہم تو دھوبی کے لڑکے

کے برابر بھی نہ ہوئے۔

حضرت محبوبِ الٰہی یہ فرماتے جا رہے تھے اور ہاتھ کے رومال کو حرکت دیتے جا رہے تھے۔ دوسرے مُریدوں کے ساتھ ہی امیر خسرو بھی وہاں موجود تھے۔

مُریدوں نے امیر خسرو سے کہا: "آپ پیر و مرشد سے معلوم کریں کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟"

امیر خسرو مزاج آشنائے پیر تھے، جواب دیا۔ "اس وقت پیر و مرشد حالتِ جذب میں ہیں اس لیے میں ان سے بات نہیں کروں گا۔"

مُریدوں نے پوچھا: "ہم کب تک اس کی اُمید رکھیں؟"

امیر خسرو نے جواب دیا۔ "دو چار دن میں۔ اس وقت تک آپ کی طبیعت معمول پر آجائے گی اور میں ان سے بات کر لُوں گا۔"

مُرید خاموش ہو گئے۔ امیر خسرو نے تیسرے دن اپنے پیر و مرشد کو ہشّاش بشّاش پایا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ امیر خسرو نے موقع غنیمت دیکھا، پوچھا "حضرت! آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔"

آپ نے اجازت دے دی۔ "پوچھو، کیا پوچھنا ہے؟"

امیر خسرو نے عرض کیا: "آپ نے کئی دن پہلے حالتِ وجد میں سماع کے دوران فرمایا تھا کہ دھوبی کا بیٹا آپ سے برتر تھا کس معاملے میں؟ تمام مُرید اس تلمیح کی تفصیل جاننے کے لیے بے چین ہیں۔"

حضرت محبوبِ الٰہی نے امیر خسرو کو سمجھایا۔ "اس واقعے میں ایک ایسے عاشق کی داستان پنہاں ہے جو مثالی ہے اور عارفانِ عشق و محبت کے لیے اس میں عبرت اور رشک کا سبق پایا جاتا ہے۔ سنو اور اس جیسا بننے کی کوشش کرو۔"

حضرت امیر خسرو اپنے مرشد کے شیدائی اور قربان تھے۔ پوری محویت اور انہماک سے اُن کی باتیں سُن رہے تھے۔

حضرت محبوبِ الٰہی فرما رہے تھے۔ "وہ شاہی دھوبی تھا۔ محل سے کپڑے آتے تھے اور پورا کنبہ اُن کی دُھلائی اور صفائی میں مشغول ہو جاتا تھا۔ دھوبی کا لڑکا بھی انھی میں شامل تھا۔ لڑکے نے شہزادی کے کپڑوں کو اپنے لیے پسند کر لیا تھا۔ وہ ان کپڑوں کو دیکھتا، اُن کی بُو سونگھتا اور شہزادی کے لیے اپنے دل میں ایک کسک سی محسوس کرتا۔ اُس نے خود کو شہزادی ہی کے کپڑوں کے لیے وقف کر لیا تھا۔ اُس کو محل کے کسی اور کے کپڑوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ شہزادی کے کپڑوں کو بڑی محنت اور توجہ سے دھوتا۔ ان پر شاندار استری کرتا اور اُن کو خوب صورتی سے تہ کر کے قرینے سے رکھ دیتا۔ فارغ اوقات میں وہ شہزادی کے خیالی وجود سے باتیں کرتا رہتا۔ ان باتوں کو جب زیادہ وقت گزر گیا تو اس کی محبت میں شدت بھی زیادہ پیدا ہو گئی اور گھر والے بھی اس راز سے آگاہ ہو گئے۔ اُس کے والدین کو فکر لاحق ہو گئی کہ اگر یہ بات کسی طرح مشہور ہو کر محل کے اندر تک پہنچ گئی تو بادشاہ کا عتاب اور جلال اُس کے خاندان کو تباہ و برباد کر کے رکھ دے گا۔ دھوبی نے بیوی کو سمجھایا۔ "نیک بخت، اس کو سمجھا کہ یہ پاگل پن چھوڑ دے۔"

دھوبن نے جواب دیا: "میں اسے سمجھاؤں گی ضرور لیکن مجھے یقین نہیں کہ اُس پر میری نصیحتوں کا اثر ہو۔"

دھوبی نے کہا: "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ اپنا پاگل پن چھوڑے گا نہیں اور ہم سب بلا وجہ مارے جائیں گے۔"

دھوبن کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ وہ کیا تدبیر کرے جو لڑکا اپنے اس فضول فعل سے باز آجائے۔

وہ اپنے بیٹے کے پاس گئی تو دیکھا وہ شہزادی کے دُھلے ہوئے کپڑے تہ کر کر کے سلیقے سے ایک طرف رکھتا جا رہا ہے ماں اُسے کچھ دیر دیکھتی رہی۔ لڑکا اس میں اتنا منہمک تھا کہ ماں کی آمد اور موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔

ماں کچھ دیر تو دیکھتی رہی، اس کے بعد اچانک بیٹے کے پاس گئی اور کہا: "لا بیٹے، میں یہ کام کر دوں تو کچھ تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

لڑکے نے ماں کو منع کر دیا: "نہیں ماں، یہ کام میں خود کروں گا۔"

ماں نے اصرار جاری رکھا۔ "محل سے حکم آیا ہے کہ شہزادی کے کپڑے تجھ سے نہ دُھلوائے جائیں۔ انھیں ہم خود دھوئیں گے۔"

لڑکے نے پریشان ہو کر پیشانی کا پسینہ پونچھا اور پوچھا: "محل میں یہ حکم کس نے دیا ہے؟"

دھوبن نے جواب دیا: "بادشاہ نے۔"

لڑکے نے کہا: "بادشاہ نے یہ حکم کیوں دیا؟ کیا میں کپڑے صحیح طرح نہیں دھوتا؟"

ماں نے جواب دیا: "میں کیا کہہ سکتی ہوں کہ بادشاہ نے یہ حکم کیوں دیا؟ ہو سکتا ہے تیری باتیں بادشاہ کے کانوں تک پہنچ گئی ہوں۔"

لڑکے نے ماں کی باتوں پر یقین نہیں کیا: "ماں! آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں میں اس پر کس طرح یقین کر لوں۔"

ماں نے پوچھا: "کیوں، اس پر یقین نہ کرنے کی وجہ؟"

لڑکے نے کہا: "بادشاہ کو اگر ہماری کسی بات پر اعتراض ہوگا تو وہ حکماً ہمیں منع کر دے گا۔ ایسے ڈھیلے ڈھالے لہجے میں بات تھوڑا ہی کرے گا۔"

ماں نے کہا: "بیٹے! جب تُو اتنا سمجھ دار ہے تو یہ کیوں نہیں سمجھتا کہ تُو یہ جو کچھ کر رہا ہے اگر محل کے اندر تک یہ باتیں پہنچ گئیں تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟"

لڑکے نے جواب دیا: "ماں! یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہی ہیں، میں نے کیا کیا ہے جو بادشاہ ہم سے ناراض ہو جائے گا۔"

ماں نے کہا: "تُو شہزادی سے عشق کرتا ہے حالانکہ تُو نے اُسے دیکھا تک نہیں۔ یہ معمولی جرم نہیں ہے۔"

بیٹے نے کہا: "ماں! میں نے تو اس کا کسی سے ذکر تک نہیں کیا اور پھر جس کو میں نے دیکھا تک نہیں۔ اُس کے عشق کی آگ دل میں دبائے خاموش بیٹھا ہوں تو اِس پر کسی کو کوئی اعتراض کیوں ہوگا؟"

ماں نے اُسے مزید سمجھایا: "شہزادی سے تیرا خیالی تعلق تک بادشاہ کو گراں گزرے گا۔"

بیٹے نے صاف جواب دے دیا: "ماں! اگر یہ بات ہے تو میں مجبور ہوں۔ لاگی نا ہیں چھوٹت چاہے جیا جائے۔"

ماں چاروناچار دھوبی کے پاس آئی اور ساری باتیں دُہرا دیں: "عشق کا بھوت نہیں اُتر رہا۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"

دھوبی نے غصّے میں کہا: "اس کا گلا گھونٹ دے بس یہ کر تُو۔"

دھوبن نے کہا: "میں یہ کام نہیں کر سکتی تم کر سکو تو کرو۔"

دونوں تھک ہار کر خاموش ہو گئے۔ لیکن دونوں کسی ایسی تدبیر کی فکر میں تھے جس سے لڑکے کے دل و دماغ سے شہزادی کا خیال نکل جائے۔

کافی دنوں کے بعد دھوبن کے ذہن میں ایک تدبیر آ گئی۔ اُس نے اپنے شوہر سے کہا: "ایک تدبیر آئی ہے میرے ذہن میں بشرطیکہ وہ تم کو بھی پسند آ جائے۔"

دھوبی نے پوچھا: "کون سی تدبیر؟ کچھ مجھے بھی تو بتا؟"

دھوبن نے جواب دیا: "جب تک شہزادی کا میرے بیٹے سے رابطہ اور تعلق برقرار رہے گا" وہ اپنے عشق جیسی فضول باتوں سے باز نہیں آئے گا۔ میں کسی نہ کسی طرح اپنے بیٹے کو شہزادی سے بدظن کرنے کی کوشش کروں گی۔"

دھوبی نے کہا: "یہ بیکار کی باتیں چھوڑ۔ اب میں اس سے بات کروں گا۔"

دھوبن نے کہا: "ٹھیک ہے تم بھی اپنی سی کر دیکھو۔"

دھوبی غصّے میں بیٹے کے پاس گیا اور اس کو ڈانٹنے لگا: "دیکھ میں کہتا ہوں کہ سُدھر جا اور شہزادی کا خیال دل سے نکال دے۔"

لڑکے نے باپ کی طرف دیکھا اور خاموش رہا، کوئی جواب نہیں دیا۔

دھوبی نے کہا: "تُو خاموش کیوں ہے؟ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا۔ ہم دھوبی وہ شہزادی، ہمارا اُس کا کیا جوڑ؟"

لڑکے نے جواب دیا: "جس راز کو میں اپنے سینے میں دبائے، چھپائے پھر رہا ہوں، اس کو آپ لوگ افشا کر دینے پر تُل گئے ہیں۔"

دھوبی نے دھمکی دی: "بہت ہو چکی۔ اب میں برداشت نہیں کروں گا اور آئندہ تو شہزادی کے کپڑے نہیں دھوئے گا۔"

لڑکے نے جواب دیا: "آپ ضد نہ کریں اور بات کو یوں ہی رہنے دیں۔ میں شہزادی کے کپڑے ہر حال میں دھوؤں گا۔"

دھوبی نے کہا: "میں بھی دیکھوں گا کہ تُو کس طرح دھوئے گا۔"

اس تلخ کلامی کا دھوبن کو علم ہوا تو اُس نے دھوبی کو سمجھایا کہ سختی مت کرو ورنہ بات مشہور ہو جائے گی۔

دھوبی نے جواب دیا: "بات تو ہر طرح مشہور ہو کر رہے گی۔ اور ہم سب قتل کر دیے جائیں گے۔"

کئی دن بعد دھوبن اپنے بیٹے کے پاس سوگوار گئی اور بیٹے سے پوچھا: "تُو کیا کر رہا ہے؟"

بیٹے نے جواب دیا: "شہزادی کے کپڑے تہ کر رہا ہوں۔"

دھوبن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، کہنے لگی: "افسوس کہ اب تُو یہ کام نہیں کرے گا۔"

لڑکے نے پوچھا: "کیوں؟ کیا بادشاہ کو ہمارے بارے میں کچھ معلوم ہو گیا؟"

دھوبن نے جواب دیا: "نہیں بیٹے! ایسی کوئی بات نہیں بلکہ یہ سمجھ لے کہ وہ آشیانہ ہی نہ رہا جس پر ہمیں ناز تھا، وہ شاخ ہی ختم ہو گئی جس پر۔ ۔ ۔"

لڑکے نے سارے کپڑے ایک طرف رکھ دیے اور پوچھا: "ماں! بات کیا ہے؟ ذرا صاف صاف بتائیں۔"

دھوبن نے کہا: "آج میں محل میں گئی تھی، وہاں کہرام برپا تھا، محل کے در و دیوار آنسو بہا رہے تھے۔"

لڑکے کا دل ڈوبنے لگا۔ "ماں! مجھے صاف صاف بتائیں کہ معاملہ کیا ہے؟"

دھوبن نے جواب دیا: "محل کی کنیزیں بتا رہی تھیں کہ شہزادی کے پیٹ میں اچانک درد اُٹھا۔ اس درد میں رات بھر تڑپتی رہی۔ طبیبوں نے رات بھر علاج کیا اور آخر صبح کو شہزادی چل بسی اور پورے محل کو روتا چھوڑ گئی۔"

بیٹے نے پوچھا: "کیا یہ خبر سچ ہے؟"

دھوبن نے جواب دیا: "کیا تُو یہ سمجھتا ہے کہ میں زندہ شہزادی کو خواہ مخواہ مار سکتی ہوں۔"

بیٹے نے حسرت سے کہا: "ماں! یہ تُو نے کیسی خبر سنائی۔ افسوس کہ میں اس سے بے خبر رہا۔"

ماں نے اُسے تسلی دی۔ "ہاں بیٹے! موت پر کس کا اختیار ہے اور کسی کو بھی کچھ پتا نہیں کہ اس کی موت کب اور کہاں واقع ہو جائے۔"

لڑکے نے سرد آہ بھری۔ "درست، سچ ہے۔ موت کا کوئی بھروسا نہیں کہ کب اور کہاں آجائے۔"

ماں نے محسوس کیا کہ بیٹے کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ سرد پڑتا جا رہا تھا، سرد اور زرد۔

لڑکے نے شہزادی کے کپڑوں کو بوسہ دیا: "تو اب میں بے کار ہو گیا۔ میرا کام مجھ سے چھن گیا اور جب کرنے کو کام ہی نہ رہے تو زندگی بے کار ہے۔"

ماں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "یہ تُو کیا کہہ رہا ہے؟"

ماں نے اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد محسوس کیا: "یہ تیرے ہاتھ اتنے ٹھنڈے کیوں ہیں؟"

بیٹے نے کوئی جواب نہ دیا اور گرتا چلا گیا۔ ماں نے اُسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر لڑکا زمین پر گر گیا۔

ماں نے شور کیا: "لوگو! دوڑنا، دیکھنا، میرے بیٹے کو کیا ہو گیا۔"

برادری والے بھی آ گئے اور دھوبی بھی آ گیا اور فرش پر دراز بیٹے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا: "اِس کو کیا ہو گیا؟"

دھوبن نے کہا: "یہی جاننے کے لیے تو میں نے تم سب کو آواز دی ہے۔"

برادری والوں نے اس کی نبضیں ٹٹولیں اور انھیں نہ پا کر اعلان کر دیا: "یہ تو مر گیا، یہ زندہ ہی کب ہے؟"

باپ نے بڑے قلق آمیز لہجے میں کہا: "اپنی زبان سنبھالو۔ کیسی بُری بات نکال رہے ہو تم لوگ۔ جانتے بھی ہو کہ کیا کہہ رہے ہو؟"

ایک بزرگ نے جواب دیا: "بھائی! ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں، سچ کہہ رہے ہیں۔ تیرا لڑکا تو مر گیا۔ جس سے چاہے تصدیق کرا لے۔"

اب تو پوری برادری میں کہرام برپا ہو گیا۔

دھوبی نے دھوبن سے پوچھا: "لیکن یہ اچانک کس طرح ہو گیا؟"

دھوبن نے پورا واقعہ سنا دیا۔ دھوبی نے دھوبن کی پٹائی کر دی: "تو تُو نے اپنے بیٹے کو یُوں ٹھکانے لگا دیا۔"

دھوبن نے رو رو کر اپنی صفائی پیش کی: "میرا تو یہ خیال تھا کہ اس طرح مایوس ہو کر وہ شہزادی کا پیچھا چھوڑ دے گا۔"

دھوبی نے روتے ہوئے کہا: "کیا خوب پیچھا چھڑایا تُو نے! کیا تجھ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ عشق کی جو آگ دل میں روشن

ہوئی تھی، وہ اس طرح نہیں بجھتی۔"

دھوبن روتی جاتی اور کہتی جاتی۔ "اب تم جو چاہو کہو، مجھے مار دو، قتل کر دو، کیونکہ اپنے بیٹے کو خود میں نے مار دیا۔ میں اس کی قاتل ہوں۔"

دھوبی نے کہا۔ "اب میں تجھ کو کیا ماروں گا تو تو خود ہی جیتے جی مر گئی۔"

برادری نے یہ فیصلہ کیا کہ اس خبر کو مشہور نہ کیا جائے اور خاموشی سے لڑکے کی تجہیز و تکفین کر دی۔

دھوبن محل کے کپڑے لے کر اندر گئی تو شہزادی کے کپڑے اُس کے حوالے کیے۔

شہزادی نے اُن پر ایک نظر ڈالتے ہی اعتراض کر دیا۔ "اس بار میرے کپڑے کس نے دھوئے ہیں؟"

دھوبن نے جواب دیا۔ "اُسی نے جو ہر مرتبہ دھوتا ہے۔"

شہزادی نے کہا۔ "جھوٹ، بالکل جھوٹ۔ یہ میں نہیں مانوں گی۔"

دھوبن نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ کیوں؟ اس میں ایسا کیا فرق نظر آیا آپ کو؟"

شہزادی نے جواب دیا۔ "کپڑوں کی دُھلائی اور ان کے بناؤ سنوار میں جو بات پائی جاتی تھی، اِس بار نہیں ہے۔"

دھوبن خاموش ہو گئی۔

شہزادی نے پوچھا۔ "دھوبن! تُو خاموش کیوں ہو گئی؟ جواب کیوں نہیں دیتی؟"

دھوبن کو ڈر تھا کہ اگر اس نے سچی بات بتا دی تو شہزادی ناراض ہو جائے گی اور بات پورے محل میں مشہور ہو جائے گی۔ اور پھر جو کچھ ہو گا اُس کا تصور ہی روح فرسا تھا۔

شہزادی نے اصرار کیا۔ "کیا بات ہے تُو خاموش کیوں ہو گئی۔ میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتی؟"

دھوبن نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "شہزادی صاحبہ! میں کیا عرض کروں، مجھ کو ڈر لگتا ہے کہ کہیں کوئی طوفان نہ اُٹھ کھڑا ہو۔"

شہزادی نے پوچھا۔ "کیسا طوفان؟ اور یہ تُو رو کیوں رہی ہے؟"

دھوبن نے ایک سرد آہ بھری۔ "رونا تو میرا مقدر ہے، اب میں یوں ہی زندگی بھر روتی رہوں گی۔"

شہزادی کو اس پر غصہ بھی آ رہا تھا اور افسوس بھی ہو رہا تھا۔ "دیکھ دھوبن! تو سچ سچ بتا دے، بات کیا ہے؟"

دھوبن نے کہا۔ "شہزادی صاحبہ! آپ پہلے مجھے یہ یقین دلا دیں کہ میں آپ کو جو کچھ بتاؤں گی آپ اپنے تک ہی رکھیں گی چرچا نہیں کریں گی اور مجھ کو معاف کر دیں گی۔"

شہزادی نے وعدہ کیا اور دھوبن نے ہیر پھیر سے بتانا شروع کر دیا۔ "شہزادی صاحبہ! میری سمجھ میں تو ابھی تک یہ نہیں آیا کہ وہ آپ کو دیکھے بغیر آپ پر عاشق کس طرح ہو گیا؟"

شہزادی خاموش رہی اور دھوبن بولتی رہی۔ "آپ کے کپڑے وہ خود دھوتا تھا اور ان کپڑوں کی دُھلائی اور بنانے سنوارنے میں آپ کو جو سلیقہ نظر آتا تھا اس میں بھی آپ کا عشق کار فرما تھا۔ ہم سب جب اِس راز سے واقف ہو گئے تو اُسے سمجھانے لگے مگر وہ نہیں مانا۔ پھر شہزادی سے پوچھا۔ "آپ ہی بتائیں کہ یہ بُری بات تھی یا نہیں؟"

شہزادی نے کہا۔ "بات کو طول نہ دے مختصر کر۔"

دھوبن نے کہا۔ "جب ہمارا سمجھانا کام نہ آیا تو میں نے مکر اور جھوٹ کا سہارا لیا۔"

شہزادی کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ سب کچھ ایک آن میں سُن لینا چاہتی تھی۔ بیزاری سے کہا۔ "دھوبن! تُو باتوں کو خواہ مخواہ طول کیوں دیتی ہے؟"

دھوبن نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "اور پھر میں نے رو رو کر اُس کو یہ منحوس خبر سنائی، منحوس اور جھوٹی خبر کہ شہزادی کا انتقال ہو گیا ہے، اب تُو شہزادی کے کپڑے نہیں دھوئے گا۔"

شہزادی نے پوچھا۔ "پھر؟ پھر کیا ہوا؟"

دھوبن نے جواب دیا۔ "پھر وہ مایوس ہو کر کہنے لگا کہ اب میں کیا کروں گا زندہ رہ کر اور کیا کام کروں گا کیونکہ اب کرنے کے لیے کوئی کام ہی نہیں رہ گیا۔ وہ گِرا اور مر گیا۔"

اتنا کچھ بتا کے دھوبن زار و قطار رونے لگی۔

شہزادی کو اس خبر سے بڑی تکلیف پہنچی۔ اُس نے آہستہ سے کہا: "اتنا کچھ ہوگیا اور مجھ کو خبر تک نہ ہوئی۔"

دھوبن مسلسل روئے جا رہی تھی: "اگر میں یہ جانتی کہ میرے جھوٹ کا یہ اثر ہوگا تو میں کچھ بھی کرتی مگر جھوٹ نہ بولتی۔"

شہزادی نے کہا: "تجھ کو اس جھوٹ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس سے تم لوگوں کو کیا تکلیف پہنچ رہی تھی؟"

دھوبن نے کہا: "شہزادی صاحبہ! ہمیں خوف تھا کہ یہ خبر آپ کے والد تک پہنچ گئی تو ہم سب ہلاک کر دیے جائیں گے۔"

شہزادی نے کہا: "تم تو یہ کہتی ہو کہ وہ خاموش رہتا تھا اور کسی سے بات چیت بھی نہیں کرتا تھا، پھر یہ بات محل تک کس طرح آجاتی؟"

دھوبن نے جواب دیا: "شہزادی صاحبہ! آپ میری برادری کو نہیں جانتیں، اس میں کون ہمارا دوست ہے اور کون ہمارا دشمن، ہمیں نہیں معلوم۔ لیکن کسی ایک کا حسد یا دشمنی ہمیں موت کے منہ تک پہنچا سکتی تھی۔"

شہزادی کو لڑکے کی موت کا بڑا دکھ تھا۔ وہ دیر تک افسوس کرتی رہی۔

دھوبن نے خوشامد کی: "آپ یہ بات اپنے تک ہی رکھیے گا۔"

شہزادی نے پوچھا: "اس کو تم لوگوں نے دفن کہاں کیا ہے؟"

دھوبن نے جواب دیا: "جہاں برادری کے دوسرے لوگ دفن ہیں۔"

شہزادی نے پوچھا: "اس کی قبر تک مجھے لے جا سکتی ہو؟"

دھوبن کو بڑی حیرت ہوئی: "وہاں آپ جائیں گی؟ برادری کے قبرستان میں آپ جائیں گی؟ ہم غریبوں کے قبرستان میں آپ جائیں گی؟"

شہزادی نے کہا: "کیوں؟ کیا تم لوگ انسان نہیں ہو؟"

دھوبن کو خوف ہوا کہ کہیں وہ شہزادی کو محل کے باہر لے جانے کے جرم میں قتل نہ کر دی جائے۔

شہزادی نے کہا: "میں تیرے ساتھ تیرے بیٹے کی قبر پر ضرور جاؤں گی۔"

دھوبن نے کہا: "کب؟ اور کس طرح؟"

شہزادی نے جواب دیا: "کل میں کنیز کے لباس میں محل کے عقبی دروازے سے باہر آجاؤں گی، وہاں تم مل جانا۔"

دھوبن پر بادشاہ کی دہشت طاری تھی۔ وہ اس کام کے لیے تیار نہ تھی لیکن جب دھوبن کو یہ دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو یہ باتیں بادشاہ تک پہنچا دی جائیں گی تو وہ تیار ہوگئی۔

دوسرے دن حسبِ وعدہ شہزادی کنیز کے لباس میں محل کے عقبی دروازے سے باہر نکلی۔ وہاں دھوبن اُس کی منتظر تھی۔ دونوں لڑکے کی قبر پر گئیں۔ شہزادی کو بھی یہاں رونا آگیا۔

دھوبن روتی جاتی تھی اور شہزادی سے پوچھتی جاتی تھی: "آخر آپ کیوں رو رہی ہیں؟"

شہزادی نے جواب دیا: "میں یہ سوچ سوچ کر رو رہی ہوں کہ آج بھی ایسے دردمند دل موجود ہیں جو اندر ہی اندر جل بجھتے ہیں۔ عشق کرنے والے، خاموش عاشق۔ اس کا کتنا بڑا ظرف تھا۔ بے لوث، بے غرض، نہ کوئی مطالبہ نہ کوئی گلہ۔"

دھوبن حیران تھی کہ اُس کے بیٹے کے عشق کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔

کچھ دیر بعد دھوبن نے کہا: "شہزادی صاحبہ اب آپ چلیں۔"

شہزادی نے پوچھا: "کہاں؟ کہاں چلیں؟"

دھوبن نے جواب دیا: "محل، وہاں آپ کو نہ پاکر ایک قیامت اُٹھ کھڑی ہوگی۔"

شہزادی وہاں بیٹھ گئی اور کہنے لگی: "مجھ میں تو چلنے کی سکت بھی نہیں رہی۔ مجھ سے تو چلا بھی نہیں جائے گا۔"

دھوبن پریشان ہونے لگی: "شہزادی صاحبہ! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ کو واپس اپنے محل چلنا ہے۔"

اب شہزادی سے بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اُس کا دل ڈوب رہا تھا۔ "دھوبن! یہ مجھ کو کیا ہو رہا ہے؟ مجھ سے تو بیٹھا بھی نہیں جا رہا، میرا دل ڈوب رہا ہے۔"

دھوبن نے اس کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر وہ گر گئی۔ اس کی حرکتِ قلب بند ہوگئی اور وہ بھی خاموشی سے چل بسی۔

دھوبن نے بھاگنا چاہا لیکن شاہی ہرکاروں نے اُسے گرفتار کر لیا جو خاموشی سے شہزادی اور دھوبن کا تعاقب کرتے چلے آئے تھے۔

بادشاہ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ بادشاہ نے تخلیے میں یہ روداد سنی اور دونوں کے حال پر افسوس کرنے لگا۔ اس نے دھوبن سے کہا، "تجھ کو شہزادی کو اپنے ساتھ نہیں لے جانا تھا۔"

دھوبن نے عرض کیا، "میں موت کے خوف سے شہزادی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔"

بادشاہ نے پوچھا، "اب تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ کیا تو موت سے بچ جائے گی؟"

دھوبن نے جواب دیا، "اب میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اگر موت پیچھا کر رہی ہو تو انسان اس سے بچ نہیں سکتا۔ اب میں موت سے نہیں ڈرتی۔"

بادشاہ نے کہا، "اگر تو موت سے نہیں ڈرتی تو موت بھی تجھ سے دور دور رہے گی۔ جا میں نے تجھے معاف کیا لیکن دیکھ اس کا چرچا مت کرنا۔ اس طرح رہنا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔"

دھوبن کو اپنی جان بخشی پر یقین نہیں آ رہا تھا، پوچھا، "کیا میں جاؤں؟"

بادشاہ نے کہا، "ہاں، تو جا۔"

دھوبن اپنے گھر چلی گئی۔ بعد میں یہ واقعہ خوب مشہور ہوا مگر بادشاہ کی موت کے بعد۔

حضرت غوث علی شاہؒ نے پوچھا، "ہم میں کون اتنا بڑا عاشق ہے؟ کسی شے، کسی صلے کی تمنا کیے بغیر عشق کرنا بہت دشوار امر ہے۔"

مریدوں پر سکتہ طاری تھا، ایک مرید نے کہا، "جب نظام الدین اولیاءؒ نے امیر خسرو کو یہ واقعہ سنایا ہوگا تو میں سوچتا ہوں کہ اُن کا کیا حال ہوا ہوگا کیونکہ امیر خسرو تو خود بھی بڑا گداز دل رکھتے تھے۔"

آپ نے جواب دیا، "امیر خسرو یقیناً تڑپ گئے ہوں گے اور میر تقی میر نے عشق کو یہاں تک بڑھا دیا کہ فرمایا۔
"سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق"

مریدوں کا عجب حال تھا۔ آپ نے فرمایا، "جانتے ہو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے واقعہ سنا کے اس پہ کیا تبصرہ کیا تھا؟"

لوگوں نے جواب دیا، "ہمیں نہیں معلوم آپ ہی فرمائیے۔"

آپ نے فرمایا، "انھوں نے امیر خسرو سے فرمایا تھا کہ میاں! ایسا عشق نہ تو ہمیں مرشد سے ہوا، نہ اللہ سے اور نہ اللہ کے رسولؐ سے۔ دھوبی کا لڑکا ہم سب سے بازی لے گیا۔"

اُن دنوں آپ کے دل و دماغ میں عشق ہی عشق سمایا ہوا تھا، ہر طرف عشق ہی عشق نظر آتا تھا۔ عشق اور عشق کی کرشمہ سازیاں اس نے دنیا میں کیا کیا گل کھلائے اور کیسے کیسے کرشمے دکھائے۔ آپ اکثر و بیشتر خواجہ میر دردؔ کے چند اشعار پڑھتے رہتے۔

~ اتنا پیغام دردؔ کا کہنا — گر صبا کوئے یار میں گزرے
کون سی رات کو ملے گا تو — دن بہت انتظار میں گزرے

آپ جب کوئی حکایت یا واقعہ بیان کرتے تو زبان اور بیان سے اس میں جان ڈال دیتے۔ لوگ آپ سے درخواست کرتے کہ ہمیں ایسے واقعات سنائیں جس سے گرمیِ عشق فزوں ہو جائے۔

آپ فرماتے کہ یہ کیفیت ہر وقت نہیں ہوتی۔ جب یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو بات کرنے میں بھی مزہ آتا ہے۔ آپ کے دو مریدِ خاص تھے، محمد یوسف اور مولوی گل حسن۔ آپ ان دونوں کی فرمائش نہیں ٹالتے تھے۔ مولوی گل حسن کو نوابیِ لکھنؤ کے ناظم پرگنہ کا ایک واقعہ معلوم تھا۔ اسے دوسروں سے سُن رکھا تھا لیکن اس طرح کہ واقعے کی بڑائی اور تاثر کا کوئی پتا نہ چلتا تھا۔ مولوی گل حسن کو یہ بھی معلوم تھا کہ اُن کے پیر و مرشد کو اس کا علم ہے۔ اب وہ اس فکر میں تھے کہ یہ واقعہ ان کی زبان سے سُنا جائے۔

مریدِ خاص محمد یوسف سے جب اس موضوع پر بات ہوئی تو انھوں نے کہا، "افسوس کہ میں فرمائش نہیں کر سکتا۔"

مولوی گل حسن نے کہا، "میں بھی نہیں کر سکتا حالانکہ میں دل کی گہرائیوں سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ سے اس واقعے کے بارے میں معلوم کروں۔"

اس دوران آپ نے ان دونوں سے کہا، "میاں محمد یوسف اور مولوی گل حسن! ذرا میرے پاس تو آنا۔"

جب دونوں آپ کے پاس گئے تو آپ نے ان دونوں سے پوچھا "نوابی لکھنؤ میں ناظم پرگنہ اور مغنیہ کا کیا واقعہ پیش آیا تھا ذرا بتانا تو۔"

محمد یوسف نے جواب دیا "میاں جی! ہم نے کسی سے کچھ سنا تو تھا لیکن وہ یاد نہیں آرہا۔"

اب آپ مولوی گل حسن سے مخاطب ہوئے "اور مولوی گل حسن! تم، تم کیا جانتے ہو اس سلسلے میں؟"

مولوی گل حسن نے جواب دیا "حضرت! کسی سے کچھ سنا تو تھا لیکن وہ اس وقت یاد نہیں آرہا اور آج کئی دن سے ہم دونوں اس فکر میں تھے کہ اسے آپ کی زبان سے سنا جائے۔"

آپ مسکرائے "کیا خوب! میں تم دونوں سے پوچھ رہا ہوں اور تم دونوں مجھ سے جاننا چاہتے ہو۔"

مولوی گل حسن نے عرض کیا "حضرت! یہ حکایت لذیذ ہے اور آپ کی زبان اور بیان سے اس کی لذت میں دوگنا اثر ہو جائے گا۔"

آپ نے فرمایا "وہی عشقِ بلاخیز یہاں بھی کارفرما ہے۔ اس کی کارفرمائیوں کی کوئی حد ہے نہ حساب۔"

دونوں مریدانِ خاص ہمہ تن گوش مؤدب بیٹھ گئے۔

آپ نے فرمایا "میں تم لوگوں کو جو کچھ بتاتا یا سناتا ہوں، اس سے میری یہ مراد نہیں ہوتی کہ تم اس سے لطف اندوز ہوتے رہو بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہی گرمیٔ عشق تم میں بھی پیدا ہو جائے۔"

محمد یوسف نے عرض کیا "میرا خیال ہے اس گرمی کے لیے آپ کی خاص توجہ بھی ہونا چاہیے۔ اس توجہ کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں۔"

مولوی گل حسن نے کہا "آپ کی خاص توجہ نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا ہے۔ اب مزید کی خواہش ہے۔"

آپ نے فرمایا "نوابی لکھنؤ میں ایک شخص ناظم پرگنہ تھا۔ اس کا دل عشق و محبت سے مملو اور لبریز تھا۔ یہ اپنے پرگنے کی دیکھ بھال اور نظم و نسق میں مشغول رہتا تھا۔ اتفاق سے ایک دن اس کے مکان کے قریب ایک باغ سے گانے کی آواز سنائی دی۔ کوئی عورت بہت خوب گا رہی تھی۔ یہ شخص اس باغ میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک خیمہ لگا ہوا ہے اور گانے کی آواز اس خیمے سے آرہی ہے یہ کچھ دور بیٹھ کے گانا سنتا رہا اور اس میں اتنا منہمک رہا کہ گانا ختم بھی ہو گیا اور اس کو اس کا احساس تک نہ ہوا۔

اندر گانے والی کو کسی نے خبر کی کہ آج تیری آواز کا ایک عجیب سودائی دیکھنے میں آیا ہے۔

عورت نے پوچھا 'وہ کون؟'

جواب دیا گیا 'یہاں کا ناظم پرگنہ باہر بے سدھ بیٹھا ہے۔'

عورت باہر نکلی اور ناظم پرگنہ کے پاس جا بیٹھی اسے حیرت تھی کہ ناظم پرگنہ نے اس پر کوئی توجہ ہی نہ دی۔

کچھ دیر بعد ناظم پرگنہ کو ہوش آیا تو وہ خیمے کی طرف چل دیا۔

عورت نے آگے بڑھ کے پوچھا 'کہاں چلے؟'

ناظم پرگنہ نے عورت کو سرسری انداز سے دیکھا اور جواب دیے بغیر کترا کے آگے بڑھ گیا۔

عورت نے آگے بڑھ کے پھر راستہ روک لیا اور پوچھا 'کہاں کا ارادہ ہے ناظم پرگنہ صاحب؟'

ناظم پرگنہ کو ہوش آگیا جواب دیا 'میں اس خیمے کی طرف جا رہا ہوں جہاں سے کسی کے گانے کی آواز آرہی تھی۔'

عورت نے مسکرا کے پوچھا 'اور میں کون ہوں؟'

اس نے جواب دیا 'میں کیا جانوں، تو کون ہے۔ میرے راستے سے ہٹ جا اور مجھے جانے دے۔'

عورت نے پوچھا 'وہاں خیمے میں تم کس سے ملو گے؟'

ناظم پرگنہ نے جواب دیا 'اس آتش نوا گلوکارہ سے جس نے میرے پورے وجود کو آتش بجاں کر دیا ہے۔'

عورت کو ناظم پرگنہ کے بھولپن پر ہنسی آگئی، کہا 'میں کون ہوں؟ آپ نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا؟'

ناظم پرگنہ نے جواب دیا 'پہلے میں اس مغنیہ سے مل لوں، پھر تجھ سے بھی بات کر لوں گا۔'

عورت نے کہا 'چلیے، یہی سہی، میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔'

دونوں ایک ساتھ خیمے کے در پر پہنچے اور ناظم پرگنہ نے در پر آواز دی 'کوئی ہے اندر؟ میں یہاں کا ناظم پرگنہ آپ سے ملنے آیا ہوں۔'

حضرت جُنید بغدادیؒ جنگل میں بیٹھے تھے۔ سامنے پیالہ دھرا تھا جس میں دودھ اور روٹی کے ٹکڑے تھے۔ ایک کُتا اس پیالے میں مُنہ ڈالے انھیں کھا رہا تھا اور آپ زار و قطار رو رہے تھے۔

ایک شخص نے ان کی حالت دیکھی تو خیال کیا کہ شاید ظالم کُتا حضرت جُنیدؒ کی روٹی اور دُودھ ان سے زبردستی چھین کر کھا رہا ہے۔ قریب جاکر حال پوچھا تو جُنید بغدادیؒ نے فرمایا "میں اس لیے رو رہا ہوں کہ اس دُنیا میں تو میری اور اس کُتے کی حالت یکساں ہے۔ ہم دونوں ہم نوالہ و ہم پیالہ ہیں۔ نہ جانے ہم میں سے اللہ تعالیٰ کی نظر میں کون بہتر ہے۔"

اندر سے ایک استاد جی نمودار ہوئے۔ سارنگی کا گز اُن کے ہاتھ میں تھا۔ اُن کی نظر عورت پر پڑی تو آگے بڑھ کے کہا۔ "تم باہر کیوں کھڑی ہو، اندر آؤ۔" اور ناظم پرگنہ سے پوچھا۔ "آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

ناظم پرگنہ نے جواب دیا۔ "اُس مغنیّہ سے جس نے میرے جسم وجاں کو پھونک کر رکھ دیا ہے۔"

عورت نے مداخلت کی اور استاد جی سے کہا۔ "استاد جی! ہمیں دروازے پر کیوں کھڑا کر رکھا ہے؟ اندر کیوں نہیں لے چلتے؟"

استاد جی نے دونوں کو اندر بلا لیا اور عورت سے کہا۔ "بی بی! آپ کا خیمہ ہے۔ آپ کو بھی اندر داخلے کے لیے کسی کی اجازت درکار ہے کیا؟"

ناظم پرگنہ کے کان کھڑے ہوئے، دونوں اندر داخل ہوئے تو وہاں چند سازندے بیٹھے دکھائی دیے۔ عورت نے ناظم پرگنہ کے لیے فرش پر گاؤ تکیہ رکھ دیا اور کہا۔ "حضور! تشریف رکھیں۔"

ناظم پرگنہ بیٹھ تو گیا لیکن اُس کی نظریں مغنیہ کو ہی تلاش کرتی رہیں۔

عورت نے پوچھا۔ "حضرت! یہ نظروں ہی نظروں میں آپ کس کو تلاش کر رہے ہیں؟"

ناظم پرگنہ نے جواب دیا۔ "اُس مغنیّہ کو جس نے میرے پورے وجود کو جلا کر رکھ دیا۔"

اُستاد جی سے رہا نہ گیا، جواب دیا۔ "حضور ناظم پرگنہ صاحب! آپ بھی کتنے بھولے اور معصوم ہیں۔ آپ کو جس کی تلاش ہے وہ آپ کے ساتھ سائے کی طرح موجود ہے اور آپ اُسے اِدھر اُدھر تلاش کر رہے ہیں۔"

ناظم پرگنہ نے عورت کو ذرا غور سے دیکھا، اب وہ سازندوں کے درمیان بیٹھ چکی تھی۔ اُس نے پاؤں میں گھنگرو باندھ لیے اور ناظم پرگنہ سے کہا۔ "حضور! میں ہی وہ مُطربہ ہوں جو کچھ دیر پہلے گا رہی تھی۔"

ناظم پرگنہ کو یقین نہیں آرہا تھا۔ "کیا واقعی؟ لیکن تم تو میری طرح باہر تھیں۔"

عورت نے جواب دیا۔ "جب مجھے کسی نے بتایا کہ میری آواز کا ایک عاشق باہر آشفتہ و وارفتہ بیٹھا ہے تو میں آپ کو دیکھنے پہنچ گئی لیکن آپ کی وارفتگی اور محویّت نے آپ کو کسی اور ہی دنیا میں پہنچا رکھا تھا۔ اس وقت اگر میں اپنے بارے میں کچھ بتاتی تو آپ کو اس پر یقین ہی نہ آتا۔"

ناظم پرگنہ تو اس کی آواز کے سحر کا شکار ہو چکا تھا، کہنے لگا۔ "اپنی آواز کا جادو جگا اور میرے وجود میں آگ لگا دے۔"

مطربہ نے اپنا راگ چھیڑا اور گھنگروؤں کی جھنکار نے آواز کے سحر کو دوبالا کر دیا۔ ناظم پرگنہ کی حالت ہی غیر ہوگئی، اس کے پاس جو کچھ بھی تھا مطربہ کو بخش دیا۔

اب ناظم پرگنہ اس کا بے دام غلام عاشق تھا۔ اُس کو یہ دُکھ بھی نہیں تھا کہ وہ جس مطربہ پر عاشق ہوا ہے وہ کسبی ہے، بے وفا کسبی، مال و زر کی حریص، جس کا وہی شخص آشنا بن سکتا ہے جس کے پاس دولت ہو، مال و زر ہو۔

جب ناظم پرگنہ وہاں سے رخصت ہونے لگا تو کسبی سے اُس کا پتا پوچھا۔ کسبی نے کہا۔ "میں پتا تو آپ کو دے دوں لیکن کیا آپ کسبیوں کے بازار میں آسکتے ہیں؟"

ناظم پرگنہ کو فکر ہوئی کہ واقعی یہ ممکن نہیں، جواب دیا۔ "پھر ہم کہیں اور مل لیا کریں گے۔"

اُستاد جی نے مداخلت کی۔ "کہیں اور کہاں؟ حضور اجازت دیں تو دولت خانے پر حاضری دے دیا کریں لیکن آپ کو ہم سب کا آنا مہنگا پڑے گا۔"

ناظم پرگنہ نے جواب دیا۔ "آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔"

کبی نے شوخ اور شریر نظروں سے ناظم پرگنہ کو دیکھا اور طنز کیا۔ "آپ ناظم پرگنہ ہیں۔ یہ پرگنہ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

ناظم پرگنہ نے جواب دیا۔ "تو اس کی فکر ہی نہ کر، میں خود کو بیچ کر بھی اگر تیری خوشنودی حاصل کر لوں گا تو یہ سمجھوں گا کہ میں کامیاب اور کامران رہا۔"

کبی کے عشق نے ناظم پرگنہ کو بددیانت بنا دیا۔ اور وہ پرگنے کی آمدنی اس آتش نو امغیّنہ پہ بے دریغ خرچ کرنے لگا۔

اس عشق کا ہر طرف چرچا ہوا اور حاسدوں اور چغل خوروں نے یہ خبر نواب صاحب تک پہنچا دی۔ لوگوں نے نواب سے کہا۔ "آپ اس سے حساب مانگیں۔ سنتے ہیں اس نے اپنا اور آپ کا سب کچھ اس کبی پر خرچ کر دیا ہے۔"

نواب نے ناظم پرگنہ کو طلب کیا اور اس سے حساب کتاب مانگا۔

ناظم پرگنہ نے صاف صاف کہہ دیا۔ "نواب صاحب! آپ مجھے سزا دلوا دیں، میرے پاس کچھ بھی نہیں۔"

نواب صاحب کو غصّہ تو بہت آیا لیکن پھر بھی ضبط و تحمل سے کام لیا اور کہا۔ "جا دفع ہو جا۔ ہم تجھ سے تیری ملازمت واپس لیتے ہیں۔"

ناظم پرگنہ بیکار ہو گیا۔ اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ اس کی برطرفی کی خبر بھی عام ہو گئی۔ کبی کو بھی پتا چل گیا۔ ناظم پرگنہ خود بھی امیر زادہ تھا۔ لیکن اب وہ برائے نام امیر زادہ تھا۔ ایسا امیر زادہ جس کا امارت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نام نہاد امیر زادہ۔

امیر زادہ شام کو کبی کے پاس پہنچا اور اُسے اپنی برطرفی کی خبر سنائی۔

کبی نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم ہے۔"

امیر زادے نے کہا۔ "اب میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا جو کچھ تھا تیری نذر کر دیا۔"

کبی نے پوچھا۔ "پھر اب یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

امیر زادے نے جواب دیا۔ "آج آخری بار تو میرے گھر آئے گی اور میں آخری بار تیرا گانا سنوں گا۔"

کبی نے پوچھا۔ "جب تم بالکل کنگال ہو چکے ہو تو میرا آج کی رات کا معاوضہ کہاں سے ادا کرو گے؟"

امیر زادے نے کہا۔ "میرے پاس اب بھی ایک صندوق ہے، وہ تیرے حوالے کر دوں گا۔"

کبی نے ہامی بھر لی اور رات کو سازندوں کے ساتھ امیر زادے کے گھر پہنچ گئی اور رات بھر وقفے وقفے سے ناچتی گاتی رہی۔ صبح ہونے سے ذرا پہلے کبی نے کہا۔ "اچھا جناب! میں نے اپنا کام کر دیا اب آپ بھی اپنا وعدہ پورا کریں۔"

امیر زادے نے ایک صندوق اُس کے حوالے کر دیا۔ وہ اپنے آدمیوں کی مدد سے صندوق لے کر گھر گئی۔ امیر زادہ بھی اُس کے ساتھ ہو لیا۔

کبی خوش تھی کہ صندوق میں یقیناً ہیرے جواہرات ہوں گے۔ اس نے امیر زادے کی موجودگی میں صندوق کھولا تو اس میں سے ایک تہبند، ایک ٹوپی، ایک کُرتہ اور ایک رومال برآمد ہوا۔

کبی کو حیرت بھی ہوئی اور غصّہ بھی آیا۔ پوچھا۔ "امیر زادے! یہ کیا تماشا ہے؟"

امیر زادے نے جواب دیا۔ "بی بی! سچی بات تو یہ ہے کہ اب تم کو دینے کے لیے اپنے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ اب تم مجھے اپنا مُرید بنا لو اور یہ خرقہ مجھے اپنے ہاتھ سے پہنا دو۔"

کبی نے کہا۔ "میاں، تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ اللہ اللہ کرو، اپنی راہ لو اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

امیر زادے نے اپنی ضد جاری رکھی۔ "جو میں کہہ رہا ہوں وہ کام کر دو، پھر میں چلا جاؤں گا۔"

کبی پریشان تھی کہ یہ کیسی مصیبت گلے پڑ گئی۔ آہستہ سے کہا۔ "میں یہاں کاروبار کرتی ہوں اسے خراب نہ کرو۔ میں نے تم سے جو کچھ لیا ہے اگر اس کے غم میں تمھاری یہ حالت ہو گئی ہے تو میں اُس میں سے کچھ تم کو واپس لوٹا سکتی ہوں۔"

امیر زادے نے جواب دیا۔ "نہیں، میں نے جو کچھ دے دیا، دے دیا۔ میں اسے واپس نہیں لے سکتا۔"

کبی نے پریشانی میں اپنی برادری کو اکٹھا کر لیا اور اُن کے سامنے یہ مسئلہ رکھ دیا اور پوچھا۔ "برادری والو! بتاؤ کہ اب میں کیا کروں اور اس شخص سے کیسے پیچھا چھڑاؤں؟"

برادری والوں نے امیرزادے سے پوچھا۔ "تُو اِس کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا؟ اور صاف صاف بتا کہ تُو چاہتا کیا ہے؟"

امیرزادے نے کہا۔ "میں اس کو بالکل پریشان نہیں کر رہا۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے خرقہ پہنا کر اپنا مُرید بنالے۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

کبی نے کہا۔ "دیکھو میاں! میرے پاس تمہارا دیا ہوا جو کچھ موجود ہے اُسے لو اور اپنی راہ لو۔ میں تم سے بہت زیادہ تنگ آچکی ہوں۔"

امیرزادے نے جواب دیا۔ "بی بی! بار بار اس کا ذکر نہ کرو۔ میں دی ہوئی چیزیں واپس نہیں لیتا۔"

برادری والوں نے کہا۔ "دیوانے! ہوش میں آجا، ہم تجھ کو کہیں دور پھنکوا دیں گے۔"

امیرزادے نے کہا۔ "دور پھنکوا دو میں پھر آجاؤں گا۔ میرا کام جب تک نہیں ہوگا میں اس در کو نہیں چھوڑوں گا۔"

برادری کے ایک بڑے بوڑھے نے کبی سے پوچھا۔ "یہ چاہتا کیا ہے؟"

کبی نے جواب دیا۔ "یہ مجھ کو پیر بنا کے میرا مُرید ہونا چاہتا ہے۔"

بڑے میاں نے حیرت سے کہا۔ "خوب! کیا یہ دیوانہ ہے؟ پاگل ہو گیا ہے؟"

امیرزادے نے کہا۔ "میں دیوانہ ہوں، پاگل ہوں، جو چاہو سمجھ لو لیکن میرا کام کردو۔"

بڑے میاں نے کبی سے کہا۔ "اگر اس سے پیچھا چھڑانا ہے تو اس کی ضد پوری کردے۔ تیرا کیا جاتا ہے!"

کبی نے پوچھا۔ "میں کہاں کی پیر ہوں جو اس کو مُرید کرلوں۔"

بڑے میاں نے کہا۔ "اگر تو پیر نہیں ہے تو اس دیوانے کے کہنے پر پیر بن جا، دو چار گھڑی کے لیے سہی۔"

کبی بھی ذہنی طور پر آمادہ ہوگئی اور امیرزادے سے پوچھا۔ "یہ رسم کس طرح ادا کی جاتی ہے؟"

امیرزادہ خوش ہوگیا اور کہا۔ "جا غسل کر اور وضو کر کے آجا۔"

امیرزادے نے اُسے جو کچھ بتایا اُس نے اس پر عمل کیا۔ امیرزادے نے بھی غسل کیا اور وضو کر کے کبی کے پاس آگیا، کہا۔ "اب ہم دونوں دو دو رکعت نماز ادا کریں گے۔"

کبسی نے نماز پڑھی تو اُس کا دل بھر آیا، رو رو کر کہنے لگی۔ "اے اللہ! تو میرے اعمال اور افعال سے واقف ہے۔ امیرزادے نے مجھ کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔ مجھ میں یہ صلاحیت یا قابلیت کہاں کہ کسی کو مُرید کروں۔ تُو چاہے تو میری شرم رکھ لے۔"

وہ رو رو کر کیا کہہ رہی تھی یہ اُسے بھی احساس نہیں تھا۔ اُس نے امیرزادے کو مرید کیا اور کفنی اس کے گلے میں ڈال دی۔

امیرزادے نے کہا۔ "میرا کام تو ہوگیا، میں چلا۔"

اور وہ وہاں سے چل دیا۔ کبسی نے اُسے جاتے دیکھا تو خود بھی اُس کے پیچھے چل پڑی۔ مُرید آگے آگے اور پیر اس کے پیچھے پیچھے۔

ان دونوں کا بڑا چرچا ہوا۔ اور مشائخ وقت کو اُن کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔

یہ دونوں گھومتے پھرتے گنگوہ پہنچ گئے۔ وہاں حضرت عبدالقدوس گنگوہی کا عرس ہو رہا تھا۔ دونوں اس عرس میں شریک ہوئے۔ مشائخ کبار کی موجودگی میں محفلِ سماع جمی ہوئی تھی۔ یہ دونوں قوالی سننے لگے۔ مشائخ نے ان دونوں کو دیکھا اور اُن کے تعارف نے انھیں محظوظ کیا۔

قوالی کی گرمی نے ان دونوں کو مست و بےخود کردیا۔ امیرزادے کا عجب حال تھا۔ وہ جوش میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور کنوئیں میں گر گیا۔ لوگوں میں تہلکہ مچ گیا کہ یہ کیا ہوگیا۔ عورت اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھی رہی۔

چند آدمیوں نے عورت سے پوچھا۔ "تو بے فکر و بے نیاز بیٹھی ہے۔ اس کو نکالنے کی فکر بھی نہیں کر رہی۔"

عورت نے جواب دیا: "وہ اس مقام تک کس طرح پہنچ گیا، میں جانتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ اس کا وجد وحال اس کا ساتھ دے گا تو وہ خود ہی نکل آئے گا اور اگر اس میں کوئی خامی کوئی کمی ہوگی تو وہ ڈوب مرے گا اور اس کا ڈوب مرنا ہی بہتر ہوگا۔" اس کے بعد اُس نے گھبرائے ہوئے مشائخ سے کہا: "آپ لوگ شیخ ہیں اور گھبرائے ہوئے ہیں لیکن میں ذرا بھی پریشان نہیں۔ آپ لوگ قوالی شروع کرائیں اور پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے لیکن قوالی کنوئیں کے پاس شروع کرائیں۔"

قوالوں کو مشائخ کی طرف سے حکم دیا گیا کہ کنوئیں کے پاس قوالی شروع کی جائے۔

قوالی شروع ہوئی اور وہی سماں بندھ گیا۔ کنوئیں کا پانی اوپر تک آ گیا اور امیر زادہ بھی مست و بے خود باہر نکل آیا۔

مشائخ میں سے ایک جو سالہا سال سے مزارِ اقدس پر معتکف تھا، وہ کسی مرتبہ اور مقام سے محروم تھا اس نے امیر زادے اور عورت کا یہ مقام دیکھا تو حسد کی آگ میں جلنے لگا۔ اُس نے دوسرے مشائخ سے کہا: "حضرات! ہم سالہا سال سے یہاں عبادت اور چلہ کشی میں مشغول ہیں اور ہم ابھی تک یہ مقام نہیں حاصل کر سکے جو اس کسبی اور امیر زادے کو کسی محنت کے بغیر ہی حاصل ہو گیا ہے۔ میرا تو اس درویشی پر سے اعتبار ہی اٹھ گیا۔"

ایک شیخ نے سمجھایا: "شیخ! حسد مت کرو کیونکہ اسی حسد نے ابلیس کو ذلیل و خوار کر دیا۔"

شیخ نے کہا: "ان دونوں نے نہ تو عبادت اور ریاضت کی اور نہ ہی اس راہ میں کوئی دوسری جدّوجہد، ان دونوں کے برعکس ہم نے تو اپنی زندگی برباد کر دی۔ جوارِ رحمت میں پوری زندگی گزار دی مگر ایسا لگتا ہے، گویا ہنوز روزِ اوّل است۔ پھر ایسے فضول اور بے کار کام سے حاصل؟"

شیخ کو محسوس ہوا کہ کوئی اس سے کچھ کہہ رہا ہے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس آواز کو غور سے سننے لگا۔ کوئی اس سے کہہ رہا تھا: "شیخ! تو کس وہم وخیال میں ہے، اپنے دل سے حسد نکال دے اور ان دونوں کی حرص نہ کر۔ اِن کا واقعہ اور معاملہ ماورات سے ہے، تو اپنی سی کر تا رہ، اللہ بہتر کرے گا۔"

دونوں قوالی کے بعد کچھ دیر ان لوگوں میں رہے، باتیں کیں اور اپنی راہ لی۔ مست و بے خود، سرشار اور دنیا سے بیزار وہاں سے ایسے گئے کہ پھر کسی نے اُن کو نہیں دیکھا، بس زبانوں پر اُن کی داستان رہ گئی۔

آپ نے جتنی دیر یہ واقعہ سنایا، دونوں مرید مست و سرشار رہے۔ دونوں کے دلوں کا عجب حال تھا۔ عشق، یہ عشق آخر ہے کیا چیز؟

آپ عشق پر دیر تک وعظ فرماتے رہے، عشق پر وعظ۔ اُن کا قول تھا کہ جو دل عشق سے خالی ہو، وہ بالکل ناقابلِ اعتبار دل ہوتا ہے۔

آپ نے انسانی حسن وجمال کو عارضی اور فانی قرار دیا: "یوں تو یہ پوری دنیا ہی عارضی اور فانی ہے لیکن حسن وجمال اس سے زیادہ عارضی اور فانی ہیں۔"

آپ اپنے حجرے سے باہر آئے تو معلوم ہوا کہ حاضرین میں ایک خود ساختہ پیر مرشد بھی موجود ہیں وہ آپ کی شہرت کے پیشِ نظر دیکھنے اور ملنے آئے تھے۔ انھیں اپنی پیری پر بڑا ناز تھا۔ لوگوں نے آپ کو اُن کے بارے میں بتایا کہ انھیں اپنے باطنی علم و کمال پر بڑا ناز ہے۔

آپ نے اس شخص پر اس وقت تو کوئی خاص توجہ نہیں دی اور اپنے صادر اور وارد سے مخاطب رہے۔ آپ کی باتوں میں کبھی کبھی مزاح کا اثر بھی واضح بلکہ غالب آتا۔

آپ نے فرمایا: "اس دنیا میں انسان کو تین چیزیں پریشان اور مائل رکھتی ہیں۔"

آپ سے پوچھا گیا: "کون سی تین چیزیں؟"

جواب دیا: "زن، زر، زمین اور اللہ کے فضل سے میں نے زن تو کی ہی نہیں، زمین اللہ نے نہیں دی، اس سے ہمیشہ محروم رکھا اب رہ گیا زر تو یہ اِدھر آیا اُدھر گیا۔ آتا ہے چلا جاتا ہے۔ میں اس کو اپنی کمزوری نہیں بننے دیتا۔ حاجت مند فیض اٹھاتے ہیں اور مسافر اور سیاح میرے لنگر سے شکم سیر ہوتے ہیں، اس سے مجھے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے۔"

آپ کا لنگر خانہ عام تھا، محفل میں موجود پیر صاحب آپ کی باتیں سنتے رہے اور منہ بناتے رہے۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ آپ

کو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔

مُریدوں کو حیرت تھی کہ آپ اُسے کس طرح برداشت کر رہے تھے۔

آخر میں آپ نے اُسے اپنے پاس بلایا تو اُس نے جانے سے انکار کر دیا اور کہا "اگر آپ کو مجھ سے بات کرنی ہے تو آپ ہی میرے پاس آجائیں"

آپ نے فرمایا "خیر کوئی بات نہیں۔ اگر یہ بات ہے تو میں خود آپ کے پاس آتا ہوں"

آپ اُس کے پاس جا کے بیٹھ گئے اور دریافت فرمایا "آپ نے علم حدیث و فقہ و تفسیر تو ضرور حاصل کیا ہوگا؟"

انھوں نے جواب دیا "میں نے کوئی علم حاصل نہیں کیا اور نہ ہی مجھ کو اُس کی ضرورت ہے"

آپ نے حیرت سے پوچھا "وہ کیوں؟ علم کی تو ہر کسی کو ضرورت لاحق رہتی ہے"

اُن کی طرف سے جواب ملا "ہمیں تو علم لَدُنّی حاصل ہے، جنھیں علمِ لَدُنّی حاصل نہ ہو، اُن کو علوم حاصل کرنا چاہئیں"

آپ نے حیرت سے پوچھا "تو آپ کو علمِ لَدُنی حاصل ہے؟"

جواب ملا "بے شک، اس میں کوئی شک کیوں کرے"

آپ نے فرمایا "اگر یہ بات ہے تو میں آپ سے اکتسابِ فیض کروں گا"

انھوں نے کمال تفاخر سے جواب دیا "ضرور، ضرور، میں حاضر ہوں"

اور پھر انھوں نے حاضرینِ مجلس پر سرسری نظر ڈالی، گویا کہہ رہے ہوں کہ دیکھ لیا تم نے اپنے پیر کو۔ وہ بھی ہم سے کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے۔

آپ نے فرمایا "حضرت! آمنتُ باللّٰہ کے کیا معنی ہیں؟"

پیر حاملِ علمِ لَدُنّی نے جواب دیا "اِس میں ایک خاص راز ہے اور اس راز کو میں سب کے سامنے نہیں بیان کر سکتا۔ اس کے لیے ہمیں تخلیہ درکار ہے"

آپ نے فرمایا "تو آیئے، تخلیے میں آجایئے، وہیں بات ہو جائے گی"

دونوں حجرے میں چلے گئے۔ حاملِ علمِ لَدُنّی پیر نے کہا "ہاں، اب پوچھو، کیا پوچھ رہے تھے؟"

آپ نے کہا "آمنتُ باللّٰہ کا مفہوم جاننا چاہتا ہوں"

خود ساختہ پیر نے کہا "میں علمِ لَدُنی کا حامل ہوں اس لیے اس کے جو معنی میں بتاؤں گا کوئی دوسرا نہیں بتا سکے گا" اس کے بعد انھوں نے سرگوشی میں کہا "آمنتُ باللّٰہ کا مطلب ہے اللّٰہ میاں کے ہاں ایک بِلّا تھا"

آپ نے اس کا بقیہ حصّہ بھی پڑھ دیا "وملائکتہٖ وکتبہٖ ورسلہٖ والیومِ الآخرِ والقدرِ خیرہٖ وشرّہٖ من اللّٰہ تعالیٰ"

پیر نے کہا "میں اس کے ایک ایک حصّے کے معنی بیان کروں گا، تم پڑھتے جاؤ"

آپ پڑھتے گئے اور پیرِ معتمد بتاتا گیا "وملائکتہٖ اور مَلائی کھا جاتا تھا و کُتبہٖ یعنی اُس کے پیچھے کتّے لگا دیے گئے، ورُسلہٖ یعنی اس کو رسّی سے باندھ دیا والیوم الآخر اور اس پر قیامت ہو گئی، والقدر خیرہٖ وشرّہٖ من اللّٰہ تعالیٰ یعنی لینے کے دینے پڑ گئے، اپنے کیے کی سزا کو پہنچ گیا"

آخر میں خود ساختہ پیر نے آپ کو نصیحت کی "حضرت! کچھ پتا نہیں تم جانتے ہو کہ نہیں؟ یہی معنی شاہ منصور نے سب کے سامنے بیان کر دیے تھے تو مُلّاؤں نے انھیں دار پر کھنچوا دیا تھا۔ تم بھی یہ معنی دوسروں کے سامنے نہیں بیان کرو گے ورنہ پھانسی چڑھا دیے جاؤ گے۔ عالموں کو ان معانی کی خبر نہیں"

خود ساختہ پیر داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

آپ نے اپنے ارادت مندوں کو ان معانی و مطالب سے مطلع کیا جو خود ساختہ پیر تخلیے میں بتا کر چلے گئے تھے۔ آپ نے فرمایا "اَلحذر! صحبتِ جہلاء سے سو بار اَلحذر!"

(جاری ہے)

مضمون کے مآخذ

تذکرۂ غوثیہ	حکایاتِ شیریں	خُم خانۂ تصوّف	سرِّ دلبراں
شاہ گل حسن	مدیر مجلّہ آئینہ	ڈاکٹر شارب	ذوقی شاہ



ضیا تسنیم بلگرامی

اللہ کے ایک برگزیدہ بندے کی سوانح مبارک

آپ کی روح کی تازگی کے لیے ہمارے عظیم اور مقدس بزرگوں کی پاکیزہ باتیں

یہ ۱۲۵۵ء کی بات ہے، ضلع گورداسپور میں، موضع رتر چھتر اور ڈیرہ بابا نانک کے درمیان ایک گاؤں ہے کھوکھے۔ یہاں ایک خاندان میں بجالت گمنامی ایک بچہ پیدا ہوا، اس ... بچے میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے لوگ اس کے ماں باپ اور خاندان کے بارے میں کچھ یاد رکھنے یا جاننے کی کوشش کرتے۔ صغر سنی ہی میں ماں اور باپ یکے بعد دیگرے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کے نانا میاں اللہ دین شاہ مست نے ان کی کفالت کی ذمہ داری قبول کی۔ یہ نوشاہی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے نانا کی ایک بیٹی تھی، جو اس گمنام بچے کی ماں تھی اور اپنی طبعی عمر کو پہنچنے سے بہت پہلے ہی چل بسی تھی، اور ایک بیٹا تھا، جو اس بچے کا ماموں تھا، یہ مدتوں زندہ رہا۔

جب بچے نے نانا کی سرپرستی اور کفالت میں ہوش سنبھالا اور دوسرے بچوں کے ماں باپ کی موجودگی میں خود کو اس نعمت سے محروم پایا تو اس کے نازک اور ننھے سے دل پر بڑا اثر ہوا، اس میں بے بسی اور محرومی کا احساس پیدا ہو گیا۔ اس محرومی کے احساس نے آہستہ آہستہ اس کی شخصیت کی تعمیر میں اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ بچے نے اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ وہ اپنے نانا سے کسی بات کی بھی شکایت نہ کرتا۔ نانا کو اس پر بڑا ترس آیا کہ یہ کیسا صابر و شاکر بچہ ہے جو کسی کی بات کا برا ہی نہ مانتا اور ہر کسی سے عاجزی اور تکلف سے پیش آتا۔ نانا اس کے عجز و انکسار اور توکل اور قناعت کو بڑی توجہ سے محسوس کر رہا تھا۔

ایک دن نانا نے اپنے چند دوستوں کی موجودگی میں اس بچے کو بلایا اور اس سے پوچھا، "میاں صاحبزادے! میں چاہتا ہوں کہ تم پڑھ لکھ کر اس لائق ہو جاؤ کہ میں تمہیں کسی بہت اچھی جگہ پر تعینات کرا دوں۔"

بچے نے بڑی سادگی سے جواب دیا، "نانا صاحب! میں دنیا سے کچھ بھی نہیں چاہتا، مجھے جو کچھ لینا ہے اپنے رب سے مانگ لوں گا آپ میری فکر نہ کریں۔"

نانا اپنے نواسے کے منہ سے یہ غیر معمولی باتیں سن کر دنگ رہ گئے۔ ابھی تک انہوں نے اس بچے کو یوں ہی معمولی سا ناقابل ذکر بچہ سمجھ رکھا تھا لیکن آج اس کے جواب نے انہیں دم بخود کر دیا تھا۔ انہوں نے نواسے سے کہا، "بیٹے! میں جو کچھ تیرے لئے چاہتا ہوں بخلوص قلب چاہتا ہوں اور یہ بھی یاد رکھ کہ میری یا کسی شخص کی بھی کوشش سے جو کچھ بھی تجھے ملے گا اس میں رب کی مشیت ضرور شامل ہوگی!"

نواسے نے جواب دیا، "نانا جان! آپ جو کچھ فرما رہے ہیں میں اس سے انکار کب کر رہا ہوں، میں نے جو کچھ کہا اس سے میرا یہ مطلب ہے کہ میں نے ابھی سے اپنا ناطہ اللہ تعالیٰ سے جوڑ لیا ہے۔ میں اپنے رب کا ہو جانا چاہتا ہوں۔"

نانا نے گفتگو بند کر دی اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس بچے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

انہوں نے کافی دنوں تک اپنے نواسے کی نگرانی کی اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخرکار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بچے میں حرص و طمع نام کی کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ نہ اسے بھوک کی پرواہ تھی اور نہ ہی لباس کی، اس کو مصیبتوں اور دکھوں کا شکوہ کرنا بھی نہ آتا تھا۔ آخر نانا نے اس کا نام توکل شاہ رکھ دیا۔

نانا کا تعلق چونکہ نوشاہی سلسلے سے تھا۔ اس لئے ان کے پاس آنے جانے والے درویش اس بچے پر اثر انداز ہوتے رہے۔ آتش شوق بھڑکی تو آنے جانے والے درویشوں سے انہیں تسکین نہ مل سکی اور فیصلہ کرلیا کہ کسی کامل کو خود ہی تلاش کرنا پڑے گا۔ یہ ہر وقت گم صم اور کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ نانا اس تبدیلی کو گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ آخر ایک دن پوچھ ہی لیا۔ "بیٹے توکل شاہ! یہ تم ہر وقت کیا سوچتے رہتے ہو؟"

نواسے نے جھوٹ سے گریز کیا، جواب دیا۔ "نانا صاحب! میرے سینے میں ایک بھٹی جل رہی ہے اور میں اس میں جل رہا ہوں میں ایک ایسے کامل کی تلاش میں ہوں جو مجھے راہ دکھا سکے، جو مجھے سکون پہنچا سکے جو میرا ہاتھ پکڑ کر اس راہ پر ڈال دے جس پر چل کے میں اپنی منزل مقصود پالوں۔"

نانا نے تلقین کی۔ "صاحبزادے! ابھی تم بہت چھوٹے ہو انتظار کرو، اللہ پیارے بندوں کو مایوس نہیں کرتا پھر تمہیں کیوں مایوس کرے گا!"

توکل شاہ نے سکوت اختیار کیا۔ ابھی یہ سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچے تھے کہ یہ فیصلہ کرلیا کہ جس باکمال مرشد کی جستجو ہے اس کو خود ہی تلاش کرنا چاہیئے۔

انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اس سلسلے میں نانا جان سے کسی قسم کا مشورہ کیا گیا تو ان پر پابندی لگادی جائے گی اور ساتھ ہیں نامعلوم مدت کے لئے یہیں کہیں مقفل کر دیا جائے گا!

یہ سوچ کر انہوں نے خاموشی سے نانا کا گھر چھوڑ دیا اور گھومتے پھرتے ہریانہ پہنچ گئے، پھر یہاں سے اجمیر چلے گئے۔ انہوں نے خواجہ غریب نواز رح کے مزار پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی اور کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ ان کی محویت اور استغراق پر ہر شخص کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔

اس عالم میں ایک بزرگ ان کی طرف بڑھے اور ان کے دائیں شانے پر ہاتھ رکھ دیا، پوچھا۔ "تو یہاں کس کے پاس اور کیا لینے آیا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "بابا! میں یہاں کسی انسان کے پاس نہیں آیا ہوں، مجھ کو تو خواجہ غریب نواز رح نے کھینچ بلایا ہے اس لئے میں ان کے آستانے پہ اپنی پوری زندگی گذار سکتا ہوں۔"

ان بزرگ نے اس نوعمر لڑکے کو اتنی شاندار باتیں کرتے دیکھا تو دم بخود صورت دیکھتے رہ گئے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلنے لگی، بولے "میاں صاحبزادے! خوب تم نے تو میرا ایمان تازہ کر دیا۔ ویسے میں پوچھتا ہوں کہ تم کس شہر سے کہاں ہو؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "میرا کوئی ٹھکانا نہیں رات کو یہیں کہیں پڑ رہوں گا۔"

ان بزرگ نے کہا۔ "میں چشتی نظامی... سلسلے کا ایک درویش ہوں اگر پسند کرو تو میرے ساتھ رہ لو، میرے پاس رہ کر تم خسارے میں نہیں رہو گے۔"

انہوں نے فوراً ہی فیصلہ کر دیا۔ "اگر آپ مجھے اپنے پاس رکھیں گے تو ضرور رہوں گا۔"

"وہ چشتی نظامی بزرگ نے پوچھا۔ "یہاں کے بعد آپ کہاں تشریف لے جائیں گے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "میں خواجہ غریب نواز رح کے در پر یہی سوال لے کر آیا ہوں کہ مجھ کو کہاں اور کس کے پاس جانا چاہیئے۔ میری رہبری کس کے سپرد ہوئی ہے؟ آخر میں کب تک مارا مارا پھرتا رہوں گا؟"

چشتی نظامی بزرگ نے متبسم ہو کر فرمایا۔ "اللہ نے چاہا تو تمہارے اس سوال کا جواب یہاں سے ضرور ملے گا کیونکہ یہاں سے کوئی سوالی بھی ناکام اور مایوس نہیں گیا۔"

یہ ان بزرگ کے ساتھ رہنے لگے۔ ایک ہی دن میں توکل شاہ نے یہ حیران کن منظر دیکھا کہ صبح ہوتے ہی چشتی نظامی بزرگ اپنے حجرے کا دروازہ بند کر کے مراقبے میں چلے گئے۔ باہر مزار پر قوالیاں ہو رہی تھیں، مگر ان بزرگ نے اس میں کوئی حصہ نہ لیا، خاموش اپنے حجرے میں بند مراقبے میں رہے۔

ظہر کے وقت مراقبہ ختم ہوا اور یہ نماز پڑھنے مسجد میں چلے گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے توکل شاہ بھی چلے۔ جب یہ نماز پڑھ کر واپس آ رہے تھے تو توکل شاہ نے ڈرتے ڈرتے ان سے پوچھا۔ "قبلہ محترم! آپ سماع سے دلچسپی نہیں رکھتے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "میں سماع سے بیزار بھی نہیں۔"

توکل شاہ نے کہا۔ "آپ جب مراقبے میں تھے تو مزار پر شاندار قوالیاں ہو رہی تھیں۔"

انہوں نے جواب دیا۔ "ہاں کچھ بھنک تو میں نے بھی سُنی تھی۔"

توکل شاہ نے عرض کیا۔ "میری خواہش ہے کہ کل آپ محفل سماع میں ضرور شریک ہوں۔"

بزرگ نے جواب دیا۔ "صاحبزادے! میں تمہارا کہنا ضرور مان لیتا لیکن اس میں چند قباحتیں ہیں، مجھے اس پر مجبور نہ کرو تو بہتر ہے۔"

توکل شاہ نے بچوں کی طرح ضد کی۔ "میں کچھ نہیں جانتا، میں آپ کو ضرور لے جاؤں گا!"

انہوں نے عذر پیش کیا۔ "میاں صاحبزادے! اس وقت میں مراقبے میں ہوتا ہوں۔"

توکل شاہ نے عرض کیا۔ "ظہر کے بعد بھی آپ مراقبے میں جا سکتے ہیں!"

بزرگ نے پیچھا چھڑانے کی خاطر کہا۔ "ضد نہ کرو صاحبزادے کل کی کل دیکھی جائے گی۔"

توکل شاہ خاموش ہو گئے، اور دوسرے دن جب صبح فجر کی نماز سے فارغ ہوئے تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گئے کہ بزرگ مراقبے میں جا چکے ہیں

توکل شاہ کو ان کا ظہر تک انتظار کرنا پڑا۔

دونوں نے ظہر کی نماز مسجد میں ادا کی۔ واپسی اور راستے میں ایک بار پھر دونوں میں باتیں ہونے لگیں، توکل شاہ نے شکایتاً کہا: "حضرت! کل آپ نے مجھ سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ میرے ساتھ محفل سماع میں تشریف لے جائیں گے لیکن وہ وعدہ ہنوز پورا نہیں ہوا۔"

آپ نے جواب دیا: "سائیں توکل شاہ! میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا بس یہ کہا تھا کہ کل کی کل دیکھی جائے گی۔ تم اسے میرا وعدہ سمجھ بیٹھے۔"

توکل شاہ نے کہا: "چلئے میں نے آپ کی بات مان لی، مگر اب آپ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟"

بزرگ نے جواب دیا: "صاحبزادے! ضد نہ کرو، تم میری اس آگ سے واقف نہیں ہو جو میرے سینے میں دہک رہی ہے۔ محفل سماع میں جب یہ بھڑکے گی تو سامعین اور حاضرین اس کی تاب نہیں لا سکیں گے۔"

توکل شاہ خاموش ہو گئے کیونکہ یہ ضد کے لئے مناسب وقت نہیں تھا۔

کئی دن بعد مزار کے منتظمین میں سے چند آدمی ان بزرگ کے پاس آئے اور ان سے درخواست کی کہ آج ملک کے چند نامور قوال آئے ہیں اس لئے محفل سماع میں آپ بھی تشریف لے چلیں۔

چشتی نظامی بزرگ نے جواب دیا: "آپ لوگ مجھے مجبور نہ کریں کیونکہ میں محفل سماع میں ایک خاص وجہ سے نہیں شریک ہوتا۔"

توکل شاہ نے ان کا دامن پکڑ لیا اور بچوں کی طرح ضد کرنے لگے۔ "آج تو میں آپ کو ضرور لے جاؤں گا آپ کسی ایک کی درخواست رد کر سکتے ہیں مگر سب کی نہیں۔ آج تو آپ کو چلنا ہی پڑے گا۔"

ان بزرگ نے ایک بار پھر سمجھایا: "بیٹے توکل، میرے جوش عشق کو ایک شخص بھی برداشت نہیں کر سکے گا اس لئے میں محفل سماع میں شریک ہونے سے گریز کر رہا ہوں۔"

توکل شاہ نے جواب دیا: "حضرت! میں بھی اس لئے بضد ہوں کہ اس بہانے ہم لوگ آپ کے جوش عشق کو دیکھ یا محسوس کریں گے۔"

یہ بزرگ بادل نخواستہ اٹھے اور فرمایا: "بہرحال میرا کام سمجھانا تھا، سمجھا دیا۔ اب اگر تم بضد ہو تو چلو میرے ساتھ اور وہ تماشا بھی دیکھ لو جو آج تک نہیں دیکھا ہو گا۔"

توکل شاہ اور دوسروں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی، وہ سب ان بزرگ کو محفل سماع میں لے گئے۔ حاضرین اور ناظرین میں اکثر وہ لوگ تھے جنہوں نے ان بزرگ چشتی نظامی کو محفل سماع میں کبھی بھی نہیں دیکھا تھا، قوال بھی بے حد خوش تھے انہوں نے اعلان کیا کہ آج وہ اپنی زندگی کی بہترین قوالی سنائیں گے۔

چشتی نظامی بزرگ سب سے آگے قوالوں کے پاس بیٹھ گئے۔ توکل شاہ بھی ان کے پاس ہی براجمان ہو گئے۔

قوالوں نے ان بزرگ کی طرف دیکھا اور قوالی شروع کرنے کی اجازت طلب کی۔ آپ نے سر کے اشارے سے اس کی اجازت دے دی۔ قوالوں نے ساز اور تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ جب ان دونوں کی وجہ سے ایک سماں سا بندھ گیا تو انہوں نے جامی کی نعت "ولم بڑمردہ آوارہ زعصیاں یارسول اللہ..." نہایت پر سوز لحن میں شروع کر دی، سامعین پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ چشتی نظامی بزرگ پر وجد کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ پھر قوال نے ایک دوسرے مصرعے کے بعد "پشیمانم پشیمانم پشیماں یارسول اللہ تو" جیسے ہی پڑھا ان بزرگ کی حالت غیر ہو گئی اور یہ الا اللہ کا نعرہ مار کر گر گئے۔ اس نعرے میں معلوم نہیں کتنی قوت تھی کہ پوری محفل کی حالت بگڑنے لگی۔ قوال قوالی بھول گئے اور بے ہوش ہو کر ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے، سامعین اپنے ہوش و حواس سے ہاتھ دھو بیٹھے اور مدہوشی کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے خود توکل شاہ جہاں تھے وہیں پڑ گئے۔

چشتی نظامی بزرگ اپنی جگہ سے اٹھے اور اپنے حجرے کی راہ لی۔ کچھ دیر بعد توکل شاہ بھی ان کے پاس پہنچ گئے اور عرض کیا: "حضرت! یہ کیا ہو گیا تھا!"

انہوں نے جواب دیا: "میاں صاحبزادے! کیا میں نے تمہیں پہلے ہی یہ نہیں بتا دیا تھا کہ میرے جوش عشق کو برداشت کر لینا بہت مشکل ہے۔"

توکل شاہ کو ان کے مقام کا کسی حد تک اندازہ ہو گیا تھا، بولے "حضرت! کچھ میرے لئے بھی کیجئے۔"

انہوں نے جواب دیا: "میں کیا کر سکتا ہوں جب تک اُدھر کا اشارہ بھی نہ ہو۔"

توکل شاہ نے کہا: "بہرحال میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں کبھی بھی آپ کا دامن نہیں چھوڑوں گا۔"

انہوں نے جواب دیا: "یہ ساری فضول باتیں ہیں میں تمہارے پاس زیادہ دن نہیں رہوں گا۔ میں تو اپنے کسی کے فرمان کا منتظر ہوں، فرمان کے پاتے ہی معلوم نہیں مجھ کو کہاں جانا پڑ جائے۔"

توکل شاہ نے اصرار کیا: "حضرت! جب تک میں آپ سے کچھ نہ کچھ حاصل نہ کر لوں گا آپ کے پاس موجود رہوں گا۔"

انہیں توکل شاہ پر پیار بھی آیا اور رحم بھی، بولے: "اچھا اگر تمہارے شوق کا یہی عالم ہے تو میں بطریق چشت تمہیں نفی اور اثبات کی تلقین کرتا ہوں۔"

چنانچہ ان بزرگ نے جیسے ہی نفی و اثبات کی تلقین کی توکل شاہ کے قلب پر کلمہ جاری ہو گیا۔ توکل شاہ کی حالت ہی غیر ہو گئی۔

توکل شاہ کو ان بزرگ نے تربیت دینی شروع کر دی۔

ایک دن صبح ہی صبح یہ بزرگ توکل شاہ کے پاس گئے اور مسکراتے ہوئے کہا: "میاں صاحبزادے! اپنا تو تبادلہ ہو گیا اب تم جانو اور تمہارا کام۔ میں تو یہاں سے چلا۔"

توکل شاہ نے پریشان ہو کر پوچھا: "حضرت! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

انہوں نے جواب دیا "ابھی صبح سے ذرا پہلے میرے پاس — خواجہ غریب نواز تشریف لائے تھے انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں جلد از جلد ... پہنچوں۔ مجھے وہاں کا قطب مقرر کر دیا گیا ہے، اس لئے اب میں اجمیر میں نہیں رہ سکتا، تم ... اپنا ٹھکانا کر لو۔"

توکل شاہ کا دل دھک دھک کرنے لگا پوچھا "پھر میرے لئے کیا حکم ہے؟"

بزرگ نے جواب دیا "تم اس وقت تک یہیں رہو گے جب تک خواجہ صاحب تمہیں یہ نہ بتا دیں کہ اب تم فلاں شہر میں فلاں بزرگ کے پاس چلے جاؤ۔"

توکل شاہ کا دل رو رہا تھا "انہیں ان بزرگ کی جدائی بہت شاق گذرے گی، میں جانتا ہوں۔"

یہ بزرگ جانے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ پھر اچانک ایک دن چلے گئے۔ توکل شاہ تنہا رہ گئے، یہ بہت اُداس ہو گئے۔ اس عالم میں یہ خواجہ غریب نواز کے مزار پر گئے اور بڑے پُرسوز لہجے میں کہا —— "خواجہ غریب نواز! یہ عاجز آپ کے ارشاد کا منتظر ہے۔ آخر میری منزل کہاں ہے؟ میری رہنمائی کون کرے گا؟ میں کہاں اور کس کے پاس جاؤں؟"

انہیں اپنے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ملا۔ مایوس اور دل شکستہ چپ ہو کر بیٹھ گئے۔

کئی دن بعد آدھی رات کے وقت کسی نے توکل شاہ کے حجرے پر دستک دی۔ یہ باہر نکلے تو ایک بوڑھے کو اپنا منتظر پایا، پوچھا "کیا بات ہے؟ تم کون ہو اور میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

بوڑھے نے جواب دیا "ایک ہی سانس میں اتنے سارے سوالات! خوب۔ میاں صاحبزادے! خواجہ کے مزار پر ولیوں کی مجلس جمی ہوئی ہے تم بھی وہیں پہنچ جاؤ اور جو کچھ کہنا سننا ہے کہہ سن ڈالو۔"

اس خوش خبری نے توکل شاہ کو اس قابل بھی نہیں رکھا کہ وہ ان بڑے میاں سے پوچھتے کہ تم کون ہو اور میرے پاس کیسے شانے پر آئے ہو؟

یہ خاموشی سے باہر نکلے اور خواجہ صاحب کے مزار پر پہنچ گئے، وہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا، ولیوں کی محفل میں ساری نشستیں بھری ہوئی تھیں، ایک نشست بھی خالی نہیں تھی۔ توکل شاہ نشست کی تلاش میں ہر طرف نظریں دوڑاتے رہے، بیچ میں کوئی بزرگ صدر نشیں تھے۔ توکل شاہ نے کسی سے پوچھا "یہ بزرگ کون ہیں؟"

جواب ملا "خواجہ معین الدین چشتی، سلطان الہند۔"

توکل شاہ نے پوچھا "اس محفل میں میرے لئے بھی کوئی جگہ ہے؟"

جواب ملا "نہیں!"

توکل شاہ کو بڑا دکھ ہوا، انہوں نے ہمت اور حوصلے سے کام لیا اور بچوں کی طرح کود کر بیچ میں خواجہ صاحب کے پاس پہنچ گئے! اولیائے کرام کو اس پر اعتراض ہوا اور توکل شاہ کی اس حرکت کو گستاخی پر محمول کیا۔

لیکن خواجہ صاحب نے ان سب کو مخاطب کر کے فرمایا "حاضرین! یہ بچہ بھی ہے اور مست بھی۔ اس لئے اس کی یہ حرکت ایسی نہیں جو ہمیں گراں گذرے!" پھر توکل شاہ سے پوچھا "ہاں صاحبزادے! تم کیا چاہتے ہو؟"

توکل شاہ نے کہا "حضرت! میں کب تک یہاں پڑا رہوں گا میرے بارے میں بھی اپنا فیصلہ سنا دیجئے۔"

خواجہ صاحب نے جواب دیا "توکل! تو پنجاب چلا جا، تیرا پیر وہیں ہے، تو چشتی سلسلے کا نہیں نقشبندی سلسلے سے تعلق رکھتا ہے۔"

توکل شاہ نے پوچھا "کیا چشتیہ سلسلے میں میرے لئے کچھ بھی نہیں ہے؟"

خواجہ صاحب نے جواب دیا "کہہ جو دیا پنجاب چلے جاؤ۔ تیرا پیر نقشبندیہ سلسلے سے تعلق رکھتا ہے۔"

توکل شاہ نے دوسرے دن علی الصبح اجمیر کو چھوڑ دیا۔ اور پنجاب روانہ ہو گئے۔ دوران سفر چند یوم انبالہ میں بھی قیام کیا۔ وہاں سے لدھیانہ اور پھر جالندھر تشریف لے گئے۔ یہاں توکل شاہ کو ایک مجذوب ملا وہ توکل شاہ کو روک کر کھڑا ہو گیا۔ ہنس کر پوچھا "بچے تو کس کو تلاش کر رہا ہے؟"

توکل شاہ نے اجمیر کا واقعہ سنا دیا اور کہا "مست شاہ! مجھے اپنے پیر کی تلاش ہے جس کو میں نے نہ تو دیکھا ہے اور نہ ہی اس کا نام جانتا ہوں!"

مجذوب زور سے ہنس دیا۔ بولا "خوب جس کو نہ تو نے دیکھا ہے اور نہ ہی اس کا نام جانتا ہے پھر اس کو پائے گا کس طرح؟"

توکل شاہ نے جواب دیا "بابا! جس نے مجھے اس کا نشان دیا ہے وہی اس سے ملاقات بھی کرا دے گا۔"

مجذوب نے کہا "یہ اجمیر والا اس قسم کی باتیں کرتا رہتا ہے تباؤ تو بھلا، اگر صاف صاف پتہ اور نام بتا دیتا تو اس میں کیا ہرج تھا؟"

توکل شاہ نے پوچھا "کیا آپ میرے پیر سے واقف ہیں اور ان کا پتہ بتا سکتے ہیں؟"

مجذوب نے جواب دیا "کیوں نہیں۔ بالکل بتا سکتے ہیں۔ جب اجمیر والے نے یہ بات نہیں چھپائی تو میں کیوں چھپاؤں۔ جا جہانخیلاں چلا جا۔ وہاں قادر بخش نامی ایک درویش رہتا ہے، وہی تیرا پیر مرشد ہے اور وہی تیرے قلب کو مصفا اور مجلا کرے گا۔"

توکل شاہ اس صاف صاف نام اور پتے سے اتنے خوش ہوئے کہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر جہانخیلاں روانہ ہو گئے۔ یہ جہانخیلاں میں داخل ہوئے تو ایک مست عورت انہیں دیکھ کر مسکرائی، پوچھا "صاحبزادے! کہاں رہ گئے تھے؟ دیر کر دی، بہرحال ابھی وقت ہے آفتاب ہدایت غروب ہونے والا ہے۔"

توکل شاہ خواجہ قادر بخش کی خدمت میں پہنچے تو وہ ان سے اس طرح پیش آئے گویا ان کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے توکل شاہ کے سر

پر ہاتھ پھیرا، اس کے بعد سینے سے لگا لیا۔ وہاں برسوں کے صحبت یافتہ بھی موجود تھے۔ اپنے پیر مرشد کی ایک اجنبی نوجوان پر غیر معمولی نظرِ عنایت دیکھ کر پوچھا "پیر مرشد! کیا یہ صاحبزادے اتنا جوہر قابل رکھتے ہیں کہ آپ سے غیر معمولی فیض پا جائیں؟"

خواجہ قادر بخش نے جواب دیا "اللہ تعالیٰ کا فیض عمر کی کمی یا زیادتی کا پابند نہیں ہوتا۔ توکل شاہ کا نام اللہ تعالیٰ کا مرحمت کردہ ہے ان میں وہی خصوصیات اور اوصاف بھی پائے جاتے ہیں یعنی یہ اسم بامسمیٰ ہیں۔"

خواجہ صاحب کی نوازشیں حد سے زیادہ بڑھ گئیں۔ توکل شاہ خود بھی یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان میں کسی غیر معمولی شے کا اضافہ ہو گیا ہے انہیں اپنے وجود کے بھاری پن کا احساس ہونے لگا تھا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا "اے توکل شاہ! تم کسی غیر معمولی بات سے گھبرا نہ جانا۔"

توکل شاہ نے عرض کیا "حضرت! میں نے آپ کو بڑی مشکل سے پایا ہے، اب میں معمولی اور غیر معمولی کی کیا فکر کروں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں یہاں سے کچھ نہ کچھ حاصل ہی کروں گا۔"

ایک دن توکل شاہ کی ناک سے خون جاری ہو گیا اور یہ مجذوبوں جیسی باتیں کرنے لگے۔ پرانے صحبت یافتہ خوش ہوئے کیونکہ وہ اس نوجوان سے حسد کرنے لگے تھے۔ توکل شاہ کی ناک سے خون جاری تھا کسی نے یہ خبر خواجہ قادر بخش کو پہنچا دی، آپ توکل شاہ کے پاس پہنچ گئے اور پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

توکل شاہ حالتِ جذب میں تھے، بولے۔ "حضرت! یہ آپ پوچھ رہے ہیں کہ کیا حال ہے؟"

خواجہ نے فرمایا: "ہاں یہ میں پوچھ رہا ہوں، میں نے تجھ کو انوار لطائف اور فیوض ولایت سے مالا مال کر دیا ہے تو اس بوجھ کو برداشت نہیں کر سکا۔ اور ناک سے خون جاری ہو گیا۔"

ایک مرید نے عرض کیا "حضور پیر مرشد! یہ جذب میں مبتلا ہیں کیا ان سے سلسلہ ولایت چل سکتا ہے، یہ اپنے ہوش میں نہیں، پھر یہ رہنمائی کس طرح کریں گے؟"

خواجہ صاحب نے مرید کو آنکھ دکھائی، فرمایا: "یہ ان کی عارضی حالت ہے، ورنہ توکل شاہ ایک بہت بڑے سلسلے کا بانی ہے جو اس وقت موجود ہوں گے اپنی آنکھ سے دیکھ لیں گے۔"

توکل شاہ آہستہ آہستہ ہوش میں آنے لگے۔ پھر تقریباً دو ماہ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں رہ کر ان سے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو دوسرے سالہا سال رہ کر بھی حاصل نہیں کر سکے تھے۔

ایک دن خلافِ توقع آپ نے توکل شاہ سے فرمایا "توکل! اب کام ختم ہو چکا، اب تو انبالے چلا جا اور رشد و ہدایت کا کام شروع کر دے۔"

توکل شاہ نے کہا "پیر مرشد! اتنی جلدی، ابھی تو مجھ کو اور زیادہ فیضیاب ہونے دیجئے۔"

خواجہ صاحب نے فرمایا "نہیں، اب اس کی کوئی ضرورت نہیں، تو نے اپنی نو عمری ہی میں جو کچھ حاصل کر لیا ہے دوسرے ایک عمر گزار کر بھی اس سے محروم رہتے ہیں، تو انبالے جا اور رشد و ہدایت کی خدمت انجام دیتا رہ۔"

آپ نے پیر مرشد کے حکم کے بموجب انبالے کا رخ کیا۔ اس وقت وہ حالتِ جذب میں تھے۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ان کے پاس چلا جاتا انبالے میں داخل ہوتے ہی انہیں ایک باغ دکھائی دیا۔ کسی سے پوچھا "یہ کس کا باغ ہے؟"

جواب ملا "نند سنگھ نامی ایک ہندو کا۔"

انہوں نے فرمایا "اب ہم اس باغ میں قیام کریں گے۔"

چنانچہ اس باغ میں کٹیا بنا کر رہنے لگے۔ نند سنگھ کو جب یہ خبر پہنچی کہ ایک مسلمان درویش نے ان کے باغ میں قیام کیا ہے تو وہ بھاگا بھاگا آپ کے پاس پہنچا۔ پہلے تو اس کا یہ ارادہ تھا کہ انہیں اپنے باغ سے نکال دے گا لیکن ان کی صورت دیکھتے ہی کانپنے لگا اور ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہ نکال سکا۔ آپ نے نند سنگھ سے فرمایا "تو مجھے اپنے باغ سے

نکالنا چاہتا ہے؟ حالانکہ میں نے تجھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا!"

نند سنگھ نے جواب دیا: "نہیں میاں جی! میری یہ مجال کہ میں آپ کو باغ سے نکالوں، باغ آپ کا ہے شوق سے اس میں رہیں چاہیں تو اسے آپ کے نام کر دیا جائے۔"

آپ نے فرمایا: "میں باغ لے کر کیا کروں گا۔ مجھے یہاں مستقلاً کب رہنا ہے۔ فقیروں کا کیا، آج یہاں ہیں توکل کہیں اور چل گئے۔"

ایک دن آپ نے خواب میں دیکھا کہ خواجہ قادر بخش وصال فرما گئے، اس خواب نے انہیں پریشان کر دیا، یہ فوراً ہی چھانخیلاں روانہ ہو گئے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ان کا خواب سچا تھا، توکل شاہ اپنے پیر و مرشد کے چہلم تک وہیں رہے۔ چالیسویں کے خاتمے کے بعد دستار بندی کی رسم ادا کی جانے لگی۔ یہ کئی خلفاء تھے جن کی دستار بندی ہو رہی تھی۔ آپ ان میں موجود تھے مگر کسی نے بھی آپ پر کوئی توجہ نہ دی۔

کسی مرید نے کہا: "صاحبان! پیر و مرشد اپنے آخری دنوں میں اس نوجوان توکل شاہ پر بہت مہربان تھے، آپ لوگ یہ بھی جانتے ہیں، کہ توکل شاہ ہر طرح سے اس کے مستحق ہیں کہ انہیں بھی پیر و مرشد کے خلفاء میں شامل کر لیا جائے۔ ان کی بھی دستار بندی ہونی چاہیئے۔"

خلفاء نے ناک بھویں چڑھائیں، ایک نے دوسرے خلفاء کی طرف دیکھ کر انہیں ہم خیال بنانے کی نیت سے کہا۔ "معلوم ہے ان صاحبزادے میں خلیفہ بننے کی کتنی صلاحیت ہے۔ اگر ان کی دستار بندی بھی کر دی جائے تو لوگ اس کمسن خلیفہ کی ولایت اور بزرگی کو کس طرح تسلیم کریں گے۔"

دوسرے خلفاء نے بھی اس کی تصدیق کی، کسی طرف سے آواز آئی۔ "آپ نے بجا فرمایا، پیر و مرشد نے اگر ان صاحبزادے کو اس لائق سمجھا ہوتا تو اپنے آخری لمحوں میں ان کے لئے وصیت فرما جاتے۔"

توکل شاہ کو ان کی باتوں سے بڑی اذیت پہنچ رہی تھی، یہ مزید برداشت نہ کر سکے۔ یہاں سے اٹھ کر جنگل کی راہ لی، اور اپنے رب سے شکایت کرنے لگے: "اے میرے مولا! میں نے تو کسی کا دل بھی نہیں دکھایا، پھر یہ انہیں کیا ہو گیا کہ مجھے خواہ مخواہ چٹکیاں لیتے رہے۔"

آپ نے جنگل میں قیام فرمایا، شہر سے نفرت ہو گئی۔ یہاں شب و روز یادِ الٰہی میں بسر ہونے لگے۔ ایک رات ان کی کٹیا پر کسی نے دستک دی، جب یہ باہر نکلے تو انہیں ایک بزرگ سفید براق لباس میں ملبوس کھڑا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔ آپ نے پوچھا "کیا بات ہے! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

بزرگ نے جواب دیا: "میں اللہ کے حکم پر تمہارے پاس آیا ہوں، خواجہ قادر بخش کے خلفاء نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، اللہ نے تمہارے لئے دستارِ فضیلت بھیجی ہے، اپنا سر میری طرف بڑھاؤ تاکہ میں اسے اپنے ہاتھوں سے باندھ دوں۔"

توکل شاہ نے اپنا سر ان بزرگ کی طرف بڑھا دیا۔ وہ دیر تک دستار کو توکل شاہ کے سر سے لپیٹتے رہے مگر دستار اتنی بڑی تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ جب دستار بندھ چکی تو ان بزرگ نے کہا: "توکل شاہ! تم اپنے پیر و مرشد کے حکم کے بموجب انبالے واپس جاؤ، تمہارا اس جنگل میں رہنا غیر مناسب اور غیر ضروری ہے۔"

توکل شاہ نے اسی دن انبالے کی راہ لی۔



آپ مراقبے میں حبسِ دم میں غیر معمولی قدرت حاصل کر چکے تھے یہاں تک کہ۔۔۔ دو دو گھنٹے تک سانس روکے رکھتے۔ اس عالم میں ایک دن توکل شاہ نے ایک عجیب سا منظر دیکھا۔ انہیں وحدت کا ایک بے کنار دریا نظر آیا۔ چاروں طرف ایک ہی ایک نظر آتا تھا۔ انہیں بڑی پریشانی ہوئی۔ آپ ہی آپ فرمانے لگے: "الٰہ العالمین! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، یہاں تو وحدتیں ختم ہو چکی ہیں اور ہر طرف ایک ہی ایک نظر آتا ہے۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟"

انہیں اپنے کانوں میں ایک آواز سی آتی سنائی دی، کوئی کہہ رہا تھا: "توکل شاہ! یہ حالت وحدت الوجود ہے۔ صدیوں پہلے حسین بن منصور حلاج اس کیفیت کا شکار ہو گیا تھا اور 'انا الحق' کا نعرہ لگانے لگا تھا۔"

توکل شاہ نے آنکھیں بند کر لیں اور معاملات کو مزید سمجھنے کی کوشش کی۔ اب انہیں اپنا وجود ایک قطرے کی طرح نظر آیا جو ایک بہت بڑے دریا کے سامنے موجود تھا۔ پھر یہ قطرہ دریا میں مل گیا تو وحدت ہی وحدت رہ گئی، توکل شاہ کو ہر طرف اپنے سوا کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ اب توکل شاہ کو شیطان نے ورغلانا شروع کر دیا۔ وہ آپ کو یقین دلا رہا تھا کہ کائنات میں کچھ نہیں، جو کچھ بھی ہے انسان کا اپنا ہے اور یہاں انسان سے بڑا کوئی بھی نہیں۔"

ان وسوسوں نے دل میں ایک عجیب سا سوال پیدا کر دیا: "کیا میں خدا ہوں؟"

جو کچھ نظر آ رہا تھا اس سے سوال کا جواب اثبات میں ملتا تھا لیکن اس وقت بھی توکل شاہ کو اتنا ہوش ضرور تھا کہ 'انا الحق' کہتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔

کسی نے انہیں ورغلایا۔ "توکل شاہ! تو خدا ہے، خدا تجھ سے الگ نہیں ہے!"

لیکن وجدان نے اس کی تردید کر دی، اس نے توکل شاہ کو مشورہ دیا: "توکل شاہ! تو فقط ایک بندہ ہے، خبردار جو اتنا بڑا دعویٰ کیا۔" کسی قوت نے وجدان کو برا بھلا کہنا شروع کیا: "اگر تو خدا نہیں ہے تو اس کا واضح ثبوت دے۔"

وجدان نے حکم دیا: "ذرا ایک سوئی تو لاؤ۔"

توکل شاہ نے سوئی ہاتھ میں لے لی، تو وجدان نے انہیں حکم دیا۔ "اب سوئی کو اپنے جسم میں داخل کرو۔"

انگلیوں نے سوئی کو بازو میں داخل کر دیا، درد و اذیت سے

ان کے منہ سے "سی" نکل گئی۔ وجدان نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"توکل شاہ! اگر تو خدا ہے تو سوئی کی چبھن سے تجھے تکلیف کیوں محسوس ہوئی!"

نفس نے ہتھیار ڈال دیئے "لیکن کچھ ہی دیر بعد پھر سرکشی اختیار کی، کہنے لگا۔ "کچھ بھی سہی، میں خدا ہوں سوئی کی چبھن سے کوئی فرق نہیں پڑتا!"

وجدان نے کہا، "اچھا تب پھر آگ کا انگارا اپنے ہاتھ میں لے کر دکھا!"

نفس نے جوش میں آکر انگارے کو مٹھی میں دبا لیا۔ مگر آگ کی سوزش نے ایک دم بے اختیار مٹھی کو کھول دیا اور انگارا ہاتھ سے گر گیا۔ آپ نے اپنی مٹھی جو کھولی تو جلی ہوئی ہتھیلی پر ایک بڑا سا آبلا ابھرتا محسوس کیا۔ سوزش نے ان سے صبر و قرار چھین لیا تھا۔

وجدان نے طنزاً کہا، "احمق! تو تو خدا تھا پھر یہ تیری ہتھیلی جل کیوں گئی اور اس میں یہ سوزش کیسی؟"

سرکش نفس پوری طرح زیر ہو چکا تھا۔ آپ سے بولا "میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔"

توکل شاہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی، ورنہ منصور کی طرح بہک جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔

اب آپ میں وہ باتیں آ گئی تھیں جو اپنے عہد کے بڑے بڑے ولیوں اور باکرامت بزرگوں میں پائی جاتی ہیں۔ آپ کے پاس بہ کثرت مریدوں اور ارادت مندوں کا مجمع آنے لگا۔ ان میں مولوی محبوب عالم نامی مرید او ارادت مند کو آپ کا خاص قرب حاصل تھا۔ آپ ان سے مزے مزے کی باتیں کیا کرتے تھے۔

ان دنوں برِ صغیر میں شدھی سنگھٹن کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی۔ آریہ سماجی انفرادی اور اجتماعی کوششوں سے مسلمانوں کو ہندو بنا رہے تھے۔ درد مند مسلمان اس تحریک کو غم و غصے سے محسوس کر رہے تھے۔ لیکھو رام آریہ سماجی ہندوؤں کا سرگرم عالم اور رکن تھا۔ اس نے کتنے ہی جاہل اور کمزور عقیدہ مسلمانوں کو ہندو بنا لیا تھا۔ مسلمان اس کے نام تک سے نفرت کرتے تھے۔

لیکھو رام نے ایک دن اپنی تقریر میں رسول اللہؐ کی شان میں گستاخی کی۔ کسی غیرت مند مسلمان نے مشتعل ہو کر لیکھو رام کو قتل کر دیا۔ اس قتل نے ہندو مسلم فساد کی صورت اختیار کر لی۔ ہندوؤں کا عام خیال یہ تھا کہ اس قتل میں کسی نہ کسی طرح توکل شاہ کا ہاتھ ضرور ہے۔ چنانچہ ہندوؤں نے اپنی ایک خفیہ نشست میں یہ فیصلہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح ان فقراء کو ضرور ٹھکانے لگا دینا چاہیئے۔"

یہ سوچ کر لیکھو رام کا ایک چیلا توکل شاہ کی خدمت میں پہنچا اور فرطِ عقیدت سے ان کا پاؤں پکڑ لیا۔ آپ نے فوراً ہی اپنا پاؤں چھڑا لیا۔ اور کہا، "یہ کیا کرتا ہے؟ یہ گناہ ہے خود بھی گنہگار ہو رہا ہے اور مجھ کو بھی گنہگار کر رہا ہے۔"

چیلے نے مٹھائی کا ڈبہ آپ کے حوالے کر دیا اور درخواست کی "حضرت! میرا دل رکھ لیجئے ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔"

آپ نے جواب دیا، "بھائی میرے! مٹھائی لے کر کیا کروں گا یہ میرے کس کام کی!"

چیلے نے مزید اصرار کیا، "اچھا اب آپ اگر نہیں کھاتے تو میں اس مٹھائی کو یہاں سے واپس بھی نہیں لے جاؤں گا آپ اپنی طرف سے اس مٹھائی کو اپنے یار دوستوں یا مریدوں میں تقسیم فرما دیں۔"

اس وقت ان کے پاس مولوی محبوب عالم بیٹھے ہوئے تھے آپ نے مٹھائی کا ڈبہ مولوی محبوب عالم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "محبوب عالم! یہ مٹھائی رکھ لے کام آئے گی۔"

مولوی محبوب عالم نے از راہ عقیدت اور محبت مٹھائی کا ڈبہ پیر مرشد کے ہاتھ سے لے کر اپنی خوابگاہ میں رکھ دیا۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ جب وہ پیر مرشد کے پاس سے جائیں گے تو مٹھائی کا ڈبہ اپنے ساتھ لیتے جائیں گے چنانچہ جب مولوی محبوب عالم مٹھائی کا ڈبہ لے کر اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ تو توکل شاہ نے ان کے پیچھے ایک مرید دوڑایا اور اس کو حکم دیا کہ مولوی جہاں بھی ملے پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔ پہلے اس کے ہاتھ سے مٹھائی کا ڈبہ اپنے قبضہ میں کر لینا، اور یہ کہہ دینا کہ اگر راہ میں کوئی مٹھائی دے تو اس سے نہ لینا کیونکہ وہ ایک سازش ہے۔ اس کے بعد کوئی بات نہ کرنا۔"

وہ مرید مولوی محبوب عالم کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑ بھاگ کرنے لگا

اس دوران کسی اور نے مولوی محبوب عالم سے کہا۔ "مولوی صاحب! اپنے بیوی بچوں کے لئے یہ مٹھائی لیتے جانا۔"

مولوی صاحب نے یہ مٹھائی بھی لے لی۔ ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ انہیں کسی کے پکارنے کی آواز سنائی دی یہ رک گئے۔ مرید دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا اور کہا۔ "مولوی صاحب! ذرا رُکئے، میری بات تو سُنئے!"

مولوی محبوب عالم کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی، ان کے سامنے کیچڑ کی ایک پٹی تھی، انہوں نے اس کو عبور کرنے کے لئے چھلانگ جو لگائی تو پاؤں پھسل گیا، وہ کہیں اور گرے اور مٹھائی کیچڑ میں دور دور تک بکھر گئی۔

اب وہ آدمی بھی مولوی محبوب عالم کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے کہا۔ "مولوی صاحب! پیر و مرشد نے فرمایا ہے کہ اس مٹھائی کو نہ تو خود کھائیے اور نہ کسی اور کو کھلائیے۔ یہ مٹھائی مسموم ہے۔"

مولوی صاحب نے جواب دیا۔ "مٹھائی تو کیچڑ میں لت پت پڑی ہے اب اسے کون کھا سکتا ہے۔"



انبالہ کے منصف میر امتیاز علی کے خلاف کسی نے ایک فوجداری مقدمہ دائر کر دیا۔ یہ بہت پریشان ہو گئے۔ توکل شاہ کے ایک خاص مرید سید ظہور الدین کی ان سے بڑی دوستی تھی۔ اس دن سید ظہور الدین ظہر کی نماز پڑھ کر قیلولے کے لئے لیٹے ہی تھے کہ منصف انبالہ میر امتیاز علی نے دروازے پر دستک دی۔ ظہور الدین باہر نکلے اور اپنے دوست منصف انبالہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی جو دیکھیں تو پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا بات ہے میر صاحب! آپ کچھ پریشان نظر آتے ہیں!"

میر صاحب نے فوجداری مقدمہ کی پوری تفصیل دہرا دی۔ اور کہا "سید صاحب! آپ کے پیر مرشد توکل شاہ کی بزرگی کا بڑا شہرہ ہے خدا کے لئے مجھ کو ان کے پاس لے چلو اور ان سے پوچھ کر بتاؤ کہ کہیں اس مقدمہ میں سزا تو نہیں پا جاؤں گا!"

سید ظہور الدین اس وقت میر صاحب کو لے کر توکل شاہ کے پاس پہنچ گئے اور انہیں مقدمے کی تفصیلات بتا کر درخواست کی کہ "پیر مرشد! میر صاحب کو چھٹکارا دلا دیجئے!"

توکل شاہ فوراً ہی مراقبے میں چلے گئے اور کچھ دیر بعد فرمایا "اپنے دوست میر امتیاز علی سے کہہ دو کہ شکایات کے کچھ کاغذات کل تک واپس لے لئے جائیں گے اور انہیں اس پر بڑی شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔"

میر صاحب خوش خوش اپنے گھر چلے گئے۔ توکل شاہ نے دو دن بعد اپنے مرید سید ظہور الدین سے پوچھا۔ "سید! وہ تیرا دوست میر امتیاز علی کہاں غائب ہو گیا؟"

سید صاحب نے جواب دیا "پیر و مرشد! اس کو کچھ سکون میسر آگیا ہے اس لئے وہ ادھر کا راستہ بھول گیا۔" اور توکل شاہ نے مسکرا کر کہا "یہ اس کی بھول ہے ابھی سکون کہاں حاصل ہوا ہے، جن لوگوں نے اس سے معافی مانگ لی ہے آج یا کل وہی لوگ دشمن بن کر نقصان پہنچانے آ جائیں گے۔"

سید صاحب چپ ہو گئے، پانچویں دن میر امتیاز علی صاحب گھبراتے ہوئے آئے اور توکل شاہ کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ اور رو رو کر عرض کیا۔ "شاہ صاحب کل جو دوست تھے، آج دشمن ہو گئے ہیں۔ بتائیے، میں کیا کروں؟"

آپ نے فرمایا۔ "میں نے تو یہ سنا تھا کہ تجھ کو سکون حاصل ہو گیا ہے۔"

میر امتیاز نے جواب دیا۔ "وہ میری بھول تھی، خوش فہمی تھی۔"

آپ نے پوچھا۔ "اب تو کیا چاہتا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "حضرت! میری عزت آبرو پر بن گئی ہے خدا کے لئے مجھ پر رحم فرمائیں۔"

آپ کچھ دیر کے لئے مراقبے میں چلے گئے۔ میر امتیاز خاموش بیٹھے توکل شاہ کی صورت دیکھتے رہے۔

آخر مراقبے سے سر اٹھا کر آپ نے فرمایا۔ "ابھی ابھی میں نے تیرے دشمن کو تیرے قدموں میں گرا ہوا دیکھا ہے، جا، اللہ جو کچھ کرے گا بھلا کرے گا۔"

میر امتیاز کو پھر بھی چین نہیں آیا، آہستہ سے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "حضرت! میں آپ کی ان باتوں سے کیا سمجھوں؟"

آپ نے فرمایا۔ "کیا میں نے یہ نہیں کہہ دیا کہ تیرا دشمن خوار ہو گا۔ تیرے مقدمے میں ایک سکھ کی شرارت تھی اللہ نے اس کو ذلیل کر دیا۔"

اس کے بعد آپ نے میر امتیاز کو چلے جانے کا اشارہ کیا، وہ چلے گئے، مگر دل کی بے قراری اور اضطراب اپنی جگہ برقرار تھے، وہ اٹھ کر چلے تو گئے مگر الجھنوں اور پریشانیوں کو لئے ہوئے۔

کئی دن بعد میر امتیاز کا مقدمہ پیش ہوا اور عدالتی کارروائی شروع ہو گئی۔ آپ کے سارے مخالفین عدالت میں کھڑے ہو کر کہنے لگے۔ "میر امتیاز علی! ہم سب شرمندہ ہیں ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ آپ کو ناحق پریشان کیا اب ہم آپ سے معافی چاہتے ہیں۔"

عدالت نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "اگر تم سب اس پر شرمندہ ہو کہ انہیں ناحق پریشان کیا تو یہ بھی بتاؤ کہ وہ شخص کون ہے جس نے تم سب کو اس شرارت پر آمادہ کیا۔ میں اس شخص کو دیکھنا اور جاننا چاہتا ہوں۔"

ان لوگوں نے عدالت کے ایک گوشے میں کھڑے ہوئے سکھ کی طرف اشارہ کیا، کہا۔ "وہ رہا، اس نے ہمیں اس پر آمادہ کیا تھا کہ میر امتیاز علی کو... تنگ کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے نادانی اور حماقت میں غلطی کی۔"

عدالت نے حکم دیا۔ "اس سکھ کو روک لیا جائے!"

عدالت کے کارندوں نے اس کو پکڑ کر ایک طرف کھڑا کر دیا۔ میر امتیاز نے عدالت سے درخواست کی۔ "میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ اس کو معاف کر دیا جائے کیونکہ اس نے اپنی غلطی اور اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے۔"

عدالت نے سکھ کو حکم دیا۔ "تحریری معافی نامہ داخل کیا جائے۔"

سکھ نے تحریری معافی نامہ داخل کر دیا اور جب میر امتیاز عدالت سے باہر نکلے تو اس سکھ نے ان کے پاؤں پکڑ لئے اور رو رو کر اپنی شرارت کی معافی مانگنے لگا۔ میر امتیاز نے کہا۔ "میں تجھ کو اس لئے معاف کر رہا ہوں کہ ہمارے پیرو مرشد توکل شاہ نے ہمیں حکم نہیں دیا ہے کہ تجھ سے تیری شرارت کا بدلہ لیا جائے جا۔ میں نے تجھ کو معاف کر دیا۔"

جب یہ باتیں توکل شاہ کو معلوم ہوئیں تو آپ نے فرمایا۔ "خدا جھوٹوں کو ذلیل کرتا ہے۔"

انہی دنوں پیر جیو عنایت اللہ کو بھی روحانیت میں شہرت حاصل ہو رہی تھی۔ ان کے پاس بھی لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ یہاں توکل شاہ کا ذکر بھی ہوتا رہتا تھا۔ ان کے ارادت مند انہیں بڑھاتے چڑھاتے رہتے تھے، مگر پیر جیو انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیتے تھے۔ کسی مرید نے بڑے جوش میں کہا "حضرت! آپ توکل شاہ کو بڑا کہتے ہیں، مگر مجھے تو آپ بڑے نظر آتے ہیں۔"

پیر جیو نے کہا۔ "ایسی بات نہیں ہے، توکل شاہ کا مقام بہت بلند ہے میری تو وہاں کوئی حیثیت ہی نہیں۔"

اتنے میں ایک بڑھیا روتی ہوئی آئی اور عرض کیا۔ "حضرت پیر جیو! میری بیٹی کو جن نے تنگ کر رکھا ہے خدا کے لئے میری مدد فرمائیے۔"

پیر جیو نے جواب دیا۔ "بڑی بی! اس سلسلے میں تمہیں توکل شاہ کے پاس جانا پڑے گا، کیونکہ جن ان کے نام سے خوف کھاتے ہیں۔"

بڑھیا نے کہا۔ "واہ جی! ہم تو آپ کے پاس آئے ہیں اور آپ ہمیں توکل شاہ کے حوالے کر رہے ہیں میں تو وہاں نہیں جاؤں گی۔"

پیر جیو نے عاجزی سے کہا۔ "اگر تو وہاں نہیں جائے گی تو تیری خاطر مجھ کو وہاں جانا پڑے گا۔"

بڑھیا نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا توکل شاہ واقعی اتنے بڑے ہیں کہ میرے کام کے سلسلے میں آپ کو وہاں جانا پڑے گا؟"

پیر جیو نے جواب دیا۔ "بی بی! میں نے جو کچھ کہا، اس میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔"

بڑھیا سکتے میں آگئی۔ کچھ دیر بعد بولی۔ "تب پھر میں خود توکل شاہ کے پاس چلی جاؤں گی۔"

پیر جیو نے فرمایا۔ "نہیں، مجھ کو ان کے پاس جانے دے۔ تو بعد میں بھی جا سکتی ہے۔"

پیر جیو کو توکل شاہ کے پاس جاتے دیکھ کر ان کے مریدوں کو حیرت ہوئی اور انہیں پہلی بار توکل شاہ کی عظمت اور بزرگی کا احساس ہوا۔

پیر جیو توکل شاہ کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے فرمایا۔ "کیوں عنایت اللہ! تم ہمیں خود کو گھٹا کر بڑھاتے رہتے ہو!"

پیر جیو نے عرض کیا۔ "حضرت! جو مرتبہ اللہ نے آپ کو بخش دیا اس کو کوئی اور کس طرح گھٹا بڑھا سکتا ہے آپ کو اللہ نے بڑا کیا ہے۔"

پیر جیو کی بات پر آپ مسکراتے رہے۔ پھر پوچھا۔ "بڑھیا کی لڑکی کا کیا حال ہے؟"

پیر جیو نے عرض کیا۔ "حضرت! اس سلسلے میں حاضر ہوا ہوں، بڑھیا بہت پریشان ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ "جاؤ، جن سے کہہ دو، وہ بڑھیا کی بیٹی کو تنگ نہ کرے، یہ بات میرا نام لے کر کہہ دینا۔"

پیر جیو واپس گئے اور بڑھیا کی بیٹی کو خود جا کر دیکھا اس وقت جن آیا ہوا تھا، پیر جیو نے جن سے کہا۔ "جن! آج میں توکل شاہ کے پاس گیا تھا، انہوں نے کہا ہے کہ جن سے کہہ دو بڑھیا کی بیٹی کو تنگ نہ کرے۔"

جن نے جواب دیا۔ "واہ جناب! توکل شاہ کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی، میں یوں ہی چلا جاتا۔"

بڑھیا بہت خوش ہوئی مگر دوسرے ہی دن وہ دوبارہ پیر جیو کے پاس پہنچی اور عرض کیا۔ "پیر جیو جی وہ جن تو پھر آ گیا اور میری بیٹی کو تنگ کر رہا ہے"

پیر جیو دوبارہ توکل شاہ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا۔ "شاہ صاحب! جن دوبارہ آ گیا۔"

توکل شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "جن کو میرا اسلام پہنچاؤ اور کہو یہ میری بات ہے لڑکی کو تنگ نہ کرے اور مجھ کو غصہ نہ دلائے۔"

پیر جیو نے توکل شاہ کا پیغام جن کو دوبارہ پہنچا دیا، جن نے کہا۔ "پیر جیو جی! آپ بھی خوب ہیں، بار بار توکل شاہ کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں یونہی چلا جاتا ہوں ان کا نام لے لینا ہی کافی ہے۔"

یہ کہہ کر جن چلا گیا لیکن تیسرے دن پھر آ گیا۔ پیر جیو جی جن کی شکایت لے کر پھر حاضر ہوئے اور کہا "حضرت، اس جن نے تو بہت تنگ کر رکھا ہے۔"

توکل شاہ نے غصے میں فرمایا۔ "اچھا تو وہ پھر آ گیا!" ان کے پاس ہی ان کے مرید اور خلیفہ امیر اللہ بیٹھے تھے، توکل شاہ نے اپنا ڈنڈا اٹھا کر ان کے حوالے کر دیا اور حکم دیا۔ "امیر اللہ جاؤ اس جن کو ڈنڈے مار مار کر بھگا دو۔"

امیر اللہ ڈنڈا لے کر بڑھیا کی بیٹی کے پاس پہنچ گئے اور ڈنڈے سے اس کی پٹائی شروع کر دی جن شور کرتا رہا چلاتا رہا کہ خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو، مجھ کو معاف کر دو، میں آئندہ یہاں نہیں آؤں گا۔

امیر اللہ نے کہا۔ "میں کس طرح یقین کر لوں کہ تو جو وعدہ کر رہا ہے اس پر پورا بھی اترے گا۔"

جن نے جواب دیا۔ "اگر میں جھوٹا عہد کروں گا تو یہ ڈنڈا کل بھی آپ کے پاس ہوگا، آپ کل بھی اس طرح سزا دے سکیں گے۔"

امیر اللہ نے ہاتھ روک لیا اور کہا۔ "اچھا اب تو بھاگ جا، خبردار، جو پھر کبھی اس لڑکی کو پریشان کیا۔"

جن چلا گیا، لڑکی ہوش میں آگئی وہ بہت کمزور ہو گئی تھی، اپنے سامنے امیر اللہ کو دیکھ کر حیا سے سمٹ گئی اور اپنی ماں سے پوچھا۔ "یہ کون بزرگ ہیں؟"

ماں نے جواب دیا۔ "بیٹی! یہ توکل شاہ کے مرید اور خلیفہ ہیں تیرے

جن کو اتار نے آئے تھے۔"

اس کے بعد امیر اللہ کے ڈنڈے کی یہ خاصیت مشہور ہوگئی کہ جس پر بھی آسیب کا جن کا اثر ہوتا امیر اللہ کے ڈنڈے کی ضرب اُسے اُتار دیتی۔ یہاں تک کہ دور دور سے جوق در جوق لوگ آنے لگے۔ امیر اللہ تنگ آگئے انہوں نے اپنے پیر و مرشد توکل شاہ سے درخواست کی کہ خدا کے لئے اس مصیبت سے نجات دلایئے کیونکہ میں اس خدمت کے بعد کوئی کام نہیں کر سکتا۔"

توکل شاہ نے وہ ڈنڈا واپس لے لیا اور امیر اللہ کی اس سے جان چھوٹی۔

آپ اپنے مریدوں کے سامنے مختلف قرآنی نکات پر باتیں کرتے تھے، مریدوں میں نہایت لائق و فائق اور عالم فاضل لوگ بھی موجود تھے آپ نے اچانک ان سے سوال کیا۔ "لوگو قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے کہ اللہ ہر شے پر قدیر ہے اور دوسری جگہ یوں ہے کہ اللہ ہر شے پر محیط ہے۔ کیا تم میں ایک بھی ایسا شخص موجود ہے جو قدیر اور محیط کے فرق پر روشنی ڈال سکے؟"

مولوی سراج الدین نے عرض کیا۔ "حضور مجھ کو کیا خبر؟"

توکل شاہ نے کہا "سراج الدین تم تو مولوی ہو۔"

مولوی سراج الدین نے کہا۔ "پیر و مرشد! اس سوال کا تعلق تصوف سے ہے نہ کہ علم ظاہر سے۔ آپ ہی اس کا صحیح جواب دے سکتے ہیں۔"

آپ مسکرائے فرمایا "قدیر کا تعلق ہے اس کی ذات سے اور محیط کا تعلق ہے اس کی صفات سے۔ چنانچہ مراتبۂ قدیر اعلیٰ درجے کا ہے بمقابلۂ مراتبۂ محیط۔"

مولوی سراج الدین اور دوسرے شریک مجلس اس مختصر تشریح سے بہت محظوظ ہوئے، انہیں اعتراف تھا کہ پیر و مرشد نے قدیر اور محیط کی تعریف میں "سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔"

اسی طرح ایک دن آپ دو رالہ مسجد میں اپنے مریدوں پر توجہ فرما رہے تھے۔ مریدوں کی نظریں بار بار سامنے کی خانقاہ کی طرف جاتی تھیں۔ آپ نے کسی سے پوچھا۔ "یہ کس کی خانقاہ ہے؟"

کسی مرید نے جواب دیا۔ "شاہ ملک شہید کی۔"

آپ نے فرمایا۔ "کسی نے کبھی شاہ ملک شہید کو دیکھا ہے یا یونہی؟"

ایک مرید نے جواب دیا۔ "جی ہاں پیر و مرشد اسے دیکھا بھی ہے بے سر کا لاشہ، خون میں لت پت۔ واقعی مجھ کو تو بہت ڈر لگتا ہے۔"

آپ نے انہیں حکم دیا۔ "تم سب اپنی اپنی آنکھیں بند لو، تاکہ تم لوگوں نے جو کچھ نہیں دیکھا، اسے بھی دیکھ لو۔"

مریدوں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ آپ نے بھی آنکھیں بند کرلیں اور کچھ دیر بعد دریافت کیا "کچھ دکھائی دیا؟ شاہ ملک شہید نظر آیا؟"

مریدوں نے بیک آواز جواب دیا۔ "حضور والا! ہم سب اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھ رہے ہیں اس کو اگر بیان کریں تو کسی کو یقین نہ آئے!"

آپ نے فرمایا۔ "جب تم سب ایک ہی منظر دیکھ رہے ہو تو بیان کرنے میں کیا حرج ہے اور کون ہے جو اس پر یقین نہیں کرے گا۔"

ایک مرید نے عرض کیا۔ "حضرت! میں اپنے سامنے ایک بے سر کا لاشہ دیکھ رہا ہوں۔ خون میں لتھڑا ہوا۔ شاید یہ شاہ ملک شہید کا لاشہ ہے۔ ان کے ساتھ بہت سے سوار بھی ہیں۔ ملک شہید کے ہاتھ میں ایک برچھا بھی ہے، اس برچھے سے وہ جنگ میں معروف ہیں۔ ان کے جسم سے خون جاری ہے۔"

آپ نے انہیں حکم دیا۔ "اچھا بس، اب چپ ہو جاؤ اور اپنی آنکھیں کھول دو، خبردار جو کسی اور کو یہ سب بتایا۔"



آپ نے ایک دن اپنے حاضرین میں ایک عورت کو بیٹھے دیکھا یہ عورت اپنی وضع قطع سے ہندو معلوم ہوتی تھی۔ آپ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔ "کیا بات ہے تو یہاں مردوں میں بیٹھی کیا کر رہی ہے؟"

عورت رونے لگی، بولی۔ "میاں جی! میں مسلمان نہیں ہوں، ہندو ہوں۔ میں نے آپ کی بہت تعریفیں سنی ہیں۔ بس اس لئے آگئی ہوں ایک مصیبت میں گرفتار ہوں آپ کی مہربانی اور دعا درکار ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ "سیدھی سیدھی بات کر، پہیلیاں نہ بجھا۔"

عورت نے کہا۔ "میاں جی! میرا لڑکا اندھا ہے اس کو روشنی دلا دو۔"

آپ نے جواب دیا۔ "عورت! میں کوئی طبیب تو ہوں نہیں۔ کسی حکیم کے پاس جا۔ وہی اس کا علاج کر سکتا ہے۔ ہم فقیروں کے پاس کچھ بھی نہیں۔"

عورت نے عرض کیا۔ "حضرت! میں اتنا علاج کرا چکی ہوں کہ اب علاج کا اعتبار ہی جاتا رہا۔ میں تو آپ کی دعا لے کر واپس جاؤں گی۔"

آپ نے فرمایا۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں تیرے بیٹے کے حق میں دعائے خیر کروں، ورنہ تو دل شکستہ اور آزردہ ہے۔"

عورت نے اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور اپنے گھر کے لئے روانہ ہوگئی، اس کا لڑکا اس کے ساتھ بڑی تیزی سے چلتا رہا۔ ایک جگہ کسی پتھر سے ٹھوکر کھائی اور زمین پر گر گیا، ماں نے لپک کر اس کو اٹھایا مگر لڑکے کی غیر معمولی حالت دیکھ کر اس سے پوچھا۔ "کیا بات ہے بیٹے! میرا خیال ہے کہ تیری بینائی واپس آ چکی ہے۔"

لڑکے نے اپنی دونوں آنکھیں ملیں۔ پھر کھول دیں، خوشی سے چلایا "آہا! ماں میری آنکھ کام کرنے لگی میری بصیرت واپس آگئی۔"

عورت نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو لڑکے کے سامنے کر دیا اور پوچھا "بتا تو سہی کتنی انگلیاں ہیں؟"

لڑکے نے صحیح صحیح جواب دے دیا، ماں چیختی چلاتی ایک بار پھر توکل شاہ کے پاس پہنچی اور پورا واقعہ سنا کے بولی "میاں جی میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرے لڑکے کی بینائی واپس آجائے گی۔"

آپ نے جواب دیا۔ "بینائی تو اللہ نے دی ہے۔ میں کیا۔ کچھ بھی نہیں، یاد کر ٹھوکر ہی سے اس کی بینائی گئی تھی ٹھوکر ہی سے واپس آگئی۔"

ہندو عورت نے بہت سوچا تو یاد آگیا کہ ایک روز اس کا بیٹا ٹھوکر کھا کے گرا تھا تو اس کی بینائی جاتی رہی تھی اب وہ ٹھوکر ہی سے واپس آ چکی ہے۔

اس واقعہ کا دور دور تک شہرہ ہوا۔

ابھی وہ ہندو عورت رخصت ہی ہوئی تھی کہ ایک دس گیارہ سال کا لڑکا آپ کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ آپ نے اس لڑکے کو بغور دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی۔

لڑکے نے عرض کیا۔ "پیرو مرشد! آپ مجھ کو نہیں پہچان سکیں گے کیونکہ میں کانپور سے آیا ہوں۔ میں یہاں کا مقامی نہیں ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔ "بیٹے خیریت تو ہے کہو کیسے آنا ہوا؟"

لڑکا رونے لگا بولا۔ "باباجی! میں کسی ہندو کا بیٹا نہیں ہوں مسلمان ہوں، میرا باپ آپ کا مرید ہے اس کو سزائے موت کا حکم سنایا جاچکا ہے بس دس پندرہ دن باقی رہ گئے ہیں!"

اس کے آگے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ آپ کے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا، پوچھا۔ "تو کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف بتا۔"

لڑکے نے جواب دیا۔ "اپنے باپ کی زندگی۔ بس! اور کچھ نہیں۔"

آپ نے کوئی جواب نہ دیا اور منہ پھیر کر کسی اور سے بات کرنے لگے، لڑکے کو بڑا دکھ پہنچا، اس نے بآواز بلند کہا۔ "باباجی! میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ٹلوں گا جب تک کہ میرا باپ چھوٹ نہیں جاتا۔"

توکل شاہ نے ناگواری سے فرمایا۔ "یہ کیسی ضد ہے۔ میں کیا کروں؟"

لڑکے نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ آپ کیا کریں؟"

آپ پھر چپ ہوگئے۔ اس بات کو کئی دن گذر گئے۔

ایک شب، نصف رات کے بعد آپ نے لڑکے سے کہا۔ "ذرا میرے ساتھ چل۔"

لڑکا چپ چاپ ان کے ساتھ ہولیا۔ چند مریدوں نے بھی رفاقت کا شرف حاصل کیا۔ آپ انبالہ کے ایک نامی گرامی تالاب کے کنارے جا کھڑے ہوئے، فرمایا۔ "جب تک میں پانی کے اوپر سر نہ نکالوں، تم لوگ کہیں جانا مت۔"

آپ نے یہ کہا اور تالاب میں غوطہ لگا گئے۔ یہ لوگ دو گھنٹے تک آپ کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ کسی نے تشویش ظاہر کی "شاہ جی واپس بھی آئیں گے کہیں یا ڈوب کر ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہوگئے۔"

ابھی یہ بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ شاہ صاحب پانی کی سطح پر نمودار ہوگئے، لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

آپ نے لڑکے کو اپنے قریب بلا کر فرمایا۔ "جا اپنے باپ کے پاس واپس جا، وہاں ایک غلطی پر اس کو سزائے موت سنائی گئی تھی میں نے اس غلطی کو دور کردیا ہے۔"

لڑکے کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی لیکن مریدوں نے لڑکے کو سمجھایا کہ تو فوراً کانپور واپس جا اللہ بھلی کرے گا۔

جب یہ لڑکا اپنے گھر کانپور پہنچا تو اپنے باپ کو گھر میں موجود دیکھا لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ باپ نے اس کو اپنے پاس بٹھا کر پوری تفصیلات سنیں، لڑکے نے جواب دیا اور آخر میں کہا۔ "باواجان! میاں جی نے آپ کو آزاد کرادیا۔ ان کا شکریہ ادا کرتے اپنا لے چلے چلیئے۔"

باپ کو کیا انکار ہوسکتا تھا جب یہ دونوں آپ کے سامنے پہنچے تو شاہ صاحب نے مسکرا کر لڑکے کے باپ سے کہا۔ "تم نے اپنے بیٹے سے پوچھا نہیں کہ وہ سزائے موت کے فیصلے کو کیا ہوگیا؟"

باپ نے جواب دیا۔ "باباجی!" "یہ بچہ ان باتوں کو کیا جانے بہرحال جو کچھ ہوا معجزہ ہوگیا۔"

آپ نے فرمایا۔ "اچھا اب اپنے رب کا شکریہ ادا کر۔"

یہ شخص! دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا رہا۔

کہتے ہیں ان کے بیسیوں واقعات ہیں جنہیں محفوظ رکھا گیا ہے اور ان سے کتابیں بھری پڑی ہیں، آپ نے لوگوں کو ہر قسم کا فیض پہنچایا ظاہری باطنی، عقلی نقلی، جب آپ وعظ فرماتے تو فصاحت اور حکمت کے دریا بہا دیتے۔

آخری عمر میں آپ کو اسہال کی شکایت ہوگئی تھی۔ جس نے آپ کو کمزور کرنا شروع کردیا۔ آپ کے مریدوں میں اضطراب پیدا ہوگیا اور دوا علاج ہونے لگا۔ اسہال کی زیادتی نے اتنا کمزور کردیا کہ غشی کے دورے پڑنے لگے۔ ہوش میں آتے اور مریدوں کو روتے دیکھتے تو فرماتے۔

"روتے کیوں ہو مجھ کو کیا ہوگیا، میں تو تم میں موجود ہوں ابھی۔"

مرید جواب دیتے۔ "ہم سے آپ کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔"

آپ مسکرا کر فرماتے۔ "اگر نہیں دیکھی جاتی تو رونے کی بجائے میرے حق میں دعا کیا کرو، اللہ کو انسان کی عاجزی اور گریہ زاری بے حد پسند ہے۔"

مریدوں نے دعائیں شروع کردیں۔ ۱۴ ربیع الاوّل ۱۲۱۵ھ بروز بدھ آپ کی حالت زیادہ بگڑ گئی۔ اس حال میں بھی نمازیں اشاروں میں ادا فرماتے رہے،

بے ہوشی کے غلبے سے نکلے تو پوچھا "کیا وقت نماز ہے؟"

کسی نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں!"

آپ نے پھر پوچھا۔ "کیا وقتِ مراقبہ ہے؟"

جواب ملا۔ "ہاں۔"

آپ کو حبسِ دم کی عادت تھی، ایک بار حبسِ دم کیا، ہوش میں آگئے، دوبارہ حبسِ دم کیا، پھر ہوش میں آگئے۔ تیسری بار حبسِ دم کیا تو سانس واپس نہیں آئی اور اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے۔

انبالے میں ایک قیامت برپا ہوگئی۔ ایک کہرام مچ گیا۔ آپ کے ماتم گساروں میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ امراء بھی تھے اور غرباء بھی تھے، بازار اُجڑ گئے۔ گلیاں سنسان ہوگئیں۔

کہتے ہیں ایک بار کسی نے آپ کو "سید" لکھ دیا تھا۔ آپ نے اس کو منع کردیا تھا کہ میں سید نہیں ہوں، مجھ کو آئندہ سید نہ لکھنا۔ حالانکہ آپ کو توکل شاہ کہا جاتا ہے اور یہ کمال کی بات ہے کہ ان کے اصل نام کا کسی کو بھی علم نہیں۔ پوری زندگی اسم باسمیٰ گذار دی۔ توکل شاہ، توکل و قناعت کے جیتے جاگتے نمونہ تھے۔

شیخ شرف الدین

شاہ کمال

صابر پیا کلیری

عمرو بن عثمان

قطب ربانی

محبوب سبحانی

عارف ملتانی

یوسف ثانی

صدیق ثانی

محمود واحد گیلانی

بوعلی قلندر

خواجہ احرار

توکل کا بندہ

قبلہ حاجات

غوث علی قلندر

توکل شاہ